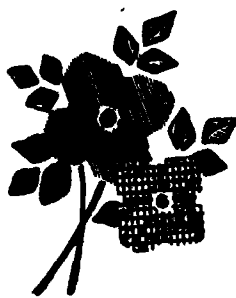




Price Rs. 6-00

TelePhone: 229161
Postal Regd. No. H/HD593
R. No 37/979/84
MONTHLY **SHADAAB** HYD.
11-5-147 RED HILLS, HYD-A. P.
Vol.12 No.12
DEC 1996

شاداب بک کلب

۱۱-۵-۱۴۷ ریڈ ہلز۔ حیدرآباد-۵۰۰۰۰۴ (اے پی)

- اردو کتب و رسائل خرید کر پڑھنے اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ اس مد پر خرچ کرنے کی عادت ڈالنے کیلئے "شاداب بک کلب" قائم کیا گیا ہے۔
- شاداب بک کلب کی رکنیت فیس -/25 روپئے ہے۔
- ہر رکن کو سالانہ 500 روپے کی کتب و رسائل خریدنے ہونگے۔ یہ رقم وہ پیشگی جمع کروائیں گے یا ہر ماہ 50 روپے پیشگی ادا کریں گے۔
- مکتبہ شاداب کی مطبوعہ کتب پر 25 فیصد ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا دیگر کتب پر 10 فیصد ڈسکاونٹ دیا جائے گا۔
- کتب کی فہرست مکتبہ پر موجود رہیگی اور منتخب کتب کی فہرست "شاداب" میں چھپتی رہے گی۔
- ہر رکن کو اپنی پسند سے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔
- مکتبہ شاداب میں غیر موجود کتب کی خواہش پر انھیں حاصل کر کے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- اگر کوئی رکن سال کے ابتدائی دس ماہ تک -/500 روپے کی کتب فراہم کرنے کی خواہش نہ کریں تو ادارہ اپنی پسند کی کتب روانہ کرے گا





ماہنامہ شاداب شفق حیدرآباد

جلد ۱۳ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۹۶ء

قیمت : ۶ روپے

منیجنگ ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	ایڈیٹر
قدیر انصاری	رشید الدین	محمد قمرالدین صابری

زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۲۰۰	۳۶۰	۳۲۰۰
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۳۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۲۵ پاکستانی روپے	۲۳۰ روپے	۲۳۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ :

ماہنامہ شاداب ۵-۱-۱۴۷ ریڈ ہلز حیدرآباد۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل ہائی ٹیک پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس
چھتہ بازار حیدرآباد میں چھپا کر دفتر شاداب ۵-۱-۱۴۷ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

صفحہ

مولانا مفتی محمد طیب

شریعت، طریقت اور سیاست

لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ علماء کرام کے ہاں حکومت اسلام کا کوئی تصور ہے؟ اصل میں سوال کا سبب بعض علماء کرام اور ان کے متوسلین کا تنگ موقف اور ملکی سیاست سے کنارہ کشی، علم الکلام کو پڑھنے پڑھانے اور تصوف اخلاق تک محدود سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ٹھیک اسی طرح یہ بھی ہے کہ آج جو کوئی دین کے ایک اہم شعبہ کے ساتھ منسلک ہے وہ اس کو فقط دین کی خدمت سمجھتا ہے اور باقی شعبوں میں کام کرنے والوں کی نفی کرتا ہے۔ جبکہ اللہ پاک کا حکم ہے "اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو" اور اس مرض کا اصل سبب رابطہ کی کمی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

ت — وہ ذات ہے جس نے بھیجا ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول ان ہی
میں سے پڑھتا ہے ان پر اس کی آیات اور انہیں پاک کرتا
ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ وہ پہلے کھلی
گمراہی میں تھے

اس آیت میں تلاوت آیات کا ذکر ہے اور اس کی حیثیت کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں
یہ حیثیت کہ اسلامی نظام کے تحت مختلف شعبے پیدا ہوتے ہیں

1. مسئلہ تعلیم جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے کے اور سکھا دینے کے ہیں کہ جس پر امت کے علم و فکر کی تکمیل اور ترقی موقوف ہے۔

2. مسئلہ تزکیہ یا تہذیب الاخلاق: جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات و مقامات کو سامنے لانا ہے۔ جس پر قلوب کی استقامت موقوف ہے۔

3. مسئلہ تعین حکمت جس کے معنی یہ ہیں کہ [illegible] کے مطابق آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجموعی زندگی، اسوۂ حسنہ، امت کے سامنے آ گئے کہ ہیں جس کے مجموعہ پر امت کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔ پس قرآن کے اصلاحی پروگرام کے تین بنیادی اصول ہو گئے۔ تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال۔

عرف عام میں پہلے یعنی تعلیم کا لقب "شریعت" ہے دوسرے تہذیب اخلاق کا "طریقت" تیسرے تنظیم اعمال کا نام "سیاست" ہے۔ یہ دین کے اصول ثلاثہ ہیں جس سے دین کا نظام مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں سے راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ راستہ ہی سامنے نہ ہو تو مسافت طے کرنا کیسے ممکن ہے؟ طریقت سے راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر چلنے کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت سے کیا ہوتا ہے؟ اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں۔ اگر راستہ پر خار اور سنگ راہ سے پر ہو تو طاقت بھی کیا کام دے سکتی ہے؟ اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت راستہ ہی میں صرف ہو کر رہ جائے گی منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔

پس شریعت "راہ" ہے طریقت "قوت رہبری" اور سیاست "تصفیہ راہ" ہے۔

قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے۔ راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے۔ اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور شغب بھی لیے ہوتا ہے اس لیے قدرتی چیز ہے کہ طریقت تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادی پر ہو نیز وہ اپنے اسی بنیاد اور اصل اور معانی و فروع کے

لحاظ سے انسان کا طبعاً تجلی و خلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری جدوجہد تنگ سے تنگ اور یکسو ہو جاتا ہے اسے صرف اپنی ذات اور اصلاح و فلاح تک محدود نظر آتی ہے۔ وہ دوسروں سے کٹتا ہے تو انہیں بھی اہتمام خالق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے۔ بہرحال خلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک اس پر طریقت کا غلبہ ہو لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور ادائے حقوق پر ہے۔ ہدایت و ارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا ان کی اذیتیں کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں جلنے جھلسنے کا سلسلہ شریعت میں ضروری ہے۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی کی جاتی ہے شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے وہاں لوگوں سے بھاگنا اور دور رہنا ہے اور یہاں مخلوق میں گھل مل جانا ہے پس ایک عالم شرع جس پر رشد و ہدایت کا غلبہ ہو بحیثیت ایک شرعی فریضے کے سارے انسانوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کی اصلاح کی فکر میں رہے گا اسے درد ہوگا اپنے گھر کا اپنے قبیلے کا پورے شہر کی عام برادری کا اور پوری دنیا کے انسانوں کا بھی اس عظمت پسندی سے اسے کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی جب تک اس شرعی رنگ کا غلبہ ہو گا۔

امور سیاست کے دائرہ میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید و وسیع و ہمہ گیر ہو جاتی ہے وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکل کر بندوں تک آیا تھا اور یہاں تک سیاست میں بندوں سے نکل کر شہروں تک اور شہروں ہی نہیں صحرا و پہاڑوں، زمینوں اور ان کی پیداوار دریاؤں اور ان کے حیوانات اور ان کے منافع غرض کہ ساری کائنات کے اجزا اور ان کی تنظیم تک ایک سیاسی فرد کو بڑھنا پڑتا ہے وہاں حقوق کا پہچاننا الگ ہیں اور دفاع مظالم الگ حدود و تعزیرات الگ ہیں اور جہاد و صلح یا جنگ بیت المال کی حفاظت الگ ہیں اور دشمنوں کی

کو دبانا اور مظلوموں کی حمایت، بدکرداروں کا مقابلہ کرنا اور حق داروں کو حق دینا۔ غرضیکہ
کہ ملک اور سماج کو ہر طرح کے تغیرات کے خطرے سے محفوظ رکھنا
اور نئے نظاموں کی بنیادیں ڈال کر سارے عالم پر ایک حکومت قائم کرنا ایک سیاسی
فرد کا کام ہے۔ ظاہر ہے اس میں یکسوئی اور خلوت کہاں میسر آ سکتی ہے کیونکہ شریعت
اس لئے ہے کہ معاملات جماعت سے متعلق ہیں اور سب سے کٹ کر ایک گوشہ
پہ زمین کے لیے کسی انسان کے اوقات صرف کئے جاتے ہیں جس کی یکسوئی [illegible]
طریقت میں صرف یکسوئی اور شریعت میں ایک اس دائرہ تعلقات میں محدود تھی اس
لئے طریقت یکسوئی اور حکومت یکسوئی اور سیاست اختلاط ہی اختلاط اور شریعت دونوں
کے درمیان ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت در انجمن پیدا کر دیتی ہے اس سے
خود واضح ہو جاتا ہے کہ شریعت کا "خلوت در انجمن" میں آ جانا ہی ممکن ہے کہ اس کے مطابق
باطن پر یکسوئی کا غلبہ ہو "طریقت" ہے اور باطن بلند ہو انجمن سے ہے "سیاست" خلوت در
خلوت در انجمن" اور "دل بیار دست بکار" کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس
حالت میں ان تین شعبوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ان کے باہمی امتزاج کے
مخلوط منافع منقطع ہو کر ایک مخصوص نقصان میں پڑ جائے گی۔ اگر صرف طریقت رہ
جائے جس میں شریعت اور سیاست نہ ہو تو وہ صرف رہبانیت اور خشک زندگی ہے اور
اگر صرف شریعت ہو جس کے ساتھ طریقت اور سیاست نہ ہو تو وہ صرف نقشہ اور صرف جمود
ہے۔ اگر سیاست کے ساتھ طریقت و شریعت نہ ہو تو وہ حکومت اور صرف جبر ہے اور
ظاہر ہے کہ یہ تینوں شعبے تنہا کامل نہیں بلکہ اس لئے ان میں سے ہر ایک دوسرے
کا سہارا اور مصلح ہے اور اس لئے "دین" نے ان سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا
جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے پس طریقت کا [illegible] کا مصلح شریعت اور سیاست
[illegible] جس کی [illegible] تعلقات کی [illegible] اور اجتماعیت [illegible] کے مجموعہ کا

مصلح طریقت ہے۔ جس سے قلب میں شفقت و محبت پیدا ہو کر مجموعی شدید نقل
ہوتا ہے۔ سیاست کی محبت و تحکم کا مصلح شریعت و طریقت ہے جن کی آمیزش سے
مخلوق پر رحم اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے۔ اور خلافت الٰہی نمایاں ہو کر نفسانی ظلم
و جبر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر شریعت و طریقت کی کسی بھی ویسے ہی کا مصلح سیاست ہے
کی مادی شوکت ان دونوں کے لیے سرمایہ حفاظت و حفاظت بنتی ہے۔ پس جب ایک طرف
طریقت اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے نفس میں انصاف پیدا ہو گیا اور شریعت کے
ذریعے علم احکام اور تعلیم خیر کا جذبہ شفقت قائم ہو گیا اور ریاضت و محنت کے ذریعے
اس علم الاخلاق اور حسن اخلاق کی نفاذ کی قدرت پیدا ہو گئی تو اب سیاست میں
سے نخوت و کبر نکل کر مقدرہ خودداری اور شہامت و بہادری آ جائے گی۔ طریقت میں
سے بیہم خلوت نکل کر حقیقت خلافت کے لیے تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ذکر پیدا ہو جائے
گا اور اجراء احکام شریعت میں سے خشکی جو محض تنگ نظری نکل کر وسعت [illegible]
ہمہ گیری، تعاون اور آپس میں اتحاد کے جذبات ابھر آئیں گے۔ جس سے قوم کے اندر
روحانی عروج کمالات خود بخود قائم ہو جائے گا جس کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عنصروں کے جمع کیے ہوئے مکمل
نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین انجام نہیں کر سکتے
جب تک وہ بیک وقت حامل شریعت، محقق طریقت اور سیاسی نہ ہوں۔ افسوس ہے کہ آج
یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شعبوں کی صورت میں اور بعض کے ہاں تک کہ مستقل
طبقات بنتے جا رہے ہیں اور اسی طرح شریعت اور سیاست کو الگ الگ مستقل ضد
سمجھا گیا ہے اور صرف اسی پر اکتفا کیا گیا ہے بلکہ مدرسے اور خانقاہ کی [illegible]
اس سے سمجھتے ہیں کہ ...

کے مقابلے میں، اس لیے قوم میں مستقل تین طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے مل کر کسی اعلیٰ طاقت کے بالمقابل ہوں، جس نے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور حق کا راستہ بھی غلط ڈال دیا ہے۔ اپنی اپنی قابلیتیں آپس ہی کی لڑائیوں میں ختم کر دیتے ہیں جس سے مرکز اعداء طاقت زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔

میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں اور نہ صرف افراد ہی مل جائیں بلکہ ان کے یہ تینوں فنون اس طرح باہم آمیختہ ہو جائیں کہ قوم کا ہر فرد عامل شریعت، صوفی محقق اور سیاسی مفکر ہو جائے۔ اس وقت تک قوم بحیثیت مجموعی کامل قوم نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کامیابی کا منہ کبھی نہیں دیکھ سکتی۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جز علم احکام اور حسن اخلاق دیانات کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم و اجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانات سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا تب نہ حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دیانات، اگر دیانات نہ رہے تو سیاست مار کاٹ کرنا اور محض استبداد کا ملک ہو سکتا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانات بے کسی و بے بسی اور زوال کی حامل ہو جائے گی۔ قانون محض اور کورے سیاست سے دنیا کبھی امن و چین کا منہ نہیں دیکھ سکتی اور نہ ہی عالم بشریت کی اصلاح و تنظیم ہو سکتی ہے۔

اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پرامن ہوتا کیونکہ وہاں قرآنی سیاست کی دفعات پر ساری کی ساری طرح ہر گرفت ہے لیکن کتنی ہی عمدہ قانون سازی چلتی رہے جیسے فن قانون عام معروف رہی ہیں تبھی تو فردیات پر روزانہ قانون بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں اسی قدر بے باکی بڑھتا گئے جاتے ہیں۔ نتائج اور اہل وطن میں صرف افراد اضافہ ہو رہا ہے اس نئی کا ضد کی اور ہوس تک قانون کے دائرے میں رہ کر قانونی خلاف ورزیاں اور آئین ظلم و ستم

اب سیکھتے جا رہے ہیں اور یورپ کی ساری دنیا فسق و غفلت گری خود ہوا میں
سے جہنم زار بنی ہوئی ہے۔

پس اگر محض سیاست اور وضع کردہ قانون سے بشریت کی اصلاح و تنظیم ممکن ہو سکتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا اس لیے کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی، اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے یعنی وہاں سیاست کے پیچھے نہ اخلاق باقی ہیں نہ مقصد کا علم ہے اور نہ اس کا نمونہ عمل اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کیونکر سیاست اور خالی قانون کے اتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم نصیب ہو سکتا ہے

پس آج کی یورپین تباہ کاریاں عالمگیر بدامنی اور انسانیت کی یہ تباہی اور خرابی خالی سیاست سے نہیں بلکہ فقدان دیانت کے سبب سے ہے آج ایک بے شعور درندہ بن گیا ہے تو محض سیاست اس کے دل و دماغ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعہ دیانت ہے۔ دیانت بلا سیاست اور علم و اخلاص بلا شوکت کے بے بس و بے کس اور عوام کی آنکھوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کر سکتے اور نہ صرف یہی بلکہ اس کمزور ترین صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر و استہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقے میں ان کی مخالفت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ظالم و گناہ گار کی طبیعتیں بے شوکت دین سے دلیر ہو جاتی ہیں اس حالت میں کھل کھیلتی ہیں اور اس کا استہزاء اور تمسخر کا سنت کو اور مضبوط بنا دیتی ہیں ساتھ ہی وہ طبقہ جو گو فسق و فجور کا شکار نہ ہو تقویٰ و تقدس کی طرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا ہو وہ بھی فسق و فجور کا غلبہ دیکھ کر متزلزل ہو جاتا ہے پھر وہ خالص حقانی طبقہ جو علم و اخلاص کا سرمایہ لیے رہتا ہے بے کس بن کر رہ جاتا ہے جس میں سے کمزور دل لوگ اس لیے کسی کی مصیبت سے گھبرا کر یا مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کر دیتی ہے

عنصر اور مکمل کے خواص آثار رفعت و شوکت کے سارے جذبات ختم کر کے روح کا شکست خوردہ غالب ہوجاتے ہیں اور پھر ہر طاقتور کمزور کو کچل دیتا ہے اور خود وہ اپنے سے زیادہ کے ہاتھوں کچلا جاتا ہے۔ ظالم مظلوم کو ختم کر دیتا ہے اور وہ اپنے سے زیادہ ظالم کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ دنیا آخرت کا خسارہ بن جاتا ہے اسلئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم و اخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن و چین کا سانس نہیں لے سکتی اس لئے اسلام نے دین کی رہبانیت کو ختم کر کے اس کے ساتھ سلطنت لگائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اس کو خلافت بنا دیا جس سے دیانت و سیاست کا ایک امتزاج قائم ہو کر دیانت کی بے حسی سیاست سے ختم ہوئی اور سیاست کا جور و استبداد دیانت سے پامال ہو گیا۔ چنانچہ اسی جامعیت کی طرف کئے اشارے فرمائے گئے۔ احادیث نبویہ میں "ملک اور دین دو جڑواں بھائی ہیں" "دین نیو اور سلطنت پاسبان کہا گیا ہے" "ڈھنے والا اور لٹنے والا ہو جاتا ہے"

اور آخرت میں بہت کچھ یاد رہے جسکی عمر کتنی زیادہ ہے اس کی تو حسنات بھی بہت ہوں گی۔ اور جسکی شہوات زیادہ ہوں اس کے گناہ زیادہ ہوں گے اور اس کا دل بھی سخت ہوگا۔ اور جسکا دل سخت ہوگا وہ حسنات اور سیئات میں فرق نہ کرے گا وہ آگ میں داخل ہوگا۔

حضرت عروہ بن زبیر بار بار کہتے کہ کبھی بیٹا اپنے ساتھ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا نہ کیجیو ایک وقت تمہیں پکڑا کرے گا۔ ایک دن اتفاق سے راہ میں آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ خیانت کی۔ اس وقت ہم کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ... آپ نے آنکھوں سے ہی کھول دی۔ آپ کی نظر قبروں پر پڑی اور انا للہ وانا الیہ راجعون

الحاج سید غلام محمد کیفی غفرلہ تعالیٰ [illegible]

[illegible]

سیرت الاولیاءؒ

حضرت حاتم اصمؒ فرماتے ہیں کہ شیطان مجھ سے سوال کرتا ہے تیرا کھانا کیا ہے، تیرا لباس کیسا ہے اور سکونت کہاں ہے۔ میں جواب دیتا ہوں کہ میرا کھانا موت ہے، میرا لباس کفن ہے اور میرا مسکن قبر ہے۔"

حضرت مالک بن دینارؒ نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ آپ کے ہمسایہ میں ایک یہودی رہتا تھا۔ آپ کے گھر کی جانب یہودی [illegible] کے دروازے [illegible] پاخانہ بنا لیا اور غلاظت آپ کے گھر میں پھینکتا [illegible] ایک مدت تک [illegible] ایسا ہی کیا۔ [illegible] آپ نے کسی سے ذکر نہ کیا [illegible] ایک دن وہ یہودی آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: [illegible] سے تکلیف تو نہیں ہوتی؟ آپ نے فرمایا تکلیف تو ہوتی ہے لیکن [illegible] صاف کر دیتا ہوں [illegible] تکلیف آپ کیوں برداشت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا [illegible] اللہ تعالیٰ کا حکم ہے والکاظمین الغیظ [illegible]

[illegible]

کے دل میں گوشت کی خواہش پیدا ہوئی آپ نے صبر کیا۔ جب تقاضائے نفس حد سے گزر گیا تو آپ
قصاب کی دوکان پر گئے اور گوشت کا ایک ٹکڑا خریدا اور آستین میں رکھ کر چل دیئے۔
قصاب نے اپنے شاگرد کو آپکے تعاقب میں بھیجا تاکہ معلوم کرے کہ آپ گوشت کا کیا کریں گے۔
تھوڑی دیر کے بعد شاگرد واپس آکر بیان کیا کہ آپ غیر آباد جگہ پر پہنچے تو گوشت کو آستین سے باہر
کیا اور تین بار سونگھا اور گوشت ایک فقیر کو دیدیا اور کہا کہ اے جسم تکلیف جو تجھ کو دیتا ہوں یہ
خیال مت کر کہ کسی دشمنی کی وجہ سے ہے۔ چند روز صبر کر کہ شاید محنت ختم ہوجائے اور نعمت نصیب
ہوکہ جسے ہرگز زوال نہ ہوگا۔

ایک دن ایک عورت نے آپسے کہا "اے ریاکار"! آپ نے جواب دیا بیس سال ہوئے
کہ کسی نے میرا نام نہ لیا۔ تو نے ٹھیک سے پہچانا کہ میں کون ہوں؟

حضرت احمد بن حرب کے پڑوس میں ایک شخص کے یہاں چوری ہوگئی آپ احباب کے ساتھ
اس کی غمخواری کو گئے۔ پڑوسی نے گمان کیا کہ قحط پڑا ہوا ہے اس نے دستر خوان کا حکم دیا۔ حضرت
احمد نے کہا حادثہ سن کر افسوس کرنے آئے ہیں۔ اس نے کہا "اس حادثہ سے مجھ پر تین شکر واجب
ہیں۔ اول یہ کہ دوسروں نے میرا مال چرایا میں نے نہیں، دوسرے یہ کہ ابھی آدھا مال میرے
پاس موجود ہے۔ تیسرے یہ کہ دنیا گئی ہے تو گئی ہے اور دین میرے پاس ہے"

حضرت شبلیؒ سے قاضی نے پوچھا بیس دینار ہوں تو کیا زکوٰۃ دینی چاہیئے۔ آپنے فرمایا
ساڑھے بیس دینار۔ قاضی نے کہا یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا حضرت صدیق اکبر کے پاس چالیس ہزار
دینار تھے اور باقی ایک بھی نہ رکھا۔ قاضی نے کہا پھر آپ نے یہ آدھا دینار زیادہ کیسے
بنایا؟ آپ نے فرمایا۔ یہ جرمانہ ہے کہ اس نے بیس دینار اکٹھے ہی کیوں کئے۔

ایک جوان ہمیشہ صوفیائے کرام کا انکار کرتا تھا۔ ایک روز حضرت ذوالنون نے اس کو
انگشتری دی اور فرمایا "اسے نانبائی کے پاس لے جا اور ایک دینار کے عوض گرو رکھ دے۔"
جوان اسکی انگشتری گروی رکھنے گیا نانبائی نے اس سے کہا میں ایک درہم سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"
وہ واپس ہو کر آپ کی خدمت میں آیا۔ آپنے فرمایا۔ اسے صراف کے پاس لے جاؤ دیکھو

قیمت دریافت کرنے کے لئے وہ انگشتری صراف کے پاس لے گیا۔ صراف نے ایک ہزار دینار اس کی قیمت بتائی۔ پھر آپکی خدمت میں آیا۔ آپ نے فرمایا "تیرا علم صوفیائے کرام کے متعلق نانبائی کے علم کی طرح ہے جو اسے انگشتری کے متعلق تھا۔" یہ سن کر اس نے توبہ کی اور انکار سے باز آیا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ بادشاہوں کے تحفے قبول نہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ خلیفہ مستنجد باللہ نے اشرفیوں کے دس توڑے آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ آپ نے حسب معمول انکار کیا۔ خلیفہ نے اصرار کیا تو آپ نے ایک توڑا دائیں ہاتھ میں اور ایک توڑا بائیں ہاتھ میں لے کر دونوں کو دبایا تو اشرفیوں سے خون بہنے لگا۔ پیر بغداد نے خلیفہ سے ارشاد فرمایا "شرم نہیں آتی بغداد کے لوگوں کا خون کھاتے ہو اور اسے جمع کر کے میرے پاس لاتے ہو۔" خلیفہ پر اتنا اثر ہوا کہ غش کھا کر گر پڑا۔

عبدالواحدؒ اور حضرت سفیانؒ ایک روز حضرت رابعہؓ کی عیادت کو گئے لیکن آپ کی ہیبت کی وجہ سے باتوں کی ابتداً نہ کر سکے۔ آپ نے سفیانؒ سے کہا "کچھ فرمائیے" انہوں نے کہا "اے رابعہؓ دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ اس رنج کو تجھ پر آسان کرے۔" آپ نے یہ سن کر ان کی طرف دیکھا اور کہا "اے سفیان کیا تم نہیں جانتے کہ یہ بیماری مجھ پر اس کے حکم کی وجہ سے ہے؟" انہوں نے کہا "جانتا ہوں۔" آپ نے کہا "جو تو جانتا ہے تب بھی مجھ سے کہتا ہے کہ اس سے درخواست کروں۔ اور جو کچھ اس کی مرضی کے خلاف کرنا درست نہیں۔"

ایک دفعہ ایک قوم حضرت معروف کرخیؒ کے سامنے سے دریائے دجلہ میں کشتی سے گزری جس کے پاس شراب اور دیگر سامان عیش رکھا ہوا تھا۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ ان کے واسطے بددعا کیوں نہیں کرتے۔ تو آپ نے فرمایا "اے خدا ان کو آخرت میں بھی ایسی خوشی و خرمی دے جیسی یہاں دی ہے۔" لوگوں نے کہا ہم نے بددعا کی گزارش کی تھی۔ آپ نے فرمایا "میں کیسے کسی مسلمان کے حق میں بددعا کروں۔ بیشک جب اللہ ان کو آخرت میں خوش کرے گا تو یہاں ہی توبہ کی توفیق دے کر ان کو معاف کرے گا۔ تم کو اس سے کیا شکایت

محبت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ! جو مجھے مخلوق میں سے زیادہ پیارا ہے مجھے بتلا دو۔ فرمایا اسے جس کسی کو مجھ سے سب سے زیادہ پیار ہے جو شخص صبح کو نہاتا ہے تو مجھے کی خبر گیر بھائی کی طرح غمگین ہو کر خود اس کو کھانا کھلاتا ہے۔

حضرت میمون بن مہران کو جب کسی دعوت میں بلایا جاتا تو غریبوں کے پاس بیٹھتے اور ان کے ساتھ رزق پاتے۔

کسی بادشاہ نے کسی فقیر کو اپنے محل کے سامنے بیٹھا دیکھا جس نے روٹی کا سوکھا ٹکڑا پانی میں بھگو کر کھایا اور پھر سو گیا جب اٹھا تو بادشاہ نے اسے بلایا اور پوچھا جب تم نے روٹی کا سوکھا ٹکڑا کھایا اور سو گیا تو کیا تو اپنے پروردگار سے خوش تھا؟ فقیر نے کہا ہاں! لیکن میں تجھے وہ شخص بتاتا ہوں جو اس سے بھی کم پر خوش ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا وہ کون ہے؟ اس نے کہا "جو آخرت کے بدلے دنیا پر خوش ہو گیا"۔ یہ الفاظ بادشاہ پر کارگر ہوئے وہ بادشاہت چھوڑ کر کمبل اوڑھے رات کے اندھیرے میں جنگل کی طرف چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تیرا اللہ تعالیٰ سے ایسے ستر گناہ کر کے ملنا جو اللہ سے ہوں بہت آسان ہے اس ایک گناہ سے جو کسی خاص شخص سے تعلق رکھتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ صدقہ کو حقیر نہ جانو کیونکہ اس کا ایک دانہ بھی قیامت میں پہاڑ جتنا وزن رکھتا ہے۔ آپ نے ایک فقیر کو ایک دانہ انگور کا عطا کیا اس نے واپس کر دیا گویا اس کو حقیر جانا تو آپ نے فرمایا کیا دیکھتے نہیں قرآن مجید میں ہے فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ (ترجمہ جو ذرہ برابر نیکی کرے گا دیکھ لے گا) اس انگور میں کتنے ذرے ہیں۔ پس وہ آدمی شرمندہ ہوا اور وہ انگور شکریہ کے ساتھ لے لیا۔

حضرت محمد بن سلام فرماتے ہیں جو انسان سے محبت کی علامت ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہر ایک سے ملتا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے۔

ڈاکٹر نسیم الدین
ریسرچ اسکالر

[illegible]

شاہ سلطان ثانی اور ان کی سی حرفی

شاہ سلطان دکنی غزل کے ایک باشعور صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ لیکن دکنی کے بہت سے نامور شعرا کی طرح ان کے سوانح کے باب میں بھی ہم تذکرہ نگار تاریخ ادب اور تذکروں کے اوراق خاموش ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں شاہ سلطان کا ایک ضخیم مجموعہ کلام محفوظ ہے جس میں تین ہزار آٹھ سو سے زیادہ اشعار ہیں لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اتنے ضخیم کلام میں کہیں بھی شاعر نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے ان کے حالات زندگی معلوم ہونے کا پتہ چل سکتا ہے۔

ڈاکٹر [illegible] دکنی ادب کی تاریخ میں [illegible] شاہ سلطان [illegible] کے ایک صوفی شاعر تھے جن کا کلیات اردو موجود ہے لیکن سارا کلام تصوف و معرفت کے مسائل اور تخیل سے معمور ہے۔

[illegible] قطب شاہی کا شاعر ہے۔ دیگر شعرا کی طرح ہم ان کے نام سے واقف نہیں۔ [illegible]

[illegible]

عادل شاہی دور کا شاعر ہے۔"

سعادت مرزا اپنے مضمون "حضرت شاہ سلطان ثانی" مرقع دکن میں "ڈاکٹر زور وغیرہ نے لکھا ہے کہ شاہ سلطان کا تعلق گولکنڈے سے تھا ہمارا یہ خیال ہے کہ شاہ صاحب ایک وسیع المشرب اور بیجاپوری رنگ کے تھے۔ اور ان کے تعلقات نہ صرف بیجاپور بلکہ احمد نگر اور گولکنڈے سے بھی تھے۔"

"اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء" میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے سلطان کو کرنول کا باشندہ بتایا ہے لیکن انہوں نے اپنے ماخذ کا پتہ ظاہر نہیں دیا۔

"فہرست کتب خانہ سالار جنگ" میں نصیر الدین ہاشمی نے رسالہ ورد اسرار کے تذکرے میں سلطان کو گولکنڈے کا شاعر قرار دیا ہے۔ راقم بھی اسی خیال کا مؤید ہے کہ سلطان کا تعلق دبستان گولکنڈہ سے ہے۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں سلطان کے مریدوں اور معتقدوں کی بعض تصانیف موجود ہیں ان کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان اپنے وقت کے ایک بڑے صوفی تھے۔ شاہ سلطان کے ایک مرید محمد افضل قادری مصنف مثنوی "محی الدین نامہ" کا بیان ہے کہ سلطان میراں شاہ معروف کے خلیفہ تھے۔ وہ اپنی مثنوی "محی الدین نامہ" میں لکھتا ہے

میراں شاہ معروف اور دستگیر ؛ کہ دل میرا کر یک روشن ضمیر
[illegible] بحر برسے سلطان میں ؛ دیے ہیچ کوں سلطان کے ہات میں
کہ افضل خلیفاں میں معروف شاہ ؛ لیوے بالیں اس کا تو جاسے گناہ

شاہ سلطان کے ایک اور مرید مرتضیٰ گیانی نے مثنوی "وصل نامہ" لکھی ہے جس میں ان کا ذکر کیا ہے۔

کہتا ہوں سو صفت مرشد کی ؛ کہ دونوں جہاں کے مرشد کی
کہ سلطان مرشد ہے روشن ضمیر ؛ بکیا عاشقاں میں سو ہنچ کیا سیر

"ڈاکٹر [illegible] صدیقی نے اپنے مقالے "دیوان سلطان کا تنقیدی مطالعہ" میں

شاہ سلطان اور ان کے والد کے جو حالات بیان کئے ہیں انھیں پڑھ کے بہت ذہن میں "قصۂ حاتم طائی" اور "فسانۂ عجائب" کے بعض داستانوی کرداروں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رضیہ صدیقی کے بیان سے یہ بات عیاں ہے کہ دکنی شاہ سلطان کی مادری زبان نہیں تھی کیونکہ وہ روم کے باشندے تھے۔ انھوں نے جب روم چھوڑا ہوگا تو ان کی عمر ۲۰ تا ۳۰ سال کے درمیان ضرور رہی ہوگی۔ تبھی تو ان کے والد نے ان کے امور سلطنت سنبھالنے کی خواہش کی تھی۔ اس عمر میں تھا وہ دکن وارد ہوئے تھے جہاں ان کا سابقہ دکنی زبان سے پڑتا ہے۔ لیکن یہ بات عقلاً ناممکن اور ناقابل یقین ہے کہ شاہ سلطان نے دکن میں آنے کے بعد دکنی زبان سیکھی اور دکنی کے روزمرہ، دکنی محاورے، دکنی ضرب الامثال، دکنی پیرایہ اظہار اور بیان کے سانچوں میں اس درجہ مہارت اور قدرت حاصل کرلی کہ بالکل اہل زبان کی طرح اس میں شعر گوئی بھی کرنے لگے اور شعر بھی ایسے جن میں اسلامی مذہب کی معرفت کی باتیں اور تصوف و سلوک کے دقیق مسائل بیان کئے ہیں۔ اور دکنی زبان میں ایسا ضخیم کلیات چھوڑا جو کلیات قلی کو چھوڑ کر دبستان دکن کا سب سے ضخیم کلیات ہے۔ اور اس مستزاد دکنی نثر میں رسالے بھی تصنیف کیے۔ قرار واقعی صورت حال یہ ہے کہ کلیات سلطان کی زبان پکار پکار کر کہہ رہی ہے دکنی شاہ سلطان کی مادری زبان ہے۔ لہٰذا انہیں رومی شہزادہ تسلیم کرنا محض افسانہ طرازی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ صدیقی کی اطلاعات کو قبول کرنے میں ایک محقق کو اس لیے بھی تردد ہوتا ہے کہ ان کی بنیاد سجادہ مزار شاہ سلطان کی فراہم کی ہوئی زبانی معلومات پر قائم ہے جس کی صحت اور سچ کو جانچنے کی کوئی کسوٹی ڈاکٹر صاحبہ کے پاس نہیں۔ علاوہ ازیں رضیہ کے مطابق وہ اپنے والد فخر سلطان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ جبکہ افضل بن مصنف محی الدین نے جو شاہ سلطان کا مرید تھا ان کو میاں شاہ معروف کا خلیفہ بتایا ہے۔ اس معاملے میں ظاہر ہے کہ مرید مصنف کے ملفوظ افضل کی شہادت قابل ترجیح ہے
واضح ہو کہ ایک رسالہ "سرالاسرار" کا پتا کی عبارت سے یہ بات

ہوتی ہے کہ یہ رسالہ سلطان کے کسی مرید کی تصنیف ہے جس میں اس نے اپنے ہادی شاہ سلطان کے فیضان کا ذکر کیا ہے۔ اس رسالے کی شرح نعمت اللہ شاہ نے "شرح درالاسرار" کے نام سے لکھی ہے۔ جس کے ترقیمے سے صاف عیاں ہے کہ درالاسرار کے مصنف کا نام سلطان ثانی ہے۔ اس ترقیمے اور "درالاسرار" کی ابتدائی عبارت میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہے کہ اس رسالے کو سلطان ثانی کی تصنیف مانا جائے اور سبب تالیف میں جس شاہ سلطان کا ذکر ہے انہیں سلطان کے والد فخر سلطان سمجھا جائے۔ لیکن افضل کی اس شہادت کے بعد سلطان ثانی سید میراں شاہ معروف کے مرید اور خلیفہ تھے تطبیق کی یہ صورت بے حقیقت ہوتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ درالاسرار کو "شاہ سلطان" کے کسی ایسے مرید کی تصنیف مانا جائے جس کا نام بھی سلطان ہی تھا۔ اور اس نے مرشد کے نام سے امتیاز کے لئے اپنے نام کے آگے "ثانی" کا اضافہ کیا تھا۔ یہی صورت قرین قیاس اور درست معلوم ہوتی ہے۔

شاہ سلطان کی تصانیف کا ذکر سخاوت مرزا نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

۱۔ کلیاتِ سلطان ۲۔ دیوان سلطان ۳۔ معراج نامہ منظوم ۴۔ زنجیرہ
۵۔ درالاسرار ٦۔ رسالہ وجودیہ ۷۔ کلیاتِ سلطان (فارسی)
۸۔ کشف الطریقین (فارسی)

کلیات سلطان کے بارے میں ڈاکٹر زور رقم طراز ہیں "اس میں اکثر غزلوں کی زمین ہے جو کلیات قلی قطب شاہ میں ہے کلیات سلطان کا قلمی نسخہ مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد راقم الحروف کی نظر سے گذرا ہے۔ اس میں ردیف وار غزلوں کے علاوہ ایک مثنوی بھی شامل ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں "غزلیات کے [illegible] ... بہ سے وہ فن کی بہت کچھ

ڈاکٹر زور سے تسامح ہے۔ درحقیقت یہ سی حرفی چندوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ قصیدے کی ہیئت میں ہے۔

شاہ سلطان کی سی حرفی کل تیس ۳۰ ابیات پر مشتمل ہے اور اس میں ستائیس حروف تہجی کا ذکر ملتا ہے جو ترتیب وار الف تا ی بیان کیے گئے ہیں سوائے حرف عین کے جس کا ذکر محذوف ہے نقطہ اور لا کے لیے بھی کوئی شعر نہیں ہے۔ اس میں حروف تہجی سے مصرعوں کا آغاز ہوتا ہے اور حروف کے پورے نام فرد شعر میں دیئے ہیں۔ فاعلاتن فاعلات کے وزن پر ہے۔

شاہ سلطان کی یہ سی حرفی اس خصوصیت کی بنا پر دکنی کی تمام سی حرفیوں میں انفرادیت کی حامل ہے کہ عام سی حرفیوں کے برخلاف اس میں یہ التزام ملتا ہے کہ جس حرف کا جو شعر ہے اس کا نہ صرف مصرعہ اولیٰ بلکہ مصرعہ ثانی بھی اسی حرف سے شروع ہو۔
مثلاً ظ کا شعر درج ہے:-

ظوئے ظاہر ہو یا باطن ظرف کھتا دیکھیاں
ظل ابلیس کا دیکھ اپنا ظن نہ راکھیا یک رتی

دکنی کی بیشتر سی حرفیوں کے برخلاف جو عموماً مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں شاہ سلطان کی یہ سی حرفی قصیدے کی ہیئت میں ہے۔ مطلع کی طرح اس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے باہم مقفیٰ ہیں اور مابعد تمام اشعار بھی قصیدے کے اشعار کی طرح ہم قافیہ ہیں لیکن ان میں ردیف نہیں ہے۔ "ی" سے شروع ہونے والے شعر میں جو ستائیسواں شعر ہے سلطان کا نام ملتا ہے۔ ستائیس اشعار میں ستائیس حروف کا بیان مکمل ہے۔ آخری تین اشعار میں کسی حرف کا بیان نہیں یہ بھرتی کے معلوم ہوتے ہیں جو غالباً تیس کی گنتی مکمل کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ان میں ہر شعر کے اندر سلطان کا نام آیا ہے۔

شاہ سلطان نے اس سی حرفی میں سلوک و معرفت کی گہری باتیں اور دقیق مسائل بیان کیے ہیں۔ مضامین کے تنوع اور ندرت کے اعتبار سے یہ دکنی کی

عسیر الفہم اور دقیق سی حرف ہے۔ مثلاً سی حرفی میں درج ذیل مسائل تصوف بیان کئے گئے ہیں۔

ابتدا۔ انتہا۔ بقا۔ بے حد۔ شاہدی۔ روحیت۔ جہت۔ لذت دیدارت۔ سوز آہی۔ سالک ملکوت۔ عقل۔ حب۔ عشق۔ فعل۔ خلقت آدم۔ حدس بینا بینت حرکات۔ شوق۔ یاد۔ تعلقات۔ صبغتہم صبغۃ اللہ خلقت۔ طبع۔ ظاہر باطن۔ خفی۔ غیر ذات صفت۔ ظہور کنز مخفی لا عدد۔ صفت لا عدد فی ذات لاشریک لافنا۔ تشریح۔ ذات قدیم۔ برقع وجود۔ گنج گوہر وغیرہ۔ نمونتاً چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

ازالف اوّل انتہا ہو نکت سلطان صفی — ابتدا جدا انتہا سکا اسم آپی کرخفی
بے بقا کی بے خودی فی الیس بجز و بیہوش ہو — بے نشا جلد بے حد تھا قول انا تپ خودی
سے رقم مسب بیتہ سکا سکی سعد ہو نزول — مالک پنجہ ہو لیلیٰ محو پاتی ہو خفی
صاد صباح منتم ہو صادف تحقی بت کمال لنگ — صد اپنا بھر لیا ہو صافی الخفا ہو عاشقی

سلسلہ صفحہ ۲۶

تو اس ملک میں آندھرا کے جگ موہن ریڈی اور کرناٹک کے پاٹل پٹ ایا جیسے حضرات کی بھی کمی نہیں جو اسلام اور قرآن کو کسی نہ کسی حد تک سمجھنے کے بعد ان کے حق میں کلمہ خیر کہتے ہیں۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے۔

(پروازِ رحمانی)

سلسلہ صفحہ ۳۹ میں اپنی اور حکومت ہند کی جانب سے کمیٹی کے تمام ذمہ داروں کو یقین دلاتا ہوں کہ اس یونیورسٹی کو بنانے میں جس طرح کی مدد کی ضرورت ہوگی وہ حکومت کی جانب سے دی جائے گی۔ میں پھر ایک بار آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس جلسے میں بلایا اور ہمارے خیالات کو سنا اس کا انعقاد کرنے والوں کو ہماری طرف سے مبارک

پرواز رحمانی

خبر و نظر

ایک مورخ کی فکرمندی

پروفیسر ناتھ پانڈے، علمی حلقے جانتے ہیں کہ ملک کے دیانتدار مورخ اور مخلص سیاستداں ہیں۔ مسلم دور حکومت کی تاریخ پر خاص نظر رکھتے ہیں، اور اس سلسلہ کے حقائق اپنے مضامین اور لکچروں کے ذریعے اہل ملک کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ دیگر منصف مورخوں کی طرح ان کی بھی تحقیق یہی ہے کہ مسلم دور حکومت کے حقائق کو تاریخ کی کتابوں میں توڑمروڑ کر پیش کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط بیاں پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔ جناب پانڈے آج کل ہندو مسلم تعلقات کے لیے بھی بہت فکرمند ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ملک کا دورہ کرکے عوام و خواص کو حقائق سے باخبر کرنے کا عزم کیا ہے اسی سلسلہ میں ۱۴؍دسمبر ۱۹۹۵ء کے ٹائمز آف انڈیا نے ان کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ "اسلام نہ تو متعصب دین ہے نہ بنیاد پرست قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور یہ کہ اللہ ایک ہے جس نے محبت اور اخوت کا آفاقی پیغام عام کرنے کے لیے مختلف ملکوں میں اپنے پیغمبر بھیجے۔

صوفی سنتوں کے پیغام کی طرف

دین اسلام کے بارے میں اپنی معلومات اور تاریخ کے سلسلے میں بعض حقائق کا اظہار کرنے کے بعد جناب پانڈے نے ایک خاص بات یہ کہی کہ "قرون وسطیٰ میں مسلم صوفیاء اور ہندو سنت باہم مل کر توحید اور انسانی بھائی چارے کا پیغام عام کیا کرتے تھے۔ اس لیے میرا بھی یہی پیغام ہے کہ ہمیں قرون وسطیٰ کی طرف لوٹ جانا چاہیئے تاکہ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ پوری دنیا میں مختلف طبقوں کے درمیان جو خلیج پڑ گئی ہے اسے بھرا جاسکے۔" یہ جناب پانڈے کے دلی کرب کے ساتھ اس عزم کا اظہار ہے جو وہ ملک کی فرقہ وارانہ فضا کو خوشگوار بنانے کے سلسلے میں رکھتے ہیں۔ ان کی پہلی کوشش یہ ہے کہ غیر مسلم طبقے اسلام کے بارے میں اپنا معاندانہ رویہ تبدیل کریں۔ ظاہر ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک توقع کی اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے کہ پروفیسر بشمبر ناتھ پانڈے جیسے تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور روشن ضمیر شہری کی قولی اور عملی کوشش یہ ہو کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی صحیح پوزیشن کو سمجھنے کے لیے خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے۔ ہر شریف النفس شہری کو ان کی اس مہم میں حصہ دار بننا چاہیئے۔

پہلے سوتا تلاش کیا جائے

البتہ اس موقع پر ایک بات کہنے کو جی چاہ رہا ہے کہ پہلے کیوں نہ اس سوتے کو تلاش کیا جائے جس سے یہ بے انصافی، بد دیانتی اور دروغ گوئی نکلی ہے اور جس کے نتیجہ میں یہ نفرتیں عداوتیں اور بدگمانیاں پھیلی ہیں۔ یہ سوتا ہمیں ملتا ہے قدیم مزاج میں جسے تاریخ کے مشہور مدبر اور دانشور چانکیہ نے اپنے ارتھ شاستر میں سمو دیا ہے۔ منو مہاراج نے پیدائشی بنیاد پر اونچ نیچ کا جو سماجی نظام مدون کیا تھا چانکیہ نے اس بنیاد پر نظام مملکت کے اصول اور موزوں وضع کئے جس کا ایک نکتہ یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی حقیقی یا فرضی دشمن فرقہ موجود ہونا چاہیئے تاکہ اس کے خلاف مستقل نفرت پھیلا کر مملکت

ایک گروہ نے اس فکر کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں سے بیزاری کا ماحول پیدا کیا۔ برطانوی حکومت نے اسی مزاج سے فائدہ اٹھایا۔ آج جو کچھ بھی ماحول پایا جاتا ہے اسی مزاج کا پرتو ہے لہٰذا کیا اچھا ہو اگر جناب پانڈے اپنی ہم میں دیانتداری اور عدل و انصاف کا وہ جوہر بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں جسے دھرم کا خاصہ ہونا چاہیئے اور جس سے خود موصوف نے اکتساب کیا ہے۔ (ص ب، م)

قصہ ایک معمر صحافی کا

انگریزی قارئین اور اردو اخبار بینوں میں کون ہے جو خشونت سنگھ کے نام سے واقف نہیں۔ مشہور صحافی اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ کم از کم وہ معاملات میں منفرد شہرت رکھتے ہیں۔ تنازعات پیدا کرنے اور جنسی لطیفے بیان کرنے میں۔ تنازعات کی مختصر اسٹوری یہ ہے کہ چار پانچ سال پہلے "دہلی" کے نام سے ایک ناول لکھا تھا جس میں بعض مسلم حکمرانوں کی غلط کاریوں کو "مسلم تہذیب" سے جوڑ کر مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ کچھ دن بعد مہاراشٹرا کے شیواجی اور بال ٹھاکرے کے بارے میں کچھ باتیں لکھیں جن پر شیوسینا نے غم و غصے کا اظہار اور پرتشدد احتجاج کیا۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کو معمولی ادیب و شاعر کہہ دیا جس کی وجہ سے تعلیم یافتہ بنگالی اور دوسرے لوگ ناراض ہو گئے۔ اب سنیئے گاندھی کی بہو مینکا گاندھی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں اپنی کتاب میں لکھ دیں کہ مینکا چراغ پا ہو گئیں یہاں تک کہ دہلی ہائی کورٹ کی طرف کوچ کیا۔ جنسی لطیفوں والی بات یہ ہے کہ تحریر، تقریر اور گفتگو غرض ہر بات بات میں جنسی لطیفے کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ اس وقت ۸۰ سال سے زیادہ کے ہیں مگر طبیعت سے یہ ذوق نہیں گیا۔

اعتراض کے جواب میں

مینکا کا کیس کچھ ایسا ہی ہے۔ خود نوشت سوانح حیات میں خشونت سنگھ نے اس خاتون کے بارے میں دیگر قابل اعتراض باتیں لکھنے کے علاوہ

نہیں جو ہنسی کی کوشش سے عاری ہو۔ بھی لکھ دیا بلکہ کچھ اور بھی جو واقعی قابل اعتراض ہے۔ اور
کوئی بھی قانون اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ خدا کا شکر ہے۔ دوسرے حلقے بھی احتجاج
کر رہے ہیں۔ لیکن فی الحال خشونت سنگھ کی تحریر یا اس پر ہونے والے اعتراض سے بحث
نہیں گفتگو کا تعلق صرف صاحب تصنیف کے اس رد عمل سے ہے جس کا اظہار انہوں نے
اعتراض و احتجاج کے جواب میں کیا ہے۔ ۲۳؍ دسمبر کے ایک انگریزی روزنامے کو انٹرویو
دیتے ہوئے خشونت سنگھ کہتے ہیں، "ضبط برداشت کا دامن تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا
ہے۔ آخر ہمارے پاس لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانح حیات بھی تو ہے جس میں ان
کا ہر جنسی تعلق کے قصے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب انہیں دکھائی گئی تو
انہوں نے اس سے اتفاق بھی کیا اور اس کی اشاعت کی منظوری بھی دی۔ میرا خیال ہے
ہم یہاں ایک دوسری دنیا میں رہتے ہیں۔ کسی بھی تنقید کے بارے میں ہم زیادہ سے
زیادہ غیر روادار ہوتے جا رہے ہیں۔"

استدلال درست نہیں۔

غیر روادار ہونے کی شکایت کس حد تک درست ہو سکتی ہے لیکن محترم
سردار جی نے ماؤنٹ بیٹن سے جو استدلال کیا ہے اس پر ہنسی ہی آتی اور افسوس
ہوتا ہے۔ یورپ کے بے لگام معاشرے سے تعلق رکھنے والے ایک فرد کو پیش کر کے یہ کہنا
کہ ہندوستانی بھی اس کی تقلید کریں، بڑھاپے کی بڑ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ
کہ اظہار خیال کو بھی کچھ شائستگی اور شرم و حیا کا پابند ہونا چاہیے۔ مذاہب
مقدس شخصیات پر کیچڑ اچھالنا اور پھر ان کے ماننے والوں سے کہنا کہ اسے ہنسی خوشی برداشت
کر لیں، غلط ہے۔ اسی طرح کسی کی ذاتی زندگی کو موضوع گفتگو بنا کر دنیا کے سامنے اسے
رسوا کرنا اچھی بات نہیں۔ اور اگر یہ کام محض ذہنی لذت کوشی کے لیے کیا جائے تو اور بھی
برا ہے۔ سردار خشونت سنگھ نے دیکھ لیا کہ اس معاملے میں "غیر روادار" مسلمان ہی نہیں

تمام ہندوستانی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان کسی بات پر احتجاج کرتے ہیں تو انہیں کٹر وادی اور فرقہ پرست کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جب دوسرے طبقات احتجاج کرتے ہیں تو اس قسم کی کوئی گالی نہیں دی جاتی صرف "غیر ذمہ دار" کہا جاتا ہے۔

تین بڑوں کی باتیں

اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جسٹس میر ناصر علی نے کہا "اسلامی شریعت موجودہ متعدد مسائل کا بہترین حل پیش کرتی ہے بشرطیکہ مسلمان ہندوستانی سماج کے سامنے اسلامی تعلیمات کو بہترین انداز میں پیش کریں۔۔۔ مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں دور کرنے میں مدد ملے گی"۔

—— عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جسٹس بیگ محمد حسن نیشکا نے کہا "پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا پیغام تمام بنی نوع انسانی کے لئے ہے —— تلگو زبان میں ہونے والے اس ترجمہ سے قرآن پاک تک تمام لوگوں کی رسائی ہو سکے گی اور ان کے سامنے خدا کا حقیقی پیغام پہنچ سکے گا"۔ جماعت اسلامی ہند کے سربراہ مولانا محمد سراج الحسن صاحب نے کہا۔ "آج اس ملک میں اگر مسلمانوں کے تشخص کو خطرہ لاحق ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ ان کی یہ تاریخی غلطی ہے کہ اپنے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں انہوں نے اپنے قول وعمل سے یہاں کے باشندوں تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچایا۔ وہ ابھی اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ قرآن کے یہ تراجم اسی غلطی کے ازالہ کی کوشش ہیں۔"

مشترک نکتے

متذکرہ بالا تینوں کی یہ تین باتیں ۱۳ دسمبر کو حیدرآباد میں تلگو ترجمۂ قرآن کے اجراء کی تقریب ۔۔۔

یہی ناکہ قرآن تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ جو لوگ اسے صرف مسلمانوں کی کتاب سمجھتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں اسی طرح مسلمان اس کتاب کا پیغام اپنے ہم وطنوں تک نہ پہنچا کر غلطی کرتے ہیں۔ اسے سب تک پہنچنا چاہیئے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات کا بڑا سبب قرآن سے ان کی غفلت ہے۔ اگر جسٹس سرداراعلیٰ خاں نے پورے اعتماد کے ساتھ شریعت اسلامی کو آج کے تمام مسائل کا حل بتایا ہے تو یہ شرط بھی واضح کردی کہ مسلمان ان تعلیمات کو اہل وطن کے سامنے پیش کریں۔ اور اگر امیر جماعت اسلامی ہند نے موجودہ حالت کو اسی کوتاہی کا خمیازہ قرار دیا ہے تو ازالہ کی صورت بتادی کہ وہ کام آج بھی ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ جسٹس ریڈی اگر اعتراف کرتے ہیں پیغمبر اسلام کا پیغام تمام انسانوں کے لیے ہے تو اس کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کی تعلیمات مختلف زبانوں کے ذریعے عام ہندوستانیوں تک پہنچنی چاہئیں۔

اللہ جزائے خیر دے :

اللہ جزائے خیر دے ان نیک نفوس کو جو قرآن و سیرت کی تعلیمات کو تمام باشندگان ہند تک پہنچانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اور بلند حوصلے جماعت اسلامی کے خادموں کے کہ ان نامساعد حالات میں بھی توفیق ایزدی سے یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ ان خادموں نے اب تک جنوب کی چاروں زبانوں میں کتاب ہدایت کا مکمل ترجمہ پیش کردیا ہے۔ دیگر زبانوں میں ترجمہ کا کام ہو رہا ہے کچھ جزوی تراجم شائع بھی ہوچکے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ملک میں یہ کام کسی ایک جماعت یا ایک ادارہ کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے پوری طاقت کو لگ جانا ہو اور ترجیحی بنیاد پر لگنا ہوگا۔ حالات نامساعد ضرور ہیں لیکن مایوس کن نہیں۔ اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ہر جگہ ان تراجم کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اگر اہل وطن میں با عاقبت اندیش لوگ اسلام اور قرآن کو سمجھے بغیر ان کی مخالفت پر کمر بستہ

(اداریہ معارف، دعوت ۶ جنوری ۹۶ء سے)

اسباب پر غور کیجئے

بابری مسجد کی شہادت مسلمانوں کو اس امر کی دعوت دیتی ہے کہ وہ سوچیں اور غور کریں کہ کیا اسباب و حالات تھے کہ ان کی پانچ سو برس قدیم مسجد ڈھا دی گئی اور وہ اس کا تحفظ تو درکنار اس کے لیے زیادہ احتجاج کرنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کو الزام دینے کے بجائے وہ اپنے ہی کو مورد الزام قرار دیں اور یہ واقعہ ہے کہ دوسروں کی جارحیت اور ظلم و تعدی سے زیادہ مسلمانوں کی کمزوری اور کوتاہی کی وجہ سے مسجد شہید ہوئی۔ افسوس، اور سخت افسوس ہے کہ اس عظیم الشان حادثے کے بعد بھی مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں لیا۔ اب بھی ان کی غفلت، سرمستی، خود فراموشی اور خدا فراموشی کا وہی حال ہے۔ وہ نہ اپنے حالات و معاملات کی اصلاح کے لیے فکرمند ہوتے اور نہ انہیں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی تلافی کا کوئی خیال ہوتا ہے۔ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے ان کی نگاہیں ملک کی سیاسی جماعتوں کی جانب اٹھتی ہیں لیکن اس خدائے حی و قیوم کی جانب وہ نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتے جس کے قبضۂ قدرت میں یہ پوری کائنات ہے اور جس کی مرضی کے بغیر دنیا کا ایک پتہ بھی حرکت نہیں کرتا۔ اپنی اصلاح و فلاح کے منصوبے بنا کر اپنی قوت و طاقت کو بڑھانے کے بجائے اپنے اختلافات و انتشار کو بڑھا کر اپنی ہوا خیزی کر رہے ہیں۔ کیا عجیب بات ہے کہ جو چیز خود ان کے پاس موجود ہے اس کی طلب دوسروں سے کر رہے ہیں۔

کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی

سرگرمیاں اور خدمات

کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی، اردو کی ایک قومی تنظیم ہے جو گذشتہ زائد از ربع صدی سے اردو تعلیم کے شعبہ میں خدمات انجام دے رہی ہے۔ ریاست آندھرا پردیش کے تمام اضلاع کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کمیٹی کی فعال اور متحرک شاخیں موجود ہیں۔ تعلیمی کمیٹی نے اردو زبان و ادب کے فروغ، ترویج، ترقی اور ارتقا، کے لیے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ کمیٹی نے، ادب و زبان کی ترقی، اردو تعلیم کے استحکام و توسیع کی راہ میں درپیش مختلف مسائل کو حل کرنے اور اس سمت نئی راہیں اور جہتیں تلاش کرنے کے لیے اب تک متعدد کانفرنسیں، سمینار، سمپوزیم وغیرہ منعقد کئے ہیں۔ کل ہند نوعیت کی اب تک (۱۷) اردو کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ اردو ادب و شعر کی توسیع اور مقبولیت کے لیے کمیٹی کے زیر اہتمام متعدد اجتماعات اور مشاعروں کا بھی انعقاد عمل میں لایا گیا ہے۔ تعلیمی کمیٹی ہی وہ واحد تنظیم ہے جس نے ملک میں ایک مرکزی اردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں آواز اٹھائی اور اسی تحفظ کی ایک اہم کارنامہ [illegible] کا سلسلہ [illegible] اور کل ہند پیمانے پر [illegible]

اجتماعی طور پر کئی مرتبہ دلی جاکر وزیراعظم سے ملاقات کی اور پُرزور نمائندگی کے نتیجہ میں محبانِ اردو کے دیرینہ خواب کی تعبیر میں حیدرآباد میں مولانا ابوالکلام آزاد مرکزی اُردو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا۔

اُردو تعلیمی کمیٹی کو سماج کے مختلف طبقات کے دانشوروں، ممتاز ماہرین تعلیم، محققین وائس چانسلرس، اساتذہ، ادیب، شعراء صحافیوں، سماجی کارکنوں، مختلف انجمنوں کے صدور اُردو اداروں کے معتمدین، یونیورسٹیوں کے صدور شعبہ جات اردو اور نامور شخصیتوں کا بھرپور تعاون و اشتراک حاصل رہا ہے، جو یا تو کمیٹی کے رکن رہے یا اس کی سرپرستی فرما رہے ہیں یا پھر اس کے علمی جلسوں میں شامل ہیں۔

کمیٹی کے زیر اہتمام ادارے: اُردو تعلیمی کمیٹی ایک مرکز خوش نویسی گورنمنٹ گرلز جونیر کالج (نامپلی) کے احاطے میں تقریباً (۱۳) سال سے کامیابی سے چلا رہی ہے جس میں ہر سال (۵۰) طالبات خوش نویسی کی تربیت حاصل کر رہی ہیں۔ ترقی اُردو بیورو کی سرپرستی میں اس کلاس کی تین جماعتیں سال اول، سال دوم اور آرائشی خطاطی کی اعلیٰ تربیت کے لیے قائم ہیں۔ یہ سنٹر طالبات کے مستقبل میں روزگار کا ذریعہ اور معاون سمجھا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں ایک کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ اُردو تعلیمی کمیٹی کا ایک اہم مرکز ہے جہاں ہر چھ ماہ میں طالبات کا ایک بیاچ تربیت پاتا ہے۔ فارغ التحصیل طالبات کے لیے روزگار کے مواقع کی فراہمی بھی اس انسٹی ٹیوٹ کا مقصد ہے۔ اُردو داں عوام کے فائدے کے لیے مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیے تربیتی مراکز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

بیروزگار نوجوانوں کے فائدے کے لیے اُردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی تربیت کے ادارے قائم کرنے کا بھی منصوبہ ہے جسے بہت جلد قابل عمل بنایا جائے گا۔ اُردو تعلیمی کمیٹی ناخواندگی کو ختم کرنے کی بھی پرزور سفارش کرتی ہے اور مختلف ہ جماعتوں سے

اس شعبہ میں کام کر رہی ہے۔

اردو تعلیمی کمیٹی کی کامیاب نمائندگی کے نتائج :

- ملک میں پہلی مرتبہ ایک اردو ذریعہ تعلیم کا اقامتی اسکول کا قیام۔
- حیدرآباد میں ترقی اردو بیورو، وزارت فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کی جنوبی ہند کی شاخ کا ۱۹۸۶ء میں قیام
- انگریزی اور تلگو ذریعہ تعلیم کے مدارس میں اردو کی بحیثیت زبان اول شمولیت
- کارپس رقم کے بغیر امداد پر یادرشنی گورنمنٹ ڈگری کالج برائے طالبات کا قیام جس میں اردو، انگریزی اور تلگو ذریعہ تعلیم کی سہولت حاصل ہے۔
- گورنمنٹ گرلز جونیر کالج نامپلی میں مرکز خوشنویسی کا قیام۔
- ملک میں پہلی مرتبہ اردو کمپیوٹر کورس کا آغاز۔
- نویں اور دسویں جماعت کے نصاب میں آرٹ سبجکٹ کے طور پر اردو خطاطی کی شمولیت کے سلسلے میں اسٹیٹ کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کی جانب سے ورک شاپ۔
- دفتر ناظم تعلیمات میں ایک اسپیشل آفیسر کی جائیداد کا تقرر۔

کمیٹی کے صدر نشین جناب محمد جلیل پاشاہ کو نومبر ۱۹۹۰ء میں حکومت کی جانب سے اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا صدر مقرر کیا گیا۔ جہاں انہوں نے اردو کے فروغ و ترقی کے سلسلہ میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے اور اردو کے حق میں پرزور وکالت کی

اردو اکیڈیمی کی گرانٹ :

قیام اکیڈیمی کے بعد سے پہلی مرتبہ (۱) کروڑ (۵) لاکھ روپے کی تجاویز حکومت

کوششیں کی گئیں اور حکومت سے اضافہ گرانٹ کی مانگ کی گئی جس پر (۲۰) لاکھ گرانٹ کی منظوری عمل میں آئی۔ بعد ازاں جناب محمد جلیل پاشا کی تجاویز پر عمل آوری کے لیے اردو اکیڈیمی کو چالیس لاکھ کی گرانٹ دی گئی۔

میاچنگ گرانٹ :

اس ضمن میں مرکزی حکومت سے پر زور مطالبہ کیا گیا ہے جس طرح تلگو اکیڈیمی کو گرانٹ حاصل ہوتی ہے اسی طرح اردو اکیڈیمی کے لیے بھی میاچنگ گرانٹ منظور کی جائے۔

پنجسالہ منصوبہ میں اردو کی ترقی کو شامل کرنے کی نمائندگی

اس بات کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا کہ زبانوں کی ترقی کے اہم ترین مسئلہ کو منصوبہ بندی کے دائرہ سے باہر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ سابق نائب صدر منصوبہ بندی کمیشن مسٹر پرنب مکرجی کے دورہ حیدرآباد کے موقع پر ریاست کی اہم (۵۰) شخصیتوں کے وفد کے ہمراہ ان سے ملاقات کرکے زبانوں کی ترقی کے لیے آئندہ پنجسالہ منصوبہ میں گنجائش فراہم کرنے کے مطالبہ پر مشتمل ایک یادداشت پیش کی گئی ہے اور اردو زبان کی ترقی کے لیے (۲۰۰) کروڑ روپے مختص کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ جناب محمد جلیل پاشاہ ملک کی پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے پنجسالہ منصوبہ میں زبانوں کی ترقی بالخصوص اردو کی ترقی کے لیے رقمی گنجائش فراہم کرنے کے مسئلہ پر منصوبہ بندی کمیشن کو توجہ دلائی ہے۔ اور وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے مرکزی حکومت سے نہ صرف آندھرا پردیش بلکہ ملک کی تمام اردو اکیڈیمیوں کے لیے میاچنگ گرانٹ فراہم کرنے کی نمائندگی کی ہے۔

کم آمدنی کے طبقات کو اردو درسی کتابوں کی مفت فراہمی

پہلی تا تیسری جماعت کے لیے اردو ذریعہ تعلیم کے کم آمدنی والے طبقات کو درسی کتابوں کی مفت سربراہی پر حکومت کو آمادہ کرتا ہے۔ ایسی سہولت صرف تلگو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کو حاصل تھی۔ جناب جلیل پاشاہ نے حکومت سے بار بار نمائندگی کی کہ اردو ذریعہ تعلیم کے طلبا کو بھی مفت درسی کتابیں سربراہ کی جانی چاہئیں چنانچہ حکومت نے اس سے اتفاق کیا اور ایک جی۔ او۔ کے ذریعہ اس پر عمل آوری کے احکامات جاری کر دیئے۔

اردو اساتذہ کے تقررات :

تیسرا اہم کارنامہ اردو مدارس کے اساتذہ کی جائیدادوں کا ہے۔ یہ مسئلہ بے حد اہم تھا کیوں کہ اس کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم میں تعلیم بری طرح متاثر ہو رہی تھی اور نتائج بے حد خراب آرہے تھے۔ جناب محمد جلیل پاشاہ نے نہ صرف علاقہ شہروں کے اس مسئلہ پر حکومت کو توجہ دلائی بلکہ اپنے دورۂ اضلاع میں سرکاری جائزہ میٹنگس میں ڈی۔ ای۔ اوز کو بھی اس تعلق سے توجہ دلائی اس کے نتیجہ میں دونوں شہروں کی (۲۵۰) سے زیادہ مخلوعہ خالی جائیدادوں کو پُر کیا گیا۔ مزید تقررات کے لیے پیشقدمی جاری ہے۔

ضلع کلکٹر کی سرپرستی میں اردو رابطہ کمیٹیوں کا قیام :

جناب محمد جلیل پاشاہ نے صرف شہر کے مسائل تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اضلاع اور مضافات کے دوروں میں نہ صرف کلکٹرس کے ذریعہ سرکاری وغیرہ سرکاری اداروں کی جائزہ میٹنگیں رکھوائیں بلکہ ہر ضلع کلکٹر کی سرپرستی میں اردو رابطہ کمیٹیاں تشکیل دیں جو اردو سے متعلق سرکاری احکام کی عمل آوری کو یقینی بنانے کے لئے کام کرتی ہیں۔ اب تک ایسی (۱۰) کمیٹیاں قائم کی جاچکی ہیں۔

قومی یکجہتی کنونشن ۔ ملک کی بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے پیش نظر ایک قومی یکجہتی کنونشن کا انعقاد عمل میں لایا گیا جس میں ریاست کے دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ اس ضمن میں قومی یکجہتی مشاعرہ بھی کیا گیا۔

اردو تعلیمی کمیٹی کے مستقبل کے منصوبے حسب ذیل ہیں :

حیدرآباد میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد • ٹیچرس ٹریننگ اردو انسٹی ٹیوٹ کا قیام • ہر سطح پر اردو متبادل جماعتوں کا قیام • آندھرا پردیش کے بہترین اردو اساتذہ کے لیے اعزازات • اردو اساتذہ کے لیے تقررات کے روسٹر سسٹم میں استثنیٰ کا حصول • نصاب میں آرٹ سبجکٹ کے طور پر اردو خطاطی کی شمولیت • ہندوستان بھر کے ترقی اردو بیورو کی جانب سے قائم کردہ اردو خوش نویسی کے تربیتی مراکز میں اساتذہ کو یو۔جی۔سی، اسکیل کے تحت تنخواہوں کی اجرائی • اردو اساتذہ کے لیے سرکاری اعزازات کا آغاز۔

کل ہند تعلیمی کمیٹی کی (۱۱) سالہ کامیاب جدوجہد اور مرکزی اردو یونیورسٹی کے قیام کی مسرت میں ۱۰ اور ۱۱ جنوری ۱۹۹۶ء کو دو روزہ ۱۸ ویں کل ہند اردو کانفرنس منائی جارہی ہے۔

اس کانفرنس میں حسب ذیل امور زیر بحث آئیں گے۔

۱ ۔ کل ہند سطح پر اردو خواندگی کا پروگرام مختلف سطحوں پر عمل آوری کے لیے سفارشات اور ضروری اقدامات۔

۲ ۔ اردو رسم الخط کا تحفظ اور اس کی زیادہ سے زیادہ ترویج و اشاعت

۳ ۔ مرکزی حکومت کی جانب سے اردو یونیورسٹی کے قیام کے مسئلہ پر مزید سفارشات۔

۴ ۔ آندھرا پردیش کا مینی سب کمیٹی کی رپورٹ پر عمل آوری دیگر ریاستوں میں بھی (۱۱) نکاتی اردو بولنے والوں کو سہولتوں کی فراہمی۔

۵۔ مرکزی سرکار کی جانب سے اردو اکیڈمی کو حاصل گرانٹ کی اجرائی۔
۶۔ نئی تعلیمی پالیسی اور لسانی فارمولے میں اردو کا موقف
۷۔ مرکزی حکومت کی جانب سے ہر ریاست کے اردو اکثریتی اضلاع میں اردو اقامتی مدارس کے قیام پر غور اور تجاویز۔
۸۔ کل ہند سطح پر خوش نویسی اور آرائشی خطاطی کے اساتذہ اور ملازمین کو گورنمنٹ اسکیل کے مطابق تنخواہیں۔
۹۔ وزیراعظم کے (۱۵) نکاتی فلاحی پروگرام اور کل ہند سطح پر اقلیتوں کے مسائل
۱۰۔ فن خطاطی کو عام کرنے کے لیے اردو تعلیمی اداروں میں لازمی تربیت
۱۱۔ ہر ریاست میں علاحدہ ڈائرکٹوریٹ (اردو) کا قیام
۱۲۔ خواتین کے تعلیمی مسائل۔
۱۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد قومی اردو یونیورسٹی ۳ جولائی ۱۹۹۶ء سے آغاز
۱۴۔ بہار کی طرح آندھرا پردیش اور دیگر ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے۔
۱۵۔ نئی تعلیمی پالیسی میں اردو کا موقف۔
۱۶۔ سہ لسانی فارمولہ کی سختی سے عمل آوری۔

ڈاکٹر جگن ناتھ مشر
مرکزی وزیر دیہی علاقہ اور روزگار

آل انڈیا اردو کانفرنس حیدرآباد میں تقریر

دوستو، بزرگ بھائیوں اور بہنو!

آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی حیدرآباد کی جانب سے منعقد اردو کانفرنس میں حصہ لیکر مجھے آج بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں کانفرنس کے منتظمین کا بہت شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس تاریخی کانفرنس میں مجھے مدعو کیا۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو بالکل ہندوستانی زبان ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے پیدا ہوئی ہے۔ اردو پہلے ہندوستان کے فوجی بھائیوں کی زبان بنی، بعد میں اس کا استعمال عام اور خاص بھی لوگ کرنے لگے اور یہ زبان دھیرے دھیرے سنورتی نکھرتی گئی اسے ہندوستانی اور اردو وغیرہ کئی نام بھی دیئے گئے۔

حیدرآباد اور جنوبی ہند سے اس زبان کا ایک خاص رشتہ ہے اس کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ علاؤالدین خلجی نے جب جنوبی ہند کو فتح کیا اور ۱۲۹۶ء سے ۱۳۱۶ء تک حکومت کی اسی وقت ہندوستان کی زمین پر اردو کی ابتدا ہوئی پھر محمد تغلق نے دولت آباد کو دلی کے عوض اپنا دارالسلطنت بنایا تب اس اردو زبان کو دکنی کہے جانے لگا جنوب میں ۱۳۴۷ء سے لیکر قطب شاہی کے زمانے (۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۷ء) میں اس زبان نے خوب ترقی کی اس خاندانوں کے بادشاہ

زبان کی دو سو برسوں تک پرورش ہوئی۔

جنگ آزادی میں اردو زبان کا اہم کردار رہا ہے۔ انقلاب زندہ باد اسی زبان کا نعرہ ہے۔ اس نعرے نے وطن کی آزادی کے لیے لڑنے والوں کو تقویت دی اور ملک میں جوش ولولہ پیدا کیا۔ اردو زبان کی ترقی میں حیدرآباد کا بڑا ہاتھ رہا ہے اردو کے سب سے پہلے شاعر ولی دکنی ہیں جو اسی علاقے کے رہنے والے تھے ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی بڑے بڑے شاعر حیدرآباد آئے اور یہاں ان کی پرورش کی گئی۔ خاص خاص ناموں کا ذکر میں کرنا چاہوں گا۔ یہ ہیں۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، فانی بدایونی، اور ہم لوگوں کے دور کے شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی۔

اس کانفرنس کے ایجنڈے سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے اٹھارہویں اجلاس میں اردو زبان کی ترقی کے بارے میں انتہائی اہم فیصلے کئے جانے والے ہیں جن میں اردو کو تعلیم کا ذریعہ، اردو کو بطور ثانوی زبان سرکاری دفتروں میں استعمال، اردو کا مقابلہ جاتی امتحانات میں استعمال، ہندوستان کے وزیر اعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام، نئی تعلیمی پالیسی میں اردو کا کردار اور اس کا مقام ان کے علاوہ مولانا ابو الکلام آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی کا قیام بے شک اس کانفرنس کے تاریخی فیصلے ہوں گے۔

میں اس کانفرنس کو خاص طور سے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اس نے اس اردو یونیورسٹی کے لیے مولانا ابو الکلام آزاد کا نام چنا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نہ صرف اردو کے ایک ادیب، عالم، صحافی، اور ماہر تعلیم تھے بلکہ جنگ آزادی کے دوران کانگریس پارٹی کے صدر طویل عرصے تک رہے وہ ملک کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ انکی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ملک میں سیکولرزم کے قیام کے لیے مولانا ابو الکلام آزاد نے جو کام کئے انہیں ملک کے لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

وزیر اعظم وی پی سنگھ رہنما راشٹر اور حکومت ہند نے اس یونیورسٹی کو حیدرآباد میں قائم

کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ اردو کے ساتھ برابری کا سلوک اور کانگریس سرکار کی سیکولرزم کی پالیسی کا کھلا ثبوت ہے۔ کانگریس پارٹی نے دوسرے مقامات پر بھی اُردو کو اس کا صحیح مقام دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں میں آپکے سامنے بہار کی مثال دینا چاہوں گا۔ بہار میں جب میں وزیر اعلیٰ تھا تب اُردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنائی گئی اس صوبے میں اردو ترقی کر رہی ہے اور اُردو جاننے والے لوگ فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ہند نے یہ یونیورسٹی کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ عثمانیہ یونیورسٹی (۱۹۱۸ و ۱۹۴۸ء) کا بدلہ ہوگا۔

میں چاہوں گا کہ اُردو زبان کی ترقی کے لیے میں نے کانگریس حکومت میں وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے جو فیصلے کئے تھے ان سے آپکو واقف کرانے کے لیے کچھ ذکر کروں۔ میرا یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جہاں اُردو بولنے والوں کی آبادی ایک سو پچاس ہو وہاں کے پرائمری اسکولوں میں ایک ٹیچر اُردو کا بحال کیا جائے۔ اس فیصلے سے پچیس ہزار پرائمری اُردو ٹیچر بحال کئے گئے۔ اُردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جس سے ایک ہزار اردو مترجم اور ایک ہزار اُردو ٹائپسٹ کی بحالی ہوئی۔ ریاست کے سبھی ضلع اور بلاک دفاتروں میں اُردو زبان کا استعمال ہو سکے اس پر نظر رکھنے کے لیے اُردو راج بھاشا ڈائرکٹوریٹ قائم کیا گیا۔ میری کانگریس سرکار کا یہ بھی فیصلہ تھا کہ کسی بھی ہائی اسکول کو منظوری دینے کے لیے ایک اُردو ٹیچر کی بحالی لازمی شرط ہوگی اُردو کو فروغ دینے کے مقصد سے اُردو اکاڈمی کا قیام کیا گیا اور اسے بارہ لاکھ روپے دئے گئے۔ تاکہ وہ ٹھوس ڈھنگ سے اپنا کام شروع کرے۔ اقلیتی اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کو اسی درجے کے دوسرے اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کی طرح تنخواہ اور پروموشن دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ مدرسہ کے اساتذہ کو نہ صرف تنخواہ کی سہولت دی گئی بلکہ دوسری سروس شرطیں بھی اسی درجے کے دوسرے اسکولوں کے اساتذہ کے برابر کردی گئیں۔ غیر سرکاری ادارہ انجمن ترقی اُردو کو سرکاری گرانٹ دیا گیا تاکہ وہ اس زبان کو آگے بڑھانے کے اقدامات کریں۔ راج بھاشا یعنی سرکاری زبان کی شکل میں اُردو کے

استعمال پر نظر رکھنے کے لیے اُردو راج بھاشا تنفیذی کمیٹی بنائی گئی اور بہت کچھ گرم کرد یکھنے کے اختیارات دیے گئے سکنڈری سطح تک سبھی سبجکٹوں کی کتابیں شائع کرنے کا انتظام کیا گیا اس زبان کو فروغ دینے کے ارادے سے ہی ۴۲۲۵ مدارس کو منظوری دی گئی ۲۷۰۱ منظور غیر سرکاری مدارس کے اساتذہ اور ملازمین کو مہنگائی بھتہ منظور کیا گیا اس طرح اردو زبان کی ترقی کے لیے ہم نے بہار میں کئی فیصلے کئے جن کا فائدہ اقلیتوں کو ملا۔

میں یہاں بہت ہی مختصر طور پر بتانا چاہوں گا کہ مرکزی حکومت نے اقلیتوں کی تعلیم روزگار اور مقدس مقامات کی حفاظت کے لئے کیا کچھ کئے ہیں وزارت دیہی حلقہ اور روزگار کی جانب سے بھی کچھ کام کئے گئے ہیں جن کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ اس وزارت نے بھی صوبے کی سرکاروں کو روپئے بھیج کر ان سے کہا ہے کہ قبرستانوں کی گھیرابندی کروادے اس کے علاوہ بہت سی جگہوں میں زمین کے لیے تکرار ہوتے ہیں پہلے ۱۹۸۴ء میں آنجہانی شری متی اندرا گاندھی نے جو پندرہ نکاتی پروگرام چلایا تھا ان کے نفاذ کے بارے میں ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو وزراء اعلیٰ افسروں کی میٹنگ وزیراعظم نے بلائی تھی اس میں دس فیصلے کئے گئے جن کا تعلق تعلیم، روزگار، ٹکنیکل ٹریننگ وغیرہ سے ہے طے ہوا ہے کہ ملک کے اہم اضلاع میں جہاں اقلیتوں کی آبادی زیادہ ہے ان میں تعلیم کے لحاظ سے سروے کرایا جائے اور اس کے ایکشن پلان تیار کیا جائے۔ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ طبقوں کے لیے مدرسوں کو نئے ڈھانچے میں ڈھالنے کی اسکیموں کو تیزی سے عمل میں لایا جائے۔ اقلیتوں کو تکنیکی تعلیم حاصل کرا کر انہیں نوکری کے لائق یا اپنا روزگار شروع کرنے کے لائق بنایا جائے۔ اس کے لئے ان سبھی اہم اضلاع میں پولی ٹکنیک، انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر، کمیونٹی پولی ٹکنیک کھولے جائیں۔ اقلیتوں کے درمیان کاریگر طبقہ کو ٹرائسیم اور آئی آر ڈی پی کے تحت ترجیح دے کر ان کی مدد کی جائے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے مطابق امتحان کے پہلے ٹریننگ دینے کی اسکیم کو مستعدی سے لاگو کر کے اقلیتوں کے بچوں کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس طبقہ کے پڑھے لکھے

ڑکوں اور کاریگروں نیز عورتوں کو خاص طور سے ترجیح دے کر انہیں اپنا روزگار کرنے
کے لائق بنایا جائے یہ بھی طے پایا ہے کہ وزارت فلاح و بہبود اقلیتوں کے پسماندہ علاقوں
پروگراموں کے لیے روپے کا انتظام کرائے اس طرح ہم کانگریس کی صوبائی اور مرکزی دونوں
حکومتیں اقلیتوں کی بہتری کے لیے اقدامات کرتی ہیں اور آگے بھی کرتی رہیں گی اور
ور آگے بھی ۔ میں اپنی وزارت کی جانب سے سروے کرا کر پتہ لگوا رہا ہوں کہ کن علاقوں میں
قلیتوں کی تعداد زیادہ ہے اور وہ کس قدر غریب اور پسماندہ ہیں ان علاقوں میں اقلیتوں
کیا خاص روزگار دھندے ہیں روزگار میں انہیں کیا دشواری ہوتی ہے خاندانہ مند روزگار دھندے
کرنے کے لائق بنانے کے لیے اقلیتوں کو ٹریننگ میں ترجیح دلائی جائے گی ۔ اقلیتی مالیاتی
کارپوریشن کو پانچ سو کروڑ کی پونجی دی گئی ہے جن سے انہیں اپنی ترقی کا منصوبہ بنانے اس کا
اذ کرنے میں مدد ملے گی ۔ ہم نے اقلیتوں کے کمزور طبقہ خاص کر بنکروں کو گرگھ، نئی تکنیکی
ٹریننگ، اندرا آواس یوجنا میں مکان دینے اور زندگی جیالی، کتائی وغیرہ کے لیے سنٹر بنانے
اقدامات کئے ہیں۔ جن سے ان کی حالت سدھرے گی اور وہ بھی تعلیم پاکر اردو زبان کو بڑھانے
تعاون کریں گے ۔ اس طرح حکومت کے الگ الگ محکموں کے ذریعہ جو اقدامات
جارہے ہیں ان سے اقلیتوں کی تعلیم، روزگار دھندا اور جان و مال کی حفاظت ہوگی ۔
اقلیت برادری کی جتنی مالی حالت سدھرے گی اتنی ہی ترقی اردو زبان کی اردو ادب کی
تہذیب کی ہوگی.

اس موقع پر آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی کے ذریعے اردو زبان کے لیے کئے گئے
ں کی ستائش کرتا ہوں یہ کمیٹی پچھلے ۲۵ برس سے ریاستی اور ملکی سطح پر برابر اس سمت
م کرتی رہی ہے آندھرا پردیش میں اس کمیٹی نے جتنے کام کئے ہیں ان کی تعریف کی
نی چاہیئے۔ اس نے مولانا ابوالکلام آزاد کی صد سالہ کے لیے جو قدم اٹھائے ہیں اس
لیے مجھے بہت خوشی ہے.

باقی صہ ۲۰ پر

نامی انصاری - (کانپور)

رشید احمد صدیقی چیئر

(ہماری زبان ۸ / ۱۲ ۱۹۵ء میں ایک خط)

مکرمی ! اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ۔ بتائیں ہم تمہیں مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

تازہ ترین خبر ہے کہ نامور طنز و مزاح نگار اور صاحب طرز ادیب رشید احمد صدیقی (مرحوم) کو ان کی محبوب درس گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یہ اعزاز دیا کہ ان کے نام سے یونیورسٹی میں ایک چیئر قائم کردی جس میں ظاہر ہے کہ ایک اردو پروفیسر کا بھی تقرر ہوگا مگر اسی یونیورسٹی نے رشید احمد صدیقی کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ۳۰ اپریل ۱۹۵۸ء کو ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی مدت ملازمت میں ایک دو سال کی توسیع بھی انہیں کی حالانکہ وہ اس کے خواہش مند بھی تھے اور ضرورت مند بھی ۔

پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ ہم لوگ شعبۂ اُردو کی طرف سے ان کو الوداعیہ دینا چاہتے تھے مگر انھوں نے بوجوہ اسے منظور نہیں کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے یار خوش اطوار ڈاکٹر ذاکر حسین اس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔

اسی یونیورسٹی میں دوسری مثال ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی ہے جن کی علمی قابلیت اور شعور ... [illegible]

باوجود وہ اپنی زندگی میں پروفیسر نہ بن سکے اور ان کا حق کسی دوسرے کو دے دیا گیا۔ پس مرگ ان کو بھی "پروفیسر شپ" عطا کر دی گئی ہے۔ ممکن ہے کبھی مسلی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں خلیل الرحمٰن اعظمی چیئر بھی قائم ہو جائے۔

علامہ اقبال کے نام پر بھوپال کا "اقبال سمان" مع ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد کے ہر سال اردو کے کسی نامور ادیب یا شاعر کو دیا جاتا ہے۔ خود اقبال کی زندگی میں سر اکبر حیدری مدار المہام ریاست حیدرآباد نے "مفوضہ اقبال" کو ایک موقع پر مبلغ ایک ہزار روپیہ ریاست کے توشہ خانے سے دینے کا حکم دیا تھا جسکو اقبال نے اپنی اہانت سمجھ کر لینے سے انکار کر دیا تھا۔

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول ؛ جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

مرزا غالب زندگی بھر دہلی کے محلہ بلیماران میں کرایے کے مکان میں رہے لیکن اپنے لیے ذاتی مکان کبھی نہ خرید سکے۔

اب غالب کا قدِ آدم مجسمہ درگاہ حضرت نظام الدین سے ملحق غالب اکیڈمی کی شاندار پانچ منزلہ عمارت میں مقیم ہے جس کے عقب میں وہ ڈومنی بھی قفس کے اپنڈ میں استادہ ہے جس کو غالب نے اپنی زندگی میں بقول خود "مار رکھا تھا"۔

اب اس ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ اعزاز و اکرام سے سرفراز ہونے کے لیے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا مرنا ضروری ہے، اس کے بعد ہی لوگ ان کی قدر و منزلت کا صحیح تعین کر پاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا معاملہ اس کی ایک تازہ مثال ہے۔

نقش نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اداریہ ہماری زبان ۸ مارچ تا ۱۴ مارچ ۱۹۹۵ء

ایس بی چوان کو ہمارے مشورے

ہندوستان کے عام انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے ہمارے سیاسی رہنماؤں کے دل میں اُردو کا درد پیدا ہوتا ہے سیاسی جماعتیں اپنے منشور میں دعویٰ کرتی ہیں کہ اگر وہ اقتدار میں آگئیں تو اُردو کے سارے دکھ دور کردیں گی۔ اور ہمارے سیاسی رہنما اُردو کے زبردست مداح بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ الیکشن سے پہلے چھوٹے چھوٹے سیمیناروں اور مشاعروں کی صدارت ایسے بڑے بڑے وزیر کرتے ہیں جن کی عام دنوں میں اُردو والوں سے ملاقات کبھی ممکن نہیں۔

کچھ دن ہوئے بریلی میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ تھا، اس میں شرکت کے لیے دہلی سے مرکزی وزیر داخلہ جناب ایس بی چوان تشریف لے گئے انھوں نے اپنی تقریر میں اُردو کی زبردست مداحی کی اور کہا کہ بعض اُردو دشمن کہتے ہیں کہ یہ زبان ہندوستان میں باہر سے آئی ہے لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ یہ زبان سو فیصدی ہندوستان کی ہے۔ یہیں پیدا ہوئی اور یہیں ترقی اور فروغ کے منازل سے گزری ہم چوان صاحب کی ان تمام باتوں سے سو فیصدی متفق ہیں۔ لیکن اگر ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک کے سیاسی رہنماؤں کی اُردو کے موضوع پر تقریروں کو یکجا کرکے ان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی وزیر ایسا نہیں ہے جس نے اُردو زبان کی تعریف میں زمین و آسمان ایک نہ کر دیے ہوں لیکن عملی طور پر کسی وزیر، صوبائی حکومت یا مرکزی حکومت نے اُردو کی بقا اور ترقی

کے لیے کوئی ٹھوس کام نہیں کیا اس کا نتیجہ ایک چھوٹی سی مثال ہے کہ ڈیڑھ کروڑ اردو آبادی والی ریاست یعنی اتر پردیش میں آج بھی اردو ذریعہ تعلیم کا ایک سکنڈری یا ہائر سکنڈری اسکول نہیں ہے جسے حکومت چلاتی ہو۔ کچھ اسکول ہیں جو یعنی اقلیتی اداروں کی وجہ سے چل رہے ہیں۔ اور ان اسکولوں کی وہی حالت ہے جو اقلیتی اداروں اور خود اقلیتوں کی ہے۔ اسی لیے چوہان صاحب اور ان جیسے وزیروں کے اس طرح کے بیانات پر ہم کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔

دوسری بات چوہان صاحب نے یہ کہی کہ اب ہندوستان میں اردو کا ماحول سازگار ہے اور صوبائی اور مرکزی حکومت اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں ہمیں اپنی کوتاہ نظری پر افسوس ہے کہ پوری کوشش کے باوجود ہندوستان کی ایک بھی ایسی ریاست نظر نہیں آتی۔ جہاں حکومت اردو کی بقا اور ترقی کے لیے کام کر رہی ہو۔ یو۔ پی میں ایک دفعہ الیکشن [illegible] کی وجہ سے پانچ ہزار پرائمری اساتذہ کے تقرر کے احکامات صادر ہوئے تھے جس کا یہ حشر کسی نے یہ حشر کیا کہ مشکل سے چار سو، پانچ سو اساتذہ کا تقرر ہو پایا۔ باقی جن اساتذہ کو تھوڑی بہت اردو آتی تھی، ان کے ناموں کی فہرست بنا کر محکمہ تعلیم میں رکھوا دی گئی اور جب یہ پوچھا جاتا کہ پانچ ہزار اساتذہ کا تقرر ہو گیا؟ تو یہ فہرست دکھا دی جاتی۔

حقیقت یہ تھی کہ جن اساتذہ کا تقرر کیا گیا تھا ان میں مشکل سے تین چار سو اساتذہ تھے جو اردو پڑھاتے تھے۔ اس کے کافی برسوں بعد ملائم سنگھ یادو نے اپنی حکومت میں اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے مخلصانہ کوشش کی۔ لیکن افسوس ہے کہ انہیں زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ اس لیے ہم چوہان صاحب کو مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت کے عہدیداروں نے اردو کے سلسلے میں جو اطلاعات انہیں فراہم کی ہیں۔ وہ صریحاً غلط اور بے بنیاد ہیں۔

اردو والوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک ان کو زبان کے بارے میں ایسے لوگ مشورے دیتے رہے ہیں جن کا لسانیات یا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو ان معاملات کو بالکل نہیں سمجھتے اکثر یہ ہوتا ہے کہ کوئی غیر اردو داں اردو کی ترقی اور فروغ کے

سلسلے میں بڑی پُرجوش تقریر کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اردو کا رسم الخط بدل کر دیوناگری کر دیا جائے۔ ہم اس تجویز کو ان الفاظ میں مکمل کرتے ہیں کہ "اردو کا رسم الخط دیوناگری کر دیا جائے تاکہ یہ رہی سہی زبان بھی ختم ہو جائے۔"

کچھ عرصہ پہلے ہم نے "ہماری زبان" کے اداریے میں لکھا تھا کہ اردو ایسا ہے جیسے ایک صاحب کے پاس شیروانی تھی جو انہوں نے جوانی میں سلوائی تھی اس زمانے میں چونکہ یہ بہت مہنگی سلی تھی اس لیے وہ صاحب اس کو بہت احتیاط سے پہنتے تھے۔ جب کوئی شادی ہوتی تو شیروانی نکالتے، اس پر استری کرتے اور بہت سے پہنتے۔ شادی ختم ہونے پر پہلا کام یہ کرتے کہ شیروانی تہہ کر کے ٹرنک میں بند کر [illegible] یہی حال اردو کا ہے۔ الیکشن میں جب کچھ دن رہ جاتے ہیں تو جماعتوں اور خاص طور سے کانگریس کو اردو یاد آتی ہے وہ اپنے سرد خانے سے اردو کو باہر نکالتی ہے۔ جھاڑ پونچھ کر سب کے سامنے پیش کرتی ہے اور اس کی عظمت کے گیت گاتی ہے آج کل مرکزی حکومت نے اپنے سرد خانے سے اردو پیش کرنے کا کام چوہان صاحب کو دے رکھا ہے گذشتہ دنوں انہوں نے بریلی کے ایک مشاعرے میں تقریر کرتے ہوئے اردو کی زبردست تعریفیں کی تھیں ۲۴ نومبر کو مرکزی نائب وزیر مملکت برائے امور داخلہ جناب سید سبط رضا کی کوٹھی پر ادبی شعری نشست میں تقریر کرتے ہوئے اردو کے بارے میں ایسی باتیں کہیں جو کانگریس کی پالیسی کے صریحاً خلاف ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ "اگر کوئی زبان تمام ملک کو متحد کر سکتی ہے تو وہ صرف اردو ہے" انہوں نے مزید فرمایا کہ "گاندھی جی ملک کی زبان کے طور پر ہندوستانی کو دیکھنا چاہتے تھے اور یہ ہندوستانی زبان یا قومی اتحاد کی ہونی چاہئیں۔"

اگر ہم پچھلے چالیس سال سے کانگریس اور دوسری سیاسی جماعتوں

آپ تو یقیناً "ایس بی چوان صاحب کے ان الفاظ سے بے انتہا خوش ہوتے یہاں میں چوان صاحب کی اطلاع کے لیے ایک دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو کے قتل کرنے والوں میں کانگریس ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء میں گاندھی جی کے اصرار پر کانگریس نے طے کیا تھا کہ اس تنظیم کا کام "ہندوستانی" زبان میں ہوگا۔ ہندوستانی زبان سے مراد یہ تھی کہ ایک ایسی زبان جو عام فہم ہو جس میں اردو اور ہندی کے الفاظ شامل ہوں اور جس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ شامل نہ کیے گئے ہوں اور جو اردو اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کانگریس اس تجویز پر عمل کرتی رہی، لیکن اگست ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں کانگریس نے تجویز منظور کی کہ اب ہندوستان کی قومی زبان ہندی ہوگی۔ ۱۰؍ اگست ۱۹۴۷ء کے "ہریجن سیوک" میں گاندھی جی نے کانگریس کی اس تجویز پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی لسانی پالیسی کو پھر دہرایا اور کہا کہ ہندوستان کی قومی زبان کا حق صرف ہندوستانی کو ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی موقعوں پر گاندھی جی نے کانگریس کی اس پالیسی کے خلاف احتجاج کیا لیکن کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ ۱۹۴۶ء میں دستور ساز اسمبلی بنائی گئی۔ اور ۱۲؍ ستمبر ۱۹۴۹ء کو اسمبلی میں قومی زبان کی تجویز پر غور کیا گیا۔ قومی زبان کا ڈرافٹ ڈاکٹر امبیڈکر نے تیار کیا تھا۔ لیکن اس ڈرافٹ پر تین سو سے زائد ترمیمات آئی تھیں۔ گوپال سوامی آئینگر نے قومی زبان کے سلسلے میں جو ڈرافٹ تیار کیا تھا اسے غور و خوض کے لیے اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس ڈرافٹ میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندی ہوگی۔ گویا گاندھی جی کے "ہندوستانی" کے تصور کو یکسر ختم کر دیا گیا۔ اس ڈرافٹ پر بہت سے اراکین نے اظہار خیال کیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ کانگریس کے بہت سے اراکین نے گاندھی جی کی ہندوستانی کی نہیں ہندی کی حمایت کی۔

۱۳؍ ستمبر ۱۹۴۹ء کو پنڈت نہرو نے اس ڈرافٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے

گوپال سوامی آئنگر کی حمایت کی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے گاندھی جی کے ہندوستانی کے تصور پر بھی بات کی لیکن اس طرح سے کہ اردو کے رسم الخط کا ذکر نہیں آنے پایا۔ انہوں نے کہا کہ گاندھی جی اس زبان کو ہندوستانی کہتے تھے جو متحدہ تہذیب کی نمائندہ تھی اور جو عوام کی زبان تھی۔ پنڈت نہرو کا یہ بیان صریحاً غلط تھا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ گاندھی جی ہندوستانی اس زبان کو کہتے تھے جس میں ہندی اور اردو دونوں زبانیں شامل تھیں جس میں فارسی، عربی اور سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ سے گریز کیا جاتا تھا اور جسے گاندھی جی کی تجویز کے مطابق اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھا جانا چاہیئے تھا۔

غرض یہ ہے کہ ہندی یا اردو کا قتل کسی اور نے نہیں کانگریس نے کیا تھا۔ کیا چوان صاحب کے علم میں یہ تمام حقائق نہیں ہیں؟ اب اگر زبان کے سلسلے میں کانگریس کی پالیسی بدل گئی ہے تو ہماری چوان صاحب سے درخواست ہے کہ وہ مرکزی حکومت اور کانگریس کی طرف سے باقاعدہ زبان کی پالیسی کا اعلان کریں۔ ہم یہ بات نہیں کہیں گے کہ صرف اردو کو ہندوستان کی قومی زبان بنا دیا جائے۔ ہاں یہ ضرور کہیں گے کہ اردو کو اس کا جائز حق دلوایا جائے۔

بہت سے کام ایسے ہیں جو مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں عام شکایت یہ ہے کہ گورنمنٹ اور مرکزی اسکولوں اور نوودیالیوں میں اردو پڑھانے کی سہولت نہیں دی گئی ہے جب کہ شمالی ہندوستان کے اسکولوں میں تمل، تلگو وغیرہ جیسی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ اگر واقعی مرکزی حکومت کی نیت صاف ہے اور چوان صاحب اردو کی ترقی اور فروغ میں دلچسپی رکھتے ہیں تو ہماری ان سے درخواست ہے کہ نوودیالیہ اور مرکزی اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام کریں۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی تقریباً سبھی ریاستوں میں کانگریس۔ اقتدار میں تھی۔ اردو والوں نے ہندوستان کی قومی زبان ہندی کو تسلیم کر لیا تھا اور وہ صرف یہ چاہتے

تو اس کا جائز حق ملے لیکن کانگریس کی تمام حکومتوں نے اُردو کی بیخ کنی میں
ں۔ تھوڑے کچھ دن سے یہ ہو رہا ہے کہ کروڑوں روپیہ لگا کر بعض اُردو کے ادارے
ہا رہے ہیں" اُردو یونیورسٹی کے خواب دکھائے جا رہے ہیں۔ اردو اکیڈمیاں
ی ہیں اور اُردو انعامات کی رقم چند ہزار سے بڑھا کر لاکھوں میں کر دی جا رہی ہے
سلسلے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ سب اُردو والوں کو اُردو کی طرف سے غافل کرنے
ختم کرنے کے بہترین ذرائع ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ چوان صاحب کے اس بیان پر ایک سیاسی جماعت ہوا میں
اتر آئی ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ چوان صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف
ی بیان ہے اور اس کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

جے۔ پی کے نائب صدر کشن لال شرما صاحب نے چوان صاحب کے اس بیان پر
استعفیٰ کی مانگ کی ہے اور کہا ہے کہ افسوس کی بات ہے کہ چوان صاحب
مات ایکتا" کے چیئرمین ہیں اُردو کے حق میں ایسی غلط باتیں کرتے ہیں۔ یہاں
یہ ہے کہ شرما صاحب کو اُردو سے غیر معمولی دلچسپی ہے اور انہیں اس زبان
قدرت حاصل ہے کہ جب وہ اُردو میں تقریر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے
یا شخص تقریر کر رہا ہے جس کی مادری زبان اُردو ہے۔ تقریر کے دوران وہ اردو
ین شاعروں کے شعر بھی پڑھتے ہیں لیکن اُردو دشمنی میں وہ کسی سے پیچھے
چاہیے۔ کیونکہ اسی میں ان کی سیاسی جماعت کا مفاد ہے۔

یہ بہار کے سابق وزیر اعلیٰ جگن ناتھ مشرا صاحب نے جو کچھ کیا اور یوپی میں وہاں کے سابق
جناب ملائم سنگھ یادو نے جو کچھ کیا کیا چوان صاحب مرکز میں رہ کر مرکز کے زیر انتظام علاقوں
میں بھی نہیں کر سکتے؟

[illegible] درخواست کروں گا کہ اُردو [illegible] کیا [illegible] اگر [illegible]

دِ نئے بھسل۔ نوبھارت ٹائمز

بلاتبصرہ

حالانکہ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ کس دن کو کس طرح مناتا ہے لیکن نئے سال کے استقبال میں پانی کی طرح روپیہ بہایا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس طرح ہم نہ صرف ایک غلط روایت کی بنیاد ڈال رہے ہیں بلکہ اس سے ملک کی معیشت بھی متاثر ہو رہی ہے۔ نئے سال کے استقبال کے اور مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ ہم اس طرح ان غریب لوگوں کو ضروریات مہیا کر سکتے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ نیا سال اسی وقت خوشیوں بھرا ہو سکتا ہے جب ملک سے بے روزگاری اور غربت کا خاتمہ ہو محض ہوٹلوں میں ناچ گا کر یا شراب پی کر نیا سال خوشیوں سے نہیں بھرا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ حکومت کو اس جانب بھی کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

جلد (۱۲) شمارہ : (۲)

فروری ۱۹۹۶ء قیمت ۶ روپے

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری	رشید الدین	قدیر انصاری

مجلس مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم ۔ ڈاکٹر منتاء الرحمٰن خاں منشاء ، محترمہ سیدہ مہر ، پروفیسر طالب علی
ڈاکٹر یوسف الدین ۔ محمد منظور احمد منظور ، منیر احمد صدیقی

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	۶۵ روپے	۲ سال	۱۲۰ روپے	تاحیات	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	"	۲۰۰ "	"	۳۶۰ "	"	۲۷۰۰ "
امریکہ	"	۱۴ ڈالر	"	۲۷ ڈالر	"	۲۰۰ ڈالر
انگلستان	"	۲۵ پونڈ	"	۴۵ پونڈ	"	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	"	۱۷۵ پاکستانی روپے	"	۳۰۰ روپے	"	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ :-

ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز ، حیدرآباد

ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلیشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد ۴ سے شائع کیا۔

فہرست

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مدرسہ کیا ہے

مدرسہ کا شجرۂ نسب :

حقیقی مدرسہ کی بنیاد اور پہلے مدرسہ کی بنیاد کہاں رکھی گئی ہے، پہلے مدرسہ کی بنیاد قرطبہ اور غرناطہ میں نہیں رکھی گئی، قیروان اور قاہرہ میں نہیں رکھی گئی، دہلی اور لکھنؤ میں نہیں رکھی گئی۔ فرنگی محل ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند میں نہیں رکھی گئی، پہلے مدرسہ کی بنیاد مسجد نبوی میں رکھی گئی، اور اس مدرسہ کا نام صفہ تھا۔ آپ مجھے معاف کریں میں صرف اسی کو صحیح النسب مدرسہ اور عالی نسب مدرسہ اسی کو سمجھتا ہوں جس کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی پر جاکر ختم ہو اور میں اسی مسجد کو صحیح النسب مسجد سمجھتا ہوں جس کا شجرۂ نسب کعبۃ اللہ پر جاکر ختم ہو، میں اس کے مقابلہ میں دوسرے الفاظ بولنا نہیں چاہتا کہ وہ مسجد کیا کہلاتے گی؟ مسجد ضرار! قرآن مجید نے بتایا ہے، اس کے علاوہ آپ کو کوئی نیا لقب ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں: وہ مسجد، مسجد ضرار کہلائے گی، جس کا شجرۂ نسب ابراہیم و محمد علیہما السلام کی بنائی ہوئی مسجدوں پر ختم نہیں ہوتا۔

اور وہ مدرسہ مدرسہ نہیں بلکہ انسانیت کی قتل گاہ کہلائے گا۔ جس کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی پر ختم نہیں ہوتا، مسجد نبوی پر ختم نہیں ہوتا، اور ابوذرؓ و سلمانؓ پر ختم نہیں ہوتا، صدیقؓ و علیؓ پر ختم نہیں ہوتا، زیدؓ اور سیدہ عائشہؓ پر ختم نہیں ہوتا۔

ان مبلغان دین، ان ہادیان انسانیت، ان پیشوایان عالم پر ختم نہیں ہوتا، جنہوں نے ہدایت کا پیغام دیا، جنہوں نے قربانی کا پیغام دیا، جنہوں نے خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو نفع پہونچانے کا پیغام دیا کہ ایثار یہاں مقصود ہے، اور اپنا زیاں گوارہ ہے لیکن دوسروں کا زیاں گوارہ نہیں، جنہوں نے یہ پیغام دیا کہ اپنے گھر میں اندھیرا رکھ کر دوسروں کے گھروں میں روشنی کا انتظام کرو، اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر (اس لئے کہ ان کا سلسلہ انہیں پر ختم ہوتا ہے، جنہوں نے غزوۂ خندق میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے تھے) دوسروں کے بچوں کا پیٹ بھرنے اور ان کو کھلانے کا انتظام کرو، جنہوں نے یہ پیغام دیا کہ مدرسہ کا کام ملازمت دلانا نہیں ہے، مدرسہ کا کام آسامیاں بانٹنا نہیں ہے، مدرسہ کا کام ایسا پڑھا لکھا انسان بنانا جو اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو مسحور کرنے نہیں ہے۔ مدرسہ کا کام قرآن سنانا ہے جب کہ دنیا میں ہر حقیقت کا انکار کیا جا رہا ہو۔ اور یہ کہا جا رہا ہو کہ سوائے طاقت کے کوئی حقیقت ہے ہی نہیں، جب دنیا میں بلا محابہ ڈنکے کی چوٹ پر کہا جا رہا ہو کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت زندہ ہے، اور سب حقیقتیں مر چکیں، اخلاقیات مر چکے، صداقت مر چکی، عزت مر چکی، غیرت مر چکی، شرافت مر چکی، خودداری مر چکی، انسانیت مر چکی، صرف حقیقت باقی ہے۔ اور وہ نفع اٹھانا اور اپنا کام نکالنا ہے، وہ ہر قیمت پر عزت بیچ کر، شرافت بیچ کر، ضمیر بیچ کر، اصول بیچ کر، خودداری بیچ کر، صرف چڑھتے سورج کا پجاری بنتا ہے۔ اس وقت مدرسہ اٹھتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ انسانیت مرا نہیں ہے، اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ نقصان میں نفع ہے، ہار جانے میں جیت ہے بھوک میں وہ لذت ہے جو کھانے میں نہیں، اس وقت مدرسہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ذلت بعض

نہ وہ عزت ہے، جو بڑی سے بڑی عزت میں نہیں، اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ
بڑی طاقت خدا کی طاقت ہے، سب سے بڑی صداقت حق کی صداقت ہے، یہ ہے
کام اور اگر مدرسہ یہ کام چھوڑ دے اور دنیا کے سارے کام کرنے لگے تو وہ مدرسہ، مدرسہ
مستحق نہیں۔

مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے انسان پیدا کرے جو اس پست سطح سے بلند ہو کر
سکا ہیے، ہم سب کچھ بیچنے کو تیار ہیں، آج دنیا نیلام کی منڈی کے سوا کچھ نہیں، کہاں کا
مدرسہ کہاں کا کتب خانہ، کہاں کے اصول اور کہاں کے معیار، ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا
زار ہے، اس میں ہر ایک اپنا جنس ہنر، اور اپنا جنس کمال ہاتھ پر رکھے ہوئے بیچنے
آیا ہے۔

لیکن ہم اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے، ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا محض ایک
ے، ایک منڈی ہے، یہاں جو آئے مال لے کر جائے اور بیچے، صرف مسئلہ قیمت کا ہے،
ہو سکتا ہے کہ کسی کو بیچنے میں کچھ دیر لگ جائے۔ اس لیے نہیں کہ اس کو اپنا جنس
ر، اپنا جنس مذہب اور اپنا جنس اخلاق زیادہ عزیز ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کے
ے دام نہیں مل رہے ہیں۔

جب انسانیت پر زوال آیا، جب اخلاقیات پر زوال آیا اور جب لوگوں کو یہ نظر
ر یہ جو حق و باطل کی بات کہی جاتی تھی، یہ محض زیب داستاں کے لیے کہی گئی ہے، اور
یا وجود نہیں ہے، حق و باطل کوئی چیز نہیں ہے، حلال و حرام کوئی چیز نہیں ہے، کفر و
ئی چیز نہیں، غلط صحیح صواب و ناصواب کوئی چیز نہیں ہے، اصل چیز تو پیسہ ہے،
ر تو طاقت ہے، اصل چیز عہدہ ہے، اصل چیز مواقع ہیں، اس وقت مدرسہ
ل پیدا کیے، کوئی ایسا آدمی لا کھڑا کر دیا، ایسا بلند قامت انسان، ایسا کہ وہ پکار
بولنے کہا کچھ نہیں! ہم نہیں جانتے۔ اور اگر کسی کو اعتبار نہیں آتا تو ہمیں خرید کر دیکھو کر

گر وہ ہمیں خرید سکتا ہے تو ہم مان لیں گے کہ دنیا میں اخلاقیات کوئی چیز نہیں، اور ان سب پر مکمل زوال آچکا ہے، مدرسے نے ایسے ایسے لوگ پیدا کیے ہیں۔

میرے نزدیک مدرسے کا صرف ایک کام ہے کہ وہ ایسے محقق اور ربانی علما پیدا کرے جو صرف یہی نہیں، یہ تو ان کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا سودا کریں، انہیں بلکہ وہ دنیا کو جو ضمیر کا سودا کر رہی ہے، اس کو سرزنش کر سکیں، اس سے کہہ سکیں کہ ان کا ضمیر اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے کہ وہ روز بکے، روزانہ نیلام پر چڑھے، ایک عہدے پر بک جائے، ایک عہدہ ایک کرسی، ایک خوشنودی، ایک تبسم اس کو خرید لے۔

عالم ہر زمانہ میں، ہر جگہ قبلہ نما ہے!

مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر باعقیدہ، ایسے باایمان، ایسے باحوصلہ ایسے باہمت فضلا پیدا کرے کہ جو اس ضمیر فروشی، اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کے مینار کی طرح قائم رہیں کہ وہ کہیں نہیں جاتا اپنی جگہ پر کھڑا ہے، راستہ بتاتا ہے، جیسے قبلہ نما کہ آپ کہیں بھی آپ کو قبلہ بتا دے گا، ہندوستان میں بتائے گا۔ دوسرے ملک میں بتائے گا، پہاڑ پر رکھیں تو بتائے گا، پل پر رکھیں تو بتائے گا، یہ عالم کا کام ہے کہ ہر زمانہ میں ہر جگہ قبلہ نما ہے۔

تبصرہ نگار : م۔ ق۔ سلیم

THE HOLY QURAN AND OUR DAILY LIFE

مصنف : ڈاکٹر میر مصطفیٰ حسین

تبصرہ نگار : ڈاکٹر مصطفیٰ علیخان فاطمیؒ

عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے مترجمین اور مؤلفین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے فلسفہ، سماجی علوم، سائنسی علوم، طب، انجنیری، تاریخ، جغرافیہ اور سیرت و سوانح کی ۳۵۱ کتابوں کا انگریزی، فرانسیسی، جرمن، عربی اور فارسی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیا اور ۲۳۶ کتابیں بشمول (۷) سات مجموعہ اصطلاحات علمیہ کی تالیف کی۔ بتیس علوم و فنون کے متعلق فلسفہ اسلامی کے ۱۲ جغرافیہ ممالک اسلامی کے ۲ اور تاریخ اسلام کے ۲۳ ترجمے اور بیس اردو تالیفات کی طباعت و اشاعت عمل میں آئی۔ اس طرح اصطلاحات پر ۵۰ کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔ سربرآوردہ مترجمین علامہ عبداللہ عمادی، علامہ علی حیدر نظم طباطبائی، پروفیسر مناظر احسن گیلانی، سید محمد ابراہیم ندوی، سید ابوالخیر مودودی، ڈاکٹر میر ولی الدین، قطب الدین محمودی، سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالقدیر صدیقی، عبدالحلیم شرر، ڈاکٹر زاہد علی، اور مارماڈیوک پکتھال ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے مذہبی سائنس کے اساتذہ پر بھی جامعہ عثمانیہ کی علمی فضا، ترجمہ، تالیفات اور تحقیقی مشاغل کے بڑے گہرے اثرات پڑے ہیں۔ پروفیسر ہاشم میر علی صدر کیمسٹری کالج نے قرآنیات پر موضوعی اور سائنسی انداز میں علمی کام کا بیڑا اٹھایا۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کیمپس میں طلبہ

کو پڑھاتے اور آیو مائیکشی مزہ عنایت سنگر پر ندامت کی عملی تعلیم دیتے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں پروفیسر ہاشم امیر علی نے Students Quran کے عنوان سے انگریزی ترجمہ کے ساتھ مرتب کی اور ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی سے طبع کروائی یہ ۷۱۶ صفحات کی ایک مختصر اور جامع تالیف ہے۔ برسوں بعد ان کی ایک کتاب بعنوان

The Message of The Quran

بھی طبع ہو کر نایاب کمیاب ہے۔ پروفیسر ہاشم امیر علی صاحب کا یہ مشغلہ آخر عمر تک جاری رہا۔ ۱۹۶۲ء میں ندمی کالج' آندھرا پردیش ندمی یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی سے راست تعلق باقی نہ رہا۔

پروفیسر ہاشم امیر علی کے شاگرد رشید ڈاکٹر میر مصطفیٰ حسین' پروفیسر آف اگرونومی۔ آندھرا پردیش ندمی یونیورسٹی نے مطالعہ قرآن و اسلامیات کی شمع کو اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی روشن رکھا ہے۔ قرآنی ایجوکیشن سوسائٹی حیدرآباد کے وہ صدر بھی ہیں۔ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد برسوں کی عرق ریزی اور اپنے معروضی مطالعہ قرآنی کا ماحصل زیر نظر کتاب مقدس قرآن اور ہماری روزمرہ زندگی "

The Holy Quran and our Daily Life

انگریزی میں تالیف کی ہے۔ پروفیسر مصطفیٰ حسین صاحب کو اردو زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ ان کے کئی مضامین اور مراسلے مذہبی اور علمی موضوعات پر بھی روزنامہ سیاست اور دیگر موقر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کتاب کے انگریزی زبان میں تالیف کرنے کا اہم ترین سبب یہ ہے کہ آج کی ہماری نوجوان نسل کو اپنی مادری زبان اردو اور دینیات سے بہت کم واقفیت رہ گئی ہے۔ سرکاری اور خانگی مدارس کے نصاب تعلیم میں اردو بحیثیت ایک زبان کے شامل نہیں ہے۔ سابق حیدرآباد جیسی ریاست کے حدود میں بھی اردو ذریعہ تعلیم انتظامیہ کی حکمت عملی اور تاریخی جبر" کے باعث یاد ماضی بنتا جا رہا ہے۔ اقتضائے وقت اور افادی نقطہ

سے اس کتاب کا انگریزی میں لکھا جانا بھی قرین مصلحت ہے تاکہ ہر ایک پڑھے لکھے فرد کے لئے تعلیماتِ قرآنی سے استفادہ کی سہولت میسر آئے اور خصوصاً ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اس بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں کہ اسلام ایک آسان دین ہے اور قرآن کریم کی تعلیمات پر خلوص دل سے عمل تمام انسانیت کے لیے باعث سلامتی و موجب رحمت ہے۔ مولف نے انتہائی سلیس اور سادہ زبان میں قرآن کریم کے اہم موضوعات کو پیش کرنے کی بہت ہی کامیاب کوشش کی ہے

قرآن وہ مقدس اور آخری صحیفہ آسمانی ہے کہ جس میں وحی خداوندی بلا کسی تحریف و تبدیلی کے محفوظ ہے۔ اس کی ہدایات اور احکام زماں و مکاں کے حدود سے ماورا ہیں اور سارے عالم انسانیت کی رہنمائی کرتے ہیں اس کا پیام کسی خطہ ارض، کسی قوم یا نسل کے لیے محدود و مخصوص نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ قرآن کا مقصود للہیت اور تعمیر انسانیت ہے۔ اس کی تعلیمات آدم خاکی کو جوہر کامل کی نورانیت عطا کرتی اور بالآخر مومن کامل اور منظور حق بنا دیتی ہیں۔

گر زمین آسمان سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دل آہن رباید زنگ را
نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمین

(اقبال)

قرآن مجید کے تمام احکام اور تعلیمات کی عملی صورت گری کا اولین اور بہترین نمونہ سرورِ عالم، نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے شب و روز، آپ کے اخلاق اور آپ کا اسوہ حسنہ ہے سابق دکتا ... کا آغاز استاد کا محترم جناب سید ہاشم علی صاحب سابق

ب امیر جامعہ عثمانیہ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عالمانہ اور بصیرت افروز پیش لفظ کا اقتباس ہے جس میں پروفیسر مصطفیٰ کمال حسین صاحب کے تدریسی اور تجرباتی کارناموں کے ساتھ کی قرآنیات اور دینی علوم میں دلچسپی اور ایک مثالی زرعی علوم میں استاذ کی حیثیت تذکرہ کیا گیا ہے۔ محترمی ہاشم علی صاحب نے اسلامی اخلاق و کردار اور عمل صالح کی اہمیت کو بہت موثر اسلوب میں پیش کیا ہے۔

مؤلف نے اپنے دیباچہ میں قرآن کریم کی تعلیم و تفہیم کے سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں خصوصاً عصر حاضر کے نوجوانوں کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مفید مشورے دیئے ہیں۔ کتاب کی تالیف کا مقصد بھی واضح کیا ہے کہ قرآنی تعلیمات سلیس اور آسان انگریزی زبان میں پیش کرنے کی ممکنہ کوشش کی گئی ہے تاکہ انگلش میڈیم سے تعلیم یافتہ افراد بالخصوص نوجوان نسل آسانی سے سمجھ سکے اور اطمینان بخش طریقہ سے عمل کر سکے۔ مستعمل اصطلاحات اور مخففات کی توضیح و تشریح کی گئی ہے تاکہ قاری کے لیے کوئی مشکل نہ ہو۔ یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ اس تالیف میں توجہ کا اصل مرکز متن مقدس کی تعلیمات اور احکام ہیں جنہیں ممکنہ اختصار کے ساتھ عام فہم الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ قرآنی تعلیم کا اولین عملی نمونہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے اور آنحضرت کا عمل "اسوہ حسنہ" ہے۔ آئمہ فقہ کے مذاہب فقہ اس کتاب کا مقصود مطالعہ نہیں۔ فہرست مضامین (۱۴) موضوعات پر مشتمل ہے جن کے تحت (۲۴۳) عنوانات اور ذیلی عنوانات قائم کئے گئے۔ جن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے موضوعات، عنوانات اور ذیلی عنوانات میں ایک فطری اور منطقی ربط و تسلسل لائق تحسین ہے۔ فہرست مضامین پانچ صفحات پر مشتمل ہے اس لئے یہاں صرف (۱۴) موضوعات درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) قرآن کریم (۲) تصور الٰہ (۳) پیغمبر اسلام حضرت محمد (۴) دین اسلام (۵) عبادات (۶) اخلاقی و سماجی آداب (۷) انسانی روابط و تعلقات (۸) خاندانی زندگی (۹) انسانی حقوق

(۱۰) تحقیق (۱۱) عدل و مساوات (۱۲) معاش اور (۱۳) اسلامی اسٹیٹ (۱۴) متفرق۔

ماہرین اشتیاق موضوعات کے علاوہ صفحات ذیلی عنوانات اور حق کو دیکھ کر ہی طمئن ہو سکیں گے کتاب کے آخر میں موضوعاتی اور مترادفات کے مطابق آیات بھی شامل ہیں۔ اصطلاحات حاشیہ میں دیئے گئے ہیں۔ اس کے باوصف دیباچہ کے اختتام میں مؤلف پروفیسر مصطفیٰ حسین صاحب نے عالمانہ انکسار سے کام لیتے ہوئے اظہار کیا ہے کہ قرآنیات پر لکھی گئی سابقہ کتابوں کی طرح یہ تالیف بھی ایک "انسانی کوشش" ہے اور انسان مرکب من الخطا والنسیان ہے۔ اس لیے کسی بھی چوک یا کمی یا غلطی کی نشاندہی اور توجہ دہانی مؤلف کے تشکر کی مستحق ہو گی۔ سچ یہ ہے کہ کامیاب دنیوی زندگی اور عقبیٰ کی سرخروئی کا انحصار علم صحیح، عمل صالح اور صدقِ حق کے حاصل کرنے کے لیے پرخلوص سعی اور جدوجہد پر ہے۔ The Holy Quran and our Daily Life کی کمپوزنگ مسرز کے بی ین زیراکس خیریت آباد۔ حیدرآباد نے جدید ترین D.T.P کمپیوٹرائز سسٹم پر کی ہے اور ہیومن ورگتی آرٹ پرنٹرز نے نہایت نفیس طباعت کی ہے۔ کتاب کا گٹ اپ جاذب نظر اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ وہ بین الاقوامی معیار کے مطابق ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تالیف قرآنی تعلیمات کو عام فہم بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرے گی۔ اسکے نسخے قرآن ایجوکیشن سوسائٹی ۱۷/۲۷۳۱۷-۱۰-۳ ہمایوں نگر حیدرآباد ۲۸...۵ اور

WALDEN BOOK HOUS BEGUMPET

یا دکتستیاب میں جیسے A.A. HUSSAIN عابد روڈ اور ساتی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

The Holy Quran and our Daily Life
Dr. Mir Mustafa Hussain
Professor of Agronomy
Publisher: Quran Education Society 10-3-27317
Humayun Nagar Hyd-28

قیمت (60) روپئے، تبصرہ نگار ڈاکٹر مصطفیٰ کمال سابق ڈائرکٹر آندھرا پرنسپل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ حیدرآباد

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
ریڈر شعبۂ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی

تعلیم ایک تحریک

مسلمانوں کی تعلیم پر ایک دستاویزی کتاب

مصنف: محمد اسحاق

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو محسوس کر کے ہی سرسید احمد خاں نے اس تحریک کی بنیاد ڈالی تھی جسے ہم علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر سرسید نے مخالفتوں کے ایک سیلاب کے باوجود اپنے خون جگر سے اس تحریک کی آبیاری نہ کی ہوتی تو شاید قعر مذلت میں گم ہو چکے ہوتے سرسید نے اعلیٰ تعلیم کے لیے ملت کے نوجوانوں کو راغب کیا اور ساتھ ہی ان کی ذہنی تربیت کے لیے بھی جدید طریقے اختیار کئے مسلمان پسماندگی کا شکار ہو گئے وہیں تعلیمی میدان میں بھی ان کا تناسب کم سے کم ہوتا گیا۔ پاکستان کے قیام نے تو اور بھی ستم ڈھایا۔ کیوں کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر گئی اور ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کا تعلیمی فیصد تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ معاشی مجبوریاں، سماجی سطح پر بے توجہی اور تعلیمی سہولتوں کی دن بدن کمی ملت کے نونہالوں کو تعلیم سے دور کرتی رہی۔ جو مدارس باقی رہ گئے ان کا معیار بھی ایسا نہیں کہ وہاں سے نکلنے والے

طلباء اعلیٰ تعلیمی میدان میں اپنی اہلیت کو ثابت کرسکیں۔ بیسویں صدی کی آخری دو تین دہائیاں تو تعلیمی میدان میں مسابقتی اعتبار سے اعلیٰ ترین سطح کا مطالبہ کرتی رہیں۔ اور اب جب کہ ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آج کی سائنس اور تکنیکی سطح کی اعلیٰ تعلیم آنے والے زمانے میں از کار رفتہ ہو کر رہ جائے گی۔

محمد اسحاق صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے تعلیم کے ضمن میں مختلف مسائل پر گذشتہ پندرہ برسوں سے ملت کو متوجہ کرنے کا اہم فریضہ انجام دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اسحاق صاحب خود ماہر تعلیم ہیں اور تیس برس سے زائد عرصہ تک مختلف اہم سرکاری عہدوں پر کام کرنے کے علاوہ مابعد وظیفہ المدینہ کالج آف ایجوکیشن مجیب نگر اور سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کالجوں کے ابتدائی مراحل میں نہایت تندہی اور انہماک سے خدمات انجام دے کر ان کو مثالی کالج بنادیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے ملت کی خدمت کا وہ جذبہ کار فرما تھا جو انقلاب آفریں شخصیتوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ اسحاق صاحب کے تعلیمی مسائل پر مضامین مختلف اخبارات اور رسائل کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اہم جریدے تہذیب الاخلاق۔ میں بھی شائع ہوئے اور ان کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے ملک کے کئی رسالوں نے انہیں دوبارہ شائع کیا۔ پھر احباب کے اصرار پر ان کی پہلی کتاب "تعلیمی مسائل اور ہماری ذمہ داریاں" منظر عام پر آئی اس کے پانچ سال بعد اس کتاب میں شامل مضامین کے علاوہ کچھ اور مضامین شامل کرکے "تعلیمی مسائل" کے عنوان سے دوسری کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اسحاق صاحب کے مضامین کا سلسلہ جاری رہا اور پچھلے دو تین برس میں شائع ہونے والے مضامین پر مشتمل زیر نظر کتاب "تعلیم ایک تحریک" کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ دیدہ زیب سرورق اور کتابت کمپیوٹر سے آراستہ اس کتاب کے آغاز میں جناب محمود بن محمد سابق سفیر برائے سعودی عرب اور پروفیسر جعفر نظام سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی کے تاثرات کے علاوہ جناب سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تحریر کردہ وہ پیش لفظ بھی شامل ہے جو انہوں نے اسحاق صاحب

کی پہلی کتاب کے لیے سپرد قلم کیا تھا۔ اس پیش لفظ کی افادیت اور اس کے اندر موجود ملت کے لیے شاہ صاحب کی تڑپ کے پیش نظر مصنف نے اس کتاب میں بھی شامل کیا ہے۔ سید حامد صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ اسحاق صاحب کی تحریروں میں صالح جذبہ اور دانش کا موثر اور کارگر امتزاج ہے۔ پروفیسر جعفر نظام نے بھی اسحاق صاحب کے مضامین کو وقت کا تقاضہ قرار دیا ہے کیونکہ عصری تعلیم کے بغیر ملت اسلامیہ ترقی کے میدان میں عصری اقوام کے دوش بدوش نہیں رہ سکتی۔ اور جناب محمود بن محمد نے موجودہ دور کے تعلیمی مسائل پر اسحاق صاحب کی گہری نظر کی ستائش کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ایک منصوبہ بند مہم کے ذریعے تعلیم کے روایتی جمود کو ختم کرنا ممکن ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون "بچہ اسکول سے کیوں بھاگتا ہے" نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے دقیق علمی اصطلاحات اور بڑے بڑے اصول دہرانے کی بجائے نہایت سلیس اور سادہ زبان میں بچوں، والدین اور اساتذہ کے رویوں کا تجزیہ کیا ہے اور اس ضمن میں کچھ مفید مشورے بھی دیتے ہیں۔ جن پر عمل کیا جائے تو ان کے خیال میں بچہ اسکول سے بھاگنے کی بجائے اسکول کی طرف بھاگے گا۔ آج کا دور مسابقت کا دور ہے۔ جو لوگ مسابقت کی دوڑ میں نمایاں مقام نہیں حاصل کر سکتے، ان کے لیے زندگی کے مختلف مراحل پر ناکامیاں مقدر بن جاتی ہیں۔ لیکن مسابقت کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کچھ بنیادی عوامل بھی ہیں۔ صرف درسی کتابوں کا کیڑا بن جانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جو مسابقتی دوڑ میں کامیابی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اسحاق صاحب نے ایک مضمون میں ایسے ہی چند نکات بیان کئے ہیں جن پر عمل کیا جائے تو مقصد حاصل کرنا ناممکن نہیں۔ ایک اور مضمون میں مصنف نے جہاں ایک طرف مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا ہے وہیں دوسری طرف ان کا خیال ہے کہ اگر انگریزی میں مناسب استعداد حاصل کی جائے تو ہندوستانی تعلیمی نظام کے پس منظر میں ملت کے طلبا کے لیے اعلیٰ معیار تک پہنچنا ممکن ہو سکتا ہے

جس کے لیے ان کا مشورہ ہے کہ اسکول کے زمانے سے ہی طلبا کی انگریزی کو بہتر بنانے پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ اور جدید سائنٹفک طریقے اختیار کرنے چاہئیں تاکہ اعلیٰ تعلیمی سطح پر انہیں زبان کی دشواری نہ ہو۔ اردو میڈیم مدارس کے ضمن میں ایک مضمون میں مصنف نے جو مشورے دیے ہیں وہ بیحد اہم اور ان کے برسہا برس کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ ان مشوروں پر اگر سنجیدگی سے عمل کیا جائے تو ان اردو مدارس کی صورت حال میں نمایاں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اور قوم میں غربت کی وجہ سے جو ناخواندگی پھیلی ہوئی ہے اس کا بھی سد باب ممکن ہے۔ مدینہ ایجوکیشنل سنٹر کے زیر اہتمام سوپر اسکول کی اسکیم پر بھی ایک مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم کے درد مند اصحاب اس طرح کے مزید سوپر اسکول قائم کرنے کی طرف توجہ دیں تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا ملک اور قوم کے لیے قیمتی اثاثہ ثابت ہو سکیں۔ ملک کے انقلاب کے لیے ایک بہت اہم مسئلہ اچھے اساتذہ کا حصول ہے جس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک اہم وجہ ہے معلم [illegible] بھی ہے۔ اسحاق صاحب نے اپنے تجربات کی روشنی میں اچھے اساتذہ کے حصول کے لیے کچھ اہم مشورے دیے ہیں کیونکہ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ایک استاد پوری نسل کا معمار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں جملہ اٹھارہ مضامین ہیں اور ہر مضمون اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ من حیث الکل اسحاق صاحب کی یہ تازہ ترین تصنیف "تعلیم ایک تحریک" والدین کے لیے، تعلیمی اداروں کے سربراہوں کے لیے، سماجی اصلاح اور تعلیمی تحریکوں سے وابستہ اصحاب کے لیے اور خود اساتذہ کے لیے ایک [illegible] تحفہ ہے میرے لیے یہ بات بھی یقیناً لائق صد افتخار ہے کہ اسحاق صاحب نے ان کے کہنے کے مطابق حیدرآباد میں اپنی اس تصنیف کی پہلی کاپی مجھے عنایت کی اور اس طرح مجھے [illegible] کی عزت افزائی کی۔ اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شگفتہ اور دل پذیر [illegible] کے پیرائے میں اسحاق صاحب نے اپنے تجربات اور ایک عرصے کے غور و فکر کے بعد تعلیم سے متعلق جن مسائل پر خامہ فرسائی کی ہے۔ وہ یقیناً وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ان مسائل پر مطالعہ

محمد اسحٰق فاؤنڈر پرنسپل
المدینہ کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر اور
سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، بنجارہ ہلز حیدرآباد

تعلیم کا کام — عائشہ بیگم کے نام

محترمہ عائشہ بیگم، صدر محفل علم و فن، سابق جوائنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن، مہاراشٹرا کے نام اور کام سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ ان کا واحد مشن تعلیم ہی تعلیم ہے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تعلیم ہی موضوع گفتگو ہوتا ہے۔ روزانہ صبح سے شام تک اپنی کار میں غریب ذہین بچوں کی تلاش میں گھر گھر اسکول اسکول پھرتی رہتی ہیں تاکہ ان کی مدد کی جائے۔ ان کے عزم و لگن کو دیکھ کر خیال آیا کہ محترمہ کے کام کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی چاہیئے تاکہ اس گم نام نیک نام خاتون کے کام سے عجب نہیں بہت سے خاندانوں کو روشنی ملے گی۔ ممکن ہے کچھ لوگ کچھ دیر کے لیے گہری فکر میں گم ہو جائیں گے اس مضمون کا اصل مقصد بھی یہی ہے ورنہ محترمہ کی تعریف و توصیف میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں ہے۔

دوسروں کی باتیں بعد میں ہوں گی، یہ بتلائیے کہ آپ کے بچے بھی کچھ پڑھے لکھے ہیں۔

کہنے لگیں میرے سات بچے، چار لڑکے تین لڑکیاں اس میں چھ ڈاکٹر ہوئے اور ایک لڑکا انجنیئر۔ دو بہو ڈاکٹر ہیں اور تینوں داماد ڈاکٹر، یہ سب کے سب امریکہ، انگلینڈ میں ہیں۔ ایک صاحبزادی ڈاکٹر شمیم حیدرآباد ہی میں وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کی سپرنٹنڈنٹ اور گائناکالوجی کی

پروفیسر ہیں اعلیٰ تعلیم کے دوران میرے خاندان کے بچوں نے گیارہ گولڈ میڈل لیے ایک لڑکی نے میڈیسن میں چار گولڈ میڈل لیے یہ سب میرے یہاں آج [illegible] ہیں۔ میں نے کہا ایک ہی خاندان میں گیارہ ڈاکٹر اور گیارہ گولڈ میڈل احد عشر کوکبا کی مثال۔ گیارہ کے گیارہ آسمان کے ستارے پھر ان سب کے بچے میڈیسن، انجینئرنگ اور کالج کی اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ کے سب بچے جب اتنے قابل نکلے تو ظاہر ہے کچھ اپنے آبائی خاندان کے ماحول اور روایات کا ضرور اثر ہوگا۔

ہاں یہ بات بڑے پتے کی ہے۔ میری آٹھ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ہمارے خاندان میں بزرگ عالم، فاضل اور جید علمائے دین گزرے ہیں۔ میری والدہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن ان کا ارادہ تھا کہ سب بچوں کو کالج تک اعلیٰ تعلیم دلا کر رہوں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری سب آٹھ بہنیں محکمہ تعلیمات میں کلاس ون گزیٹڈ آفیسرس کے عہدے سے ریٹائر ہو گئیں اور میرے بھائی ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے سے ... ساٹھ ستر برس پہلے لڑکیوں کے لئے نہ تو اسکول زیادہ تھے اور نہ کالج۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لڑکیوں کی تعلیم کو گناہ اور خاندان کے لیے عیب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے زمانے میں آپ کی والدہ کی دور اندیشی اور روشن خیالی کچھ [illegible] سے کم نہیں۔

تعجب ہے کہ آپ کے سب بچے ذہین اور فطین کیسے نکلے۔

آپ تو میرے سب راز معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اور میرے شوہر روزانہ شام میں اپنے بچوں کے ساتھ روزانہ چار گھنٹے ان کے اسباق اور ہوم ورک دیکھنے بیٹھ جاتے۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر ہونے کے باوجود میں صرف ایک دن کلب گئی۔ عام طور پر لوگ کسی تقریب میں شریک ہوتے سوائے ایسی تقریب کے جو بہت ضروری اور اہم ہوتی۔ بچوں کی تعلیم میں ایک دن کا بھی حرج ہوتا تو میں بے چین ہو جاتی۔ ان کے عام معلومات کے لیے ہر بچی کی پبلک لائبریری سے روزانہ ایک کتاب ایک ہفتے میں لاتی جو ۲۴ گھنٹوں بعد واپس کرنی پڑتی۔ وہ ایک کتاب ایک دن میں

اُن چاروں بچے بڑی بڑی پڑھ لیتے۔ اس طرح لائبریری کی ساری کتابیں میرے سب بچے دیمک کی طرح چاٹ گئے۔

میری ایک لڑکی ہوسٹن (امریکا) میں کاسٹالوجسٹ ہے جو انگلینڈ اور امریکہ کے بارہ امتحانات پاس کر چکی ہے۔ ایک داماد ڈاکٹر عبدالعلی شہرہ آفاق کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر کولی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ان کی شہرت اور عظمت کے لیے اسی قدر کہ ڈاکٹر کولی کا نام کافی ہے ان سب بچوں کی تعلیم پر خرچ بھی بہت آتا ہوگا۔ کس طرح آپ ان سب بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے رہے۔

میں اور میرے شوہر سادہ لباس استعمال کرتے ہیں میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھڑکدار اور قیمتی ساڑی نہیں خریدی۔ جو ٹیچرس اور خواتین مجھ سے عید میں ملنے آتیں میری سادہ لباسی پر حیرت کرتیں۔ کیونکہ وہ بھڑکدار لباس اور زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتیں۔ کبھی وہ پوچھ لیتیں کہ آپ ہیڈ مسٹرس کے عہدہ پر ہوتے ہوئے بھی کیوں اتنے سادہ لباس میں رہتی ہیں۔ میں کہتی اچھے لباس اور زیور کی تمنا میرے دل میں نہیں ہے۔ اگر میں اس آرائش و زیبائش پر خرچ کروں تو میں بچوں کو پڑھا نہیں سکتی، جیسے یہ بچے بڑے ہو کر کچھ نام پیدا کریں گے تو اس وقت جو خوشی ہو گی اس کا اندازہ تو اب نہیں ہو سکتا۔ میں نے کبھی زندگی میں کسی سے بھی قرض نہیں لیا۔ آج میرے سب خواب پورے ہو گئے۔ ان بچوں کو دیکھ کر ماں کی جو خوشی ہو گی ہے وہ آپ کو کیسے بتاؤں، مجھے اپنی سادہ زندگی پر کبھی شرمندگی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ فخر ہی رہا نہ معلوم کتنی خواتین نے میری زندگی سے سبق لیا ہوگا۔

میں نے گفتگو کو ذرا بدلتے ہوئے سوال کیا کہ اپنے بچوں کے لیے کون کیا کچھ نہیں کرتا۔ اگر آپ نے بھی یہ سب کیا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر آپ نے کچھ غریب، ذہین بچوں کے لیے بھی کیا ہوتا تو پھر یہ آپ کے کام سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ سوال کچھ ان کی رگ حمیت کو ابھارنے والا تھا۔ ذرا جوش میں آ کر کہنے لگیں۔

میں نے بچپن ہی میں اور پھر اسکول کی ٹیچر اور بڑے عہدوں تک پہنچنے تک ہر منزل میں نے بحیثیت عہدہ دار نہیں بلکہ خانگی طور پر دوسروں کے بچوں کی تعلیم کے لئے مقدور بھر کوشش کرتی رہی۔

محترمہ نے کوئی دس بارہ قصے ایک گھنٹے میں سنا ڈالے سب کہاں کچھ آپ بھی سن لیجئے کہنے لگیں۔

میں اورنگ آباد میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر تھی ایک دن ایک غریب لڑکا آیا کہنے لگا مجھے کہیں نوکر رکھوا دیجئے۔ پوچھا بیٹا کچھ پڑھا بھی ہے کہنے لگا میٹرک اسی سال کامیاب ہوا ہوں۔ کیا نمبر لایا ہے۔ ۹۸ فیصد تین مضامین میں پورے سو فیصد یہ حیرت میں پڑ گئیں۔ اس لڑکے کو سمجھایا کہ بیٹا تو ڈاکٹر بنے گا۔ غریب باپ نے وعدہ کیا کہ کسی طرح اس کے اخراجات برداشت کرے گا۔ وہ میڈیسن کے کورس کے دوسرے سال میں تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا، یہ اس وقت جالنہ میں تھیں انہیں خط ملا کہ آپ کے مشورے پر عمل کرتا تو اچھا ہوتا۔ میرے خاندان کو سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ میں ایم بی بی ایس کے دوسرے سال میں ہوں۔ اگر مجھے کم از کم ۲۵ روپے ماہانہ وظیفہ کسی طرح نہ ملے تو میں تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوں۔ محترمہ عائشہ بیگم نے فوراً ٹیلی گرام کے ذریعے ۲۵ روپے منی آرڈر بھیج دیا اور خط لکھ دیا کہ تعلیم ختم کرنے تک ۲۵ روپے ماہانہ تمہیں ملتے رہیں گے۔ یاد رہے کہ یہ روپے آج کے نہیں کوئی تیس پینتیس برس پہلے کے تھے اس لڑکے کو یہ رقم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کوئی تین برس تک ملتی رہی۔ ایک دفعہ وہ گھر آیا اور اپنی پہلی تنخواہ محترمہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ محترمہ نے کہا اس کی حقدار تو تمہاری والدہ ہیں اور رقم واپس کر دی، لیکن اس شریف ڈاکٹر نے تعلیم کے زمانے کے پورے روپے واپس کر دیئے تاکہ اس رقم کی امداد دوسرے لڑکوں کے لیے جاری رہ سکے۔ اس ڈاکٹر کی شادی اپنے خاندان کی خوب صورت لڑکی سے ہوئی۔ ان کے بچے کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں الحمد للہ [illegible]

سیول سروس ہیں۔ اگر حقیقت یہ عائشہ بیگم صاحبہ نے اس لڑکے کی تعلیم میں دلچسپی نہ لی ہوتی تو معلوم یہ ہیرا کہاں کوڑے کرکٹ میں گم ہوجاتا، کسی کو پتہ بھی نہ ہوتا۔

ضلع پربھنی میں ایک صاحب امریکہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرکے آئے اور کسی بڑی پوسٹ پر کام شروع کیا لیکن یہ تھے کٹر مذہبی آدمی۔ لڑکیوں کی تعلیم کے دشمن اور لڑکیوں کو پردہ کرانے کے سخت پابند۔ ان کی ایک بارہ سالہ لڑکی چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ رکشا کو پردہ لگا کر اسکول جاتی تھی ایک روز یہ لڑکی پردے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ باپ کی نظر پڑی۔ شام میں لڑکی اسکول سے واپس آئی۔ ابا جان غصے سے آپے سے باہر ہوگئے۔ لڑکی کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ لڑکی کا ایک دانت گر گیا اور اسکول سے نام خارج کروالیا۔ محترمہ کے بہت سمجھانے بجھانے پر اس لڑکی کو وہ دوبارہ اسکول بھیجنے پر آمادہ ہوگئے۔ اس حادثے کے ایک دو سال کے اندر ہی ان صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ۲۵ سالہ بیوہ اور پانچ بچے بے سہارا اس دنیا میں رہ گئے۔ عائشہ بیگم صاحبہ نے اس سارے خاندان کو گھر بلا کر رکھ لیا۔ یہ پردہ نشین بیوہ تھوڑی پڑھی لکھی تھیں۔ انہیں پڑھانا شروع کیا۔ انہوں نے میٹرک پاس کر لیا۔ اور ٹریننگ اسکول میں ٹیچر ہوگئیں۔ باپ کا مرنا کیا تھا سب کے لئے تعلیم کا دروازہ کھل گیا یہ خاتون میں کپڑے سیتیں اور اس پیسے سے گھر کا خرچ چلانے لگیں ان کے پانچوں بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ اور لڑکیاں بڑے خاندانوں میں بیاہی گئیں۔ ان کے چچا بھائی چھوٹی چھوٹی سی کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ ان سب کے بچوں کو اس نے تعلیم کا انتظام کیا اب ان میں پچاس سے زاید افراد آپ کو ڈاکٹر، انجینئر، ٹیچر، پی ایچ۔ ڈی، پرنسپل مل جائیں گے۔

میں نے کہا مولانا سلیمان ندوی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "اگر غریب خا

[illegible] کوئی غ

باقی ... رہے گا ..... اس پر محترمہ نے کہا!

دیکھیے صرف ایک ہی پشت میں تعلیم نے سارے خاندان میں انقلاب برپا کر دیا اور کہا میں نے کسی پردہ نشین خاتون کو ایسی ذہین ، دور اندیش ، دانش مند اور حوصلہ مند اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

ایک دن ایک لڑکی اپنے خاندان سے ناراض ہو کر محترمہ کے گھر آ گئی تاکہ وہ کالج میں شریک ہو سکے ۔ اس لڑکی کے بھائی کالج کی اعلیٰ تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ بڑی مشکل سے محترمہ نے انہیں سمجھایا۔ اس لڑکی کے ساتھ اور آٹھ لڑکیوں کو کالج میں شریک کروایا اس لڑکی نے ڈیرہ دون سے ایگریکلچر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ آج کل زرعی کالج میں ایک شعبہ کی ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ہے اور پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

اچھا آج کل آپ کی مصروفیت کیا ہے ۔ حیدر پورہ میں یعنی صاحب کے بنگلہ میں " امام بخش " میموریل اسکول " چلا رہی ہوں جس میں ۱۲۶ طلباء اور دس ٹیچرس کام کرتے ہیں ۔ اس عمارت کا ایک حصہ میرے داماد ڈاکٹر عبدالعلی نے اسکول کو دینے کے لیے دے دیا ہے ۔ اس محلے کے عام طور پر غریب خاندانوں کے لڑکے اور لڑکیاں پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ میں اسی اسکول میں بیٹھا ہوا تھا ایک خاتون اپنے دو بچوں کو لے کر آئیں اور اپنی افتاد سنانے لگیں ۔ یہ دونوں بچے رات میں سڑکوں پر گھومتے پھرتے رہتے ہیں باپ پینے کا عادی ہے ۔ کبھی کبھی گھر کی صورت دیکھ لیتا ہے ۔ میں ان بچوں کو آپ کے حوالے کرتی ہوں ۔ محترمہ نے کہا بیٹا تم بڑے ہو کر رکشا چلاؤ گے یا میری طرح موٹر کار میں اڑتے پھرو گے اس کے لیے تعلیم ضروری ہے ۔ بچوں نے کہا ہمیں رکشا نہیں چلانا ہے موٹر کار چلانا ہے ۔ بس انہیں اپنے اسکول میں جہاں پہلے ہی سے ۱۸ بچوں کے قیام و طعام کا مفت انتظام ہے ان دو بچوں کے رہنے ، کھانے پینے کتابیں کاپیاں سب مفت انتظام کر دیا ۔ یہ دونوں لڑکے کوئی دو ماہ سے پڑھ رہے ہیں ۔ ذہین ہیں ۔ خود محترمہ روزانہ ان کا

ہم ملک دیکھتی ہوں۔ چند برسوں بعد عجب نہیں کہ یہ سماج میں کسی ایسی حد تک پہنچ
میں نے کہا کسی ایک وقت مدد دے کر نجات حاصل کر لینا آسان ہے لیکن آ
ان بچوں کی ہی نہیں ان کے خاندان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لیتی ہیں۔ یہ تو مان کا بھ
کتنی یہ پریشانی اپنے سر لیتا ہے۔ کہنے لگیں۔ دیکھیے یہ میرا مشن ہے۔ اگر میں
یہ کروں تو میری زندگی کے دس سال کم ہو جائیں گے۔ میں نے مسلمان ہی نہیں تین ہندو
خاندانوں کی مدد کی ہے۔ ان کے نام لینا نہیں چاہتی۔ ان میں ایک ڈاکٹر ایک انجینئر
پرنسپل ہے۔

اب صرف آخری سوال رہ گیا۔ آخر یہ ماہانہ اخراجات کا خرچ آپ کیسے برداشت
کیسے کرتی ہیں جو میرے کام سے واقف ہیں وہ میری مدد کرتے ہیں۔ میں نے آج تک
کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ کبھی اخبار میں کوئی اپیل کی۔ میری پنشن کی ساری رقم غریب
بچوں کی تعلیم پر خرچ ہو جاتی ہے۔ میں نے آج تک اپنی پنشن کا ایک روپیہ بھی ا
پر خرچ نہیں کیا۔

اگر کسی ایک خاتون میں خدمت خلق کا ایسا جذبہ ہو تو وہ تعلیم کے ذریعے کئی ای
خاندانوں ہی نہیں بلکہ ان کی آنے والی نسلوں کو نامعلوم وقت کے دھارے تک اپنے اس احسا
سے ہموار رکھ سکتی ہیں۔ شاید اس کا اندازہ فرحت آرا بیگم کو بھی نہ ہوگا۔

میں نے کہا کوئی پیغام

چلیے آپ کی خاطر اقبال کا ایک شعر پڑھ دیتی ہوں۔

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

میں نے یہ شعر پڑھا۔

بہت ہی خوشی ہوئی حالی سے مل کر

جناب سید ہاشم علی اختر، علی گڑھ

مجتبیٰ حسین کے نام ایک خط

"اردو محض ایک رسم خط نہیں جیتی جاگتی زبان ہے"

سیاست کے آپ کے کالم کے ۳ر اور ۱۷ر دسمبر کے مضامین میں ' ذکر پھر اُردو کا اور آل بہاری واجپائی کے عنوانات پر آپ کی دلچسپ تحریر دیکھ کر آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

آج سے کوئی بیس پچیس سال پہلے لسانیات کے ایک بنگالی پروفیسر نے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جس کا آخری جملہ یہ تھا کہ " اردو غلط نام اور غلط رسم خط میں ہندوستان کی رابطہ زبان ہے۔"

اب اگر جامعہ عثمانیہ کے اردو میڈیم کے طالب علم مرکزی وزیر داخلہ ایس۔ بی۔ چوان صاحب آزادی کے تقریباً پچاس سال بعد ایمان داری سے اس کا اعلان کرتے ہیں تو آپ کو خوش اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو ناخوش ہونا چاہیے تھا۔ مگر بقول آپ کے بھاجپا کو سخت اعتراض ہے۔

اُردو کے معاملہ میں آپ کی قنوطیت PESSIMISM اس لیے جائز ہے کہ قنوطی ایک تجربہ کار رجائی یا OPTIMIST ہوتا ہے۔ لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی کا اس بیان پر اعتراض کرنا اُردو کے بارے میں کانگریس کے قول و فعل میں تضاد کا دوسرا رُخ ہے اس لیے کہ آپ کے دوسرے مضمون میں آپ نے جس خوشگوار تجربہ کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھاجپا کے

جو بہت بڑے لیڈر اردو کو محض دیوناگری رسم خط میں لکھے جانے پر ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان ہندی مانے پر تیار ہیں۔ اور اس طرح ان کو اردو سے نہیں بلکہ اس کے نام اور رسم خط سے مخالفت ہے ۔ اور اس طرح دستور کے آرٹیکل 371 کی روح کی تعمیل کر رہے ہیں جس کے لحاظ سے ہندوستان کی قومی زبان ہندی کے بارے میں صاف الفاظ میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ اس کا فارم FORM ہندوستانی کا ہوگا اور اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہوں گے ۔ کانگریسی حکومتوں نے جس زبان کو رائج کرنے کی کوشش کی تھی اس کے بارے میں جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے سابق چیف جسٹس آندھرا پردیش کی کتاب A NATION WITHOUTA NATIONAILANGUAGE میں یہ لکھا ہے کہ دستور کی تعمیل نہیں ہوئی بلکہ ہندوستان کی مروجہ عام رابطہ کی زبان کے بجائے یوپی کی علاقائی REGIONAL زبان کو مسلط کیا گیا۔ جو عام زبان نہ بن سکی اور اب اگر کانگریسی حکومت کے ذیر داخلہ کو ساری خفیہ رپورٹیں مل رہی ہیں۔ زبانی طور پر اس کا اقرار کریں۔ اور بھاجپا کے لیڈر عملی طور پر اس پر عمل کریں تو اردو والوں کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

ہندی مادری زبان والی ایک نوجوان شاعرہ کویتا کرن کی کتاب سرفت کے لیے جو پیش لفظ میں نے لکھا تھا اس میں اردو کے بارے میں میں نے یہ لکھا تھا۔

" چند سو سال پہلے جب ہندوستان میں دو بڑی تہذیبیں ایک جا ہو جائیں اور ایک فراخ دل اور وسیع آغوش ہندی نے اپنا دامن فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے الفاظ سے بھر لیا تو ایک بے تعصب فارسی نے جو سنسکرت پر مبنی ایک آریائی زبان ہے اور تقریباً سات سو سال تک ہندوستان کی سرکاری زبان رہی ہے۔ اپنے حروف تہجی میں چند حروف کا اضافہ کر کے ہندی کی آوازوں کو اپنے میں سمو لیا ۔ ہندی اور فارسی کے اس امتزاج کا نام اردو ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے الفاظ میں " اردو ہندی نژاد ہے اور قدیم ہندی اور پراکرت کی آخری اور مہذب سے شائستہ صورت زبان کی بنیاد ہندی پر ہے۔ ضمیر میں سب کی

ہندی ہیں۔ افعال سب ہندی ہیں۔ لیکن عربی فارسی الفاظ کے اضافے نے اس کی اصل حیثیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اردو اور ہندی میں ماسوا جزوی اختلاف کے کوئی فرق نہیں ہے۔"

(قواعد اردو ۱۹۱۴ء)

اس طرح ہندوؤں کی زبان اور مسلمانوں کے رسم خط کے ملاپ سے ایک گنگا جمنی تہذیب کی زبان بنتی گئی جس میں فارسی اور عربی کے الفاظ شامل ہیں جب فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے تو اردو کہلاتی ہے۔"

اس زبان میں ہندی کی ملاحت بھی ہے اور مغربی ایشیا کی صباحت بھی۔ اس میں صبح بنارس اور شام اودھ بھی ہے اور شام مصر اور شب شیراز بھی۔ اس میں گھنگھور گھٹائیں بھی ہیں اور ابر بہاراں بھی ہیں۔ اور چشم خمار آلودہ بھی۔ خم ابرو بھی ہے اور کاجلوں کی لکیر بھی۔ تن من بھی ہے اور دل و جان بھی۔ مدھوا بھرے ہونٹ بھی ہیں لب لعلیں بھی۔ اردو ہندی اور فارسی کے ایک طویل اختلاط کا نام ہے جس میں پریم بھی ہے اور عشق و محبت بھی۔ اس میں ہندی کی مٹھاس ہے اور فارسی کی شیرینی بھی۔

اردو محض ایک رسم خط کا نام نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی زبان کا نام ہے جس کے پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں لیکن الکٹرانک میڈیا کی وجہ سے اس کے سننے، بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ یہ اب آنکھوں کی نہیں کانوں کی زبان ہے:

ابن خلدون نے اپنی مشہور کتاب المقدمہ میں لکھا ہے کہ حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ زبانوں پر بھی بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی تاریخ میں فارسی بولنے والے حکمرانوں کے زمانے میں مقامی زبان کو ایک نیا رسم خط فارسی ملا۔ اس کا مزاج بدلا اور نام بھی۔ اسی طرح انگریزی، فرانسیسی، اور پرتگالی حکمرانوں کے زمانے میں فارسی جو سات سو سال تک سرکاری زبان رہی تھی بالکل ناپید ہو گئی اور اب اردو کے ایم۔ اے بھی فارسی سے ناواقف ہیں اور ہندوستان کے سارے علاقے میں انگریزی سرکاری زبان ہوتی اور ہندی کی فارسی آمیز شکل اردو کو جس کو رومنوں نے رابطہ کی زبان پایا تھا ۱۸۳۲ء میں شمالی ہند میں سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ اور اپنی سہولت کے لحاظ

ہ دمن رسم خط اختیار کر کے اسے رمن اردو ROMAN URDU کہا گیا۔ حکومت حیدرآباد نے
اس کے باون سال بعد ۱۸۸۴ء میں اُردو کو سرکاری زبان بنایا اور اس تبدیلی یا
TRANSITION کے دور میں ایک مثل ہوئی ٹریننگ کے زمانے میں آج سے پچاس سال پہلے
دیکھی تھی اس کا عنوان تھا" سر کردن ہندو ق اور لگنا بطبخ کو"
پانڈیچری اور گوا میں فرانسیسی اور پرتگالی زبانیں رائج رہیں۔ ان سیاسی تبدیلیوں
کا اثر شہروں کے نام پر بھی ہوتا ہے۔ ریاست حیدرآباد میں ایسے ہوگا کی کا نام مومن آباد ہوا
اور اب پھر ایسے ہوگاتی ہو گیا ہے اس طرح وارناسی، ممبائی، اور سینیٹ پیٹرس برگ، بنارس
بمبئی اور لینن گراڈ بنے اور اب پھر اصلی نام پر واپس آگئے ہیں"
ہندوستان میں اردو سے تعصب کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جس رابطہ کی زبان کو انگریزوں
نے رابطہ کی زبان کی حیثیت سے باقی رکھا تھا اس کو پاکستان نے اپنی قومی زبان بنالیا۔ ہندوستان
نے ہندی کو قومی زبان اس شرط سے بنایا کہ اس کا فارم ہندوستانی کا ہو یعنے ایسی ملی جلی زبان
کا جو تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں عام بول چال کی زبان تھی اور جس میں جواہر لال نہرو،
مرارجی دیسائی۔ اور موجودہ وزیر اعظم پی، وی نرسمہا راؤ تقریر کرتے ہیں لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں
دونوں کے تعصب نے ان کو حقائق سے اندھا کر دیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر غالب کا یہ شعر

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جس کے مجموعہ الفاظ میں سے صرف ایک فارسی لفظ ہے۔ محض فارسی رسم خط میں لکھے
جانے کی وجہ سے غیر ملکی اور ناپسندیدہ بن جائے اور اٹل بہاری واجپائی کی یہ شاعری

" اتنا کافی ہے
تم وستک پر
خود دروازہ کھولیں"

جس میں نو الفاظ میں سے چار عربی، فارسی کے ہیں۔ محض دیوناگری رسم خط میں لکھے جانے کی وجہ سے وطن پرستی کے امتحان میں کامیاب کرنے والی قومی زبان ہندی کہلاتے۔

اب اگر ہم سیاسی سطح سے ہٹ کر علمی سطح پر آئیں تو ان دو مثالوں سے یہ اندازہ ہوگا کہ علمی سطح پر آئے تو ان دو مثالوں سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ علمی سطح پر بھی اُردو یعنی "وسیع طور پر ہندی" کو ہندی ہی سمجھا جا رہا ہے۔ ہندی کے مزاح نگاروں پر پی ایچ۔ ڈی کے ایک مقالہ میں مجتبیٰ حسین پر ایک Chapter لکھا جانا اور نظیر اکبرآبادی کے فن پر ہندی پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو کو جو ہندوستان کی قومی اور رابطہ کی زبان ہے اسے اس مقام سے ہٹانے میں خود اُردو والوں کی وہ ضد حائل ہے، جو تاریخ کے جبر کو سمجھے بغیر ایک نامقبول رسم خط کی مخالفت کرتی رہتی ہے۔

اس کا ثبوت مجتبیٰ حسین کے دوسرے مضمون میں ملتا ہے۔ وہ حیاتی صاحب نے یہ تو کہا کہ وہ آریہ سماجی ہیں لیکن یہ نہیں کہا کہ اس زمانے میں سارا آریہ سماجی لٹریچر فارسی رسم خط میں تھا اور اب وہی زبان دیوناگری رسم خط میں ملتی ہے۔

اسی طرح مرلی منوہر جوشی کا آپ سے کہنا کہ "میں ہندی میں آپ کی تحریریں پڑھتا ہوں۔ جو زبان آپ لکھتے ہیں اس کا صرف رسم خط تبدیل کرنے کی ضرورت ہے" اس بات کا ثبوت ہے کہ اعتراض زبان کی ساخت پر نہیں اس کے رسم خط پر ہے۔ لیکن جوشی صاحب کی تقریر انہوں نے فارسی رسم خط میں لکھی تھی جس سے ظاہر ہے کہ آزادی سے پہلے پیدا ہونے والے تمام لوگ جن میں جواہر لال نہرو، راجندر پرشاد (جو فارسی کے ایم۔ اے۔ تھے) اور موجودہ وزیر اعظم جنہوں نے جامعہ کے اُردو دور میں کالج میں شرکت کی تھی ہندوستان کی رابطہ کی زبان کو فارسی رسم خط میں سیکھتے تھے۔ لیکن سوائے وجیا لکشمی پنڈت کے جنہوں نے اپنی سوانح عمری میں اُردو کو اپنی مادری زبان بتایا ہے، دوسرے تمام لیڈر سیاسی وجوہات کی بنا پر اس راز کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔

لیکن اکیسویں صدی کی اردو میں اخبار کی سرخی "آب نوشیدنی کی ہوش ربا گرانی" نہیں باقی رہ سکے گی اور اسے اپنی roots کی طرف جانا ہوگا اور "پینے کے پانی کی ہوش اڑانے والی مہنگائی" کہنا پڑے گا۔ میرا یہ ریمارک صرف ہندوستان میں پنپنے والی اردو سے متعلق ہے۔

دوسرے مضمون کے آخر میں آپ کا یہ جملہ کہ "ہم نے سوچا تھا کہ مرلی منوہر جوشی اردو کی محفل میں آئے ہیں تو اس مظلوم زبان کے بارے میں بھی کچھ کہیں گے لیکن اس معاملے میں وہ خاموش رہے" اردو والوں کی قنوطیت کا ترجمان ہے۔ آپ نے اٹل بہاری واجپائی کو اردو میں شاعری کرتے سنا۔ مرلی منوہر جوشی کی فارسی رسم خط میں لکھی ہوئی تقریر دیکھی جنھوں نے آپ کی ٹھیٹھ اردو کو ہندی یعنی ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان کا درجہ دیا اور آپ اس عملی ثبوت کے باوجود مایوس ہو گئے۔ مجھے تو اس واقعے سے اردو کے لیے ایک روشنی opportunity نظر آتی ہے جس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جہاں اردو والے ہندوستان کے بارے میں بے جا قنوطیت سے کام لیتے ہیں وہیں یورپ و امریکہ میں اردو کے پھیلنے کے بارے میں بے جا رجائیت کا اظہار کرتے ہیں۔ چالیس، پچاس یا اس سے بڑی عمر کے لوگوں کا مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شریک ہو جانا اردو کے پھیلنے کا ثبوت نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت ہے کہ شمع ابھی جل رہی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ مغربی ممالک میں اردو اب خاندانوں ہی میں ماں باپ اور بچوں کے درمیان رابطے کی زبان باقی نہیں رہی ہے۔

رسم اجرائی

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی ادبی خدمات

مصنفہ: ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ

گلوریس دکن ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ۸ر جنوری ۱۹۹۶ء کو اردو گھر مغل پورہ میں جلسہ رسم اجرائی "ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی ادبی خدمات" مصنفہ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ منعقد ہوا جلسہ کی صدارت عظیم لیڈر، محقق و نقاد اور دانشور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض جلسہ کے کنوینر ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے انجام دیئے۔ کتاب کی رسم اجرائی بارونمائی ڈاکٹر مغنی تبسم نے فرمائی جلسہ کو پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صدر شعبہ اردو تروپتی یونیورسٹی، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صدر شعبہ اردو انوارالعلوم کالج جناب منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ، ڈاکٹر بیگ احساس، پروفیسر ڈاکٹر مغنی تبسم، پروفیسر ڈاکٹر اشرف رفیع نے مخاطب کیا۔ مصنفہ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے بھی اپنے کام کے سلسلہ میں چند جملے کہے مظفر پروین نے تہنیتی نظم پڑھی مصنفہ کی گل پوشی اور صدارتی تقریر کے بعد جناب ڈگیر راؤ صاحب پرنسپل دکن گلوریس اسکول کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔

جلسہ کا آغاز ناظم جلسہ ڈاکٹر عقیل ہاشمی صاحب کی جامع تقریر سے ہوا جس میں

ڈاکٹر صاحب نے مصنف کا اور ان کے مقالہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی ادبی خدمات کا خوبصورت انداز میں تعارف کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کو اپنے تاثرات بیان کرنے کی زحمت دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی ہمہ جہت شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ان کے استاد تھے اور وہ ان کے اساتذہ میں سے ایک تھے جن کو وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتے جنہوں نے ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں اہم حصہ لیا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں بڑے نقاد، محقق، ادیب، شاعر، ماہر لسانیات اور اعلیٰ پائے کے اڈیٹر تھے۔ انہوں نے کیا تنقیدی ذہن اور نیا انداز فکر دیا۔ وہ دکنی کے پہلے محقق ہیں جنہوں نے دکنی کی تحقیق میں تنقید کی گنجائش پیدا کی اور نئے موضوع کا اضافہ کیا۔ انہوں نے تنقید کی نئی بنیادیں نئے زاویے نئی سوجھ بوجھ نیا ذہن اور نیا ذہن دیا۔ انہوں نے معروضی نقطہ نظر کی اہمیت کو سمجھایا۔ وہ تنقید کے میدان میں کافی بے مروت تھے ان کا پٹھان ذہن کھرے کھوٹے کی شناخت میں کسی مروت کو نقصان وہ بلکہ حقیقت کی تلاش سے منحرف کردینے کے مترادف سمجھتا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر ریحانہ کے کام کی تعریف کی کہ ایسی پھیلی ہوئی شخصیت پر کام کرنا آسان کام نہیں تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر ریحانہ کی کوشش کو سراہا اور اس مقالہ کو ایک قیمتی مقالہ قرار دیا۔ اس کے ساتھ ان کی گائیڈ ڈاکٹر اشرف رفیع کو بھی مبارک باد دی کہ ان کی نگرانی میں ایک شاگرد نے اتنا اچھا مقالہ لکھا۔ انہوں نے آخر میں کہا کہ اچھا کام خود اپنی شناخت کروالیتا ہے۔ اور مقالہ انہی اچھے کاموں میں سے ایک اچھا کام ہے جس کو ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے انجام دیا۔

اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اکثر مقررین ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے شاگرد تھے۔ ہر ایک نے ڈاکٹر صاحب کے ادبی کارناموں پر کھل کر روشنی ڈالی۔ جس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوئے تھے اس وقت ملک عظیم مرزا، پروفیسر زور،

پروفیسر عبدالمجید صدیقی نصیر الدین ہاشمی وغیرہ تحقیق کے میدان میں تھے۔ مسعودی صاحب کے کشمیر چلنے کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں جامعہ میں آئے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی شخصیت کے دوسرے پہلو بیان کئے انہوں نے بتایا کہ وہ سائنس کے طالب علم تھے لیکن اردو سے گہری دلچسپی کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے انہیں اردو میں ایم اے کرنے کے لیے ایسے متاثر کن دور اندیش انداز سے ترغیب دی کہ انہوں نے سائنس کا میدان چھوڑ ہی دیا۔ انہوں نے یہ بات بھی بتائی کہ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ سبق کی تیاری کرکے کلاس آتے تھے اگر کسی وجہ سے درس تیار کر نہیں پاتے تو اس دن کلاس ہی میں نہیں آتے تھے یہ اسکالر اور محقق و نقاد کا تدریسی رویہ تھا جو بے تکان بولتا اور ہر موضوع پر بے تکان لکھتا تھا۔ وہ بڑی قدآور شخصیت کے مالک تھے مختلف زبانوں کے ماہرین ان سے استفادہ کرتے تھے وہ اردو کے فروغ کی ہر تحریک میں دل و جان سے حصہ لیتے۔ اداروں کی مدد کرتے تھے۔ وہ اردو کو کلچر کی زبان سمجھتے تھے۔ انہوں نے تنقید کو تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کا نیا شعور دیا۔ اور تاریخ ہی کے تناظر میں اردو کے مسائل سمجھنے کا راستہ ہموار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان سے مقالہ لسانی کی روشنی میں لکھوایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اور بھی بتایا کہ مسعود حسین خاں اچھے صحافی بھی تھے انہوں نے "ہماری زبان" کے کئی اداریے لکھے وہ ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔

ریحانہ سلطانہ کے مقالہ کے تعلق سے انہوں نے کہا کہ مقالہ نگار نے موضوع سے پورا انصاف کیا ہے۔ ہر بات سلیقہ سے معنوی پیرایہ میں بیان کی ہے۔ وہ ہر منزل سے اس مہارت سے گذر سکیں کہ ان کا تنقیدی رویہ محتسبانہ رہا ہے۔ ریحانہ کی یہ تصنیف پڑھنے اور سمجھنے کی دعوت دیتی ہے اور محقق کی کٹھن راہوں سے گذرنے کی ترغیب بھی کرتی ہے

ڈاکٹر بیگ احساس نے کتاب پر تفصیل سے تبصرہ کیا ان کا یہ تبصرہ ابواب وار تھا مقالہ ات ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر باب پر سیر حاصل روشنی ڈالی اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بتایا کہ سہل انگار مقالہ نگار سطحی باتیں لکھ کر جیسے انٹرویو سوال نامہ سے حاصل شدہ

مواد کو اکٹھا کر کے کسی کی شخصیت اور فن پر مقالہ لکھ لیا کرتے ہیں جس کی وجہ سے تنقید کا خصوصاً اسلوبیاتی تنقید کا معیار پست ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی تنقید پر ایسے ہی تنقید کرنے لگے جن کے پاس سرے سے تنقیدی شعور ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے [illegible] مسعود حسین خاں کی ہمہ گیر شخصیت ایک مقام پر پہنچ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ریحانہ نے اس کام کرنے کے لیے بڑی ہمت سے اہم عنوان چنا۔ ڈاکٹر اشرف رفیع نے کہا انہوں سے سخت کام بلکہ انہیں تار پر چلوایا ان کے اس عزم و ارادہ کی پکی شاگرد نے بھی اس راستہ کو طے کر کے ہمت ہو تو تار پر سے گذرا جا سکتا ہے۔ تحقیق حقیقت کی بازیافت ہوتی ہے سچ بولنے سچ پسند کرتے اور سچ برداشت کرنے کے مراحل سے محقق کو گذرنا پڑتا اور یہ سخت مرحلے ہوتے ہیں۔ تحقیق اور تنقید کی منزلوں سے گذرنے کے لیے [illegible] محقق علوم مروجہ جیسے فلسفہ سماجیات تاریخ وغیرہ سے بہرہ ور ہو۔ ڈاکٹر ریحانہ نے ان مرحلے اور ان پر کامیابی حاصل کی۔ جناب منوہر راج سکسینہ صاحب نے ڈاکٹر ریحانہ [illegible] بہت سراہا ہے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم نے کتاب کی رسم رونمائی انجام دی اور اپنے خیالات کے اظہار سے نوازا انہوں نے فرمایا کہ جب ریحانہ سلطانہ نے کتاب پر پیش لفظ لکھنے کی خواہش کی تو انہوں نے پہلے تو یہ سمجھا کہ یہ بس یونہی معمولی کام رہا ہو گا۔ اسے طریقہ کار کے بارے کہا کہ وہ جب تک کوئی کتاب پڑھ نہیں لیتے اس وقت تک نہیں لکھتے۔ اسی ذیل نے کہا کہ وہ مسعود صاحب کے پہلے شاگرد ہیں جنہوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ ان کی نگرا لکھا اس سلسلہ میں پیش آنے والی دقتوں کا اظہار بھی کیا۔ لسانیات کے شعبہ کا قیام مسعود صاحب ہی کے زمانہ میں ہوا۔ مغنی تبسم نے یہ بھی وضاحت کی اس شعبہ کے قیام ایم اے کے امتحان سے لسانیات کا پرچہ نکال دیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ مسعود صاحب اصول میں بڑے سخت تھے۔ اس زمانہ میں پی ایچ ڈی کے مقالہ کو دو سال میں مکمل کر

ورکنگ پر تبادلہ کی وجہ سے یہ کام اندرون مدت ختم نہیں ہو پا رہا تھا انھوں نے خواہش کی کہ ڈاکٹر صاحب ایک سال کی توسیع کی سفارش کر دیں تو مسعود صاحب نے صاف انکار کر دیا جسکی وجہ سے اس بلا یافت رخصت لے کر مقالہ کو مکمل کرنا پڑا۔ معنی تبسم صاحب نے مسعود صاحب کے کام لینے کے طریقہ کار پر بھی روشنی ڈالی۔

آخر میں ڈاکٹر اشرف رفیع کو مبارک باد دی کہ انھوں نے اپنے شاگرد سے ایسا کام لیا کہ اپنا اچھا مقالہ وہ لکھ سکیں ریحانہ سلطانہ کو بھی مبارک باد دی کہ انھوں نے محنت سے کام کیا۔

ڈاکٹر اشرف رفیع نے بتایا کہ جب ریحانہ سلطانہ نے ۱۹۸۹ء میں رجسٹریشن کروایا تو پہلے تو وہ اتنی دبلی پتلی طالبہ کو دیکھکر سمجھ نہیں پائیں کہ وہ ایسی ہمہ جہت شخصیت پر کام کر سکیں گی بھی یا نہیں۔ انہوں نے مسعود صاحب کو ان پر کام کرنے کی اجازت کے لئے خط لکھا تو انھوں نے جواب دیا کہ پہلے بھی ان پر کام کرنے کے لیے لوگ آگے بڑھے۔ لیکن ناکام رہے۔ بہرحال اجازت ملی۔ کام شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے بتایا کہ ریحانہ کتنی محنتی ہیں کہ انھوں نے سخت ترین مرحلوں اور نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے اپنے کام کو جاری رکھا کئی کئی بار مسودے لکھے۔ لیکن کبھی ابرو پر بل نہیں آیا۔ ان کی تعلیمی اور تدریسی مصروفیت کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ ان کے تدریسی انہماک نے بچوں کیلئے شروع کئے گئے دکن گلوریس دکن اسکول میں جو ۱۹۷۶ء میں قائم ہوا۔ آج (۱۵۰۰) بچے زیر تعلیم ہیں اپنی تدریسی مصروفیت کو برقرار رکھتے ہوئے تعلیمی مراحل کو طے کرتا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ بڑی خوشی محسوس کرتی ہیں کہ ان کے استاد مسعود صاحب پر ان کی پہلی بیٹی بدن والی شاگرد نے محنت و جانفشانی سے کام کیا اور عمدہ مقالہ پیش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مسعود صاحب یہاں سے جارہے تھے تو ان کی نگرانی میں کام کرنے والے طلبا کو دوسروں کے سپرد کیا۔ اور انہیں اپنے پاس رکھا۔ ا۔ عام ۔ کا کر ۔۔ ، ، ، لم ۔ ۔ ۔ ۔

انہیں بھیج دیں وہ پندرہ دن میں واپس کر دیا کریں گے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا مقالہ قلم بنا پر تھا۔ اس مقالہ کے تنقیدی حصہ کو مسعود صاحب نے بھیجنے کی ہدایت دی تھی۔ ڈاکٹر وہ پندرہ دن میں مسودہ بھیج دیا کرتے تھے وعدہ کے پابند تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ آخری ریسرچ اسکالر ہیں جسکو یو جی سی اسکالرشپ ڈاکٹر صاحب نے ریسرچ کے خیال میں یہ بات خاص طور پر بتائی کہ کام لینے کا ایک ڈھنگ ہے۔ اصلاح کا مرحلہ اور بھی سخت ہوتا ہے اس لئے کہ اسکالر کے ذہن کو سامنے رکھ اصلاح کرنا اور مقالہ کے معیار کو اونچا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سارا کام سے لیا کرتے تھے۔ طالب علم ہی کو فاکر بنایا پڑتا تھا۔ مواد بھی اسی کو اکٹھا کرنا ہوتا لیکن آج کل یہ مرحلے نگراں کو کرنے پڑتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ پیش رو مقرر مقالہ نگار کے ساتھ ان کی بھی تعریف کی ہے۔ ایسی ان کی تعریف کی اس لئے گئی ہے کہ انہوں نے اپنا فرض ادا کیا اور اپنے پیشہ سے انصاف کیا ہے اور اپنی ذمہ داری پورا کیا ہے۔ آخر میں اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی شاگرد کو مبارک باد دی۔

صدر محترم نے اپنی صدارتی تقریر کا آغاز ریحانہ سلطانہ اور ڈاکٹر اشرف کو مبارک دینے سے کیا۔ اور فرمایا کہ انہوں نے پی ایچ ڈی کے کئی مقالے پڑھے لیکن اس مقالہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ پی ایچ ڈی کا مقالہ کیا ہوتا ہے۔ یہ مقالہ بے شک نئے محقق بہترین نمونہ ہے۔ یہ مقالہ مسعود صاحب پر تو ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ تحقیق اور بہترین امتزاج بھی ہے۔ اسی ذیل میں یہ بھی بتایا کہ کسی کتاب پر پڑھے بغیر تبصرہ ہوتا ہے لیکن پڑھ کر تبصرہ کرنا اور مشکل ہوتا ہے' صدر جلسہ نے اس طرف بھی اشارہ کیا تحلیقات کو ہندی والے اچک لینے کی فو میں رہتے ہیں حد یہ ہے کہ معراج العاشقین جیسا عربی ترکیب والی تخلیق کو بھی ہندی تخلیق کہنے سے نہیں چوکتے ہندی والوں کی یہ دلیری بھی کافی دلچسپ ہے۔

صدر صاحب ڈاکٹر اشرف رفیع کی تقریر کے حصہ کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا۔ ڈاکٹر اشرف رفیع نے کہا تھا کہ پرانے شہر کے دو محلے یاقوت پورہ اور دبیر پورہ پچھڑے ہوئے موجود ہیں وہ یاقوت پورہ کی ہیں اور ان کی شاگرد دبیر پورہ کی اور ان محلوں میں ایسے ذہن بھی ہیں جو ایسا ہی تخلیقی کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صدر صاحب نے فرمایا کہ یہ بات کتنی اچھی ہے کہ یاقوت پورہ کی ہمشائی میں دبیر پورہ نے کام کیا اور مغل پورہ کی صدارت میں وکنی رسم اجرائی انجام پائی۔ آخر میں انہوں نے فرمایا کہ مسعود صاحب کی خاکہ نگاری کا باب تشنہ ہے اس پر بہت لکھا جا سکتا تھا صرف ایک "نانی ماں" کے کردار پر اکتفا کی گئی ہے اس بات کو پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تقریر کو "مکرر" اشرف رفیع اور ڈاکٹر ریحانہ استادہ ہما کو پھر ایک بار مبارکباد دیتے ہوئے ختم کیا اور ساتھ میں کتاب کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

جناب ڈگمبر راؤ صاحب پرنسپل دکن گلوریس اسکول نے فرداً فرداً معزز مہمانوں کے اسمائے گرامی لے لے کر شکریہ ادا کیا اور آخر میں تمام سامعین کا بھی شکریہ ادا کیا اس پر جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔ اردو گھر دانشمند خواتین و حضرات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

سلسلہ صفحہ ۱۵ کا

کے ہر ذی شعور فرد کو غور کر کے اس کتاب میں دیئے گئے مشوروں پر عمل پیرا ہو نا ضروری ہے کیونکہ قوم کی فلاح تو [illegible] ضروری ہے کہ تعلیمی میدان میں سبقت حاصل کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ملت کے لیے روشنی کا ایک مینار ثابت ہوگی اور ملک کے مل وعرض میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ



حقیقی محبت کا پرستار

کاشف کا محبوب مشغلہ مطالعہ تھا وہ ہر قسم کے ڈائجسٹ اور رسالوں کا مطالعہ کرتا افسانہ اس کی پسندیدہ صنف تھی وہ افسانہ پڑھتے ہوئے گم ہو جاتا تھا ۔ جنوری کا پہلا ہفتہ تھا۔ سردی اچھی تھی دروازے بند کرتے ہی ہیڈلیمپ کی روشنی میں میگزین پڑھنا شروع کیا۔ وہ جیسے ہی فہرست پر نظر ڈالا اسکو ایک نیا افسانہ نگار ملا۔ کاشف کی جستجو اور بھی بڑھی اور وہ افسانہ پڑھنے لگا۔ یہ افسانہ نگار م۔ش تھا۔

کاشف کو افسانہ نگار کا نام اچھوتا لگا لیکن جب یہ افسانہ پڑھنے لگا تو اسکو بہت اگر لگا اور وسعت خیال ملا۔ پہلے ہی افسانہ میں اس نامعلوم افسانہ نگار کے تخیل اور اس کی ذات سے محبت ہو گی اور اب وہی رسالہ خریدتا جس میں م۔ش کا افسانہ ہوتا ۔ایک دن ایسے ہی افسانہ پڑھتے ہوئے کاشف کو افسانہ نگار کے بارے میں باربار احساس ہونے لگا اور وہ اس ادیب کا پتہ لگانے کے لیے بے چین ہوا۔ آخر کار ہمت کر کے کاشف نے رسالہ کے مدیر کو خط لکھا۔

جناب ایڈیٹر صاحب
میں آپکے رسالہ کا قاری ہوں مجھے م ۔ش ، افسانہ نگار کا پتہ چاہیے۔
مہربانی کرکے آپ مراسلتی پتے روانہ کریں جس کے لیے جوابی لفافہ ارسال خدمت ہے

خط لکھنے کے بعد پھر افسانہ پن کھو گیا گرما کی شام تھی صحن میں بیٹھا اطراف کی درختوں کی ٹھنڈی ہوا مٹی کی سوندھی خوشبو ڈھلتا سورج بڑا ہی حسین منظر تھا ایسے میں یہ افسانہ تھا " پیار کی کوئی قید نہیں " کاشف دل ہی دل میں افسانے کے تقسیم میں کھو گیا اور احساسات کے قریب ہوتا گیا۔

ایک ہفتہ گذرا مدیر رسالہ (حامد راہی) نے کاشف کو جواب لکھا کہ جناب میں آپ کو پتہ ابھی نہیں دے سکتا۔ میرا اخلاقی فرض پورا کروں کہ میں جب تک صاحب موصوف سے اجازت نہ لوں آپ کو پتہ نہیں دے سکتا۔

پھر ایک ہفتہ گذرا کاشف کو ایک خط ملا۔ کاشف کو خط دیکھکر مسرت کی انتہا نہیں رہی کیونکہ انجانے میں یہ جس ذات سے محبت کرنے لگا تھا وہ ہم جنس نہیں بلکہ صنف نازک تھی۔

اب کیا تھا کاشف فوری اس پتہ پر مراسلہ بھیجا۔

کاشف کو جواب بھی ملا۔ پہلا خط تھا بات صرف فن پر ہوئی تحسین و آفرین بھی تھی۔
پھر مراسلت کا سلسلہ بڑھا گیا۔ اب کاشف اپنی نجی کیفیت بھی لکھتا اور اس خاتون سے بھی ذاتی حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ م ش کا پورا نام ممتاز شاہین تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے ذاتی حالات بتانے سے گریز کیا بلکہ کاشف کھلکر حقیقت بتا دیا۔
کاشف B.S.C کی تکمیل کے بعد ملازمت کے سرگرداں تھا اور ایک خانگی کمپنی میں بحیثیت TYPIST کام کر رہا تھا۔ وہ (م ش) کو لکھتا۔

مس م ش میرے لیے دُعا کرو۔ میں جیسے ابھی نوکری پر لگ جاؤں تم سے ملاقات کرونگا۔ اور میرے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرونگا۔

م ش جواب میں لکھتی مسٹر خواب صرف دیکھنے میں ہی سہانے لگتے ہیں۔ اس کو عملی روپ وہ بھی تو بہت مشکل ہوگی۔ جو خواب دیکھتے ہیں وہ ہمیشہ اُجالے سے بھاگتے ہیں۔

نہیں صبح کی پُر ہنگام زندگی میں جینے کا سلیقہ نہیں آتا۔ خیالی دنیا میں محل کی تعمیر کرنے کی بجائے حقیقت کی کٹیا کا خاکہ بناؤ۔
مجھے تو متحرک زندگی پسند ہے۔

کاشف جواب میں لکھتا ہے۔ میں بھی ہمیشہ حقیقت کی تعمیر میں ہی کوشاں رہتا ہوں میں اپنا مستقبل بنانا چاہتا ہوں اس میں تمہاری ہمت افزائی ہونی چاہیئے۔ میں تمہاری تحریریں پڑھ کر تمہیں اپنا ideal مان سکا ہوں میں نے تمہیں عورت کے روپ میں بعد میں پایا لیکن تمہاری ذات اور سوچ سے عرصہ سے وابستہ ہو گیا ہوں۔ میں تمہاری تحریروں میں میرا عکس دیکھتا ہوں اس وجہ سے تمہاری رہبری کا خواہاں ہوں۔

م ۔ ش جواب میں لکھتی ہے۔ تم بنا دیکھے اور سمجھے ہی صرف میری تحریروں سے مجھے چاہنے لگے ہو چاہت کوئی بڑی بات نہیں کسی کی چاہت پر کسی کا زور نہیں یا کنٹرول نہیں۔ لیکن ہر چاہت کا دوسرا روپ نفرت بھی ہوتا ہے۔ کیا تم چاہت کو چاہت ہی رکھو گے حقیقت کے معلوم ہونے پر بھی اور اگر تمہاری چاہت حقیقت ہو تو تم کو چاہیئے ابھی انتظار کرو۔ کیونکہ چاہنے والی شئے اگر آسانی سے مل جائے تو اسکی قیمت کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

کاشف ۔ م ۔ ش ۔ تم مجھ سے تعبیر ملے کوئی بھی رائے کیسے قائم کر سکتی ہو انسان کا اکثر اسکی ملاقات اور باہمی تعلقات ہوتے ہیں۔ جب تم مجھ سے ملو گی تو ہی کوئی رائے کر سکتی ہو۔

م ۔ ش ۔ کاشف میں ایک افسانہ نگار ہوں مجھے لوگوں کے ذہنوں کو ان کی تحریر پڑھنا آتا ہے۔ تمہارے خطوط سے تمہارا مکمل مطالعہ کر چکی ہوں ہاں تم کو میرے بارے میں معلوم پھر بھی تم مجھ سے اسطرح محبت کر رہے ہو۔ ہر خوبصورتی کے پیچھے بدصورتی ہوتی ہے

کاشف۔ خوبصورتی قدرت کے عطیات میں شامل ہے۔ خوبصورتی کا زاویہ ہر کسی کے لیے الگ ہے۔ میرا زاویہ فکر کچھ اور ہے۔

مہوش کہتی ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی رنگ میں خوبصورتی کا پجاری ہوتا ہے، وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔

کاشف۔ میڈم میں نے کہا نہ کہ میں ترنگ نگاہ رکھتا ہوں تو بدصورتی میں خوبی کی تلاش کرتا ہوں۔ جہاں تک میرے تخیل کا سوال ہے۔ مجھے قدرت کی ہر تخلیق میں ایک مخصوص کیفیت نظر آتی ہے۔

کاشف یہ خط لکھ رہا تھا کہ postman نے بیل بجائی دروازہ پر جاکر دیکھا وہ ایک ٹیلیگرام لایا تھا جس میں کاشف کو انٹرویو کے لیے اطلاع دی گئی تھی۔ انٹرویو مظفرپور میں تھا جہاں سے ۱۰ کلومیٹر کے فاصلے پر مہوش رہا کرتی تھی۔

کاشف خط کو اور طویل کیا اور خوشی کی انتہا نہیں رہی لکھا کہ ۲۵ / جنوری کو میرا انٹرویو ہے میں ۲۴ / جنوری کو مظفرپور آرہا ہوں شام ۶ بجے میں اسٹیشن پر آونگا

خط کے ملتے ہی مہوش نے جواب دیا۔ لکھا

کاشف تم بے شک آسکتے ہو۔ میں تمہیں اسٹیشن پر ہی ملونگی

مگر یاد رکھنا تم نے ابھی تک خطوط کے ذریعے چاہت کے جو قصیدے پڑھے ہیں اسکو یاد رکھنا۔ اور دیکھو کرمت نہ پھیر لینا

ہاں۔ میں تو تمہیں اصل بات بتانا بھول گئی

تم مجھے کیسے پہچانو گے!

ایک کام کرتی ہوں بھورے رنگ کی شال اوڑھے رہونگی اور سر پر پیلا گلاب لگا ہوگا۔ میں مظفرپور اسٹیشن پر تمہارا انتظار کرونگی۔ یاد رہے بھورے رنگ کی شال اور پیلا گلاب!

کاشف کو خط ملا۔ بس اس کی بےچینی کی انتہا نہیں ۵ دن باقی تھے ہر روز صبح کو دیکھتا ایک ایک دن اسکو ایک ماہ لگ رہا تھا۔ آخرکار جانے کا دن آیا ۹ بجے ٹرین تھی صبح ۵ بجے سے ہوشیار ایک ایک منٹ انتظار کرتا رہا - ایک گھنٹہ قبل اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ٹرین تو اپنے وقت پر آئیگی۔

آخرکار ٹرین آئی۔ ٹرین میں سوار ہوا۔ ہر اسٹیشن پر اپنے سوٹ بوٹ کو دیکھ گھڑی دیکھتا۔ کچھ دل دھڑکتا پھر مطمئن ہوتا۔ ہوتے ہوتے ۷ بجے۔ لیکن ٹرین آدھ گھنٹہ لیٹ تھی ۱۰ بجے منظور پور اسٹیشن آیا۔ کاشف ہاتھ میں بیاگ اور ایک فائل نیلے سوٹ میں اسٹیشن پر اترا۔ ہاتھ میں فائل تھی۔ سوٹ کیس بھی ہم۔ اس کے افسانوں پر اکس بنڈل تھے۔ دل کو تھام کر ادھر اُدھر نظریں دوڑانیں لگا۔ کچھ فاصلے پر ایک ۵۵ برس خاتون بھورے رنگ کی شال اوڑھے اور گلاب لگائے ٹہل رہی تھی۔ کاشف وہیں پھر آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے اس خاتون کے قریب پہونچا۔ ہوش گم ہی تھا۔ قدم اسلیے نہیں ڈگمگا رہے تھے کہ وہ معمر خاتون تھیں بلکہ جل رہا جس کو چاہا تھا اُس سے ملنے کی گھڑی قریب آرہی تھی۔ بڑھا۔ آواز کچھ رکتے شکل۔ پھر پوچھا۔ میڈم۔ میڈم کیا آپ مس۔ ممتاز شاہین افسانہ نگار ہو چلئے ہم وہاں بیٹھتے ہیں۔

خاتون نے یہ یہاں کیا کہتے ہو میں کوئی افسانہ وفسانہ نہیں لکھتی اور نہ کوئی شا

کاشف۔ میڈم اب مذاق چھوڑیے پہلے ہی ٹرین آدھ گھنٹہ لیٹ ہوئی اور اب کچھ چلئے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

خاتون۔ میاں مجھے جانا ہے ابھی میری ٹرین آتی ہوگی۔

کاشف۔ آپنے یہ پھول اور شال میں مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا اور کیا آپ کے جھوٹے وعدے ہی تھے۔

خاتون۔ میاں یہ پھول اور شال ۔ وہ سامنے والی لڑکی نے مجھے یہ شال اوڑھ کر پھول لگائے کھڑے رہنے کو کہا تھا۔

یہ بی بی ادھر آؤ ذرا کیا مذاق ہے۔

کاشف آگے پول کی طرف نظر دوڑاتا ہے ایک ۲۵ ، ۲۶ سال کی لگ بھگ اوسط قد میں سانولی رنگت کی جاذب نظر محترمہ نظر آئی۔ وہ گھبراتے گھبراتے آگے بڑھا۔ اس محترمہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔

ہالو۔ آپ ہیں مسٹر کاشف۔ مجھے آپ سے مل کر حقیقت میں بڑی خوشی ہوئی۔

کاشف۔ مہوش کے سنجیدہ معصوم چہرے کو تکتا رہ گیا۔ اور کہنے لگا۔ آپ اتنی حسین خواب اچھے نہیں ہوتے۔ میں تو اپنے خواب کی تعبیر دیکھ رہا ہوں۔

مہوش۔ کاشف میں بھی آج حقیقی محبت کا پرستار دیکھ رہی ہوں۔

پروفیسر رؤف خیر

کُل ہند مشاعرہ بھیونڈی

روزنامہ انقلاب بمبئی کے سب ایڈیٹر ندیم صدیقی کی طرف سے دعوت نامہ ملا کہ کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی بھیونڈی کے زیر اہتمام منعقد ہونے کُل ہند مشاعرے میں مجھے جنوبی ہند کی نمائندگی کرنی ہے حسب معمول میں نے خط اور ٹیلی گرام کے ذریعہ اپنی رضامندی ظاہر کی۔

بھیونڈی کا نام ایک زمانے سے سنتا آرہا تھا مجھے تو یہ علاقہ پاکستان کے لالوکھیت کی، لگتا ہے کہ جہاں اکثر ہنگامے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بھیونڈی دیکھنے کی میری بڑی خواہش تھی اللہ نے اس مشاعرے کے حوالے سے یہ آرزو بھی پوری کردی۔

اللہ کا احسان ہے ہندوستان کے تمام قابل ذکر مقامات میں نے مشاعروں ہی کی برکت سے دیکھ لیے البتہ بیرون ہند جانے کا ابھی اتفاق نہیں ہوا۔ انشاءاللہ وہ بھی ہو جائے گا۔ ۱۳ کی رات کے کل ہند مشاعرہ کی اطلاع تمام صبح اخبارات انقلاب، اردو ٹائمز وغیرہ کے ذریعے بھی مل گئی تھی۔ صبح ہی سے شعرا جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ منتظمین مشاعرہ نے ابتداً ان کے ڈگری کالج کے ایک ہال میں ہمیں عارضی طور پر ٹھہرایا کہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لیں۔

میں اپنے روم میں اکیلا اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈال رہا تھا کہ چند شوخ لڑکیاں کمرے میں در آئیں اور شعر سنانے پر اصرار کرنے لگیں۔ میں نے کہا رات مشاعرہ میں سنئے گا۔

انہوں نے کہا کہ شاید رات مشاعرہ میں جانے کی اجازت نہیں اپنے گھروں سے نہ مل سکے۔ لہٰذا ابھی کچھ سنا دیجئے۔ دو تین شعر سنائے تو داد اور بیداد میں تمیز مشکل ہو گئی کوئی چاہتا تھا کہ وفا کے موضوع پر کوئی بے وفائی پر شعر سنانے کی فرمائش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا مجموعہ شاداب ان کے حوالے کیا کہ اس میں جو شعر پسند آئے نوٹ کر لو۔ اور آخرکار یہ کتاب اس لڑکی کو دے دی جسے بیت بازی میں حصہ لینے کا بہت شوق تھا۔ تعلیم کی طرح شعر و ادب کا ذوق بھی اب لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

بعد میں آنے والے شاعروں سے میں نے بیت بازی کرنے والوں کا لطیفہ سنایا اور لگے ہاتھوں یہ بھی بتایا کہ بیت بازی کے ایک مقابلہ میں ایک لڑکی نے شعر پڑھا کہ

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ مرزا غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

شاعر خیامی کو لطیفہ بہت پسند آیا۔ ان کا ارادہ ہے کہ اسے اب نظم میں ڈھال لیں اور آئندہ کسی مشاعرہ میں سنا دیں۔ مشاعرہ تو خیریت میں ہونے والا تھا میں حسب عادت گھومتا رہا بھیونڈی کوئی تاریخی مقام تو ہے نہیں، اس لیے بعض مشہور و ممتاز شخصیتوں کی تلاش کرتا رہا۔ مولانا عطاء اللہ خان اور مولانا اسلمی کا نیاز حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے دونوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔

رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کا مشہور و مقبول اسکول ہے یہ اسکول اب ڈگری کالج میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سائنس، ٹکنالوجی اور کمپیوٹر کورسس بھی یہاں سکھایا جاتا ہے۔
مشاعرے سے قبل بھیونڈی کی ہر دل عزیز شخصیت جناب یٰسین مومن ایڈوکیٹ نے اسکول اور کوکن مسلم سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔
ڈپٹی کمشنر آف پولیس مسٹر راٹھور نے بڑی پرمغز تقریر کی ان کی ذاتی کوششوں اور عوامی مقبولیت کی وجہ سے بھیونڈی میں اب فسادات نہیں ہوتے۔ یہ کسی زمانے میں انڈیا کا

لالو کھیت تھا جہاں اکثر کچھ نہ کچھ ہنگامہ کھڑا ہوتا ہی رہتا تھا اب فضا پرسکون ہے

برسرِ مشاعرہ اچانک اعلان کیا گیا کہ پاکستان کے مشہور شاعر قتیل شفائی بھی

اس مشاعرے میں تشریف لا چکے ہیں اس غیر متوقع اور خوش کن اعلان کی تالیوں کی گونج

پیدا کی ہوئی۔ اگر قتیل شفائی کی آمد کی اطلاع پہلے ہی سے اخبارات، پوسٹر اور بیان

کے ذریعے کی جا سکتی تو شاید ٹکٹ زیادہ بکتے اور سامعین میں کچھ اور اضافہ ہوتا۔ یہ

مشاعرہ میں قتیل شفائی جیسے مقبول و ممتاز شاعر کے اچانک چلے آنے سے مشاعرے

کی رونق میں اضافہ ہو گیا۔

مشاعرے کی صدارت بزرگ کہنہ مشق ترقی پسند شاعر جناب علی سردار جعفری

نظامت کی ذمہ داری ملک زادہ منظور احمد کے سر تھی مگر ان کے تشریف نہ لانے کی

پر جناب معراج فیض آبادی کے کاندھوں پر آ پڑی معراج صاحب نے بڑے سلیقے

مشاعرے کی کارروائی چلائی۔

سب سے پہلے انجم بارہ بنکوی کو زحمتِ کلام دی گئی اس کے بعد معراج صاحب

رؤف خیر کو دکن کی نمائندگی کرنے کے لیے آواز دی۔ میں نے پاکستانی شاعر جناب قتیل

کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اک غزل پیش کی جس کے ایک شعر پر بہت

مہاجرین سے انصار خوش نہیں ہوتے

تو پھر کہاں کی یہ ہجرت برائے بھارت کیا

اس کے بعد اک اور غزل سنائی اور اس میں ایک شعر نے زیادہ پسند کیا۔

پرندہ لوٹ کے سرِ شام آشیانوں کو

خراب ہیں ابھی حالات رات مت کرنا

رؤف خیر کے بعد کنور جاوید کو آواز دی گئی کنور جاوید نے تقریباً آدھے گھنٹے تک مختلف

سنا کر داد حاصل کرنے کی جان توڑ کوشش کی۔ آخر کار انہیں اس شعر پر داد مل ہی گئی

سلسلہ اپنے بزرگوں سے ملا رہنے دو
مجھ کو اس دیس کی مٹی سے جڑا رہنے دو

ایک جاوید کے بعد دوسرے جاوید یعنی ملک زادہ جاوید کو پیش کیا گیا انہیں اس شعر پر داد ملی ہے ۔

رعونت آ گئی ہے لہجے میں اس کے
سنا ہے آج کل پیسہ بہت ہے

ان کے بعد شکیل جمالی کا نام پکارا گیا ہمارے ذہن میں رومانی دنیا کے ناول نگار شکیل جمالی کا نقشہ تھا مگر مائک پر آنے والا بیس پچیس سال کا کوئی نوجوان تھا اس نوجوان کو اس شعر پر خوب داد ملی ۔

تھوڑا سا سوتیلا پن ہے مٹی میں
ورنہ سارا ہندوستان ہمارا ہے

پاپلر میرٹھی کے شعر سنانے کا انداز درمیانہ ہے ۔ زنانہ و مردانہ لہجوں کے بیچ اس انداز میں شعر پڑھنے والا اپنی اداؤں اور شعروں سے داد حاصل کر ہی لیتا ہے چنانچہ پاپلر میرٹھی کا پٹھانیکر سامعین نے پسند کیا ۔

عموماً مزاحیہ مشاعروں کے بعد کسی سنجیدہ شاعر کو زحمت کلام دی جائے تو وہ برا مان جاتا ہے اسی لیے معراج فیض آبادی نے خود اپنے آپ کو پیش کیا یہ دل جگر با اعتماد شاعر ہی رکھتا ہے چنانچہ انہوں نے خوب شعر سنائے اور اس شعر پر خوب داد بھی پائی

کبھی حالات کی شدت سے سمجھوتہ نہیں کرتا
قلم فرعون کی دہلیز پر سجدہ نہیں کرتا

معراج صاحب کے بعد طاہر فراز نے اپنی آواز کا جادو جگایا بالآخر اس شعر پر داد پاکر وہ مائک سے رخصت ہوئے ۔

خواب نہ دیکھیں اللہ سے کہہ دو ہم کو مٹائے
اکثر خوابوں کی الٹی تعبیریں آتی ہیں

ڈاکٹر اسد بدایونی نے جب شعر پڑھا کہ

جلتے بجھتے ہوئے جگنو کی طرح زندہ ہیں

تو ہمیں حسن کا ظمی یاد آ گئے وہ یہاں شعر "رہتا ہوں" کی ردیف میں سناتے تھے
ڈاکٹر اسعد بدایونی علی گڑھ یونیورسٹی میں لکچرار ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں انہوں نے بتایا
ان کے بہت پرانے اشعار ہیں کچھ لوگ اگر اپنے نام سے یہ شعر سناتے پھر رہے ہیں
تو وہ کیا کر سکتے ہیں۔

ندیم صدیقی نے اک سائنسی حقیقت کو شعر میں ڈھال کر خوب داد پائی۔

تم چراغوں کی بات کرتے ہو

ہم نے سورج کو بجھتے دیکھا ہے"

ساغر جیامی مختلف اشعار سنا کر رنگ جمانے کی کوشش کرتے رہے ان کیمپلس کا اختتام کر کر
بلوا احسن کی بقول ان کے کسی نے فرمائش کی تھی۔

"علی سردار جعفری بہت ضعیف ہو گئے ہیں انہوں نے معذرت چاہی اور بیٹھے
ہی میں شعر سنا کر آرام کرنے کی خواہش کی۔ ان کے ایک ایک مصرع میں قند مکرر کا لطف تھا۔

ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں

ہر گام پہ خوں کے طوفاں ہیں کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

اسکے علاوہ سردار جعفری صاحب نے کچھ اور شعر بھی سنائے جیسے

اے وطن خاک وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے

بچ گیا ہے جو لہو اب جو فسادات کے بعد

سردار جعفری صاحب کے اسٹیج چھوڑنے کے بعد نواز دیوبندی نے مائک سنبھالا۔ ان کا شعر

سفر میں یہ مشکلیں آئیں تو جرات اور بڑھتی ہے

کوئی گر راستہ روکے تو ہمت اور بڑھتی ہے

ایک قتیل راجستھانی بھی ہیں جنھوں نے کہا

دل دیا ہے تو اک نوازش کر
مجھ کو پہچان آزمائش کر

راجستھان ہی کے علاقے جے پور سے آئے ہوئے راہی شہابی نے حسب معمول اک طویل نظم سنائی۔

خود ہی مٹ جائیں گے اُردو کو مٹانے والے

مہاراشٹر کے اک ہول ریچ ہیرے سے شاعر بھی ہیں یعنی منظور ندیم انھوں نے بڑی خوب صورت رومانی غزل سنائی اس کا ایک شعر تھا۔

بھیجے ہیں تری خدمت میں جگر کے ٹکڑے
شعر ہو جائیں غزل کے تو تجھے خط لکھوں

قتیل شفائی بھی چاہتے تھے کہ جس طرح چپکے سے مشاعرے میں چلے آتے تھے اسی طرح مشاعرے سے چپکے سے چلے جائیں انھیں آواز دی گئی تو انھوں نے اک تازہ غزل اور اک شعر پڑھا

جب تصور مرا چپکے سے تجھے چھو آئے
دیر تک اپنے بدن سے تری خوشبو آئے

قتیل شفائی کے بعد شاعر جمالی نے خوب رنگ جمایا کہ

یہ عشق و مشق تو مشکل ہے ہر غزل کے لیے
غلط سلط کوئی چکر چلانا چاہیے تھا

عوام راحت اندوری کو سننے کے لیے بے چین تھے۔ انھوں نے کہا کہ بقول شخصے مشاعرہ ادبی دیار میں چل رہا ہے مگر مجھے اپنا دھندہ بھی تو دیکھنا ہے چنانچہ انھوں نے اپنی مردانہ آواز میں حسب معمول خوب شعر سنائے اس شعر پر داد پائی۔

آواز سن رہے ہو یہ ہم ہیں حضور ہم
حالات کھو چکے ہیں مگر ایسا مزدور ہم

راحت اندوری کے بعد لوگ شعرستان سے گھر آتے ہیں مگر بشیر بدر نے اپنے چمپا چنبیلی جیسے شعروں کی مہکار سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔

جگنو ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

انہوں نے اسٹیج پر بیٹھے شاعروں کی فرمائش پر وہ شعر بھی سنایا جو قتیل صاحب کے شعر سے ملتا جلتا ہے۔ بشیر بدر نے کہا کہ وہ پاکستانی فکر کا آغاز تھا میرا شعر ہندوستانی ہے یہ کہہ کر شعر پڑھا کہ

بس گئی ہے مرے احساس میں یہ کیسی مہک
کوئی خوشبو میں لگاؤں تری خوشبو آئے

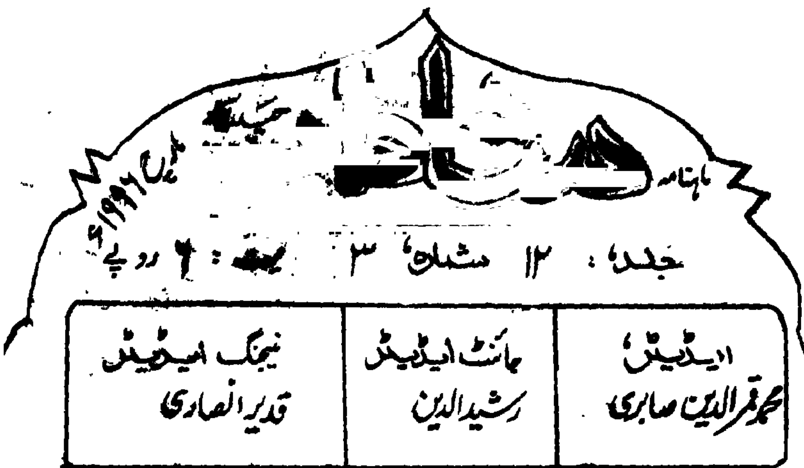
آخر میں خمار بارہ بنکوی تھے اور شائقین۔ خمار صاحب نے اپنی مدھر آواز میں کئی اشعار پڑھے اس طرح رات ساڑھے تین بجے یہ محفل شعر اختتام کو پہنچی۔

بھیونڈی میں الحمد للہ مسلم آبادی بہت زیادہ ہے تعلیم، شعر و ادب کے ساتھ مذہب سے عوام جڑے ہوئے ہیں۔ مرحلہ میلوں جھنڈوں کنڈوں کے ماننے والے بھی ہیں اور جماعت اسلامی اور جمعیت اہل حدیث کا بھی بہت اثر ہے جہاں شافعی مسلک کی ایک خوبصورت مسجد بھی ہے اس طرح لوگ کسی نہ کسی صورت میں اپنی شناخت بچائے ہوئے ہیں۔

بھیونڈی کے قریب ممبرا میں اثر فیض آبادی سے ملنے کی خواہش تھی مگر معلوم ہوا ہے کہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ دنیا سے رشتہ توڑ گئے۔

میں تو سورج ہوں بہر حال نظر آؤں گا
کوئی مٹی نہیں ایسی جو چھپالے مجھ کو

کہنے والے پر منوں مٹی پڑ گئی وہ تو اللہ معز حسین قریشی کو سلامت رکھے کہ بھیونڈی میں بیٹھ کر اپنے رسالہ "تکمیل" کے وسیلے سے کئی مرحوم شاعروں کو زندہ رکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔



ماہنامہ

مارچ ۱۹۹۶ء

جلد: ۱۲ شمارہ: ۳ قیمت: ۶ روپے

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری	رشید الدین	قدیر انصاری

مجلس مشاورت

زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	" ۲۰۰ "	" ۳۶۰ "	" ۳۵۰۰ "
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	" ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	" ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	" ۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" ۴/۷-۵-۱۱، ریڈ ہلز۔ حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" ۴/۷-۱-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست



فارم نمبر ۴ تحت ضابطہ نمبر ۸

تحت بابتہ ملکیت وغیرہ برائے ماہنامہ "شاداب" حیدرآباد اے پی

مقام اشاعت : دفتر شاداب مکان نمبر ۱۴۷ - ۵ - ۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی

اوقات اشاعت ۔ ماہنامہ

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اور مالک **محمد قمر الدین صابری**

نام، پتہ اور قومیت : 147 - 5 - 11 ریڈ ہلز حیدرآباد

میں محمد قمر الدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کی حد تک بالکل درست ہیں۔ محمد قمر الدین صابری یکم مارچ ۱۹۹۶

جوش ملیح آبادی

سورۂ رحمٰن

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرّد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

یہ سحر کا حسن، یہ سیارگاں اور یہ فضا
یہ معطر باغ، یہ سبزہ، یہ کلیاں دل رُبا
یہ بیاباں، یہ کھلے میداں، یہ ٹھنڈی ہوا
سوچ تو کیا کیا، کیا ہے تجھ کو قدرت نے عطا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

خلد میں حوریں تری مشتاق ہیں، آنکھیں اٹھا
نیچی نظریں جن کا زیور جن کی آرائش حیا
جن و انساں میں کسی نے بھی نہیں جن کو چھوا
جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

اپنے مرکز سے نہ چل منہ پھیر کر بہرِ خدا
بھولتا ہے کوئی، اپنی انتہا اور ابتدا
یاد ہے وہ دور بھی تجھ کو کہ جب تو خاک تھا
کس نے اپنی سانس سے تجھ کو منور کر دیا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

سبز گہرے رنگ کی بیلیں چڑھی ہیں جا بجا
نرم شاخیں جھومتی ہیں، رقص کرتی ہے صبا
پھل وہ شاخوں میں لگے ہیں دل فریب و خوش نما
جن کا ہر ریشہ ہے قند و شہد میں ڈوبا ہوا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

پھول میں خوشبو بھری جنگل کی بوٹی میں دوا
بحر سے موتی نکالے صاف روشن خوش نما
آگ سے شعلہ نکالا، ابر سے آب صفا
کس سے ہو سکتا ہے اس کی بخششوں کا حق ادا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

ہر نفس طوفان ہے ہر سانس ہے اک زلزلہ
موت کی جانب رواں ہے زندگی کا قافلہ
مضطرب ہر چیز ہے جنبش میں ہے ارض و سما
ان میں قائم ہے تو تیرے رب کے چہرے کی ضیا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

صبح کے شفاف تاروں سے برستی ہے ضیا
شام کو رنگِ شفق کرتا ہے اک محشر بپا
چودھویں کے چاند سے بہتا ہے دریا نور کا
جھوم کر برسات میں اٹھتی ہے متوالی گھٹا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

زندہ رہنا ہے تو...

میر کارواں بن کر رہو

ذیل کا مضمون حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔

میرے بھائیو! عزیزو اور دوستو!

میں نے آپ کے سامنے سورہ انفال کی یہ آیت پڑھی جو فوری طور پر میرے ذہن میں آ[ئی]، کسی غیبی طاقت نے میرے کان میں کہا، اس عظیم مجمع کو دیکھو، جو لاکھوں کی تعداد میں تمہ[ارے] سامنے ہے۔ اس غیر معمولی تعداد کا تصور پہلی صدی ہجری میں بڑے سے بڑے جگر [والا]، غیر معمولی حد تک حوصلہ مند، صاحب جرات اور بڑے سے بڑا پیشین گوئی کرنے والا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دنیا ہی میں نہیں بلکہ کرۂ ارض میں بھی نہیں۔ ایک ایسے قصبے میں، جو جز[یرۃ العرب] سے سات سمندر پار ہے اور جو زبان، تہذیب، قانون، قومیت اور نسل و مذہب کسی بھی [اعتبار سے]

جزیرۃ العرب سے نکلنا نہیں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہو سکے گی۔ قرآن مجید کی اس آیت پر دوبارہ غور کیجئے اور پہلی صدی ہجری کے ان حالات کو یاد کیجئے جو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ طیبہ میں پیش آئے تھے۔

قرآن مجید مسلمانوں کو مخاطب کر کے (جن کی تعداد اس وقت چند ہزار سے زیادہ نہ تھی) کہتا ہے: "جب تم تھوڑے تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، ہر وقت ڈرتے تھے کہ تم کو کوئی جھپٹا مار کے اچک نہ لے جائے (یہاں پر قرآن مجید نے تخطف کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی جھپٹا مارنا اور اڑا کر لے جانا ہیں) حالت یہ تھی کہ تم لقمۂ تر تھے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو چھوڑیئے کہ حجاز بلکہ صرف قریش کا قبیلہ ہمیشہ کے لیے اس چراغ کو گل کرنے کے لئے کافی ہوتا۔

قرآن مجید کے اندر مندرجہ ذیل آیت میں پھونک مار کر بجھانے کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ

یہ صرف ادبی لفظ نہیں، اس کے سارے الفاظ معجز ہیں۔ اس لفظ میں ایک سچی اور صحیح تصویر ہے۔ حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی زندگی کا چراغ اور اسلام کے چراغ نور کو ہر وقت گل کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بجھانے کے لئے کسی پنکھے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ منہ کی پھونک سے بجھایا جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ قرآن مجید میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کے حالات کی صحیح اور سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ"

اور تم کو پناہ دی اور تم کو نصرت خداوندی اور آسمانی مدد کے ذریعہ تمہاری تائید کی اور صرف یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے حلال و پاک چیزوں میں سے تم کو عطا فرمایا تاکہ تم شکر ادا کرو۔ طیبات کا لفظ عام ہے سلطنت سے لے کر مطلق العنان و با اختیار سلطنت تک اور سلطنت کے اندر جو ضرورت ہوتی ہے۔ [illegible]

طاقت' آزادی و خود مختاری اور بلندی و برتری حاصل ہوتی ہے' یہ سب طیبات میں آتا ہے۔

"وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ"

کہ شاید تم شکر کرو' اور تمہارے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

آج میں انسانوں کا جنگل دیکھ رہا ہوں اور اس وقت کو یاد کر رہا ہوں جب چند ہزار مسلمانوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ احسان جتلایا تھا' لیکن آج ہماری کیا حالت ہو گئی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ایک قصبہ میں دین کے خادموں کی ایک آواز پر دنیا کے دور دراز گوشوں سے کتنے انسانوں کو جمع کر دیا ہے۔ ہر ملک کے لوگ یہاں اس طرح جمع ہو گئے ہیں کہ اگر بے ادبی نہ ہو تو بلا تشبیہ میدان عرفات کا نقشہ یہاں دکھائی دے رہا ہے۔ جو طاقت مسلمانوں کو میدان عرفات میں جمع کرتی ہے وہی طاقت اور سنت ابراہیمی کی وہ کشش ہے جس نے آج اس قصبہ میں لاکھوں مسلمانوں کو یکجا کر دیا ہے۔

"وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ"

تیری نسبت سے انس و جن تو ہے امیر جنود

مکہ مکرمہ میں اگر مسلمان جمع ہوتے ہیں تو سنت ابراہیمی اور سنت محمدی کی وجہ سے' مدرسہ میں اگر مسلمان جمع ہوتے ہیں تو اس میں بھی سنت ابراہیمی اور سنت محمدی کی کشش کو دخل ہے اور آج بھی اس آواز میں وہ غیر معمولی طاقت اور کشش ہے جس کو اگر مسلمان سمجھ لیں تو دنیا کی کسی بڑی سے بڑی حکومت میں وہ اثر وہ طاقت نہیں جو اب بھی اذان کی آواز میں ہے۔ اقوام متحدہ سو بار جئے' سو بار مرے' امریکا اور روس جیسی بڑی بڑی طاقتیں مر مر کے زندہ ہوں' پھر بھی ان کی آواز میں وہ طاقت و تاثیر نہیں جو اسلام کی آواز میں

ہے، جس طرح مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اسی طرح آج بھی اس آواز میں وہ کشش، توانائی اور مسیحائی ہے جو دنیا کی کسی چیز میں نہیں ہے۔ ہمیں اور آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے قلیل تعداد کو کثیر تعداد پر غالب کر دیا۔

میں نے عربوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو لاشیٔ سے کل شیٔ بنا دیا، اور میں آپ سے ایک بار نہیں چار بار کہتا ہوں کہ آپ کچھ نہ تھے، سب کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسلام کے طفیل عطا کر دیا۔

ذرا سوچیے تو سہی!

آپ ہندوستان میں کس چیز کی پرستش کر رہے تھے؟ شجر و حجر سے لے کر ہر چیز آپ کے لیے معبود و مسجود بننے کے لائق تھی۔ پستیوں، ذلتوں، جہالتوں اور شقاوتوں کے اس بحر ظلمات سے آپ کو کس نے نکالا ہے؟ یہ وہی انبیاء کرام کی دعوت تھی جو آخری طور پر قیامت تک کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے اس دنیا کو پہنچی۔ اگر عربوں پر یہ احسان ایک مرتبہ ہے تو آپ پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان سو بار ہے۔

میں عربوں سے بار بار خطاب کرتا ہوں اور ان کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتا ہوں، یہ ان کی عالی ظرفی اور کریم النفسی ہے کہ میں نے ان کو جھنجوڑا تو جھک گئے اور جب بھی میں نے ان کو پکارا تو انہوں نے آواز دی اور جب بھی ان کا ایک محتسب کی طرح احتساب کیا، انہوں نے اس کو برداشت کیا۔ حالانکہ مجھے اس کا کوئی حق نہ تھا، میں تو اس میخانہ کا ایک ادنیٰ مے خوار ہوں۔ اب میں آپ سے کہوں گا اور سو بار کہوں گا کہ خود کو یاد کریں کہ آپ کہاں تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کہاں پہنچا دیا۔

میرے دوستو اور بزرگو!

آپ اپنی حقیقی عظمت کے راز کو سمجھیے کہ دنیا میں اب تک ہزاروں طوفان آندھی اور سیلاب کے باوجود آپ اب تک کیوں باقی ہیں؟ ہم ایک ہندوستان ہی کی تکریم کو

دیکھ لیجئے۔ یہ زمین جس کو حالی نے اتّصال الارض اور ہندوستانی تہذیب و مزاج کو اتّصال الامم سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جو قوم یہاں آئی وہ تحلیل ہوگئی۔ اور اس نے اپنی قومی خصوصیات و امتیازات کو کھودیا اور "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" کا منظر سامنے آگیا۔ اس میں نہ تو آریائی نسلیں باقی رہیں۔ نہ دوسری قومیں۔ جو بھی یہاں آیا وہ اس کے رنگ میں رنگ گیا۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اپنے آپ کو اپنے تشخص کے ساتھ باقی رکھا ہے؟ وہ ہے عقیدۂ توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستگی، اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اقرار اور اس کے سامنے ساری طاقتوں کا انکار اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی محبت کا طوق اپنے گلے میں ڈالنا۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر ہم اس قابل ہوئے کہ اس منظر کو دیکھ سکیں۔ ہم ان عربوں کو اس لئے جمع کرتے ہیں کہ ان سے ملیں اور ان سے کہیں کہ اے ہمارے مرشدو! اے ہمارے استادو! تم نے ہم کو جو سبق پڑھایا تھا اور جو مبلغ ہندوستان بھیجے تھے ہم ثابت کرتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں اور ہم کند ذہن ناتراشیدہ نہیں ثابت ہوئے۔ محمد بن قاسم الثقفی اور دوسرے جو دعاۃ دین (خواہ براہ راست عرب سے آئے یا دوسرے ملکوں سے ہو کر) جو سبق دے کر گئے تھے وہ سبق ہم نے یاد رکھا اور ہم نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ ہم اپنا سبق سنائیں اور یہ زبان حال سے سن رہے ہیں اور حیرت زدہ ہیں کہ اس ہندوستان میں اتنے غیور مسلمان، شمع اسلام کے اتنے پروانے اسلام کی شمع کو اس طرح جلا سکتے ہیں اور علم کی شمع پر اتنے پروانے جمع ہو سکتے ہیں۔ ہم نے ان عربوں کو دارالعلوم کی تاریخ سنانے اور اس کے کارناموں کی عظمت سے باخبر کرنے کے لئے جمع نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہم انہیں کے شہید شاعر ابو فراس ہمدانی کا وہ شعر سنانا چاہتے ہیں جس میں اس نے کہا تھا۔

مَحَلٌّ لِعَاقٍ صَنَائِعُهَا فَفَاقَت
وَعُمْرٌ مِنْ طَلَبٍ غَارِضِهٖ فَطَابَا

وَكُنَّا كَالسِّهَامِ إِذَا أَصَابَتْ
مَرَامِيهَا فَرَامِيهَا أَصَابَا

(کارنامے جن کو بنانے والے بڑے بلند وعالی مرتبہ تھے وہ بڑے روشن ہیں، وہ پودا جس کا لگانے والا بڑا کریم، بڑا شریف، بڑا عالی استعداد تھا، وہ پودا خوب کامیاب نکلا اور خوب برگ و بار لایا۔

ہم تو تیر تھے، جب تیر انداز نے کمان میں جوڑ کر ان تیروں کو چلایا تو وہ اپنے نشانے پر بیٹھے۔ تو تیروں کی تعریف ہے اور تیر انداز کی بھی تعریف ہے)۔

حضرات!

میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی عظمت اور تشخصات کے ساتھ اس ملک میں باقی رہئے۔ ہم مسلمان ہیں، ہم کو اس کا اقرار ہے، ہم اس ملک میں پورے اسلامی امتیازات اور مکمل اسلامی تشخصات کے ساتھ باقی رہیں گے یہ ہمارا فیصلہ ہے۔

بزرگو! اور دوستو!

ہجرت کا فلسفہ کیا ہے، ہجرت کا شرعی حکم کیوں ہے؟ اسی لیے کہ جس زمین پر احکام اسلام پر عمل نہ ہو سکے اس سرزمین کو چھوڑ دینا فرض ہے۔ ہم اس ملک میں اس حالت میں نہیں رہ سکتے کہ ہم اپنے تمام تشخصات و امتیازات سے دست بردار ہو جائیں اور اپنے مابہ الامتیاز عقائد کو چھوڑ دیں، اپنے عقیدۂ توحید و رسالت، ایمان بالآخرت سے دست کش ہو جائیں۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت اور آپ کی سنت پر چلنے کے جذبہ سے ہم خالی اور عاری ہو جائیں۔

ہم صاف اعلان کرتے ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اعلان کر دیں کہ ہم ایسے جانوروں کی زندگی گزارنے پر ہرگز راضی نہیں جن کو صرف دانہ چاہیئے اور ان کو صرف SELF SECURITY چاہیئے کہ ان کو کوئی مارے نہیں۔ ہم ہزار بار ایسی زندگی کو ٹھکرانے

اور ایسی حیثیت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم اس سرزمین پر اپنی اذانوں نمازوں کے ساتھ رہیں گے بلکہ ہم تراویح اور اشراق و تہجد تک چھوڑنے کے لیے تیار ہیں بلکہ ایک سنت کو بیفسے لگائیں رہیں گے اور رسول اکرم کی سیرت کو صاف کسی ایک نقش بلکہ کسی نقطے سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔

لیکن۔ عزیزو اور دوستو !

اس وقت جبکہ پورے ملک اور عالم اسلام کا جوہر اور دل و دماغ ایک جگہ جن کا فتویٰ سکہ رائج الوقت کی طرح چلتا ہے، یعنی ان تمام حضرات کی موجودگی ہوں، آپ یہاں سے عہد کرکے جائیں کہ ہم کو اس ملک میں مسلمان بن کر ہی رہنا ہے کسی قیمت پر اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے

میرے بھائیو! آپ اپنی طاقت اور اپنی قوت سے آشنا ہوں ے

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

آپ اپنے ساتھ تو انصاف کیجئے۔ مسئلہ ایک مدرسہ یا کسی جامعہ کا نہیں ہے نہ خیال کا مسئلہ ہے اور نہ کچھ منصوبوں اور عمارتوں کی تکمیل کا مسئلہ ہے بلکہ اسلامی کے باقی رکھنے اور اسلامی شخصیت کے تحفظ کا نہیں، آج مسئلہ ہے اس کی قیادت کا۔ آپ دوسروں کے پیچھے چلنے کے لیے ہرگز نہیں پیدا کیے گئے اور نہ خدا اس ملک میں اس لیے بھیجا ہے کہ آپ دوسروں کے حاشیہ بردار بنیں اور آپ لوگ اشاروں کو دیکھیں اور ان کے چشم و ابرو کو پہچاننے کی کوشش کریں کہ ملک کس طرف جا رہا ہے ہم کسی قومی دھارے سے واقف نہیں ہم تو دنیا کی قیادت و امامت کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

نزات
آج ملک خودکشی کے لیے قسم کھا چکا ہے، وہ آگ کی خندق میں گرنے کے لیے تیار ہے
، بداخلاقی اور انسانیت کشی کے دلدل میں ڈوب رہا ہے، آپ ہی ہیں جو ہندوستان۔ میں
یا پورے ایشیا میں اس ملک کو بچا سکتے ہیں۔ آپ اللہ اور رسول کی بات کہئے آپ کو
ئی ضرورت نہیں کہ آپ نیلام کی منڈی میں اتر آئیں اور آپ سودا کرنے لگیں کہ ہماری بولی
لی جائے۔ آپ متاع نایاب ہیں اللہ کے سوا آپ کی خریداری کا کوئی حوصلہ نہیں کر سکتا۔
اس لیے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں، کاش میں آپ کے دلوں اور دماغوں پر چوٹ لگا سکتا
ں صرف آپ سے کہتا ہوں کہ اس ملک کو صرف آپ بچا سکتے ہیں اس لیے کہ آپ کے پاس
عقیدۂ توحید اور انسانی اصول و مساوات ہے، آپ کے پاس اجتماعی عدل کا مکمل نظام موجود ہے
آپ ہی ہیں جو ہر چیز سے بالاتر ہیں، آپ ہی ہیں جن کے پاس ایمان بالآخرۃ ہے اور
جو العاقبۃ للمتقین پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی نظر
طاقت اور قوت پر رہا کرتی ہے جن کی نگاہ میں مال و متاع اور اکثریت ہی سب کچھ ہے
اور نہ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو انتخابات میں کامیابی اور پارلیمنٹ تک
پہونچ جانے ہی کو سب سے بڑی معراج سمجھتے ہیں۔
بزرگو اور دوستو!

جو دولت کے فلسفے پر ایمان رکھتا ہے اور ہر چڑھتے سورج کو پوجنے لگتا ہے وہ
ڈوب کر رہے گا، اس کو کوئی بچا نہیں سکتا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ عرب ممالک
اس سے بہتر حالت میں نہیں اور یہ میں آپ سے اردو میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں ان
سے ڈرتا ہوں، میں نے ان سے بارہا کہا ہے:

لا الفقر اخشیٰ علیکم ولکن اخشیٰ ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علیٰ
من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا فتھلککم کما اھلکتھم۔

اس کو میں نے مکہ اور مدینہ میں کہا اور ہر جگہ میں نے یہی صدا لگائی کہ وہی بچ سکتا ہے جو اللہ

کے وعدوں پر یقین اور اس کی نصرت پر بھروسہ کرتا ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمان اپنے اندر ایمانی خصائص پیدا کر لیں تو آج بھی آتش نمرود سرد پڑ سکتی ہے اور وہی انداز گلستان پیدا ہو سکتا ہے۔

میرے عزیزو اور دوستو!

میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مولانا قاسم نانوتوی اور ان کی روح کا یہی پیغام ہے۔ حضرت شیخ الہند اسی میں جلتے اور پگھلتے رہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی اور مولانا مدنی اپنے اپنے خاص طرز اور اسلوب سے اسی کے لیے ہمیشہ سوزاں اور لرزاں رہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی خصوصیات اور ملی تشخصات کے ساتھ اس ملک میں باقی رہیں، قرآن و سنت کو سینے سے لگائے رکھیں، اختلافی مسائل چھیڑنے کے بجائے توحید و سنت پر زور دیں۔ دیوبند کا یہی پیغام ہے اور اس کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے سرمایۂ ملت کو بچانے کی کوشش کی اور اختلافی مسائل کو عوام کے سامنے نہیں لائے۔

یہ دیوبند وارث ہے حضرت مجدد الف ثانی کا، اور اگر کوئی نہیں سمجھتا تو اس کو سمجھنا چاہیئے۔ یہ میرا مقام نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں اور حضرت مجدد الف ثانی کے وارث ہیں حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ معتمد بزرگوں میں سے کسی کو بھی اس میں کلام نہیں کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ کا گلستان اور ان کا مکتب فکر ہے جو دیوبند کی شکل میں اس وقت سامنے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں صحیح العقیدہ درسگاہیں ہیں وہ شاہ ولی اللہ کی شمع فروزاں اور اسی کی تجلیات ہیں۔

منصب قیادت، حفاظت ملک و ملت کا فریضہ

حضرات:

میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے لئے قائد کا مقام اختیار کیجئے۔ آپ سمجھئے کہ آپ کی حیثیت ملک میں قائد کی ہے۔ میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ کوئی یہ کہے کہ مسلمانوں

کو یہ کرنا چاہیئے. کون یہ کہنے کا حق رکھتا ہے۔ کیا نبی عربی کے بعد کوئی اور پیغمبر پیدا ہوگا کیا کتاب اللہ کے بعد اور کوئی کتاب آسمان سے نازل ہوگی کیا شریعت محمدیؐ کے بعد کوئی اور شریعت آئے گی؟ ہم سے کہنے والا صرف اللہ اور اس کا رسول ہے، ہمارا ساتھ دینے والی ہماری آسمانی کتاب اور سنت رسولؐ ہے۔ آپ یہ عہد کر کے یہاں سے جائیے کہ آپ کو ان خصوصیات کے ساتھ اس ملک میں رہنا ہے اور کتاب وسنت کو دل وجان سے زیادہ عزیز رکھنا اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار رہنا ہے۔ اگر آپ ان خصوصیات کے ساتھ اس ملک میں رہیں تو ان شاء اللہ آپ عزت کے ساتھ سربلند اور سرخرو رہیں۔

"وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"

حضرات : یہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کو دستار فضیلت ملنے والی ہے اس سے اس درسگاہ کی تین چار اہم خصوصیات کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔

(۱) اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید و سنت پر اپنی توجہ مرکوز کی (اور یہ وہ وراثت اور امانت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے وسیلہ سے اس کو ملی اور ابھی تک اس کو عزیز ہے۔

(۲) اتباع سنت کا جذبہ اور فکر۔ (۳) تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر و حضوری اور ایمان و احتساب کا جذبہ۔

(۴) چوتھا عنصر ہے اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش

یہ چار عناصر مل جائیں تو دیوبندی بنتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی عنصر کم ہو جائے تو دیوبندیت ناقص۔ فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہ شعار رہا ہے کہ وہ ان چار چیزوں کے جامع رہے ہیں۔

اب میں عام آدمیوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں آپ کا بھی حصہ ہے اور یہ صرف فضلا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ آپ بھی یہاں سے پیغام لے کر جائیے کہ عقیدۂ توحید کو سینے سے لگانا ہے اور یہ کہ گر چہ شرک اور بدعت کا دھارا بہہ رہا ہے اس سے الگ رہنا ہے توحید پر آپ قائم رہیں اتباع سنت اور اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ کے اندر ہو اور تعلق مع اللہ کی کوشش کرتے رہیں۔ آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذاکر و مذکور، محب محبوب اور عابد و معبود کا ہونا چاہیئے۔ یہی تعلق آپ کے دل و دماغ اور اپنے اعصاب پر حاوی ہونا چاہیئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

عہد صحابہؓ کا نظام تعلیم و تعلّم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد برکۃ الاسلام، عصابۃ الایمان، عسکر القرآن، جند الرحمن حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فقہ و تقویٰ اور علوم دینیہ کے حامل و ناشر تھے، جن کے بارے میں صحابہ اور تابعین کا بیان ہے۔

کان اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابر ہذہ الامۃ قلوباً واعمقہا علماً واقلہا تکلفاً واحسنہا خلقاً واصدقہا ایماناً اولئک قوم اختارہم اللہ لصحبۃ نبیہ وتبلیغ دینہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس امت میں سب سے زیادہ پاکیزہ دل، علم میں سب سے زیادہ گہرے، تکلف میں سب سے کم، اخلاق میں سب سے بہتر، ایمان میں سب سے سچے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی صحبت اور اپنے دین کی تبلیغ کے لئے منتخب کیا تھا۔

درسگاہِ نبوت کے ان فضلاء و فارغین میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم عہد رسالت میں فقہ و فتویٰ کی خدمت انجام دیتے تھے۔ دیگر صحابہ بھی کتاب و سنت اور فقہ و فتویٰ میں بلند مقام رکھتے اور عہد صحابہ میں انہوں نے دینی

علوم کی تعلیم، احادیث کی روایت اور تفقہ فی الدین میں حصہ لیا، جن میں یہ حضرات مشہور ہیں اور دینی علوم میں مرجع مانے جاتے ہیں: علی بن ابو طالب، عبدالرحمٰن بن عوف، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، ابوموسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، عبداللہ بن سلام، ابوذر غفاری، زید بن ثابت، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن عاص، ام المومنین عائشہ، ان کے علاوہ ام المومنین ام سلمہ، انس بن مالک، ابوسعید خدری، عبداللہ بن زبیر، سعد بن ابی وقاص، سلمان فارسی، جابر بن عبداللہ وغیرہ رضی اللہ عنہم حدیث و فقہ اور علوم کے حامل و ناشر تھے۔

ویسے حضرات صحابہ میں ہر فرد اپنی ذات سے مینارۂ رشد و ہدایت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اهتدیتم

اور جو حضرات جس علم میں نمایاں تھے آپؐ نے اُمت کو ان سے آگاہ کر کے ان سے تحصیل علم کی تاکید فرمائی، آپ نے فرمایا میرے بعد ابوبکر اور عمر کی اقتدا کرو، قرآن کی تعلیم ان چار سے حاصل کرو، عبداللہ بن مسعود، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب جس کو قرآن تازہ بتازہ حاصل کرنا ہو ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کی قرأت کے مطابق پڑھے، معاذ بن جبل میری امت میں حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم ہیں، میری امت میں فرائض کے سب سے بڑے عالم زید بن ثابت ہیں، عبداللہ بن عباس قرآن کے بہترین ترجمان ہیں، ابوموسیٰ اشعری کو آلِ داؤد کی خوش نوائی دی گئی ہے، علی [illegible] عالم ہیں۔ ابوالدرداء عبادت میں سب سے آگے ہیں، ابی بن کعب قرأت میں سب سے آگے ہیں، زمین کے اوپر آسمان کے نیچے ابوذر سے زیادہ صادق [illegible] ابوعبیدہ بن جراح اس امت کے امین ہیں۔

حضرت ابوبکر [illegible] معاملات میں [illegible]

کو جمع کر کے مشورہ لیا کرتے تھے ان میں عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت دینی علوم اور فقہ و فتویٰ میں مرجع تھے۔ حضرت عمر اصحاب شوریٰ کے علاوہ انصار میں سے معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت سے دینی و انتظامی امور میں مشورہ لیتے تھے۔ اسی کے ساتھ عبداللہ بن عباس اور دوسرے نوعمر صحابہ کو اپنی مجلس میں بلاتے تھے اور فتویٰ کی خدمت عثمان بن عفان ابی بن کعب، زید بن ثابت انجام دیتے تھے۔

حضرت عثمان کے دور خلافت میں بھی یہی حضرات اس منصب پر فائز رہے معاذ بن جبل سے ان کی وفات کے وقت پوچھا گیا کہ آپ کے بعد ہم کس سے علم حاصل کریں تو بتایا کہ ابو درداء، سلمان فارسی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن سلام سے۔ حضرت عمرؓ نے مقام جابیہ میں خطبہ دیا اور کہا کہ جس کو فرائض حاصل کرنا ہو زید بن ثابت کے پاس جائے اور جس کو مال حاصل کرنا ہو میرے پاس آئے۔

مسور بن مخرمہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا علم ان چھ حضرات پر منتہی ہوتا ہے، عمر، عثمان، علی، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، اور زید بن ثابت۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں عمر علم کے دس حصوں میں سے نو حصہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اگر عمر کا علم ایک پلڑ پر اور دوسرے لوگوں کا علم دوسرے پلڑ پر رکھا جائے تو عمر کے علم کا پلڑ جھک جائیگا۔

ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ہم اصحاب محمدؐ کو جب کسی حدیث کے بارے میں مشکل پیش آتی اور ہم نے حضرت عائشہؓ سے اس کے متعلق سوال کیا تو ان کے پاس علم پایا۔ زہری کا قول ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود کی مجلس میں بیٹھتا تھا، میرے نزدیک ان کی ایک مجلس میں بیٹھنا ایک سال کے عمل سے زیادہ قابل اطمینان ہے صحابہؓ کے یہ چند آراء و اقوال علمائے صحابہ کے بارے میں ہیں، اب ان کے تلامذہ تابعین کے چند بیانات

اپنے اساتذہ کے بارے میں ملاحظہ ہوں،

مشہور تابعی مسروق بن اجدعؒ کا بیان ہے کہ حضرت اصحابہ میں عمرؓ، علی ابن مسعود، زید بن ثابت، ابی بن کعب، ابوموسیٰ اشعری اصحاب فتویٰ تھے۔ ان ہی کا قول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک صحابی کو اچھی طرح جانچا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کا علم چھ حضرات عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبل، ابو درداؓ، زید بن ثابت پر منتہی ہوتا ہے۔ اور ان چھ حضرات کو جانچا تو معلوم ہوا کہ ان سب کا علم دو حضرات علیؓ اور عبداللہ بن مسعود پر منتہی ہوتا ہے

امام شعبی کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے چھ اہل علم تھے عمرؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، علیؓ، ابی بن کعبؓ، ابوموسیٰؓ اشعری اور اس امت کے قاضی چار تھے عمرؓ، علیؓ، زیدؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، مجاہد بن جبیر کہتے ہیں علما تو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں محمد بن سیرین کا قول ہے کہ اہل علم کی رائے میں صحابہ میں مناسک حج کے سب سے بڑے عالم عثمان بن عفان اور ان کے بعد عبداللہ بن عمر تھے میمون بن مہران کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر سے بڑھکر فقیہ اور ابن عباس سے بڑا عالم نہیں دیکھا ہے

ان علمائے صحابہ کے فقہی اقوال و آرا اور فتاوے ضخیم اور متوسط جلدوں میں جمع کئے جا سکتے ہیں چونکہ عہد صحابہ میں باقاعدہ تدوین و تالیف کا رواج نہیں تھا بلکہ بعض صحابہ اور ان کے تلامذہ یادداشت کے طور پر صحیفے اور نسخے لکھ لیتے تھے اسلئے ان کی روایات اور فتاوے اس وقت مدون نہیں ہو سکے اور بعد میں اسکی باری آئی چنانچہ خلیفہ مامون کے پڑپوتے ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب نے ابن عباس کے فتاوے بیس جلدوں میں جمع کئے تھے، ان کے شاگرد مجاہد اور مولیٰ عکرمہ نے ان سے سن کر نزول [illegible] اور تفسیر قرآن پر کتاب لکھی تھی اسی طرح علی بن ابو طلحہ ہاشمی نے ابن عباس کی تفسیری روایات کو جمع کیا تھا۔ (باقی آئندہ شمارہ)



اسلامی ممالک میں جزوی اسلام

پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان عمران خان	ترجمہ : سید غلام محی الدین

اس مختصر مضمون میں عمران خان نے مغربی تہذیب کی خامیوں کے علاوہ جس اہم مسئلہ کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے وہ دراصل سارے اسلامی ممالک کا المیہ ہے۔ تقریباً ہر اسلامی ملک میں ایک جانب مغرب زدہ لیکن برسر اقتدار طبقہ ہے اور دوسری جانب محروم و مجبور لیکن بے شمار عوام کے اسلام پسند نمائندے لیکن دونوں نے اپنی اپنی تفہیم کے ہر ملک کو اندرونی کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے جس نے دنیا کی نظروں میں عالم اسلام کی شبیہ بگاڑ دی۔ (ادارہ تعمیر حیات لکھنؤ)

میری نسل کے لوگ اس وقت پروان چڑھے تھے جس وقت مغربی استعمار اپنے عروج پر تھا۔ ہماری گزشتہ نسل تو غلام بنائی جا چکی تھی اور انگریزوں کے مقابلے میں ایک طرح احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ جس اسکول میں میں نے تعلیم پائی تھی وہ پاکستان کے اعلیٰ طبقات کے

دوسرے اسکولوں کی طرح تھا۔ ہم لوگ آزاد ہونے کے بعد بھی پاکستان بننے کے بجائے برطانوی پبلک اسکولوں کے تعلیم یافتہ طلبہ کا نقش ثانی پیدا کرنے میں لگے ہوئے تھے میں نے شیکسپیر کی اعلا تخلیقات کا مطالعہ تو کیا تھا لیکن اقبال سے نابلد تھا۔ دینیات کا کلاس تو غیر سنجیدہ سمجھا جاتا تھا۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں اپنے آپ کو اسلی طبقہ کا خود سمجھنے لگا تھا کیونکہ میں مغربی لباس پہنتا تھا۔ اور انگریزی میں گفتگو کر سکتا تھا۔ اسکول کی تقریبات میں کبھی کبھی دوسروں کے ساتھ میں بھی پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا تو لگا لیتا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ میں اپنی تہذیب کو پسماندہ اور اسلام کو از کار رفتہ شے تصور کرنے لگا تھا۔ ہمارے حلقہ احباب میں اگر کوئی شخص مذہب کی بات کرتا، نماز پڑھتا یا داڑھی رکھ لیتا تو ہم اسے فوراً ملا کا لقب عطا کر دیتے تھے۔ مغربی پریس اور رسل و رسائل کے زیر اثر ہمارے ہیرو یا تو مغربی فلموں کے اداکار ہوتے یا پھر پوپ میوزک (POP MUSIC) کے گویئے۔

جب میں اس پس منظر کے ساتھ آکسفورڈ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا تو حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یونیورسٹی میں اسلام ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کو عہد گذشتہ کی ایک بیکار روایت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ سائنس نے مذہب کی جگہ لے لی ہے اور اگر کوئی چیز منطقی دلائل سے ثابت نہیں کی جا سکتی تو پھر اس کا وجود بھی ممکن نہیں ہے۔ خرق عادات اور فوق الفطرت جیسی چیزوں کی جگہ صرف فلموں میں رہ گئی تھی۔ ارتقا کے متعلق ڈارون کے ناقص نظریات اور اسی قسم کے دوسرے سائنسدانوں نے تخلیق آدم کے ساتھ مذہب کو بھی ناقابل یقین بنا دیا تھا۔

اس کے علاوہ مغرب کا مذہبی تجربہ بھی بہت دہشت ناک تھا۔ عیسائی راہبوں نے خدا کے نام پر احتسابی عدالتوں (INQUISTIONS) کے ذریعہ جو مظالم ڈھائے تھے۔ انہیں پوری طرح سمجھنے کے لیے اسپین میں قرطبہ کے اذیت خانوں اور اذیت دینے والے آلات کا دیکھنا ضروری ہے۔ سائنسدانوں کو مرتد قرار دے کر ان پر جو مظالم کئے گئے تھے ان کی وجہ سے مغربی عوام نے یہ باور کر لیا ہے کہ سارے . . . . . مذاہب قدامت پرست ہیں۔

لیکن مجھ جیسے لوگوں کو جو چیز سب سے زیادہ اسلام سے برگشتہ کرتی تھی وہ اس کی تبلیغ کرنے کا اسلام پر جزوی عمل تھا۔ دوسرے الفاظ میں ان کے قول اور عمل میں فرق اس کا سبب ہے۔ یہ لوگ اسلام کا فلسفہ یا اس کی حقانیت بتلانے کے بجائے مذہبی رسوم پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان جانوروں سے اس لئے مختلف ہے کیونکہ جانوروں کو مخصوص کام کرنے کی تربیت دی جاسکتی ہے لیکن انسان کو اس سے بڑھ کر ذہنی یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ہمیشہ غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ مختلف افراد اور جماعتیں اسلام کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی رہتی ہیں۔

یہ معجزہ ہی تھا کہ میں خدا کے وجود کا منکر نہیں ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ بچپن سے ہی میری والدہ کا میرے اوپر غیر معمولی اثر تھا۔ کسی یقین یا وثوق کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی محبت نے مجھے مسلمان بنائے رکھا۔ لیکن میرا اسلام بھی جزوی ہی تھا اور میں انہیں باتوں پر عمل پیرا تھا جو میرے لئے آسان تھیں۔ نماز عیدین تک یا کبھی کبھی اس وقت جمعہ تک محدود تھی۔ جب میرے والد مجھے نماز کے لیے لے جانے پر مُصر ہوتے۔ اگر خدا کا وجود تھا بھی تو میں اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن یہ طے تھا کہ میری زندگی میں اس کی کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ بہر حال میری پرورش و پرداخت اس طرح ہوئی تھی کہ میں پکا صاحب بن جاؤں مجھے اس کے تمام وسائل حاصل تھے۔ سازگار اسکول اور یونیورسٹی اور سب سے بڑھ کر انگریز دور کے اعلیٰ طبقات تک میری رسائی جس کے لیے دیسی صاحب لوگ اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ پھر کرکٹ تھی جس نے مجھے دیسی صاحب بہادر بننے کے بجائے صرف دیسی آدمی بنا دیا۔

بہر حال یہ تبدیلی چشم زدن میں واقع نہیں ہوئی۔ وہ احساس کمتری جس میں میری نسل کے تمام لوگ مبتلا ہیں میری عالمی پیمانہ کے کھلاڑی بننے کے ساتھ زائل ہوتی گئی۔ دوسری بات یہ تھی

کہ مجھے دونوں تہذیبوں کا ذاتی تجربہ کرنے اور ان کی خوبیاں اور نقائص معلوم کرنے کا موقع ملا۔ مغربی معاشرہ میں سماجی ادارے مضبوط ہیں بلکہ ہمارے یہاں یہ معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن دوسری چیز جس میں ہمیں اس وقت بھی ان پر فوقیت حاصل ہے وہ ہماری خاندانی زندگی ہے جس میں سیکس (SUSSEX) میں رہتا تھا میں نے کرکٹ کے میدان میں بوڑھوں کے اکیلے پن کو شدت سے محسوس کرتا تھا ذرا یہ تصور تو کیجئے کہ آپ اپنے ضعیف والدین کو ضعیفوں کی قیام گاہ میں بھیجدیں۔ وہاں کے بچوں کو بھی اس محبت اور گرمجوشی سے سابقہ نہیں پڑتا جس کے ساتھ ہم پروان چڑھتے ہیں۔ وہ اس سماجی تحفظ سے نابلد ہیں جو ہمارے مشترکہ خاندان ہمیں مہیا کرتے ہیں۔

بہر حال میں یہ محسوس کرنے لگا کہ مغربی معاشرہ کو سب سے بڑا نقصان ارکان کلیسا سے آزادی حاصل کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیونکہ اس کوشش میں وہ مذہب اور خدا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ سائنس بہت سارے سوالوں کا جواب دے سکتی ہے لیکن وہ کبھی ان دو سوالوں کا جواب نہ مہیا کر سکے گی۔ اوّلاً یہ کہ ہمارے وجود کا مقصد کیا ہے؟ اور دوئم یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔؟ میرے خیال میں یہی وہ خلا ہے جس نے مادیت اور لذت پرستانہ تہذیب کو جنم دیا ہے۔ اگر ہماری موجودہ زندگی ہی سب کچھ ہے تو جب تک موقع ہے ہر شخص کو عیش کرنا چاہئیے۔ اور اس کے لیے صرف پیسے کی ضرورت ہے۔

ایسی تہذیب کا لازمی عاصرہ ہوگا کہ لوگوں کے ذہن میں نفسیاتی گتھیاں پیدا ہوں گی۔ اس کی وجہ روح اور جسم کے درمیان عدم توازن ہے، نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ میں جو مادی ترقی میں سب سے زیادہ حقوق حاصل ہیں۔ تقریباً ساٹھ فیصد لوگ دماغی امراض کے معالجوں سے رجوع کرتے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود جدید نفسیات میں انسانی روح کے مطالعہ کا کوئی شعبہ نہیں ہے۔ سویڈن اور سوئیٹزرلینڈ میں شہریوں کے فلاح و بہبود پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے لیکن وہاں شرح خودکشی بھی تمام ملکوں کے مقابلہ میں سب سے

زائد ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان صرف مادی فلاح کا طالب نہیں ہے اسے اس سے زائد کسی اور شئے کی تلاش ہے۔

چونکہ اخلاقیات کی اساس مذہب ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے جب مذہب کو بے دخل کر دیا گیا تو بدکرداری کو فروغ حاصل ہو گیا اس صدی کی ساتویں دہائی سے تو بدکرداری اور فحاشی برابر ترقی پذیر ہے اور اس کا سب سے پہلا نشانہ خاندانی زندگی ہے۔ برطانیہ میں طلاق کی شرح ساٹھ فیصدی ہے اور اندازاً تقریباً ۳۵ فیصد بن بیاہی مائیں ہیں۔ جرائم کی شرح تمام مغربی ممالک میں بڑھتی جا رہی ہے لیکن سب سے زیادہ تشویشناک بات نسل پرستی میں اضافہ ہے سائنس کے ذریعہ انسانی نابرابری کا ثبوت فراہم کیا جا رہا ہے۔ (ایک حالیہ جائزہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے سیاہ فام لوگ وہاں کے سفید فام لوگوں کے مقابلہ میں کم ذہین ہوتے ہیں۔) جبکہ مذہب انسانی مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۹۱ء کے درمیان دوسرے ممالک سے نقل مکانی کر کے یورپ میں بسنے والوں کی تعداد ۔۔۔۔ ۳،۲۰،۰۰۰ (تین لاکھ بیس ہزار) تھی۔ لیکن اسی عرصہ میں سبھی یورپین ممالک اور خصوصاً برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں نسلی فسادات بھی ہوئے۔ جنگ افغانستان کے دوران پاکستان میں چالیس لاکھ افغان مجاہدین نے پناہ لے رکھی تھی۔ صوبہ سرحد جیسے غریب اور غیر ترقی یافتہ علاقہ کے عوام کو اپنے معیار زندگی کے گرنے کی وجہ سے سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہاں کوئی نسلی کشاکش نہیں پیدا ہوئی۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان حالات میں برطانیہ کے اسکولوں میں پچھلے سال سے دوبارہ مذہبی تعلیم کا اجرا کیا گیا ہے۔

یہ تھے وہ حالات جن کی وجہ سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مجھے خدا کی جانب رجوع کرنے کا موقع ملا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ "غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں موجود ہیں۔" ان نشانیوں میں سے ایک چیز کرکٹ بھی تھی۔ میں جتنا زیادہ اس کھیل کا شعور حاصل کرتا گیا اسی قدر یہ بات میری سمجھ میں آتی گئی کہ جس چیز کو میں محض اتفاق سمجھ رہا تھا وہ حقیقتاً

شنا الٰہی تھی لیکن اسلام کو سمجھنے کا دروازہ مجھ پر سلمان رشدی کی شیطانی آیات کے بعد کھلا۔

مغربی ممالک میں رہنے والے میرے جیسے بہت سے دوسرے لوگوں کو اس کتاب کے خلاف مسلمانوں کے ردعمل کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ہمارے سامنے صرف دو راستے تھے: "جنگ یا فرار" علاوہ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اسلام پر کئے جانے والے حملے ناواجب تھے لہٰذا میں نے اس کے ف لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن کسی کے ساتھ مجھے یہ احساس ہوا کہ اسلام کے متعلق میرا قص علم میری راہ میں مانع ہوگا۔ چنانچہ میں نے اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا جس مجھے بہت فائدہ ہوا۔ میں نے علی شریعتی، محمد اسد، اقبال اور گائی ایٹن جیسے لوگوں تصنیفات کے ساتھ قرآن کریم کا مطالعہ کیا۔

میں مختصر الفاظ میں اپنی اس "تلاش حق" کا نتیجہ بیان کروں گا۔ جب بھی قرآن کریم مسلمانوں سے مخاطب ہوتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ "جو ایمان لائے اور جنہوں نے اعمال صالح کئے"۔ رے الفاظ میں ہر مسلمان پر دوہری ذمہ داری ہے۔ ایک خدا کے تئیں اور دوسری انسان جانب۔

اللہ پر ایمان کامل کا پہلا اثر میرے اوپر یہ ہوا کہ تمام انسانوں کا خوف میرے دل نکل گیا۔ قرآن جب یہ تعلیم دیتا ہے کہ زندگی اور موت، عزت اور ذلت صرف خدا تھوں میں ہے تو وہ ہر انسان کو تمام دوسرے انسانوں کی غلامی سے آزادی دلا دیتا ہے۔ پھر کسی دوسرے انسان کے سامنے جھکنے کی فرصت باقی نہیں رہتی۔ اقبال نے خوب کہا ہے ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

علاوہ ازیں اس شعور کے ساتھ کہ اس دنیائے فانی میں ہمیں آخرت کی تیاری ہے میں اپنے وضع کردہ زندانوں جیسے صنف ضعیفی، (جس کی ہیئت مغربی ملکوں میں عام معلوم ہے کہ پلاسٹک سرجری کرنے والوں کی بن آئی ہے) مادیت پرستی، ذاتی انا،

دوسروں کی تنقید وغیرہ سے آزاد ہو گیا۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہمیں دینی خواہشات کو ختم نہیں کرنا ہے بلکہ انہیں با اختیار بنانے کے بجائے اپنا پر اختیار حاصل کرنا ہے۔

اسلام کے حصہ سے جز پر عمل کرنے کی بنا پر میں ایک بہتر انسان بنتا گیا۔ جس نے یہ سمجھ لیا کہ محو بالذات ہونے اور اپنے لئے زندگی گزارنے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے مجھے جو کچھ عطا کیا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مدد کرنا چاہیئے جنہیں یہ سب کچھ حاصل نہیں ہے۔ اسلام کی ان تعلیمات نے مجھے کلاشنکوف بردار جنگجو بننے کے بجائے متحمل اور بردبار بنا دیا جو غریبوں اور کمزوروں کے دکھ درد کا احساس کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی کامیابیوں کو اپنی سعی کا ثمرہ سمجھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا منشا سمجھا اور اس سے میرے اندر غرور کے بجائے انکساری پیدا ہوئی۔ عوام الناس کے تئیں دیسی صاحبوں کا مغرورانہ رویہ اپنانے کے بجائے میں ان کی فلاح اور بہبود کی بات سوچنے لگا اور یہ محسوس کرنے لگا کہ ہمارے معاشرہ میں غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ قرآن کے الفاظ میں "ظلم تو قتل سے بدتر ہے" کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ میں حقیقتاً اب اسلام کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے قابل ہوا ہوں۔ قلبی سکون صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اللہ پر کامل ایمان ہو۔

میرا خیال ہے کہ پاکستان میں ہم صرف جزوی طور پر اسلام پر عمل کر رہے ہیں۔ صرف اللہ پر ایمان لانا اور عبادت کر لینا کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے اچھا انسان بننا بھی ضروری ہے۔ میرے خیال سے اکثر ایسے مغربی ممالک ہیں جہاں اسلام کے امتیازی اوصاف جیسے عوام کے حقوق کی حفاظت اور سماجی انصاف بہتر طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے وہاں کچھ بہترین انسانوں سے سابقہ پڑا ہے لیکن ان کی جو بات مجھے ناپسند ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوہرا معیار رکھتے ہیں۔ ایک جانب اپنے عوام کی حفاظت کرتے ہیں تو دوسری طرف دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے سے کمتر تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اپنے صنعتی پیداوار کا فاضل زہریلا فضلہ تیسری دنیا (غیر ترقی یافتہ ممالک) میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں۔ اپنے ممالک

سگریٹ کے اشتہار پر پابندی لگاتے ہیں۔ لیکن ایسی دوائیں دوسرے ملکوں میں فروخت کرتے یا جن پر انہوں نے خود اپنے ملکوں میں پابندی عائد کر رکھی ہے۔

پاکستان کو درپیش مسائل میں ایک یہ ہے کہ یہاں دو رجعت پسند گروہ اپنی قوت مجتمع کر رہے ہیں۔ ایک گروہ مغرب پسندوں کا ہے جو اپنی کم علمی کے باعث اسلام مغرب کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ گروہ ہر اس شخص کی مخالفت کرتا ہے جو معاشرہ کو اسلامی ـب دینا چاہتا ہے۔ یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ یہاں کا اسلام صرف ان کی پسند کے مطابق دوسری جانب وہ گروہ ہے جو اس مغرب زدہ اعلیٰ طبقہ کے ردعمل کے طور پر اپنے آپ سلام کا محافظ تصور کرتا ہے۔ یہ گروہ رواداری اور تقویٰ کی نمائش میں مبتلا ہے جو ت خود روح اسلام کی نفی کرتی ہے۔

اب جس چیز کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ان دونوں انتہا پسند گروہوں کے درمیان و تفہیم کا دروازہ کھولا جائے۔ اس کے لیے ان لوگوں کو جو ہمارے وسائل تعلیم کا سب سے فائدہ اٹھاتے ہیں اسلام کا سنجیدہ مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ایمان باللہ پر اکتفا کرنے دت گزار بن جانا ان کا ذاتی معاملہ ہے کیوں کہ قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے کہ مذہب ملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہے۔ بہرصورت ان لوگوں کو اپنی انتہا پسندی سے چھٹکارا حاصل کے لیے علم کا سہارا لینا ضروری ہے۔ انتہا پسندی سے صرف اظہار نفرت کافی نہیں ہے

قرآن کریم نے مسلمانوں کو "امت وسطیٰ" بتلایا ہے نہ کہ انتہا پسند۔ پیغمبر اسلام علیہ وسلم کو صرف اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ کوئی اسلام نا ہے یا نہیں کرتا اس کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اس لیے اسلام میں دوسروں پر اپنے ـ تھوپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم دوسرے مذاہب، ان کی کتابوں اور ان کے پیغمبروں کی تکریم کریں۔ ملیشیا اور انڈونیشیا میں نہ تو سلطان تھیں۔ اور نہ مبلغین اسلام کی منظم جماعتیں۔ لوگوں نے اسلام کو اس کے اصلی

اصول اور مسلمان تاجروں کے حسن اخلاق کی وجہ سے قبول کر لیا تھا۔ اس وقت اسلام کو بدنام کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ ان مسلمان ملکوں کا ہے جو مکمل اسلام کے بجائے جزوی اسلام پر عامل ہیں۔ خاص طور پر ایسے ممالک جو اپنے عوام کو ان کے حقوق سے محروم رکھ رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگ کوئی معاشرہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر عامل ہو تو اس کی ایک بڑی خصوصیت رواداری ہوگی۔

اگر ہمارا مغرب زدہ طبقہ اسلام کا مطالعہ شروع کر دے تو وہ ہمارے معاشرہ کو فرقہ بندی اور اس کی انتہا پسندی سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلا سکتا ہے کہ اسلام کتنا ترقی پسند مذہب ہے۔ یہ لوگ مغرب کو اسلامی نظریات سے روشناس کرا سکتے ہیں۔ گذشتہ سال شہزادہ چارلس نے آکسفورڈ کی اپنی ایک تقریر میں اس کا اعتراف کیا تھا کہ مغربی دنیا اس وقت بھی اسلام سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ لیکن اگر وہی لوگ جو اس کے لیے سب سے زیادہ اہل ہیں اسلام کو پسماندہ سمجھنے لگیں گے تو پھر یہ کام کون انجام دے گا۔ اسلام تو سارے عالم کے لیے ہے اور اسی لئے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کا لقب دیا گیا تھا۔

(تعمیر حیات لکھنؤ م ۲۵/۱ ۹۶ سے ماخوذ)

سلسلہ ص ۱۴

ان کا حصہ کم ہونے کے اسباب میں سے کتنا دخل ان کا اپنا ہے اور کتنا اور کس نوعیت کا حکومت اور اداروں کا اور بیوروکریسی کے ذریعہ برتے جانے والے امتیازی سلوک و تعصب کا ہے۔ یہ کام کمیشن کے سپرد اس کے ایکٹ میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح تیسرا اہم کام کمیشن کے ذریعہ ملک میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کے دوران غیر جانبدارانہ نفاذ قانون کا کرایا جانا چاہیئے۔ جس کے لیے اور اصلاحات خواہ بعد میں بھی یہ قانون بن جائے کہ فساد میں مارے جانے اور لٹنے و برباد ہونے والوں کو فوری طور پر پورا تاوان دیا جائے گا۔

[illegible]

سید حامد
سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت

علیگڑھ کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اکابرین اور معتقدین نے سیاسی اعتبار حاصل کر لیا اور حکومت وقت پر اثر انداز ہونے کے لیے گزشتہ ربع صدی میں اکثر علیگڑھ کے ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ ساز باز کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم یونیورسٹی کو اسی نہج پر نہیں چلا سکے جس کی داغ بیل سر سید نے ڈالی تھی۔ اور جس کا خواب انہوں نے دیکھا تھا اپنی خود غرضی اور کوتاہ اندیشی سے ہم اصلاح کے امکانات کو کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اہلوں کا تقرر ہو تو ان کے طلبگار باہر کے اداروں میں بھی مل جائیں گے۔ نااہل آ گئے تو جم کر رہ جاتے ہیں۔ اب اگر فیکلٹی کی اصلاح کا جرأت مندانہ قدم اٹھایا بھی گیا تو اس میں سالوں لگ جائیں گے۔ بہرکیف علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہمہ گیر اور موثر اصلاح کے لیے ترس رہی ہے

سب سے زیادہ جو بات یونیورسٹی کے معیار پر خاص اثر انداز ہوئی ہے وہ ہے۔ طلبہ کا اندھا دھند [illegible] جو فیکلٹی اور [illegible] کی صلاحیت کو بھی پار کر گیا ہے۔ ہندوستان کے بیشتر مسائل کی جڑ آبادی کی کثرت ہے ایسے ہی یہاں مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کا ہے۔ طالب علموں کے داخلے میں بے تحاشا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ [illegible] آسان نہیں ہوتی۔ لیکن [illegible]

ہماری مقبولیت بھی تو ساتھ ہی ساتھ بڑھتی ہے۔ چنانچہ طلبہ کی تعداد فیکلٹی اور ہوسٹل دونوں کی صلاحیت سے کہیں آگے بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے نظم ٹوٹنے اور معیار گرنے لگتا ہے۔ یہ مسئلہ بیشتر یونیورسٹیوں کی درپیش ہے لیکن علیگڑھ کو شاید سب سے زیادہ۔ کیونکہ یہاں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ یہ ہماری یونیورسٹی ہے ہمیں داخلہ نہ دے گی تو کسے دے گی۔ عام حالات میں تعلیمی اور اقامتی یونیورسٹی میں پندرہ ہزار سے زیادہ طلبہ کی صورت میں نہ ہونے چاہیں۔ اور ہوسٹلوں میں تو جہاں گنجائش سے زیادہ طلبہ داخل ہوئے۔ وہیں فتنہ سر اٹھاتا ہے ہماری یونیورسٹی میں اس وقت ۱۲ ہزار طالب علم ہیں ہوسٹلوں میں ایک کی جگہ دو رہتے ہیں۔ جو لوگ تکلیف اور تنگی میں رہتے ہیں۔ ان کے دل بھی تنگ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو اور ارباب اہتمام کو تکلیف پہنچانا بھی شروع کر دیتے ہیں ان کا دھیان پڑھائی سے ہٹ جاتا ہے اچٹ جاتا ہے تدریسی اور اقامتی صلاحیتوں کے بخئے ادھڑنے لگتے ہیں۔ ایسے میں یہاں کے طلبہ دوسری بڑی یونیورسٹیوں سے مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ کسب فضیلت پر انہیں دسترس نہیں رہتی۔

ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ ایک دفعہ تعداد بڑھ جائے تو اسے گھٹا کر حدود میں لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا خصوصاً ایسے زمانہ میں جب اعلیٰ تعلیم کی مانگ دن بدن بڑھتی جا رہی ہو اقامتی گنجائش میں اقامت خواہ طلبہ کی تعداد کے بقدر اضافہ ممکن نہیں ہے اور اگر ممکن ہو بھی جائے تو اس طرح کی یونیورسٹی کے لیے ایک موزوں تعداد ہوتی ہے جس سے تجاوز معیار دشمن، ضابطہ شکن اور ہلاکت خیز ہو جاتا ہے۔ لہذا علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پر تعداد کے جراحت رساں دباؤ کو روکنے کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ مسلمان ایک دوسری یونیورسٹی قائم کریں تاکہ بار بانٹا جا سکے۔ اور موجودہ یونیورسٹی کا بوجھ ہلکا ہو۔ ورنہ تعداد کے بوجھ کے نیچے نہ صرف معیار اور روایات اور یکسوئی اور

حسن اطوار سب کچلے جائیں گے۔ اور بالآخر تمام یونیورسٹی پر جا کر ٹوٹے گی۔ یہ سب کچھ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ اسے احساس کی کمی سمجھا جائے یا حوصلہ کی۔ کیا اقدامیت ہم میں باقی نہیں رہی؟ کیا ہم پیش قدمی کر ہی نہیں سکتے۔ کیا ہماری انتہا [illegible] آزادی عافیت اور خوشحالی ہے۔ جس ادارے کے قائم ہوئے سوا سو سال ہوئے [illegible] اپنی ساخت، اپنی اٹھان، اپنی افتادِ طبع، اپنی صلاحیتوں اور گنجائشوں کے اعتبار سے بالکل بدلی ہوئی اور تیزی سے بدلتی ہوئی۔ اور برق رفتار دنیا کے تقاضوں کو پورا کر سکے گا؟ ان سوالوں کا جواب سوچئے۔ اور دیجئے اور خدارا جلد دیجئے۔ سر سید نے یہ ادارہ اس وقت قائم کیا جب وسائل کا قحط تھا اب جبکہ وسائل کی ریل پیل ہے۔ اور ہم ایک آزاد جمہوری حکومت میں سانس لے رہے ہیں تو کون سی بات ہمیں اپنی چیختی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے سے روک رہی ہے؟ ایک نئی یونیورسٹی قائم کر دیجئے۔ ایک بنتھ دو کاج بکر دکھایئے۔ اپنی موجودہ یونیورسٹی کو ڈوبنے یا کچلے جانے سے بچایئے۔ آبادی کے بوجھ سے اسے چھٹکارا دلایئے۔ اسے بلند سدھاریئے سنوارئیے۔ اس کی تجدید کیجئے۔ اسے سانچے میں اس طرح ڈھالئے کہ وہ تازہ ترین تحقیق اور جدید ترین ماہیتی تجربات کو اپنے میں سمو سکے۔

نئی یونیورسٹی کی داغ بیل اس طرح پر ڈالیے اس کا قوام اس طرح تیار کیجئے کہ وہ اس نظام کی تقلید سے محفوظ رہنے جینے لیں۔

ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد اب دو سو کے لگ بھگ ہو گئی۔ یہ تعداد نہ بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ دے پا رہی ہے نہ تعلیم کی بڑھتی ہوئی مانگ کا اور نہ تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی کے نت نئے تقاضوں کا۔ نامساعد حالات اور نا موافق رجحانات ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیمی اعتبار سے بہت پسماندہ کر دیا ہے۔ سید اللہ کو مسلم یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالے ہوئے ہیں اور ایک سو سال ہو گئے۔ ایم اے او کالج

کو یونیورسٹی ہوئے پون صدی گزر چکی تا خدائے تعلیم کی رحلت کو دو کم سو سال بیت چکے
کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیمی ادارہ جو جدید تعلیم کے ابتدائی دور میں کھولا گیا
تھا آبادی اور تعلیم کے جھنڈاں دھماکے کی تاب لا سکتا ہے۔ علوم کی دنیا اور ہندوستان
کے حالات میں جو محیر العقول اور عہد آفریں تبدیلی ہوئی کی شرح ہے ہم تو اس تبدیلی
کا ذکر کریں گے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دو نمایاں تاریخی مرحلوں آزادی کے بعد اور اس کا
ذکر اختصار کے ساتھ۔ ایم اے او کالج اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والی یونیورسٹی کا خاکہ
آکسفورڈ اور کیمرج بالخصوص کیمرج یونیورسٹی کے نمونہ پر بنایا گیا تھا۔ وہ دور انگریزوں کا دور
اقبال تھا خورشید کا یارانہ تھا کہ سلطنت برطانیہ کے طول و عرض میں بیک وقت رو گردانی
کر سکے۔ اس وقت افرادی طاقت اور شخصیت کے نشوونما کے اعتبار سے انگریز ساری
اقوام عالم پر فائق تھے مشہور تھا کہ انگریزوں نے بڑی بڑی لڑائیاں جو لڑیں۔ وہ ان
کے کردار ساز اسکولوں کی بازی گاہوں میں جیتی گئیں۔ سید احمد اور سید محمود نے آکس
برج پر ایم اے او کالج کو ڈھالا۔ اور اصل پر اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کی
روایات اور ثقافت کا اضافہ کر دیا۔ زیادہ زور کردار ساز کھیلوں، مباحثوں، مقابلوں
انداز گفتگو، آداب محفل اور اطوار معیشت پر تھا۔ اس وضع تعلیم و تربیت کا کچھ ہاتھوں
ایک فائدہ در اصل ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوا کہ انگریزوں کے قائم کئے ہوئے دفاتر میں
مسلم گڑھ کے طلبہ کو نوکریاں ملنے لگیں فرصت کے اوقات سے عموماً گیر طرز نظام میں
تعلیم و تربیت کے یہ ڈھنگ بے محل نہ تھے۔ دماغ میں علم کا انبار لگا نے کے بجائے شخصیت
اور کردار، حوصلے اور اعتماد، فتح مندی اور زندگی دلی اور سیرت، صحت اور صحبت کو
بنانے اور سنوارنے اور فروغ دینے پر توجہ مبذول کی گئی۔ تعلیم نے وسعت اختیار کی
دسترس اس سے تعلیم خاص کر اعلیٰ تعلیم تک خوش حال لوگوں کی تھی۔ ...
کر جو پڑھ گیا وہ دھکا سے لگ گیا۔ تحقیق و تفتیش کا جو دور دورہ آج ہے وہ

وقت تصور سے پرے تھا۔

عالمی سطح پر بیسویں صدی میں بتدریج سائنس ٹیکنولوجی اور تحقیق کی لے تیز ہوتی چلی۔ صدی کے آخری نصف میں تو یہ عالم ہو گیا کہ جو پڑھے لکھے افراد سائنس کے حصار کے باہر رہ گئے۔ ان کا شمار گویا اَن پڑھوں میں ہونے لگا۔ وہ خود بھی خود کو جاہل سمجھنے لگے۔ سلامت روی، خوش مزاجی، فلسفہ اور ادبیات، تہذیب اور تکلف کی کمان اُتر گئی۔ آسائش اور آرائش کا زمانہ ختم ہوا۔ دوڑ اور رفتار کا زمانہ آ گیا آداب و اطوار سے دھیان ہٹ گیا۔ مقابلہ اور رفتار کی بن آئی۔ غرض یہ ہمارا ہو گئی آدمی نے اپنی عنان ہوس کے ہاتھ میں دے دی روایتی سہم رہ روایتی قدریں بے پناہ ہوتی چلی گئیں۔ انسان قدرت کو تسخیر کرتا چلا گیا۔ اور نفس خود انسان کو۔ اس انقلاب نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو متزلزل کر دیا وہ اپنا رستہ سمت، اپنی افتادِ طبع اپنا انداز فکر بدلنے نہیں پائی۔ اس ڈھنگ سے۔ بدلنے نہیں پائی جو بدلنے کا حق تھا بعض روایات کو اس نے سینے سے لگائے رکھا لیکن بسا اوقات ان روایتوں کا صرف ظاہر باقی رہ گیا باطن کا دور دور پتہ نہ رہا مغز نکل گیا چھلکا باقی رہ گیا۔

لیکن علیگڑھ کو جراحت پہنچانے میں زیادہ حصہ ایک دوسرے انقلاب کا ہے جس نے وطن کو آزاد اور تقسیم کرایا۔ مسلمان ان کے ساتھ ان کی یونیورسٹی چشم زدن میں مشتبہ ہو گئی۔ انتہاپسندوں نے تو تقسیم ہند کی ذمہ داری اس پر ڈال دی۔ غیر کے کٹہرے میں جو سانس لیتے ہیں ان کی تندرستی گھاٹنے لگتی ہے۔ ان میں ایک وقت کے بعد ایک طرح کی ضد پیدا ہو جاتی ہے وہ خول میں سمٹ جاتے ہیں گویا انہیں پیار لگنے لگتا ہے۔ مسلم گروہ کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ اس احساس نے کہ ہم مشتبہ اور مظلوم ہیں ہمیں بالعموم ایک صحت مند اور پر امید اور پر اعتماد انداز فکر سے محروم کر دیا۔ تنگ نظری متعصب دروازے کھلا ان پر بند ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ پڑھائی کو ذوق و شوق سے میسر۔

نہ کر سکے۔ یونیورسٹی چھوڑیں گے تو کہاں جائیں گے۔ یہ سوال طمانیت کو برہم کرتا رہا۔ یکسوئی نہ ہو تو پڑھائی میں دل کیسے لگے۔

دبہار نے فرسودہ اور حلبہ از کار کر دیا ہے اس کے شاخوں پر ایک بے معرف دخل اندازی اور ہجوم پیکر کورٹ کا بار نہ ڈالیے۔ اس کی ہئیت اس کا ڈھیرہ ایسا بنائیے کہ سے سرگرم عمل رہنے میں کوئی تکلف نہ رہے۔ اس کا تجربہ ہنر مندی میں حائل نہ ہو۔ نئی یونیورسٹی سائنس اور ٹیکنولوجی کی یونیورسٹی ہو۔ جو علم کے سرحدی علاقوں کا احاطہ کرتے اجاگر کرتی رہے اس کی لائبریریاں اور لیبارٹریاں تازہ ترین کتابوں جرنلوں اور آلات وادوات اور الیکٹرانک اختراعات و ایجادات سے سجی ہوئی ہوں۔ ذرائع ابلاغ میں جو حیرت انگیز انقلاب رونما ہو رہے ہیں جنہوں نے ساری دنیا کو ایک واحد لائبریری میں منتقل کر دیا ہے ہماری یونیورسٹی ان سب سے منفعت اندوز ہو یہ یونیورسٹی ترقی و تحقیق کے تازہ ترین لمحوں، رجحانوں اور عزائم سے ہم آہنگ اور ہم قدم ہو۔ ایک چھوٹے سے باخبر اور موثر بورڈ آف گورنرس اور ایک بورڈ آف مینجمنٹ کے ہاتھ میں یونیورسٹی کی باگ ڈور دے دی جائے۔ یونیورسٹی کو قائم اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے کیا جائے۔ اور اسے بالمقصد ان ساری برائیوں اور کج ادائیوں، ملاوٹوں، سفارشوں، سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں سے محفوظ رکھا جائے جو محور سے ہٹنے کے سبب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہو گئی ہیں۔ اور جنہوں نے اس کے کردار کو گھائل کر دیا ہے۔

یہاں سوال یہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اب تو ہمارے پاس دو یونیورسٹیاں آ ہیں ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ جو علیگڑھ کی ہم عمر ہے دوسری جامعہ ہمدرد جو آزادی کے بعد وجود میں آئی ہوئی پہلی اسلامی یونیورسٹی ہے۔ جامعہ ملیہ کو مرحوم انور جمال قدوائی نے ایک طویل دور تعطل سے نکالا اور اس کو نئی ہئیت سے بعد ایک جدید [illegible] کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی سعی بلیغ کی۔ لیکن ابھی اس میں [illegible] آتا تھا

باقی ہے۔ بہر کیف مجوزہ جدید یونیورسٹی کی قبا اس کی قامت پر راست نہیں آتی۔ جامعہ ہمدرد بقامت کہتر ہونے کے ساتھ ساتھ بقیمت بہتر کے منصب پر فائز ہونے کے ابھی جتن کر رہا ہے اور اس کا الگ ایک محدود کار آمد اور منفرد علاقہ تخصیص ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ان تحقیقات اور تقاضوں کا [illegible] پورا کر سکتا۔ جو ہر لمحہ رونما ہو رہے ہیں ہمیشہ سے ابھر رہے ہیں ضرورت اور سخت ضرورت ایک ایسی یونیورسٹی کی ہے جو ڈھالی ہی گئی ہو جدید سائنسی اور ٹیکنالوجی سے عہدہ برآ ہونے اور رہنے کے لئے۔

جس یونیورسٹی کی روپ ریکھا سطور بالا میں بنائی گئی ہے۔ دَرشنائی گئی ہے اسکی ضرورت کا احساس ہندوستان میں ہر جگہ پیدا ہو رہا ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ اُن ہندی مسلمانوں میں جنہوں نے دوسرے ملکوں میں کسب معاش کے لیے عارضی سکونت اختیار کی ہے یقین ہے کہ اس پروجیکٹ کو "این آر آئی" کی بھی پوری تائید حاصل ہوگی انشاء اللہ ایسے ماحول میں جب معیشت کے ابواب کھول دیے گئے۔ ایک اور پرائیوٹ یونیورسٹیوں بل پارلیمنٹ میں زیر غور ہے۔ ہماری نئی یونیورسٹی کو اپنی تاسیس کے لیے زیادہ دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔ اس کے فوائد آشکار ہیں۔ غایت وضاحت ان کی تفصیل میں جانے سے روکتی ہے ایسے پروجیکٹ کو ذرائع اندرون و بیرون ملک سے آسانی حاصل ہو جائیں گے۔ اس وقت جدید یونیورسٹی کے لئے فقط [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس تجویز [illegible] [illegible] کرتی ہے۔

پروفیسر اقبال احمد انصاری

اقلیتی کمیشن کی کارکردگی

اقلیتوں کے حالات کے جائزہ اور ان کے لیے سفارشات پیش کرنے اور موجودہ دستو
میں دیے گیے اقلیتی حقوق کی ضمانت کی عملی کارکردگی پر نظر رکھنے کے لیے ایک غیر جانبدار
فراہم کرنے کا وعدہ تحریک آزادی کے ان تمام مسودوں میں ملتا ہے جن کا تعلق اقلیتوں
سے خصوصاً فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لیے۔ جو اسکیم گاندھی جی نے ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفر
میں پیش کی پھر ۱۹۴۵ء میں سپرو کمیٹی کی دستوری تجاویز میں اس طرح کے اقلیتی کمیشن کا
وعدہ موجود ہے۔ ان تمام یقین دہانیوں کے باوجود دستور سازی کے آخری مرحلہ اکتوبر ۱۹۴۹
میں مسودہ دستور کے آرٹیکل ۲۹۹ کے متن سے لفظ اقلیت حذف کر دیا گیا۔ جبکہ اس آ
کو خصوصاً اقلیتوں کے حقوق کی نگرانی کے لیے پہلے مراحل میں وضع کر کے دستور ساز
نے اسے منظوری دے دی تھی اقلیتی ارکان مثلاً سردار حکم سنگھ نے پرزور احتجا
لیکن انہیں سردار پٹیل نے یہ کہہ کر خاموش کیا کہ اکثریت پر اعتماد رکھو اقلیتوں کے ساتھ
انصاف ہوگا۔

دستوری تحفظات پاکر اقلیتوں کو کاسہ گدائی لے کر یہ سوال بار بار اٹھ
ان کے احوال پر نظر رکھنے کے لیے اقلیتی کمیشن قائم ہو۔ حالات نے کروٹ لی تو ماہ

ایک اقلیتی کمیشن تو قائم ہوا جسے بااختیار آزاد ادارہ کے طور سے کام کرنے کے بجائے وزارت داخلہ۔ پھر وزارت فلاح عامہ کے ماتحت کام کرنے کا حکم ہوا۔ کمیشن کے فرائض کی عامی جامع فہرست سونپی گئی لیکن اختیارات اس قدر کہ اس کی سالانہ اور خصوصی رپورٹیں اور سفارشات پارلیمنٹ کے سامنے حکومت کے میمورنڈم کے ساتھ پیش کر دی جائیں گی۔ اس طرح کر ادارے سے چند ماہ کے اندر جناب ایم آر مسانی جیسے آزاد مزاج کا کمیشن کی اولین چیرمینی سے مستعفی ہوجانا قابل فہم ہے۔ دوسرے چیرمین جسٹس ایم آر اے انصاری مقرر ہوئے۔ جنہیں اپنی جرأت و بے باکی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ (موصوف سے ایک بار ان کے دفتر میں ملا) تو بے بسی کا یہ عالم کہ دفتری سہولتیں بھی باآسانی دستیاب نہیں تھیں۔ بہ ظاہر تھی حکومت بدل چکی تھی نئے حاکم کو ان کے تیور پسند نہیں تھے۔ جسٹس حمید اللہ بیگ صاحب نے کسی حد تک مخلصانہ سعی اقلیتوں کے لیے کی اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس وقت کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر این سی سکسینہ کی اس تحقیقاتی رپورٹ کو داخل فائل کر دیا جو موصوف نے ۱۹۸۲ء کے میرٹھ کے فساد کے بارے میں کی جس میں ضلع کے انتظامیہ کی غلط کاری کا پردہ فاش ہو رہا تھا (بہت بعد میں رپورٹ ایک دوسرے ادارہ نے شائع کی)۔ اس طرح سکسینہ صاحب کی طرف سے پیش کردہ ایک کارآمد جامع منصوبہ برائے اقلیات اور ان کے مسائل سے بے اعتنائی برتی جس سے اسکیم دفن ہو گئی۔ جسٹس بیگ کی ترجیحات کا یہ حال تھا کہ دسویں سالانہ رپورٹ برائے اپریل ۱۹۸۷ء تا مارچ ۱۹۸۸ء میں یہ درج ہے کہ کمیشن کا جولائی ۱۹۸۷ء میں میرٹھ کے فساد کی تحقیقات کے لیے مجوزہ دورہ ضلع مجسٹریٹ کی خواہش کے احترام میں ملتوی کر دیا گیا جبکہ رپورٹ میں دنیا کے سیاسی و فلسفیانہ موضوع پر سیمیناروں کا جگہ جگہ ذکر ہے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران اقلیتی کمیشن کو بااختیار بنانے کا مطالبہ کیا جا رہا۔ یہی زمانہ ہے جس میں حقوق انسانی کا عالمی چرچا بڑھنے سے ہمارے ملک میں بھی

حقوق انسانی کمیشن کا مطالبہ شروع ہوا۔ بالآخر ۱۹۹۲ و ۱۹۹۳ء میں دو ایکٹ پارلیمنٹ میں منظور ہوئے ایک National commision for Minorities Act 1992 اور دوسرا Protection of Human Right Act 1993۔

جو دو با اختیار کمیشنوں برائے اقلیات و برائے حقوق انسانی کو وجود میں لانے کے موجب ہوئے۔ حقوق انسانی کی رضاکارانہ انجمنوں نے کمیشن برائے حقوق انسانی کے بل پر کافی دنوں تک غور و خوض اور تنقید و جرح کی۔ حکومت نے تبادلہ خیال کے مواقع بھی فراہم کئے جس کے نتیجہ میں حکومت بل میں چند ضروری ترمیمیں کرنے پر آمادہ ہوئی تاکہ کمیشن کے چیرمین حکومت کے نامزد ہونے کے بجائے آزادانہ رویہ اختیار کر سکیں۔

۱۹۹۲ء میں جب اقلیتی کمیشن کا بل پیش ہوا تو حقوق انسانی کی ساری چھوٹی بڑی انجمنوں نے اس سے مکمل بے اعتنائی برتی۔ بل پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے لیے یہی کیا کم تھا کہ ایک وزارتی دفتر کے بجائے کمیشن کو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعہ با اختیار بنایا جا رہا ہے۔ انھوں نے ایکٹ کی شقوں پر کوئی توجہ نہیں کی۔ حقوق انسانی کمیشن اور اقلیتی کمیشن کے بلوں کی ان دو شقوں کا اب مقابلہ کیجئے جو ارکان کے تقرر سے متعلق ہیں۔

اقلیتی کمیشن ایکٹ کا چیپٹر ۱۱ سے کلاز 3 (2) کمیشن چیرمین اور چھ ارکان پر مشتمل ہوگا جنہیں مرکزی حکومت ممتاز اہل اور دیانتدار لوگوں میں سے نامزد کرے گی۔ حقوق انسانی کمیشن کے چیپٹر 11 کلاز (4) کے مطابق چیرمین اور ارکان کا تقرر صدر جمہوریہ مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل کمیٹی کی سفارش پر کرے گا: (1) وزیر اعظم (2) لوک سبھا کے اسپیکر (3) وزیر داخلہ (4) لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں حزب اختلاف کے لیڈران (5) ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا۔

دونوں کمیشنوں کے ایکٹ میں اور طریقہ کار میں جو بین فرق ہے وہ اختیارات سے متعلق نہیں بلکہ طریقۂ تقرری ارکان سے متعلق ہیں۔ دونوں کمیشنوں کو ایک سول کورٹ کے جبکہ وہ کسی دیوانی مقدمہ کی سماعت کرتی ہے، اختیارات دیئے گئے ہیں۔ مزید اختیارات حقوق انسانی کمیشن کو اس کے تفتیشی فرائض کے سبب دیئے گئے ہیں۔ اقلیتی کمیشن کو کچھ اختیارات حاصل ہیں ان کی درجہ ذیل شامل ہیں: افراد کو سمن کرنا اور ان کا بیان حلف لینا اور جانچ کرنا، کاغذات / مسودات طلب کرنا اور انہیں حاصل کرنا، پبلک ریکارڈ طلب کرنا، کمیشن جاری کرنا وغیرہ۔

دونوں کمیشنوں کا اہم حق ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً سفارشات برائے تحفظ حقوق، خصوصی رپورٹیں اور سالانہ لازمی رپورٹ پیش کریں۔ حکومت اس کی پابند ہے کہ ان رپورٹوں کے ساتھ اپنی جانب سے عملدرآمد کی رپورٹ اور عدم منظوری کے معقول اسباب میمورنڈم لگا کر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے رکھے اسی طرح اقلیتی کمیشن ریاستی حکومتوں کو ان کے حدود کار سے متعلق رپورٹیں و سفارشات پیش کرنے کا مجاز ہے جس کے بارے میں حکومتیں پابند ہیں کہ انہیں ریاستی اسمبلی میں اپنے میمورنڈم کے ساتھ اسے پیش کردیں۔

ان اختیارات کا بیش از بیش استعمال کرتے ہوئے حقوق انسانی کمیشن نے قلیل عرصہ میں قومی زندگی میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ وہ ایک ہی میں جج نیا وہ رکشمیر کے پی ایس ایف کی زیادتیوں کا پردہ فاش کرچکی ہے، اب بمبئی فسادات کی تحقیق کی ذمہ داری لے رہی ہیں۔ اس نے رضاکار تنظیموں سے بلا تعامل جاری رکھا ہے۔ متعدد سیمینار و ورکشاپ کرا چکی ہے۔ حقوق انسانی کی تعلیم کے کام کا آغاز اس کی تحریک پر ہو رہا ہے، جیل کے قانون کی اصلاح کے لیے وہ اب کوشاں ہے وغیرہ۔ حقوق انسانی کمیشن اب تک دو رپورٹیں ۹۴-۱۹۹۳ء دوسری ۹۵-۱۹۹۴ء کے لیے وقت پر پیش کرچکا ہے

اس سے زیادہ زوال اقلیتی کمیشن نے تقریباً تین سال کے عرصہ پر مبنی اپنی کوئی سالانہ لازمی رپورٹ پیش نہیں کی۔

جسٹس محمد سردار علی خاں جو اپنے عہدہ کے باعث حقوق انسانی کمیشن کے بھی ممبر ہیں اور اقوام متحدہ کے ذیلی کمیشن برائے تدارک امتیازات و تحفظ اقلیات کی رکنیت سے بھی سرفراز ہیں" انہیں کب یہ انکشاف ہوا کہ کمیشن کے پاس خاطر خواہ اختیارات و طاقت نہیں۔ ایسی بھی بے اختیاری نہیں کہ اس دور کی ایک رپورٹ بھی تیار نہ ہو سکے۔ انہیں اپنی نا طاقتی سمجھنے میں تقریباً ڈھائی تین سال کیوں لگے؟ اگر مسئلہ مالی وسائل اور افرادی تعاون و سہولتوں کا ہے تو اسے ابتدائی دنوں ہی میں ایک اشو بنا کر حکومت پر یہ واضح کیا جا سکتا تھا کہ ان پر جو بھاری ذمہ داری عائد کی گئی ہے اسکے لئے اتنے مالی وسائل اور سہولتیں درکار ہیں۔ پارلیمنٹ کو یہ معلوم ہوتا کہ مندرجہ ذیل کام جو کمیشن کو سونپے گئے ہیں وہ وسائل کی نایابی کے سبب محض پر فریب نعرے ہیں۔ کمیشن کے فرائض کی فہرست میں حسب ذیل امور شامل ہیں

(۱) اقلیتوں کی ترقی کی رفتار کا جائزہ اور احتساب

(۲) اقلیتوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی ترقی سے متعلق ریسرچ و مطالعات کا اہتمام کرنا۔

(3) اقلیتوں کے ساتھ بے جا امتیازی سلوک کا مطالعہ کرنا۔ جائزہ لینا اور اس کے تدارک کی تدابیر کرنا

(۴) دستور میں دی گئی ضمانتوں پر عمل درآمد کا جائزہ لینا و احتساب کرنا۔

ان وسیع فرائض اور قابل لحاظ اختیارات کے باوجود اقلیتی کمیشن کی تسلی بخش کارکردگی نہ ہونے کے اسباب حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ چیرمین و ارکان کے تقرری کا طریقہ ایسا ہے کہ سب لوگ حکومت کے نامزد کردہ کی حیثیت رکھتے ہیں (فرداً فرداً ہر رکن و چیرمین کے مزاج و افتاد طبع سے فی الوقت بحث نہیں) دوئم یہ کہ ملک کا سیاسی کلچر ایسا منافقانہ

کا ماحول ہے کہ بڑھ بڑھ کر دعوے (تحریری بھی) کرنے میں کوئی عار نہیں لیکن اس کے لیے
بلکہ کی رو سے عملی کارروائی ہو گی اور نہ مالی وسائل کی فراہمی (جس کی اچھی مثال
ظم کا اقلیتوں کے لیے پندرہ نکاتی پروگرام ہے جس کی حیثیت ۱۹۸۳ء سے اب تک
وعظ و پند کی ہے اسے کبھی قانونی درجہ تو کجا پالیسی کا بھی درجہ نہیں دیا گیا اور نہ اس کے
وسائل مہیا کیے گئے) تیسری وجہ یہ ہے کہ "اقلیت" کے لفظ سے وابستہ ہر کام
م بدنام کم سے کم مشتبہ ہے اس لیے کہ اقلیتی سیاست (اکثریت کے خیال میں)
ہند کی موجب ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخلص و ایماندار دانشور بشمول حقوق انسانی کی
ہلب اقلیتی کمیشن جیسے ادارہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتیں۔ ملک کے پریس بلکہ پارلیمنٹ
اس سے اغماض برت رہا ہے ورنہ کوئی اور ادارہ ہوتا تو یہ بات ضرور نمایاں طور سے
تھر کی جاتی کہ ڈھائی تین سال ہونے کو آئے اب تک ایک رپورٹ بھی پیش نہیں
جبکہ مشق (12) میں اسے لازم قرار دیا گیا ہے
مسلمانوں کے باشعور طبقہ کو بھی شاید اندازہ نہیں کہ کمیشن (جس کا وعدہ ۱۹۳۱ء سے
رہا تھا) بہت سے اہم کاموں کی تکمیل کا ذریعہ اپنے موجودہ قواعد اور ضوابط
اندر بھی بن سکتا ہے مثلاً اقلیتوں کی معاشی سماجی و تعلیمی حالت کا جائزہ لینا (
س کے لیے سب سے پہلے رجسٹرار جنرل کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۱ء
کے مردم شماری کے اعداد و شمار برائے مذہبی اقلیات شائع کریں بلکہ ان کے دفتر
ان Table کو جو مذہب Religion کے نام سے ہیں اور تعلیم و
سماجی حالات کے Table crosstabulate کر کے خود کمیشن اسے شائع کرے
ہے۔ ایسا کرنے میں کیا مانع ہے؟ کمیشن کو مسودات طلب کرنے کا حق ہے۔) دوم یہ کہ
تین معتبر معاشیات کے ماہرین خصوصی پر مشتمل ایک پینل اس کام کے لیے بنایا جا سکتی ہے
وہ سائنٹفک جائزہ لیں کہ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پسماندگی اور ملازمتوں میں

باقی صـ ۲۹ پر

نور آفاقی
جڑچرلہ محبوب نگر

تنقید و تبصرہ

"کتاب فیضانِ رسولؐ"

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اُن شعرائے کرام کو جو بحضور سرورِ کائنات ؐ ہدیۂ نعت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اور اُن حضرات کو بھی جو اپنی گوں ناگوں مصروفیت کے باوجود نعتیہ مجموعہ شائع کروانے میں پیش پیش رہے۔ اور رہتے ہیں۔ جن کی کاوشوں کی بدولت زیرِ نظر نعتیہ مجموعہ بعنوان "فیضانِ رسولؐ" منظرِ عام پر آیا۔ بقول حضرت علی احمد جلیلی "نعت گوئی کوئی آسان نہیں۔ اس کا راستہ پل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے" اسی لیے حضرت غالب کہتے ہیں۔

"غالب ثنائے خواجہ" بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اِس مجموعہ میں مستقر حیدرآباد شہر کے منجملہ چند اساتذۂ وقت صرف ۳۲ شاعروں کی نعت شامل ہیں۔ اکثر حیدرآبادی کہنہ مشق شعراء اور بعض اساتذہ کا کلام دانستہ یا نادانستہ شائع نہیں ہو سکا۔ امید کہ آئندہ بھائی جناب صلاح الدین نیرؔ بلا تحفظِ ذہنی اسی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے یہ فیضانِ رسولؐ فراخ دلی مظاہرہ کریں گے۔

خدا رکھے سلامت نور آفاقی دعائیں دو
صلاح الدین نیرؔ کا دکن میں دم غنیمت ہے

میں بھائی عبدالرحمٰن قریشی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ وہ "فیضانِ رسولؐ" اور چند دوسری کتابیں بطورِ خاص میرے مطالعہ کے لیے بھجوا گئے۔ جو میرے کتب خانے کی زینت اور اضافہ کا باعث بنیں۔ زیرِ نظر کتاب "فیضانِ رسولؐ" ان کے صاحبزادے میاں عارف قریشی سکریٹری جنرل بزمِ عثمانیہ بھٹہ کی نگرانی میں شائع ہو گئی ہے۔ اس مجموعہ میں درج ذیل اشعار ہمیں پسند آئے۔

مدینہ میں ہم نے کبھی یوں بھی دیکھا ۔ کہ حدِ نظر تک سماں نور کا ہے ۔ مرزا
ذرا نہ ترے قدموں کو چوم لوں میں بھی ۔ خوشا نصیب ترے تو مدینے جاتا ہے ۔ سعید شہیدی
جب گناہوں کے اندھیرے میں بھٹک جاتے ہیں ۔ آپ بن جاتے ہیں چراغِ رہ گزر یا مصطفٰیؐ ۔ علی جلیلی
ممکن نہیں شرحِ رخِ پرنورِ مبارک ۔ سورج سے بھی تشبیہ جو دوں بے ادبی ہے ۔ علی جلیلی
چلے تھے صاحبِ قرآں کو ڈھونڈنے خسرو ۔ تو ہم کو صاحبِ قرآں ملا مدینے میں ۔ خسرو
بقدرِ لفظ و بیاں شانِ مصطفٰیؐ کم ہے ۔ ثنا یہی ہے کہ گنجائشِ ثنا کم ہے ۔ خواجہ شوق
ممکن نہیں انوارِ نبوت کا تعین ۔ جز نورِ محمدؐ نہ زماں ہے نہ مکاں ہے ۔ خواجہ شوق
حقیقت بے نقاب و نشو نما ہے شوق پنہاں ہے ۔ یہ علم ظاہری والے فقط لفظ و بیاں تک ہیں ۔ خواجہ شوق
ایک پیالہ اور انگشتِ رسالت کا کرم ۔ آسماں ششدر ہے کوزہ میں سمندر دیکھ کر ۔ نبیل کلاہ
ہے نازاں بندگی ایسی عبادت آپؐ نے کی ہے ۔ خدا کو فخر ہے ایسی رسالت آپؐ نے کی ہے ۔ منصور لعل بہار
پلٹ بنیؐ پہ سجدہ کا حق ہے فقط انہیں ۔ شرطِ وضو میں دامنِ دل جس کا تر ملا ۔ ذاکر گوشہ شاہی
آپؐ کی ذاتِ گرامی باعثِ تخلیقِ کل ۔ آپ کے صدقے میں قائم ہے یہ عالم کا نظام ۔ ذاکر گوشہ شاہی
اس دہر میں اک ایسا بھی وقت آئے گا نیرؔ ۔ ہر شخص کو ہو جائے گا عرفانِ محمدؐ ۔ نیر
قرآں کی تفسیر ہے گفتارِ محمدؐ ۔ ایماں کی تکمیل ہے اقرارِ محمدؐ ۔ رئیس اختر
عقلِ انسانی سمجھ سکتی ہے کیا اس کا وقار ۔ خود بنانے والا جس ہستی پہ شیدا ہو گیا ۔ ناصر کرنولی
جس کی زباں پہ نعتِ رسولؐ ۔ ساری دعائیں اس کی قبول ۔ اکبر حیدرآبادی

ایک ہی پل میں مدینہ بھی پہنچ جاؤنگا / میرے آقا کو ذرا یاد تو فرمانے دو — فیض الحسن خیال

عشقِ صادق کا نتیجہ ہے کہ صادق ہو گیا / لیک تیرا مدح خواں گفتار میں کردار میں — ڈاکٹر صادق نقوی

نبی کا تذکرہ عبادت نہیں تو کیا ہے نوید / یہ نعت گوئی تو ایمان کو بڑھاتی ہے — صادق نوید

یقیناً اس بشر کی موت بھی شامل ہے جینے میں / دمِ نظارہ جس کا دم نکل جائے مدینے میں — علی الدین نوید

حشر تک خاکِ مدینہ اوڑھ کر سو جاؤنگا / گر مقدر سے ملے آقا اجازت آپ کی — علی الدین نوید

اسے مرے جذبِ دل اے مری آرزو / نعت کہنے سے پہلے تو کرے وضو — نصیر الدین بسمل

اس کو نظر آتے ہیں دو عالم کے نظارے / جس آنکھ میں پوشیدہ ہو سرکار کی صورت — ڈاکٹر طاہر راہی

تمام عمر بھٹکتا رہے گا دنیا میں / جسے نصیب نہیں رہبری محمد کی — پرنس شہامت جاہ

یہ نعتیہ مجموعہ بقول جناب صلاح الدین نیر جلدی میں شائع کیا گیا ہے۔ مگر شعراء کو چاہیئے تھا کہ چھپنے سے پہلے نظرِ ثانی کر لیتے۔ منتخب لغت کا مطلب یہ ہے کہ شعراء نے اپنی اپنی بیاض سے منتخب نعوت اشاعت کے لیے چن لیا ہے۔

حقِ تبصرہ ادا نہیں ہوتا جب تک کہ تنقیدی جائزہ نہ لیں۔ درجِ ذیل اشعار میں عروض، زبان و ادب کی غلطیاں ہیں۔ امید کہ شعرا آئندہ خیال رکھیں گے۔

ص۴ آپ کے در پہ خاموش ٹھہرا تھا میں ٭ مجھکو میری طلب سے سوا مل گیا

خاموش ٹھہرا تھا مطلب یہ ہے کہ بے طلب ٹھہرا ہوا تھا۔ صرف نیاز حاصل کرنا مقصود تھا۔ دوسرے مصرعہ میں طلب سے سوا مل گیا تو درِ حضورؐ پر خاموش ٹھہرے رہنا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔

ص۵۴ بہت بڑا فاصلہ ہے حضرتؐ ، کہاں دکن اور کہاں مدینہ
مگر جو خود آپؐ یاد کر لیں ، تو کیا کرے فاصلہ بچارا

"بچارا" متروک ہے۔ بے چارہ فصیح ہے۔ فصحاء اِس عیب کو "قطع" کہتے ہیں۔

اسی نعت کا اگلا شعر ہے

زبانِ اردو کی لاج رکھنا کہ اس میں ہے رسم خط عیب کا
یہی تو وہ رسم خط ہے آقا کہ جس میں اترا قرآن تمہارا

دوسرے مصرعہ میں لفظ قرآن غلط تلفظ کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ یعنی الف ممدودہ کو مقصور بنالیا گیا ہے۔ اس عیب کو عروض داں قصر کہتے ہیں۔
غلط تلفظ کی وجہ مصرعہ خارج الوزن ہو گیا۔
بحر متقارب مقبوض اثلم فعول فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن الیسی غلطی ایک کہنہ مشق شاعر کو زیب نہیں دیتی۔

۵۶ تینوں شعر ممکن ہے کسی دوسری نعت کا چھپ گیا ہو۔

۵۹ وہ جس پر آپ کی نظر کرم اک یاد ہو جائے ؛ قسم اللہ کی جنت کا وہ حق دار ہو جائے
کرم اللہ کا سرکارؐ کی نظرِ عنایت ہے ؛ وگرنہ سانس بھی لینا یہاں دشوار ہو جائے۔
مطلع کے اولیٰ مصرعہ میں اور دوسرے شعر کے ثانی مصرعہ میں لفظ "نظر" ظ جزم کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ جو غلط ہے۔ بالفتح یعنی زبر کے ساتھ صحیح ہے۔ یہاں چشم بٹھاتے ہوتے تو عیب دور ہو جاتا۔ لفظ "وگرنہ" متروک ہے۔ مطلع میں "وہ" کی تکرار بھی محلِ نظر ہے۔

۷ اک بار رُخِ روشن سرکارؐ دکھا دیجئے ؛ اس انجم عاصی کی مدت سے یہ حسرت ہے
حسرت کہتے ہیں جو کبھی پوری نہ ہو۔ یہاں تمنا کے معنوں میں یہ لفظ نظم ہوا ہے۔
فصحا کے نزدیک غلط ہے۔ احتیاط لازمی ہے۔ شاید عصیان کی زیادتی سے شاعر ناامید ہے۔ اب تو رحمت کو جوش میں آنا ہی چاہیئے۔

۸۶ ازل سے آنکھوں کو دیدار کی تمنا ہے ؛ عطا ہو طاقتِ دیدار اور کچھ بھی نہیں
اول تو یہ نعت کا شعر ہو ہی نہیں سکتا۔ دوم ازل سے مراد دنیائے آفرینش کے وجود میں آنے سے پہلے کا زمانہ اگر لگا و موصوف شوق ازل سے ہی کُھلی ہوئی ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ شعر بے معنی۔ اسی نعت میں پانچواں شعر یہ نعت کا نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس مجموعہ میں

ایسے کئی اشعار ہیں۔

ص۸۹ جس پر حضور چشم کرم آپ کی ہوئی وہ ہوگیا ہے حشر کے خوف و خطر سے دور
اولیٰ مصرعہ میں ماضی بعید، ثانی مصرعہ میں ماضی قریب اور اولیٰ مصرعہ میں عیب تعقید۔
ہوتا تو ٹھیک تھا ۔ جس پر حضور آپ کی چشم کرم ہوئی
وہ ہوگیا حساب کے خوف و خطر سے دور

ص۹۰ اڑ کر چلا میں بجائے دیار حبیب میں پروردگار مجھکو اگر بال و پر ملے
بال و پر میں ہونا چاہیئے۔ مگر ردیف "ملے" گڑبڑ پیدا کر رہی ہے۔ ویسے بھی باقی
نعت کی تعریف میں نہیں آتے۔

ص۹۸ خدایا نہ گوہر نہ زر چاہیئے مجھے میرے آقا کا در چاہیئے
مطلع، بحر متقارب مثمن محذوف "فعولن فعولن فعولن فعَل" میں کہا گیا ہے
نعت کے دوسرے اشعار میں ہر اولیٰ مصرعہ بحر متقارب مثمن سالم کا ہے۔
فعولن، فعولن، فعولن، فعولن وزن ہے۔ ڈاکٹر راہی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں
فاش غلطی ! ؏ بایں عقل و دانش بباید گریست

ص۱۰۱ بروز حشر آقا لاج رکھنا ، یہ جیسا بھی ہے آپ کا ہے
زبان کی غلطی ہے۔ ثانی مصرعہ یوں ہونا چاہیئے ؏ یہ جیسا بھی ہو راہی آپ کا
ص۱۰۲ کشش ہے ایسی حضور کے آستانے کی ، میں کیا کروں مجھے عادت ہے سر
شعر دو لخت ہے۔ الفاظ کی نشست غریب ہے۔ عادت کا لفظ کھٹک رہا ہے
و جبلت پر بھی بار گزر رہا ہے

ص۱۱۱ صرف اللہ کی توفیق ہے یہ نعت بنی ، آپ کو چاہیں گے اللہ کو چاہے جو
ثانی مصرعہ ساقط البحر ہے۔ قافیہ کا عیب ہے۔

ص۱۱۱ یک نظر التفات ہو دل مخلص پر ، ہے غم دنیا کا مارا رحمت اللعالمین

اولیٰ مصرعہ میں منتظر لفظ گفتنا کے ساتھ نظم ہوا ہے تو "چشم" ہونا چاہیے تھا۔ دوسرے مصرعہ میں
ذم کا پہلو نمایاں ہے۔ مصرعہ کی نثر کیجئے نعوذ باللہ "رحمت للعالمین" غم بیان کیا جاتا ہے"
مطلب نکلتا ہے۔ میاں فاروق انجم "ہے" کے بجائے "ہوں" کا لفظ بٹھاتے تو ٹھیک تھا۔
اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔

ص ۱۱۷ تمہاری مدح میں فکرِ سخن میں کرتا ہوں ‏ جگر سا سخن جلا بھلا عشق کے لیے
اولیٰ مصرعہ میں نبیؐ کی مدح میں ہونا چاہیے۔ اس مجموعہ پر تمام اشعار نعت کے زمرہ میں نہیں آتے۔

ص ۱۲۰ رُلا مجھکو ایسی دیارِ مدینہ ؛ نہ آئے کبھی یہ خیالِ مدینہ
دیارِ مدینہ رُلانے سے نہیں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

ص ۱۲۲ تھام لے ہاتھ مرا تھام لے اے ماہِ عرب
کب سے ہوں بے سروسامان مدینے والے
لفظ "سامان" اعلانِ نون کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ فصحاء کے نزدیک عطف و اضافت
کے بعد نون کا اعلان جائز نہیں۔ قواعد کے خلاف ہے۔

ص ۱۲۳ ہے طائر الجھی ہوئی دنیا کے غموں میں ؛ پا جائے سکوں گر تمہیں اک بار بُلا لو
"گر تمہیں" کے بجائے "اے نبیؐ" ہونا چاہیے تھا۔

ص ۱۲۴ خدا کرے وہ کبھی اک نظر اِدھر ڈالیں ؛ خدا کرے کہ وہ برچھی جگر کے پار کریں
کیا یہ نعت کا مضمون ہے ؟ ڈاکٹر صاحبہ خود غور فرمالیں
خدا کرے کہ، خدا کرے کہ وہ کی تکرار بے لطف
ہے وہ وہ گھور کر جہاں سے کبھی وہ گزرے تھے۔ وہیں پہ ظاہرہ عمر ان کا انتظار کریں۔
"کبھی وہ" کی جگہ "رسول" کا لفظ بٹھائے ہوتے۔ خیر۔ خطائے بزرگان گرفتن ....
ساکامل نہیں۔

ص ۱۲۵ تبسم پہ کسکی خوشبو ہے کرم ہے ؛ صبا تمھیں بہ گلاب کبھی سے پہلے

لفظ قدوم عربی ہے۔ اور مصدر ہے نہ کہ قدم کی جمع ۔ جیسا کہ اکثر شعراء نے استعمال کیا
ہے۔ قدوم کا معنیٰ کسی جگہ سے آیا یا سفر سے واپس آنے کے ہیں۔ مثلاً کسی بزرگ
کی آمد پر قدوم میمنت لزوم کا کلمہ استعمال ہوتا ہے شاید اسی مغالطہ میں قدوم
کے طور پر مستعمل ہو رہا ہے۔ اور ایک معنیٰ قدوم کا " بڑھئی کا بسولہ " یا بڑھئی کا اوزار
جو اسم جامد ہے ملاحظہ ہو لغات کشوری صفحہ نمبر ۵۵۳
پھر بھی اہلِ علم سے میری گزارش ہے کہ اس پر روشنی ڈالیں۔

ص ۱۳۱ ؎ جو کچھ ہے کرم آپ کا عشرت کا سبب ہے ۔۔ آنکھوں کو مری حسرتِ دیدار ...
مطلع ذو لحنت ہے۔

ص ۱۳۵ ؎ تہی دامن نہ ہوگا زندگی بھر ... مراد ... بھرا دامان گوہر سے
اول تو الفاظ کی بندش ڈھیلی ہے ۔ دوم کیا یہ نعت کا شعر ہے؟
اب آگے محبِ ادب میرے مشکور ہوں گے شعرائے کرام اگر وہ میرے اعتراضات
فنی اور ادبی حیثیت سے دیں۔ اور اسی پرچہ کے ذریعہ دیں۔

؎ اے ناقدانِ شعر و سخن نور کو سنو
اُس کے کلام میں تمہیں شاید کلام ہو

نوٹ : اس نعتیہ مجموعہ کی کتابت نفیس اور کاغذ عمدہ ہے۔ اور خدا کا شکر ہے
کی قیمت " دعائے خیر " رکھی گئی !
اللہ تعالیٰ تمام لکھنے والوں پر اور پڑھنے والوں پر خیر کی بارش برسائے

ماہنامہ
شاداب
حیدرآباد

جلد : [۱۲]
شمارہ: [۴]
قیمت : ۶ روپے
اپریل ۱۹۹۶ء

مینجنگ ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	ایڈیٹر
قدیر انصاری	رشید الدین	محمد قمرالدین صابری

مجلس مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم، ڈاکٹر منشاالرحمن خان منشا، محترمہ سیدہ مہر، پروفیسر تراب مسلی
ڈاکٹر یوسف الدین، محمد منظور احمد منظور، منیر احمد صدیقی

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	″ ۲۰۰ ″	″ ۳۶۰ ″	″ ۳۷۰۰ روپے
امریکہ	″ ۲۴ ڈالر	″ ۴۰ ڈالر	″ ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	″ ۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	″ ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	″ ۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	″ ۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱، ریڈہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے پبلک پرنٹرس، چھتہ بازار میں چھپاکر دفتر "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد ۴ سے شائع کیا۔

فہرست



حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ملت اسلامیہ

ذیل کا مضمون حضرت مولانا کے اس عربی مقالہ کا ترجمہ ہے جو خلیج عربی کی مشہور ریاست قطر کے مرکزی شہر اور دار الحکومت دوحہ میں ۲۳ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ کو ایک عظیم مجمع کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کو سامعین کو زبانی خطاب کیا گیا، ریاست قطر کی طرف سے ہر سال وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ کے ادارہ الشؤون الاسلامیۃ کی طرف سے الموسم الثقافی الاسلامی اور اجلاس عام ہوتے ہیں جس میں عالم عربی و اسلامی کی معروف و ممتاز شخصیتوں کو توسیعی مقالے پڑھنے اور سننے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم:
وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (آل عمران ۱۲۳)

اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا، حالانکہ تم بے سروسامان تھے، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکر گزار رہو۔

اس آیت کریمہ میں معرکۂ بدر کا ذکر ہے، مختصر سی آیت ہے لیکن اس کے اندر ہمارے لئے بہت سامان عبرت ہے، یہ ایک ایسا سبق ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہماری فکر کو جلا بخشتا رہے گا اور عزائم کو سینوں میں بیدار رکھے گا۔ یہی نہیں بلکہ اس آیت میں ہماری حیثیت کا تعین بھی ہے، اقوام عالم میں ہمارا کیا کردار ہونا چاہیئے۔ اور زندگی کے ہر موڑ پر اور بدلتے ہوئے حالات میں ہمارا کیا موقف ہونا چاہیئے، اس کی طرف واضح رہنمائی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے وہ حصے جن کو ہم عالم اسلام کہتے ہیں، جن میں حکومتیں بھی ہیں اور ریاستیں بھی موجود ہیں، دولت کی ریل پیل بھی ہے، زندگی کی آسائشیں بھی موجود ہیں علم وفن کا بھی چرچا ہے، کتب خانے، مدرسے اور یونیورسٹیاں بھی ہیں، زندگی کی سرگرمیوں کے تمام میدان موجود ہیں یہ سب کے سب بلاکسی استثنا کے معرکۂ بدر میں فتح ونصرت کا صدقہ ہیں۔ اگر خدانخواستہ اس جنگ میں کفار کی سازش کامیاب ہو جاتی، ایسی سازش جس کا جال بڑی ذہانت اور فکری کاوش سے تیار کیا گیا تھا، اور قریش کے کفار نے اپنی ترکش کا ہر تیر نکال کر رکھ دیا تھا، اگر خدانخواستہ ان کی سازشیں کام کر جاتیں اور مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو آج عالم اسلامی کا وجود ہی نہ ہوتا، نہ علمی سرگرمیاں ہوتیں، نہ حکومت وجہاں بانی کا کوئی خواب دیکھ سکتا جب زندگی ہی سرے سے نہ ہوتی تو پھر زندگی کے مظاہر بھی نہ ہوتے۔ یہ تاریخ کی ٹھوس، ناقابل انکار اور پائدار حقیقت ہے۔

حضرات! آپ مجھے کہنے دیجئے کہ آج زمین کا ہر وہ چپہ، ہر شہر اور علاقہ جو مسلمانوں سے آباد ہے جس کو عالم اسلام میں شمار کرتے ہیں، یہاں تک کہ برصغیر ہند، جہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی وسیع آبادیاں ہیں اسی طرح مسلمانان مصر، مسلمانان شام مسلمانان عراق وترکی اور وہ تمام مسلمان جن سے مشرق قصیٰ، عالم عرب، مشرقی جنوبی ایشیا آباد ہے، اگرچہ ان کی ریاستیں جدا جدا ہیں اور ان کے مقامی مسائل ومشکلات متنوع ہیں، ان میں گروہ بندیاں بھی ہیں اور ان کے رنگ روپ بھی علاحدہ علاحدہ ہیں اور ان میں

بے شمار تہذیبیں خاندان اور مقامی رنگ بھی داخل ہیں، یہ سب کے سب آج اس لیے مسلمان کہے جاتے ہیں کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتحیاب کر دیا تھا، آج یہ سب اسی جنگ بدر میں فتح یابی کا صدقہ اور اس کا پرتو ہے۔

اگر کہیں اس جنگ میں مسلمان ناکام ہو جاتے تو صاف سن لیجئے کہ عالم اسلامی نام کی کوئی چیز اس آسمان کے نیچے نہ دکھائی دیتی، اسلامی دعوت و تبلیغ کو دنیا میں اپنی راہ نکالنے کا کوئی راستہ نہ ہوتا، دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت، ملکوں کو فتح کرنے کی ہمت، اس کے نام پر حکومتیں بنانے کا حوصلہ، اداروں، مدرسوں اور کتب خانوں کی یہ چہل پہل، یہ سرگرمیاں اور نشاط و قوت کے مظاہر سب ناپید ہوتے، نہ اس قوم میں کوئی نابغہ روزگار عالم و صاحب فن ہوتا نہ اولیاء و صالحین کی کوئی جماعت ہوتی اور نہ آوازہ حق کہیں سنائی دیتا۔

لیکن آپ حضرات میں جن کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے، تاریخ و سیرت نبوی کا مطالعہ کر چکے ہیں، وہ اس معرکہ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے جب گزرتے ہیں تو ایک حرف ایک جملہ ان کی توجہات کا مرکز بن جاتا ہے، وہ حیرت و عظمت کے جذبات سے سرشار ہو جاتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو سرسری طور پر اس جملہ کو پڑھتے ہیں اور سرسری طور پر گزر جاتے ہیں، حالانکہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اس کو سرسری اور سطحی طور پر پڑھ کر گزر جائے، یہ جملہ حیران و ششدر کرنے والا جملہ ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے میدان جنگ کا معائنہ فرمایا اور وسیع صورتحال کا جائزہ لیا اور کفار کی قوت، ان کے سر و سامان، جنگی ہتھیار، تعداد کی کثرت اور جوش انتقام سے بھرے ہوئے کفار کے تیور دیکھے تو آپ کو مسلمانوں کی تعداد اور سامان جنگ کی انتہائی قلت نظر آئی، جو لوگ مکہ سے اس عزم و جوش سے نکلے تھے کہ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں گے، ان میں سے ایک ایک کی آنکھ میں خون اترا ہوا تھا۔

دوسری طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو کفار کی مہم کو ناکام بنانے کے لیے آئے تھے، جہاد فی سبیل اللہ جن کا مقصد اور آخرت جن کا مقصود تھی، دونوں فوجوں کے درمیان فرق معمولی نہیں غیر معمولی تھا، سامانِ جنگ اور جنگی تجربات اور تعداد کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی کہ مسلمان ان کفار کا مقابلہ کرسکتے، وہ ہزار کی تعداد میں تھے اور یہ صرف تین سو تیرہ انبیائے کرام علیہم السلام باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر ہمیشہ بھروسہ رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین ان کا اصلی اثاثہ ہوتا ہے پھر بھی ناموسِ فطرت اور دنیائے اسباب کی سنت سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ کبھی حقائق کا جائزہ لینے سے غافل نہیں رہتے۔

چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریقوں کے درمیان اس درجہ نمایاں اور بھیانک فرق کو دیکھا اور سامان و تعداد کی کثرت جو حملہ آور کفار کے قبضہ میں تھی اور اس کی قلت جو دفاعی مورچہ میں مسلمانوں کے پاس تھی دونوں کا موازنہ کیا تو ملاحظہ فرمایا کہ فرق کوئی معمولی نہیں ہے ایسے موقع پر نظامِ کائنات اور سنت تکوینی کا تقاضہ تھا آپ ظاہری اسباب سے صرفِ نظر نہ فرماتے لہٰذا آپ کو صاف نظر آگیا کہ مسلمانوں کی فتح صرف قوت کے بل بوتے پر نہیں ہوسکتی، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے فریادرسی نہ ہو، ان کمزور اور نہتے مسلمانوں کی دستگیری عالم غیب سے نہ ہوتی تو کامیابی مشکل ہی نہیں محال ہے واضح طور پر بالکل کھلی مدد کی ضرورت تھی جو تمام تصورات و تخمینات، اندازوں اور جائزوں سے ماورا، خرق عادت اور معجزہ کی شکل میں سامنے آئے۔

کہاں ایک ہزار مسلح بکتر بند ماہرین جنگ اور کہاں ۳۱۳ مسلمان، جن میں بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ نوخیز و نوعمر صاحبزادگان بھی تھے، آپ نے اس منظر کو دیکھ کر حالات کا جائزہ لینے میں کوئی کمی نہیں کی کیونکہ یہ آپ کے فرائض نبوت و قیادت میں داخل تھا، اس حقیقت پسندانہ جائزہ کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کے آگے سر بسجود ہوکر عرض کیا

اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد

یعنی اے اللہ اگر تو نے اس مختصر جماعت (جو مسلمانوں کی یہاں جمع ہے) کو ہلاک کر دیا تو تیری عبادت نہ ہوگی۔

یہ جملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں شمار کیے جانے کے لائق ہے کس کی مجال تھی کہ ایسی بات اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرکے کہے، کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو ایسا ہوگا۔ اور ایسا کیا تو یہ ہوگا، پھر پیغمبر بھی وہ جو اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر چاہا ہوا، محبوب با وقار، باوجاہت ہے۔ ایسا رسول جس کو اللہ تعالیٰ نے منتخب ہی اس لیے کیا تھا کہ اس کے پیغام اور لائے ہوئے دین کو قیامت تک باقی رکھے گا اور ہمیشہ اس کا ناصر و مددگار ہوگا وہ کہے "اگر تو نے مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دیا تو تیری عبادت نہ ہوگی" یعنی اے اللہ اگر تو نے اس جماعت مختصر کی شکست کرادی تو دنیا کا تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ انسانیت کو کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ دنیا کی حکومتیں اور دنیا کے ملک اسی طرح رہیں گے جس طرح آج ہیں دنیا کے خزانوں میں کمی نہیں آئے گی۔ دنیا کے کمانے کھانے کے جو کام ہو رہے ہیں وہ اسی طرح ہوتے رہیں گے بڑے بڑے دانشور، حکمت و دانائی میں ممتاز افراد جس طرح ہوتے آئے ہیں اسی طرح پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے لیکن صرف ایک بات جو نہیں ہوگی وہ ہے خالص تیری ذات پاک کی عبادت تیرے احکام کا دنیا میں نفاذ اور تیرے دین حنیف کی بقاء یہ کام نہیں ہوگا اور سب کچھ ہوگا کیوں کہ اپنی تعداد میں کمی اور دفاعی اسلحہ میں ناقص ہونے کے باوجود روئے زمین پر تنہا یہی جماعت ہے جو توحید کی داعی اور تیری عبادت گزار ہے جس کا بھروسہ صرف تجھ پر اور جس کا اعتماد تیری ذات پاک پر ہے جس کی عبادت صرف تیری ذات پاک کے لیے ہے اور جس کو یقین ہے کہ کائنات پر صرف تیرا تصرف ہے تیرا کوئی شریک نہیں ہے، تو ہی قادر مطلق حاکم مطلق اور مالک الملک ہے عبادت و طاعت کا تنہا سزاوار ہے صرف تیرے احکام اور صرف تیری

شریعت کا یہ حق ہے کہ وہ دنیا پر نافذ ہو اور بے چون وچرا اس کی فرمانبرداری کی جائے۔

سیرت نبوی میں ان سطور کو پڑھنے والا اگر ہوشمند ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال سے واقف ہیں اور اس کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی و بے نیازی کیا معنیٰ رکھتی ہے، اس کی قادر وقاہر ذات جو ساری مخلوقات سے بے نیاز ہے اور جس کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے، جو غنی بھی ہے اور قوی بھی ہے اس حقیقت کا ادراک رکھنے والا شخص جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ پڑھتا ہے اور وہ بھی ایسے نازک لمحات میں جو خوف وہراس سے پر ہیں اور جب کہ سوائے الحاح وزاری اور اس کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے کوئی چارہ کار نہیں وہ حیران رہ جاتا ہے، ایک طرف اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور غنی ذات کو دیکھتا ہے دوسری طرف رسول برحق کی زبان پاک سے ایسے الفاظ سنتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اگر تو نے اس مختصر گروہ کو ختم کر دیا تو تیری حکمرانی باقی نہیں رہے گی۔ ایسے پرہول لمحات میں یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی، کیوں کہ یہ بات جو رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی تھی وحی خداوندی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام تھا، اللہ حاضر وناظر، غیب وموجود کو جاننے والا ہے۔ وہ مسلمانوں کی بے کسی، کمزوری، تعداد کی کمی اور اسلحہ کی قلت کو دیکھ رہا تھا اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ مقابلہ میں جو دشمن ہیں وہ کسی درجہ اسلحہ سے لیس اور کتنی بڑی تعداد میں ہیں، اس عظیم تفاوت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح ونصرت سے ہمکنار کیا۔

لہٰذا یہ بات آئینہ کی طرح روشن ہو کر ثابت ہو گئی کہ مسلمانوں کو باقی صرف اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان کے وجہ سے دعوت الی اللہ کا سلسلہ قائم رہے گا اور ان کی بقا و سربلندی کی صرف یہی شرط ہے کہ وہ اس دعوت پر قائم رہیں تاکہ خدائے عزوجل کی

عبادت ہوتی رہے اور اس کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کیا جائے اور اس کی شریعت کے احکام دنیا پر نافذ ہوں اور اگر مسلمانوں نے کہیں اپنی خصوصیت ضائع کر دی تو مجھے صاف صاف کہنے دیجئے کہ خواہ جتنے مسلمان ہیں سب کے سب والیان ریاست اور ارباب حکومت بن جائیں (میں کسی ریاست یا صاحب ریاست کا حاسد یا بدخواہ نہیں ہوں بلکہ جتنی مسلم ریاستیں ہیں ان کے لیے دعاگو ہوں اور ان کی ترقی و خوشحالی کا متمنی ہوں) لیکن یہ کہتا ہوں کہ امت اسلامیہ نے اگر اپنا یہ امتیاز کھو دیا، وہ واحد امتیاز جو ان کے بقا کا ضامن ہے اور جس کے صدقہ میں ان کو بحیثیت مسلم زندگی عطا کی گئی ہے یعنی اللہ کے دین کی دعوت اور صرف اس کی عبادت اور اس کی احکام کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے کا امتیاز، اس کی شریعت اور احکام شریعت کو فرد اور سوسائٹی پر پوری طرح نافذ کرنے والی امت ہونے کا امتیاز، جو زندگی دینی تعلیمات و احکام کے مطابق ہو اس زندگی کو عام کرنے اور رائج کرنے کا عزم رکھنے کا امتیاز اگر یہ امتیاز خدانخواستہ مفقود ہو گیا تو خواہ دنیا کی دولت ان کو مل جائے پھر بھی ان کے وجود و بقا کی کوئی ضمانت نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ ”اے اللہ اگر تو نے ان مٹھی بھر تعداد رکھنے والے مسلمانوں کو غیبی مدد نہیں کی تو روئے زمین پر کوئی تیرا نام لینے والا نہیں رہے گا“ یہ بات بلاشبہ صرف ایک پیغمبر برحق ہی کہہ سکتا ہے جس پر وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہو اور جس کی عنداللہ حیثیت ہو، لہٰذا میں پوری صراحت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمان دعوت حق سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے جو ان کے سپرد کی گئی ہے اور جس کی خاطر ان کو سرفراز کیا گیا ہے تو پھر دنیا میں ان کے حفظ و بقا کی کوئی ضمانت نہیں لی جا سکتی، خواہ ان کے پاس فوجی طاقت ہو، عددی طاقت ہو، اقتصادی طاقت ہو بہتر سے بہتر مواقع میسر ہوں اور جو بھی جاہ و حشمت ان کو ملی ہو سب بے کار اور سب بے سود و بے نفع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت ان کی اسی صفت کی بنا پر کی تھی کہ ”اگر یہ نہ رہے تو تیری عبادت نہ ہو گی“

یوں سب کچھ ان کو مل سکتا ہے۔ یہ سب کچھ پا سکتے ہیں، حکومتیں ملتی رہیں گی، دولت پا سکتے ہیں، مگر امانت خداوندی یعنی دعوت الی اللہ جس سے صرف اللہ کی پرستش ہو اور اس کا پیغام ساری دنیا میں باقی رہے اور غلبہ وسطوت صرف اللہ کا رہے اس کے احکام زمین پر جاری ہوں، زندگی کے ہر موڑ پر اس کے احکام کی پیروی ہو اور دینی تعلیمات تمام بدلتے ہوئے حالات میں رہنما ہوں۔ یہ نہیں ہوگا۔ اور جب یہ نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت و نوازش بے پایاں سے امت محروم ہو جائے گی۔

لہٰذا وہ چیز جس کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے اور جس کے لیے ان کے اندر غیرت و حمیت ہونا چاہیے اور جس کو وہ اپنی جان سے، صحت سے، اپنی دانائی و ہوشمندی سے زیادہ عزیز رکھیں اور جس کو دولت و حکومت پر ترجیح دیں اپنی شہرت و ناموری کے پروپیگنڈے اور اپنی سیاسی تگ و دو سے زیادہ اہمیت دیں اور جذبۂ حکمرانی اور اپنے حدود سلطنت کو وسیع کرنے کی تمنائیں اس کے مقابلے میں ہیچ ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے دین کا داعی و مبلغ سمجھیں، علم توحید کو سربلند اور اللہ کے دین کو سرسبز و شاداب رکھنے کی آرزوؤں کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں پر غالب آجائے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دیں، اللہ کی رضا اور اس کے احکام کے اجرا کو ہر مقصد اور ہر نسبت پر قربان کرنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار کریں، ان کے بقا کی ضمانت اسی میں ہے کیوں کہ ان کا وجود ملی اسی دھاگے سے بندھا ہوا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی تھی اور مسلمانوں کو فتحیاب کرنے اور ان کو باقی رکھنے کا فیصلہ فرمایا تھا تو گویا ان کی بقا کو عبادت سے مشروط فرما دیا تھا۔ عبادت کا مفہوم صرف فرائض مقررہ کی ادائیگی نہیں بلکہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا اور اس کی رضا جوئی اور خوشنودی کو سب پر مقدم رکھنا اور دین کو وسیع تر آفاق و عالمی پیمانہ پر پھیلانے کی سعی کرنا بھی اس میں داخل ہے۔

ذا اگر مسلمانوں کا رشتہ عبودیت کی زندگی سے منقطع ہوجاتا ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ ان کا رشتہ زندگی سے منقطع ہوگیا جس امر کے باعث ان کو فتح سے سرفراز کیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ باقی رکھے گئے تھے وہ سلسلہ ہی ختم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ضمانت حیات بھی ختم ہوگئی اور ان کی حیثیت دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہوگئی کہ اگر وہ دنیا کے عام قانون حیات کے مطابق ترقی و خوشحالی کے کام کریں گے تو ترقی و خوشحالی ہوگی اور ادبار و زوال کی راہ پر چلیں گے تو ان کے نصیب میں ذلت و زوال آئیگا بلکہ عام قانون کے مطابق جس قدر ذلت و ادبار ہونا چاہیئے اس سے زیادہ ذلت و رسوائی کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ دوسری قوموں کی بقا و تحفظ کو کسی شرط سے مشروط نہیں کیا گیا تھا اور ان کے حق میں یہ آیت کریمہ صادق آئے گی۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا

ترجمہ: آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پروا نہ کرے گا۔ اگر تم عبادت نہ کروگے، سو تم (احکام الٰہیہ کو) جھوٹا سمجھتے ہو تو عنقریب (یہ جھوٹا سمجھنا تمہارے لئے) وبال جان ہوگا۔

مسلمانوں نے اس شرط کو پورا کیا اور اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کی لاج رکھی اور یاد رکھا کہ ان کو دشمن پر غالب و فتحمند کیا گیا تھا اور عین اس وقت فتح و نصرت سے ان کی مدد کی گئی تھی جب سامنے یہ نظر آرہا تھا کہ دشمن ان کو بدر کے میدان میں پیس کر رکھ دیں گے، ان کا نام و نشان دنیا سے مٹا دیں گے مگر ان کو مدد دیکر غالب کیا گیا اور روئے زمین پر باقی رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا سلسلہ ان کے دم سے باقی رکھنا منظور تھا۔

وہ اس پیغام عبادت کو لے کر دنیا میں پھیل گئے اس پیغام کو لیکر بادشاہوں

کے پاس بھی گئے اور عوام الناس کے پاس بھی، اسی کی خاطر انہوں نے ہجرت بھی کی اور جہاد بھی، اسی کے لئے انہوں نے جنگیں بھی لڑیں اور معاہدے بھی کئے، ان کے سامنے یہ حقیقت ہمیشہ جلوہ گر رہی کہ وہ اللہ کے فرستادہ اور اس کے حکم کے بندے ہیں اسلام کا جھنڈا انہوں نے چار دانگ عالم میں لہرایا اور بجا طور پر یہ سمجھتے رہے کہ وہ خلق خدا کے مخلص خادم اور محسن ہیں، اللہ کے بندوں کو خواہشات کی غلامی سے نکالنے والے ہیں، جاہلیت کے رسم و رواج اور جاہلی سماج کے عائد کردہ ان بندھنوں سے ان کو آزاد کرانے والے ہیں۔

آج ضرورت ہے کہ کوئی فرد یا جماعت بے باکی و صداقت شعاری کے ساتھ حمیت اسلامی اور غیرت ملی کے ساتھ یورپ کو حقانیت و صداقت کی دعوت دے اور یہ کام (دعوت الی اللہ کا کام) جس میں داعی کی اپنی غرض شامل نہ ہو صرف انسانیت کی بھلائی اور بہبود اس کا مطمح نظر ہو۔

یہ ذمہ داری امت اسلامیہ کی وراثت ہے اس کا فریضہ ہے، ملت کے خاندان مفکرین

اور اہل قلم کی یہ ذمہ داری ہے جہاں تک یورپ کا تعلق ہے وہ اندر سے کھوکھلا اور آسمانی ہدایات سے محروم اپنے ہاتھ سے بنائی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اس کی صحیح تصویر شاعر اسلام محمد اقبال کے ان اشعار میں نظر آتی ہے۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

میں آپ سے کہتا ہوں، بلکہ ایک سوال کرتا ہوں کہ اگر قبیلۂ قریش کے وہ افراد جو جنگ بدر اور جنگ احد میں مارے گئے تھے مسلمانوں کے خلاف استغاثہ پیش کریں اور کہیں کہ ہم نے تو خود بڑھ کر ان کے پیغمبر کو پیشکش کی تھی کہ وہ اگر دنیاوی ثروت و دولت چاہتے ہیں تو ہم ان کو دولت سے مالامال کرنے کو تیار ہیں۔ اگر عیش و عشرت کی زندگی کی طلب ہے اس طرح کہ اپنی پسند سے جس بڑے سے بڑے خاندان میں چاہیں ان کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیں، اگر حکومت و سرداری کی تمنا ہے تو ہم سب مل کر ان کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیتے ہیں مگر تمہارے پیغمبر نے کوئی بات قبول نہیں کی اور صاف انکار کر دیا اور یہ کہا کہ ہم اس کے لیے مبعوث نہیں کیے گئے ہیں لہٰذا آج کس طرح تم انہی چیزوں کے پیچھے مر رہے ہو، آج تمہیں سوائے عیش و عشرت اور لذت اندوزی کی زندگی کے کچھ نظر نہیں آتا

دعوت نہ جہاد۔

اللہ کی عبادت تو کی جاتی ہے مگر اس بات کی دعوت مفقود ہے کہ دین خالص سب کا سب اللہ کا ہو جائے اور اس کی شریعت و اسلام کا نفاذ ہونے لگے ہم نے تمہارے سامنے وہ سب کچھ پیش کیا جس کی دنیا کو طلب ہو سکتی ہے۔ مگر آسودہ حالی، فارغ البالی اور عیش کوشی کی زندگی کو تمہارے بھائی نے قبول نہیں کیا، رد کر دیا اور کہا کہ ہم اس کام کے لیے مبعوث نہیں کئے گئے ہیں ہم اس لیے مبعوث کئے گئے ہیں کہ تمہارے سامنے دعوتِ توحید پیش کریں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا راستہ بتائیں اسلام کو سربلند کریں، کیونکہ اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے، ہم نے تم سے بے شک جنگ کی کیونکہ تم اسلام کی حکومت کرنا چاہتے تھے، تم اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے تم ہی وہ تھے جو کہتے تھے کہ عبادت صرف اللہ کی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کائنات پر تصرف کرنے والا ہے وہی مدبر ہے، وہی خالق ہے، وہی رازق ہے، اور ہم اس کا انکار کرتے تھے۔ لہذا ہمارے تمہارے درمیان معرکے ہوئے اور ہمارے بہت سے لوگ اس راہ میں ہلاک ہوئے لیکن تم لوگ دنیا پر ٹوٹ پڑے اور جیسے آگ پر پروانے گرتے ہیں اسی طرح تم دنیا پر فدا ہو رہے ہو تمہاری تمنا ہے کہ تم ناز و نعم میں زندگی گزارو، دولت کا مظاہرہ کرو اور عیش و عشرت کا سامان جہاں بھی ملتا ہو وہ سب تمہارے قبضۂ قدرت میں آجائے، اب تم میں نہ تو اسلامی غیرت ہے نہ دینی حمیت اور نہ دین کی حفاظت اور اس کی وسعت کے لیے ذکر کی کوشش و ولولہ ہے تمہارے پیغمبر کے ساتھیوں کی جو زندگی تھی اس سے تم کو ادنیٰ درجہ کی بھی مناسبت نہیں رہ گئی۔

میں آپ سے معذرت خواہ ہوں اور آپ سے پہلے میں اپنے ضمیر سے معذرت کرتا ہوں، اپنے اسلامی شعور اور احساس سے معذرت کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ بہت سے ملک اور شہر اور خاص طور پر وہ ملک یا شہر جس میں کوئی غیر مسلم جاتا ہے یا تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اور قوموں کے مزاج سے واقفیت رکھنے والا شخص جاتا ہے تو اس کو مافی الاحوال کے

درمیان واضح فرق نظر آتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ زندگی کا دھارا ہر جگہ یکساں طور پر چل رہا ہے، سوائے کسب معاش کے اس قوم کا کوئی مقصد حیات نہیں ہے جس طرح دنیا کی دوسری اقوام ہیں اسی طرح قوم مسلم بھی ہے، خواہشات اور اغراض نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر یہ لوگ بھی وہ سب کچھ کرتے ہیں جو دوسرے کرتے ہیں، ان کو اس کی بھی حس نہیں رہتی کہ اپنے اور غیر کے درمیان تمیز کریں، مسلمانوں پر غیر مسلموں کو ترجیح دیں گے، تجارت و صنعت اور تجارتی مصالح اور نفع اندوزی کے سوا کوئی مطمح نظر نہیں ہے۔

میرے بھائیو! زندگی گزارنے کا جو طرز مسلمانوں میں رائج ہے وہ اسلام کے دعوتی پیغام سے کوئی میل نہیں کھاتا اور نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مقاصد سے اس کا کوئی ربط ہے جس کے لیے آپ مبعوث کیے گئے تھے اور نہ ان مقاصد سے ان کی زندگی کو کوئی مناسبت ہے جن کے لیے آپؐ اور آپؐ کے ساتھی مدینہ منورہ سے بدر گئے تھے، اور جس کی خاطر انہوں نے اپنی جانیں دی تھیں۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اس نکتہ کو ہمیشہ نظروں کے سامنے رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی تھی اور مسلمانوں کو جنگ بدر میں فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ اللہ نے اپنے رسول کو سچا کر دکھایا کہ اگر یہ امت نہیں رہی تو روئے زمین پر اللہ کا عبادت گزار نہیں رہ جائے گا اور اس طرح مسلمانوں کو باقی رکھا اور مسلمانوں کو بے چارگی، تعداد اور اسلحہ کی کمی کے باوجود ان کے دشمنوں (قریش) پر ان کو فتح و نصرت سے نواز دیا۔ اسی بنیاد پر اس وقت کے مسلمان زندگیاں گزار رہے تھے اور ایک مسلم معاشرہ صحیح معنوں میں وجود میں آیا اور ایک اسلامی زندگی عہد نبویؐ، عہد خلافت راشدہ اور محدود اور طویل تاریکی زمانوں میں سایہ فگن رہی۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے ان مقاصد اور اس روح، جذبات اور ان بنیادی محرکات عمل کو ختم کر دیا ہم چاہتے تھے کہ یہاں لوہر ایسے عرب

و اسلامی ملک و شہر میں اسلامی زندگی کو بسایہ فگن دیکھیں جو نگاہوں سے بھی نظر آتی ہو، تجربہ عمل میں بھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہو، اور ہر انسان اس زندگی کا لطف اور فائدہ اٹھا سکے اس کے بڑے اجزا اور مظاہر کیا ہیں؟ توحید پر استقامت اللہ اور اس کے سلام پر کامل ایمان، دنیا پر آخرت کو ترجیح اور اس پر اور اللہ کے خوف و خشیت پر ثبات و استقامت اہل اسلام او اہل ایمان کو ان عناصر اور جماعتوں پر ترجیح دینا جو اس دولت سے محروم ہیں (خواہ ان غیر مسلم معاونین اور ہنر مندوں کی اعانت سے کتنا ہی فائدہ پہنچتا ہو) شریعت اسلامی پر مکمل، مالیہ پر عمل اور مرد ہوں یا خواتین ہر طبقہ کی اس پر استقامت، پھر دنیا کو (جس میں مغرب بھی شامل ہے) خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دینا اور اس کی کوشش کرنا کہ دنیا میں اللہ ہی کی حکومت اور فرمانبرداری کا رواج ہو۔

والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ وسلم وبارک علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ وتابعیہ باحسان الی یوم الدین۔

قاضی اطہر مبارکپوری

قسط دوم

صحابہؓ کا نظام تعلیم و تعلم

عبداللہ بن عمرو بن عاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ت سے احادیث کا ایک مجموعہ الصادقۃ کے نام سے جمع کیا تھا جس کی روایت
کی گئی، ابو ہریرہ، ابن عباس، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک وغیرہ کے تلامذہ نے انکی
ت کو صحیفوں اور نسخوں کی شکل میں جمع کیا تھا (کتاب علل الحدیث و معرفۃ الرجال
ابن سعد، جامع بیان العلم، اعلام الموقعین وغیرہ)

علم سے مراد کتاب و سنت اور فقہ ہے۔
ہد رسالت اور عہد صحابہ میں کتاب و سنت اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دی جاتی
ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علم تین ہیں ان کے علاوہ زائد ہیں، آیۃ محکمہ،
قائمہ فرائض عادلہ، عبداللہ بن عمر کا قول ہے کہ علم تین ہیں۔ کتاب ناطق، سنت ماضیہ
دری، عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ علم کتاب اللہ سنت رسول اللہ ہے، اس کے بعد
ں اپنی رائے سے کوئی بات بیان کرے تو میں نہیں جانتا کہ اسکو اپنی حسنات میں
ا یا سیئات میں پائے گا۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا ہے کہ کثرت حدیث علم نہیں
ا تو خشیت خداہے۔

علوم اور زبانیں | حضرات صحابہ علم یعنی کتاب و سنت اور فقہ کے ترجمان و معلم کے ساتھ دوسرے علوم و ادب کے عالم بھی تھے، مثلاً علم الانساب میں ابوبکر، ابوالجہم بن حذیفہ، جبیر بن مطعم سب سے بڑے عالم تھے اور جمیع انساب عرب پر رکھتے تھے ان کے علاوہ عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، عقیل بن ابی طالب کا علم الانساب نمایاں مقام رکھتے تھے، حضرت ابوبکر تعبیر رویا میں سب سے آگے زید بن ثابت سریانی زبان کے عالم تھے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سترہ دن میں اس زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے عبداللہ بن عمرو بن عاص بھی سریانی اور عبرانی زبان کے عالم تھے، اور تورات پڑھ تھے۔ ابوہریرہ نے تورات کو پڑھا نہیں تھا مگر مضامین سے اچھی طرح واقف

اس کی شہادت کعب احبار نے دی ہے۔ نیز ابوہریرہ فارسی زبان سے وا تھے اور بعض روایات کے مطابق حبشی زبان بھی جانتے تھے انکے وطن نجران یمن اہل فارس آباد تھے جن کو ابناء کہتے ہیں، نیز حبشہ بھی یمن کے سامنے واقع ہے وہاں کے لوگ ملک عرب میں کثرت سے رہتے تھے۔ سلمان کی مادری زبان تھی، ایک روایت کے مطابق ایرانیوں نے ان سے سورہ فاتحہ فارسی میں لکھنے کو کی تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ " بنام یزداں بخشایندہ لکھا اور رسول اللہ صلی اللہ کو سنایا ایرانیوں نے اس ترجمہ کو پڑھنا شروع کیا اور جب انکی زبان نرم تو عربی میں پڑھنے لگے۔

مدینہ منورہ کی دینی و علمی مرکزیت | وارثین علم نبوت میں بہت سے حضرات اور عہد خلافت میں جہاد و غزوات میں شہید ہو گئے، کتنے حضرات بلاد میں امارت، قضاء اور تعلیم کے لئے روانہ کئے گئے کچھ اپنے اپنے قبائل اور عر میں چلے گئے اور ایک بڑا طبقہ دینی علوم کی تدریس و تعلیم سے پہلے دنیا سے رخصت

اس دور میں جو حضرات مدینہ منورہ میں رہ گئے وہ خلاصۃ الخلاصہ تھے اور شہر نبوت عالم اسلام کا دینی و علمی مرکز تھا امام مالک رح کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں فلاں غزوات سے اتنے اتنے ہزار صحابہ کو لیکر واپس ہوئے تقریباً دس ہزار مدینہ میں رہ کر یہیں فوت ہوئے زید بن ثابت کا قول ہے کہ جب تم اہل مدینہ کو کسی مسئلہ پر متفق دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ سنت ہے، عبداللہ بن مسعود کو حضرت عمر رض نے تعلیم کیلئے کوفہ بھیجا تھا جب وہاں کوئی شخص مسئلہ معلوم کرتا تو جواب دیتے تھے، اور جب مدینہ آکر دیکھتے کہ یہاں کے علماء کا عمل اس کے خلاف ہے تو کوفہ واپس جاکر گھر جانے سے پہلے اس شخص کو بتا دیتے تھے کہ اس مسئلہ میں اہل مدینہ کا یہ عمل ہے ایک شخص نے ابوبکر بن عمر بن حزم سے کہا کہ فلاں مسئلہ میں مجھ کو خلجان ہے انہوں نے کہا کہ بھتیجے! جب تم اہل مدینہ کو کسی بات پر متفق دیکھو تو تمہارے دل میں اس کے بارے میں خلجان نہیں ہونا چاہیئے، مجاہد، عمرو بن دینا[ر] اور دوسرے علماء کہا کرتے تھے کہ ہم علم میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، البتہ عطا بن ابی رباح کو ہم پر اسلئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ مدینہ سے علم حاصل کر کے آئے ہیں۔

ابوالعالیہ ریاحی بصری کہتے ہیں کہ ہم لوگ بصرہ میں صحابہ سے حدیث سنتے تھے اس کے بعد مدینہ جاکر وہاں کے صحابہ سے سنکر مطمئن ہوتے تھے شعبی نے کوفہ میں ایک حدیث بیان کر کے شاگردوں سے کہا کہ تم لوگوں کو یہ حدیث مفت مل گئی اس سے کم حدیث کیلئے آدمی سواری کر کے مدینہ جاتا تھا ابوقلابہ کہتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں کئی دن قیام کیا حالانکہ اس کے علاوہ میری کوئی حاجت نہیں تھی کہ ایک شخص کے پاس ایک حدیث تھی میں اسکو سنوں یحیی ابن ابوکثیر نے مدینہ کا سفر کیا تاکہ صحابہ کی اولاد سے علم حاصل کریں۔

عمر بن عبدالعزیز نے بلاد اسلامیہ حدیث و سنن کو مدون مرتب کرنے کیلئے فرمان جاری کیا تو خاص طور سے قاضی مدینہ ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ وہاں کی احادیث خصوصاً عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی مرویات کو مدون کریں، الغرض مدینہ کے دینی و علمی مرکز سے پورا عالم اسلام وابستہ تھا۔

اور اسی مینارۂ نور سے ہر طرف روشنی پھیلتی تھی۔

مدینہ کے چار فقہائے صحابہ اور انکی فقہ کے مراکز | امام ابن قیمؒ کہتے ہیں۔

والدین والفقہ والعلم انتشر فی الامۃ عن اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ واصحاب زید بن ثابت واصحاب عبداللہ ابن عمرؓ واصحاب عبداللہ بن عباس فعلم الناس عامتہ من اصحاب ھؤلاء الاربعہ فاما اھل المدینۃ فعلمھم عن اصحاب زید بن ثابت وعبداللہ بن عمر واما اھل مکۃ فعلمھم عن اصحاب عبداللہ بن عباس واما اھل العراق فعلمھم عن اصحاب عبداللہ بن مسعود۔

دین فقہ اور علم حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت زید بن ثابتؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے اصحاب و تلامذہ سے پھیلا ہے اور لوگوں کا عام علم ان ہی چاروں حضرات کے شاگردوں سے ہے اہل مدینہ کا علم زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر سے اہل مکہ کا علم حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ سے اور عراق کا علم حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ سے اور عراق کا علم حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب سے ہے۔

اور امام بخاری کے استاد امام علی مدینیؒ کا بیان ہے

لم یکن من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من لہ اصحاب یذھبون مذھبہ ویفتون فتواہ ویسلکون طریقتہ الا ثلاثہ عبداللہ بن مسعودؓ وزید بن ثابتؓ و عبداللہ ابن عباس۔

حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت زید بن ثابت حضرت عبداللہ بن عباس

کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں کوئی عالم ایسا نہیں تھا جسکے تلامذہ اصحاب اس کے فقہی مذہب پر عمل کرتے ہیں اس کے فتوی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اور اسی طریقہ پر چلتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان چار یا تین حضرات کا فقہی مسلک بنیادی طور پر امت میں رائج ہوا، فقہ و فتوی میں ان کے اصول پر عمل کیا گیا ان کے مقابلہ میں دوسرے صحابہ کے فقہی آراء و اقوال رائج ہوئے، ان تصریحات میں صحابہ کے تفقہ فی الدین کا ذکر ہے، تفسیر و تاویل، تحدیث و روایت دوسرے دینی امور میں ان کے رسوخ فی العلم سے بحث نہیں ہے۔

مسجد نبوی کی تعلیمی مرکزیت | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں مسجد نبوی مرکزی درس تھی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں بھی مسجدوں میں تعلیمی مجالس اور حلقے قائم ہوتے تھے بلکہ اعیان و اشراف اور اہل علم کی عام نشست مسجدوں میں ہوتی تھی، ابو ادریس خولانی کہتے ہیں، المساجد مجالس الکرام، حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک شخص نے جہاد میں جانے کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں تم کو اس سے افضل عمل نہ بتاؤں؟ مسجد بناؤ اور قرآن، سنت اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دو، دور صحابہ میں مسجد نبوی میں تعلیمی حلقوں میں تدریسی حلقوں کی کثرت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود کے ایک شاگرد مسجد میں گئے اور چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا کہ

عہدی بہذا المسجد وانہ کمثل الروضۃ اجتن منہا حیث شئت

اس مسجد میں میرا یہ تجربہ گزرا ہے جس میں لوگ باغیچہ کے مانند تھی تم اس کے جس درخت کے سائے میں چاہو بیٹھ جاؤ۔

ابوالاحوص کہتے ہیں کہ ہم نے اہل علم کو دیکھا ہے کہ ان کی مجلسیں صرف مسجدوں میں منعقد ہوتی تھیں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے علما کو حکم دیا تھا کہ علم کی نشر و اشاعت اپنی مسجد میں کریں کیونکہ یہ سنت مٹ رہی ہے۔

عہد فاروقی میں مسجد نبوی میں تعلیمی حلقوں کی کثرت :

خلافت راشدہ میں قرآن کی حفاظت و اہمیت کے پیش نظر احادیث کی روایت سے روکا جاتا تھا، اس کے باوجود مسجد نبوی میں فقہ و فتویٰ اور روایت حدیث کے متعدد حلقے قائم تھے، جن میں دور دراز کے طلبہ شریک ہوتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کی کثرت کا اندازہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ متوفی ۲۲ھ کے ایک صحابی شاگرد کے بیان سے ہوتا ہے، جندب بن عبداللہ بن سفیان بجلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔

اتیت المدینۃ ابتغاء العلم فدخلت مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذا الناس فیہ حلق یتحدثون فجعلت امضی الحلق حتی اتیت حلقۃ فیہا رجل شاحب علیہ ثوبان کانما قدم من سفر

میں طلب علم میں مدینہ آیا مسجد نبوی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ لوگ حلقہ در حلقہ آپس میں حدیث بیان کر رہے ہیں میں ان حلقوں سے گزرتا ہوا ایک حلقہ میں گیا جس میں ایک صاحب (ابی بن کعب رضی اللہ عنہ) متفکر بیٹھے ہیں ان کے جسم پر دو کپڑے ہیں گویا ابھی سفر سے واپس آئے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مزاج میں کچھ تندی و تیزی تھی بعض اوقات طلبہ سے بے اعتنائی برتتے تھے ایک مرتبہ ان ہی جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ نے ان کے بے رخی پر کہا

اے اللہ ہم تیری جناب میں ان حضرات کا شکوہ کرتے ہیں ہم طلب علم کیلئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں، اپنے جسموں کو تھکاتے ہیں اسوار ہوتے ہیں اور جب ان حضرات سے ملتے ہیں تو یہ ہمارے سامنے منہ بگاڑتے ہیں اور نا ملائم باتیں کرتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد ابن ضمرہ تمیمی بصری لکھتے ہیں

قلت لابی بن کعب نأتیکم من البعد نرجو عندکم الخیر ان تعلمونا فاذا اتیناکم استخففتم امرنا کانا نهون علیکم۔

میں نے ابی بن کعبؓ سے کہا کہ ہم لوگ دور دراز مقامات سے آپ حضرات کے یہاں اس امید پر آتے ہیں کہ آپ ہم لوگوں کو حدیث کی تعلیم دیں گے اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو ہم کو حقیر سمجھتے ہیں گویا آپ کے نزدیک ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے

حضرت ابی بن کعبؓ نے اپنے دونوں شاگردوں کا شکوہ سن کر ان کے ساتھ نہایت محبت و شفقت کا معاملہ کیا اور آنے والے جمعہ کے دن حدیث بیان کرنے کا وعدہ فرمایا مگر اس سے پہلے انتقال کر گئے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد فاروقی ہی میں مسجد نبوی میں تعلیم و تدریس کے متعدد حلقے قائم تھے اور مدینہ کے باہر کے طلبہ صحابہ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

تعلیمی مجلسوں میں نوجوان طلبہ کی کثرت

صحابہ کی تعلیمی مجلسوں میں شریک ہونے والوں میں بیشتر نوجوان طلبہ کی کثرت ہوتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں پیش گوئی فرما کر ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور دین کی تعلیم دینے کی تاکید فرمائی تھی۔
سعید خدری سے روایت ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا تھا

سیاتیکم شباب من اقطار الارض یطلبون الحدیث انا جاؤکم فاستوصوا بهم خیراً۔

عنقریب تمہارے پاس اطراف زمین سے نوجوان علم کی طلب میں آئیں گے جب وہ آئیں تو تم لوگ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

اور عبد اللہ بن مبارک کہتے ہیں۔

اخبرنا [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

یغرس فی ھذا الدین غرسا یشد الدین بھم

ہم کو خبر ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس دین میں پودے لگاتا رہے گا جن سے اس دین کو تقویت دے گا۔

حضرت عمرو بن عاصؓ اہل قریش کے ایک حلقہ کے پاس گئے اور کہا کہ تم لوگوں نے ان لڑکوں کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے! ایسا نہ کرو، ان کے لیے مجلس میں وسعت پیدا کرو، ان کو حدیث سناؤ اور سمجھاؤ یہ صغار قوم ہیں، عنقریب کبار قوم ہو جائیں گے تم لوگ بھی صغار قوم تھے اور کبار قوم آج ہو گئے ہو۔ حضرت حسن بن علیؓ اپنے لڑکوں اور بھتیجوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ علم حاصل کرو، اگر آج تم صغار قوم ہو تو کل کبار قوم بن جاؤ گے تم میں سے جو یاد نہ کر سکے وہ لکھ لیا کرے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ جب اپنی مجلس میں نوجوانوں کو آتے ہوئے دیکھتے تو نہایت والہانہ انداز میں ان کا استقبال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو مرحبا ہو آپؐ نے ہم سے فرمایا تھا کہ میرے بعد لوگ تمہارے پاس حدیث کی طلب میں آئیں گے، تم ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ کرنا، ان کو حدیث کی تعلیم دینا حسن سلوک سے پیش آنا مجلس میں جگہ بنانا۔ اس کے بعد ان سے کہتے تھے۔

فانکم خلوفنا واھل الحدیث بعدنا۔

تم لوگ ہمارے بعد ہمارے جانشین اور حدیث کے عالم ہو گے

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب نوجوانوں کو طلب علم میں دیکھتے تھے تو کہتے تھے۔

مرحبا بینابیع الحکمۃ، ومصابیح الظلم خلقان الثیاب

جدد القلوب حبس البیوت ریحان کل قبیلۃ

مرحبا حکمت کے سرچشمے، ظلمتوں کے چراغ پرانے کپڑے نئے دل والے، گھروں کی زینت اور خاندان و قبیلہ کے گل بوٹے،

درس گاہِ صحابہ کے یہ نوجوان طلبہ آگے چل کر علومِ نبوت کے وارث و معلم ہوئے اور ان کا شمار طبقہ تابعین کے علمائے کبار میں ہوا۔

صحابہ کی اپنے شاگردوں سے محبت اور انکے ساتھ حسن سلوک

وصیت نبوی کے مطابق حضرت صحابہ نے اپنے حلقہ نشینوں اور شاگردوں کے ساتھ انتہائی شفقت و محبت اور ایثار و خلوص کا معاملہ کیا ان کی دلداری و دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ حضرت انس رض کے شاگرد حمید کا بیان ہے کہ ہمارے ساتھ ثابت بن اسلم بنانی بھی حضرت انس رض کی مجلس میں جاتے تھے راستہ میں جو مسجد پڑتی ثابت اس میں جاکر نماز پڑھتے جب ہم لوگ حضرت انس رض کے پاس پہنچ جاتے تو کہتے۔

این ثابت، ان ثابتا دویبۃ احبّہا

ثابت کہاں رہ گیا؟ ثابت ایسا کیڑا ہے جس کو میں محبوب رکھتا ہوں۔

خود ثابت کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضرت انس رض کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہم کو دیکھ کر کہا کہ:

واللّٰہ لانتم احب الی من عدتکم من ولد انس الا من علی مثل ما انتم علیہ

خدا کی قسم میں لوگوں کے برابر انس رض کی (اپنی) اولاد سے زیادہ تم لوگوں کو محبوب رکھتا ہوں البتہ ان میں سے جو تم لوگوں کے مانند ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رض سے پوچھا گیا کہ آپکے نزدیک سب سے محترم کون آدمی ہے؟ تو بتایا کہ میرا ہم نشین جو حاضرین مجلس کو پھاندتا ہوا میرے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتو اس کے چہرے پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دوں اس کے بدن پر مکھی بیٹھتی ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے ان کا قول ہے کہ میرے ہمنشین کا میرے اوپر تین حق ہیں۔ اسکو آتا ہوا دیکھوں تو انتظار کی نظر سے دیکھوں جب بیٹھ جائے تو اس کے لیے گنجائش نکالوں اور جب بات کرے تو اسکو غور سے سنوں۔

ابوالعالیہ ریاحی نے غلامی کی حالت میں قرآن پڑھا اور لکھنا پڑھنا سیکھا وہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ مجھے اپنے تخت پر بٹھاتے تھے حالانکہ قریش اعیان و اشراف نیچے بیٹھتے تھے اور کہتے تھے کہ یوں علم عزت و شرافت میں بڑھ جاتا ہے اور عالم کو بادشاہوں کی طرح تخت پر بٹھاتا ہے۔ ابوحمزہ نصر بن عمران ضبعی بصری کہتے ہیں ابن عباس مجھے تخت پر بٹھاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم میرے یہاں رہو میں تمہارے لیے اپنے مال سے ایک حصہ مقرر کر دیتا ہوں۔

زر بن حبیش کا بیان ہے کہ میں حضرت صفوان بن عسال کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا کس کام سے آئے ہو؟ میں نے کہا طلب علم کے لیے حاضر ہوا ہوں یہ سنکر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے بشارت دیکر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ طالب علم کیلئے ملائکہ اس لیے خوش ہو کر اپنے پر بچھاتے ہیں کہ وہ علم طلب کر رہا ہے

مدینہ سے ایک طالب علم حضرت ابو درداءؓ کے پاس دمشق گیا انہوں نے اس سے پوچھا یہاں کس لئے آئے ہو کوئی حاجت ہے یا تجارت مقصد ہے یا یہ سفر طلب علم کی غرض سے کیا ہے؟ طالب علم نے کہا کہ میں صرف طلب علم کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں اس پر حضرت ابو درداءؓ نے مسرت و بشارت کے انداز میں کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو بندہ طلب علم کے لیے نکلتا ہے فرشتے اس کے لئے پر بچھاتے ہیں وہ جنت کا راستہ طے کرتا ہے اور عالم کے لیے آسمان اور زمین والے حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں استغفار کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت زاہد پر ایسی ہے جیسی چودھویں رات کی چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے علماء درہم و دینار وراثت میں نہیں چھوڑتے انبیاء کرام علم کی وراثت چھوڑتے ہیں جس شخص نے علم کی وراثت حاصل کی اس نے وافر حصہ حاصل کیا۔

(تعمیر حیات لکھنؤ م ۱۹۶۹ء سے ماخوذ)

ریاض الدین احمد (دینی تعلیمی کونسل یوپی)

امریکی نظام تعلیم کا مطالعہ

مطالعہ اور عمل

(ایک فعال نصاب تعلیم کا مطالبہ)

خوش قسمتی سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا وہ خطاب نظر سے گذرا جو طلبا میں دعوتی مزاج کی تشکیل کے بارے میں تھا۔ اس تقریر کو پڑھ کر میں پھڑک اٹھا کیونکہ محترم نے نئے تعلیمی فلسفہ کو روحانی قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔ درحقیقت مطالعہ اور عمل کا تعلیمی کردار اسلاف سے چلا آرہا ہے مگر حالیہ دور میں اس کو نئے نئے تکنیکی انداز سے پیش کیا جارہا ہے۔ دوران کلام مولانا نے ارشاد فرمایا۔ ہم یہاں آپ کو ایک حقیقت سے باخبر کرنا چاہتے ہیں کہ ایک چیز مجھی جاتی ہے فیکٹر (FACTOR) دوسری چیز ہوتی ہے ایکٹر (ACTOR) عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں صرف اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ اثر ڈالنے کی نہیں ہے لیکن عرصے سے ہمارا تعلیمی نظام چاہے مدارس عربیہ کا ہو یا انگریزی اسکولوں کا، اسی غلط فہمی کا شکار ہے' مغرب نے اپنے بچوں کو عمل کرنا، اثر ڈالنا اور مطالعہ میں ڈوب جانا سکھایا اس لیے وہ تعلیمی دنیا کے صف اول میں داخل ہوگئے۔ [illegible] ہم آزادی کے بعد قیود علم و عمل سے بھی آزاد ہوگئے۔ [illegible]

کیا جاتا ہے ۔ اور یہاں ہمارے بچے ابھی کتنا پیچھے ہیں۔

ذوق مطالعہ : برٹش اسکول کی ایک لڑکی کو میں نے دیکھا جو سینئر کیمرج (SENIAGR COMBRISE) کا امتحان دینے والی تھی اس کے پاس تقریباً سو کتابوں کی لائبریری تھی کتابیں متنوع عنوانات پر تھیں یہاں تک کہ ایک کتاب ۲ ہزار پہیلیوں کی بھی تھی یہ بھی اپنے یوم پیدائش کے تحفوں میں کتابیں ہی لینا پسند کرتی تھی امتحان کا نتیجہ آیا تو اس کا ۱۱ یا ۱۲ جتنے بھی مضامین تھے سب میں ڈسٹنکشن (DISTINCTION) آیا اور ایک مضمون میں اس کا اسکور (SCORE) سو فیصدی تھا۔

اس درجہ کے طلبا کو وہاں ریسرچ پروجیکٹ (تحقیقی مقالہ نویسی) دیئے جاتے ہیں ایسے پروجیکٹ جو زندگی سے بہت قریب ہوں، اسی لڑکی کے پاس ایک پروجکٹ پارکنگ لاٹ میں آنے والی کاروں کے بارے میں تھا۔ میں نے جب اس پروجیکٹ کا خاکہ دیکھا جو لڑکی نے تیار کیا تھا تو میں حیرت میں پڑ گیا، کیونکہ میں نے تو ایسا خاکہ اس وقت تیار کیا تھا جب میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ریسرچ پروگرام کا ایک پروجکٹ کر رہا تھا۔ اس وقت میں پرنسپل ہو چکا تھا۔

ایک واقعہ : میرے ایک ساتھی انگریزی کے ایم اے تھے اور پڑھتے بہت تھے انگریزی لٹریچر پر ان کو بڑا عبور تھا۔ آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوئے انٹرویو الہ آباد میں ہوا ایک انگریز ٹنکر (TINKER) نامی چیرمین تھا۔ ان کو انگریزی لٹریچر کا ایم اے دیکھ کر سوالات کی بھرمار کر دی اور جو جواب یہ دیتے اس کو غلط کہتا اور اس کی تنقیص کرتا لیکن انہیں اپنے مطالعہ پر اعتماد تھا اس لیے مرعوب نہیں ہوئے اور اپنے جواب کے حق میں دلائل پیش کرتے رہے۔ . . . آخر میں اس نے جھنجلا کر کہا کہ ایسے نامعقول جوابات میں نے کبھی نہیں سنے تھے۔ انٹرویو ختم ہو گیا۔ واپس آئے تو ان کا منھ لٹکا ہوا تھا کہنے لگے کہ ٹنکر سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے میرے دلائل کو نہیں مانا اور جھلا گیا لیکن جب نتیجہ آیا تو ان کا نام کامیاب

کی فہرست میں تھا اور معلوم ہوا کہ انٹرویو میں ان کو دو سو نمبر میں دو سو نمبر ملے تھے مطالعہ پر اعتماد کی یہ ایک زندہ مثال ہے۔

مطالعہ استاد کا حق ہے : کسی وقت الٰہ آباد کے ٹریننگ کالج میں ایک سیمنار ہو رہا تھا اس میں امریکہ کے کسی پرائمری اسکول کا ایک ٹیچر شریک تھا۔ وہ تھا تو عمرانیات کا طالب علم مگر سائنس، فلسفہ، تاریخ، لٹریچر وغیرہ پر ایسے وثوق سے بولتا تھا کہ ہمارے یہاں ماہرین اساتذہ بھی حیرت زدہ ہو گئے اس کے برخلاف ہمارا استاد تو اپنے مضمون پر بھی اعتماد اور وثوق سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ وہ بیچارہ تو اسی دن سے تارک مطالعہ ہو جاتا ہے جس دن سے ملازمت کا پروانہ اسکو ملتا ہے اور ہمارے پرائمری اسکول کا استاد تو اپنے مضامین سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ اخبار تک پڑھنا اسے گوارا نہیں ہے

ایک مطالعہ کا ذوق : امریکی اسکولوں میں بچوں کی کتب بینی کا بہت ذوق پیدا کیا جاتا ہے ایک طالبہ جو درجہ گیارہ میں پڑھ رہی تھی، ہر روز ایک گھنٹے کے لیے ملک کی پبلک لائبریری میں جاتی تھی کیونکہ اسے جن موضوعات پر مضامین تیار کرنا تھا اس کے لیے لائبریری کا سفر ضروری تھا پھر اس کو ہفتہ میں ایک دن کتابیں تقسیم (ISSUE) کرنے کا کام بھی دیا جاتا تھا تاکہ اس کی نظر لائبریری کی بہت سی کتابوں پر پڑ جائے وہاں ان تجربات کے مارکس میرٹ (MRIT) لانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

ذوقِ تجسس : امریکہ میں چھوٹی سی عمر سے بچوں کو تفکر کا عادی بناتے ہیں ایک قرآن ٹیچر نے اسلامک سنٹر کے بچوں کے سامنے قرآن پاک کا یہ حکم رکھا کہ اللہ سے ڈرنا چاہیئے۔ بچوں سے کہا کہ تم خود بتاؤ کہ کیوں ڈرنا چاہیئے۔ بچوں نے طرح طرح کے جوابات دیئے مگر ایک بچے نے جو جواب دیا وہ قابل تحسین ہے اس نے کہا کہ "میں اپنے والدین سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ اگر وہ ناراض ہو گئے تو مجھے چاکلیٹ لاکر کون دے گا۔ اور اللہ سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ اگر اللہ ناراض ہو گئے تو یہ اچھی اچھی چیزیں جو مل رہی ہیں کون دے گا۔"

ایک بار انگلستان کی تعلیم یافتہ ایک خاتون نے کہا کہ "میرا چار سالہ بچہ یہ
اللہ کہاں ہے مجھے دکھائیے میں اسے تکتی رہی جواب دوں مری سمجھ میں نہیں آتا ۔ اس وقت
علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آگیا ؎

ما ترا جوئیم و تو از دیدہ دور
نے غلط ما کور و تو اندر حضور

تو میں نے بچے کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ "بیٹے ! کیا تم اپنی ناک کو دیکھ
جواب ملا نہیں ۔ پھر میں نے اسے ایک بہت دور کی جگہ کا اشارہ کر کے پوچھا
دیکھ رہے ہو ؟" جواب ملا نہیں تو اب سمجھ لو میں نے کہا کہ اللہ تمہاری آنکھوں سے
ہیں کہ ان کو دیکھنا ناممکن ہے ' اور تم سے اتنی دور ہیں کہ اس دوری تک تمہاری
دیکھ سکتی ۔ اس لیے تم اللہ کو دیکھ نہیں سکتے ۔ مگر ہیں وہ تمہاری آنکھ میں موجود

ایک بار ہوسٹن میں میں ایک کتاب بلیک ہول (K HOLE
پر پڑھا تھا ۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ میں اس کا خلاصہ کرنا چاہتا ہوں ۔ مگر وقت
پاس نہیں ہے ' میرے قریب ایک بچہ کھڑا تھا جس نے درجہ 5 کا امتحان دیا
فوراً کہا کہ میں اس کا خلاصہ تیار کر کے ابھی لاتا ہوں میں حیرت میں پڑ گیا ۔
۱۵ منٹ میں اس نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ میرے سامنے رکھ دیا یہ کاغذ
بھی میرے فائل میں موجود ہے ۔ یہ خلاصہ تیار کرنے میں اس نے کمپیوٹر کا اس
فوراً میرے پاس لے آیا یہ بچہ ریاضیات (MATHS) میں اتنا تیز ہے کہ وہ
طالب علم ہونے کے باوجود اس کو اجازت دی گئی ہے کہ اس مضمون میں درجہ سات

اس طرح کی ٹکنیک اور ترغیبات سے ہمارے بچے محروم ہیں۔

محنت کا جائزہ : ترقی یافتہ ممالک میں ہر منصوبے یا محنت
بہت ضروری سمجھتے ہیں تاکہ عمل کی خامیاں ابھر کر سامنے آجائیں وہ لوگ

شخص یا منصوبہ یا ادارہ کے کردار کا جائزہ وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہتے ہیں ہمارے یہاں جانچنے کا قاعدہ خالی ہے اس لیے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہماری محنت کا تاثر کیا ہے اور اخراجات کے تناسب میں نفع بخش ہوتی یا نہیں۔ یہاں جو ڈھرا چل پڑا وہ چل پڑا۔ خلا اور کمائیاں پر کرنے کا کوئی نظام نہیں ہے۔ قدیم روش پر اڑے رہنا ہمارا روایتی مزاج ہے

ایک تحریر : لائبریری کا ذوق کتب بینی کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ مجھے یہ ذوق ورثہ میں ملا ہے میرے والد مرحوم اگرچہ پولیس کے ملازم تھے مگر ان کے پاس لائبریری بہت اچھی تھی اور بعض مکاتب کو ان کی تاکید تھی کہ جو بھی نئی کتاب اسلام یا سیرۃ پاک پر آئے وہ ان کے پاس بلا آرڈر کے بھیج دی جائے، اقبالیات کے بھی وہ بڑے شوقین تھے جب وہ سونے جاتے تھے تو مجھکو بلا کر فرماتے تھے کہ کچھ مجھے پڑھ کر سناؤ تاکہ میں سو جاؤں سیرۃ النبی (شبلی نعمانی) کے بیشتر حصے میں نے ان کو اسوقت پڑھ کر سنائے تھے جب میں اسکول کا طالب علم تھا وہ ذوق اب بھی میرے ساتھ ہے۔ اور ایک چھوٹی سی لائبریری، میرے گھر میں ہے میرے بیٹے اور بہوؤں کے پاس بھی الگ الگ لائبریری ہے

میں جب الہ آباد یونیورسٹی کے مسلم ہاسٹل میں مقیم تھا تو پہلے ہی سال میں لائبریرین چن لیا گیا میں نے لائبریری کی تنظیم بڑے ذوق سے کی جھاڑ پونچھ سے لے کر کتابوں کی تقسیم تک ہر کام میں اپنے ہاتھ سے کرتا جب میرے سب ساتھی کھیل کے میدان میں ہوتے تو میں لائبریری میں پایا جاتا۔ میرے ذوق اور تنظیم کو دیکھ کر مولانا نامی (جو ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے) اتنا خوش ہوئے کہ انہوں نے چار سو کا عطیہ نئی کتابیں خریدنے کے لیے پیش کیا۔ اب وہاں ایک تنخواہ دار جز وقتی لائبریرین ہے اور اکثر لائبریری بند رہتی ہے۔

یہی ذوق میرے ساتھ اسلامیہ کالج گیا۔ وہاں میں نے لائبریری کی خوب توسیع کی سر عبدالرؤف سکشن اور سر شفاعت احمد خان سکشن کے دو اہم ذخیروں کا اضافہ کیا۔ تاریخ کے سکشن میں مطالعہ کے لئے یونیورسٹی سے ریسرچ اسکالر آنے لگے، ہر کلاس کے بچوں کو کتابیں

بارے میں کچھ لکھنے کی بھی ترغیب دی جاتی تھی۔ اگر کچھ نہ لکھ سکیں تو کتاب کا نام اور مصنف کا نام اپنے لائبریری کارڈ پر لکھدیں۔ بڑے بچے اخبار پڑھ کر روزانہ کی اہم خبریں پبلسٹی بورڈ پر لکھ دیا کرتے تھے۔

افسوس کہ ان کوششوں کی اب صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔

مولانا شبلیؒ کا انٹرویو : ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں اساتذہ کا تقرر ہو رہا تھا مولانا شبلیؒ بھی انٹرویو کے لیے بلائے گئے۔ جب وہ وقت مقررہ پر پہونچے تو سرسید نے انہیں لائبریری میں بٹھا دیا اور یہ کہکر چلے گئے کہ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ الماریوں کے تالے بند تھے۔ مگر شیشوں سے کتابیں نظر آرہی تھیں۔ شبلی صاحب ٹہل ٹہل کر کتابوں کا جائزہ لیتے رہے سرسید گھوم پھر کر آئے تو فرمایا کہ "اب آپ کا انٹرویو کل ہوگا۔" دوسرے دن جب وہ تشریف لائے تو تالے کھلے ہوئے تھے اور وہ کتابیں نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ پھر سرسید تشریف لائے تو فرمایا کہ اب آپکا انٹرویو کل ہوگا۔ اس دن لائبریری میں ایک میز بھی لگی تھی اور لکھنے کا سامان بھی تھا۔ اب شبلی صاحب کتابیں دیکھ بھی رہے تھے اور لکھ بھی رہے تھے۔ حسب معمول تھوڑی دیر کے بعد سرسید آئے اور فرمایا "مولوی شبلی آپکا انٹرویو ہو گیا اور آپ کالج کے استاد مقرر ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کی نظر میں کتب بینی کی کیا عظمت تھی۔

آج جو اساتذہ مقرر ہوتے ہیں ان کی کتب بینی صفر سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کا وہ وقار نہیں ہے جو پرانے اساتذہ کا تھا۔ میرے انگریزی کے استاد پروفیسر ادیب اردو فارسی اور سنسکرت پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

بک شاپ کی سیر : حضرت مولانا نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کتابوں کی دوکانوں کی سیر ایک بڑی بامقصد تفریح ہے اس سے بعض نظر ماہر ذوق مطالعہ کے علاوہ کبھی کبھی حیرت انگیز فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ ایک مسلم طالب علم جس نے آئی اے ایس میں ٹاپ (TOP) کیا تھا، اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ حضرت کتابوں کی دوکانوں کی سیر کے علاوہ

۔ انٹرویو کے قریب جب دکانوں کا دورہ کر رہے تھے تو ایک جدید ترین کتاب پر نظر پڑی اسکو
منے دلچسپی سے دیکھا اور اس کا بغور جائزہ لیا۔ اتفاق سے ممتحن صاحب بھی اسے دیکھ گئے
اور اسی پر انہوں نے اپنے بہت سے سوالات مرتب کر لیے تھے، ہر امیدوار سے اسی پر
ں کرتے تھے جواب نہیں ملتا تھا۔ لیکن جب یہ پہونچے تو اس کے ہر سوال کا جواب آسانی
دیتے رہے اس لیے انہوں نے بہت اونچا اسکور کیا اور اول آگئے۔

مگر ایک افسوس کی بات یہ ہے کہ عربی اور اردو کتابوں کی دکانیں اس طرح ترتیب
دی جائیں کہ لوگ گھوم پھر کر کتابیں دیکھ سکیں، خواہ انہیں کوئی کتاب خریدنا ہو، لیکن
زی یک اسٹال ہندوستان میں بھی ایسے ہیں کہ لوگ وہاں تفریحاً جا سکتے ہیں اور
ہیں۔

سیات اور عمل : آجکل انگلستان اور امریکہ میں مدرسیات کو عمل سے
ے کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے ورجینیا میں نیا نصاب تعلیم پبلک کے مشورے
لیے پیش ہوا۔ چھ سو مرد اور عورتوں نے نصاب پر رائے زنی کی مجلس میں حصہ لیا۔ عام
رہ یہ تھا کہ عمل پر زیادہ زور دیا جائے۔ ایک ماں نے بگڑ کر کہا ورجینیا کے اعلیٰ
ہ داروں کے نام بتا کر کیا کرو گے پہلے بچوں کو لالٹین سے کمرہ روشن کرنا سکھاؤ۔ انگلستان
میں تعلیمی کیپسول (CAPSULES) تیار کیے گئے ہیں جو بچوں کو علمی ترجیحات کی طرف
تے ہیں اور بچوں کو اپنی دلچسپی کے مضامین خود چننے کا موقع دیا گیا ہے۔ امریکہ میں مدرسیات
ہر بچے بہت سے کام کرتے ہیں مثلاً رچمنڈ میں ایک طالب کو ہر ہفتہ ایک ضعیفہ کے ہاں دن
بت کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اور ہیوسٹن میں ایک طالب علم کو ہسپتال میں مریضوں
بھال کے لیے ہفتہ ہفتہ جانا پڑتا تھا۔ ایک چھوٹا بچہ (عمر دس یا بارہ سال) اس کو
سرٹیفکیٹ انسداد منشیات کی مہم میں حصہ لینے کے لیے ملا تھا [illegible] اپنا [illegible]
[illegible]

ہمارے یہاں ایسی کوئی ترغیب نہیں ہے جو عوتی عمل کے لیے حسن اخلاق کو ذریعہ بنانا درسیات کا بوجھ گھٹانے اور سلسلۂ گفتار مختصر کرنے کے لیے ضروری ہے۔

درسیات اور تجسس: قومی معیار تعلیم کی ایک عالیہ کانفرنس میں جو واشنگٹن میں منعقد ہوئی تھی۔ نیشنل ریسرچ کونسل کے چیئرمین اس پر زور دے رہے تھے کہ وہ نہ صرف سیکھنا اور مشق کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ طلبا میں مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت بھی ہونا چاہیئے۔ اس صلاحیت کو حاصل کرنے کے لئے راہ تجسس سے گذرنا ضروری ہوگا تاکہ طلبا صرف الفاظ اور اصطلاحات کے الٹ پھیر میں گم نہ ہو جائیں بلکہ تفکر اور تدبر کی طرف مائل ہوں۔

جاپانی اسکول: کہتے ہیں کہ واٹر لو کی لڑائی کھیل کے میدان میں لڑی گئی اور جاپانی معاشیات کی جنگ کلاس روم میں لڑی گئی۔ ایک امریکی استاد جو دو برس سے وہاں پڑھا رہا ہے کہتا ہے کہ یہاں اسکول کی ڈسپلن ایسی سخت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ملٹری اکاڈمی ہے۔

۱ : جاپانی بچے صبح کو ۲۵ سے ۳۰ منٹ اسکول کی صفائی کا کام کرتے ہیں۔ اور غسل خانے وغیرہ بھی صاف کرتے ہیں۔

۲ : بچے ایک دوسرے سے افضلیت کا نہ کوئی لباس پہن سکتے نہ کوئی چیز استعمال کر سکتے۔

- ہاتھ میں گھڑی باندھ کر نہیں آ سکتے۔
- رنگین جوتے نہیں پہن سکتے۔
- لڑکیاں بالوں میں ربن نہیں لگا سکتیں۔
- بالوں کو رنگ نہیں سکتیں۔
- خوشبو لگا کر اسکول نہیں آ سکتیں۔
- میک اپ نہیں کر سکتیں۔

غنی نعیم

ادب کے مجاور - انشائیہ

(سراج معانی کے انشائیہ "کنکر بولتے ہیں" سے متاثر ہو کر)

(قسط اول)

شہر حیدرآباد، فرخندہ بنیاد، گہوارہ علم و فن کی ماحولیاتی اور فضائی آلودگی کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی یہاں کی ادبی انجمنوں میں قدم رنجہ فرمانے کی ہمت کرے۔ شہر حیدرآباد کی موجودہ ادبی فضا کو دیکھ کر ایک ہی خیال اُبھرتا ہے کہ شعر و ادب کو ایک مقدس لاش کی صورت مقبرہ میں دفن کر دیا گیا ہے اور اس درگاہ کے خلیفہ اور مجاور اس بارگاہ کے فیضان سے نہ صرف روزگار حاصل کر رہے ہیں بلکہ اپنے زندہ رہنے کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اس مقدس بارگاہ کے کئی چلے بن گئے ہیں جن پر خلیفہ اور مجاورین اپنے گنتی کے حواریوں کے ساتھ نیم ماہی، ماہواری، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ فاتحہ خوانی میں مصروف رہتے ہیں۔ ہر چلے کا مجاور اور خلیفہ اپنی نام نہاد ادبی شخصیت کی اشتہار بازی میں شہرت کا بھکاری بنا ہوا ہے اور کسی نہ کسی معزز نام سے خود کو وابستہ کئے اپنے چلے اور چیلوں کے متعلق خبریں شائع کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ بات صرف اس حد تک محدود نہیں بلکہ ان ادبی اجلاسوں (جنہیں غیر ادبی کہنا زیادہ معقول ہے) میں شرکا کی تعداد بمشکل تمام بشمول ان خلیفہ و مجاور اور ان کے حاشیہ برداروں کی

ں تا پندرہ ہوتی ہے۔ اس میں تین چار تو مستقل مہمانانِ خصوصی ہیں۔ صدرِ محفل کہیں
مستقل ہے۔ اور اکثر انجمنوں میں بطور رفعِ حاجت ان ہی مستقل مہمانانِ خصوصی میں سے
ںا ایک کو صدرِ محفل کا اعزاز دیا جاتا ہے۔ اس مزارِ مقدس پر عود و لوبان کی دھونی تو
ہیں ہوتی البتہ بغض عناد اور کینہ حسد و حواس اٹھتا ہوا فضا کو اس درجہ آلودہ کر جاتا ہے کہ
نس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ گھٹن اور حبس ان محفلوں میں اس لیے بھی زیادہ محسوس
ا ہے کہ ان مجاوروں نے اپنے ذہن و دل کے دروازے اور فکر کے دریچے
رثا بند ۔ کر رکھے ہیں ان نام نہاد ادب کے مجاوروں کی فکر کے سوتے تو کب کے
ملہ ہو چکے ہیں۔ ادب کے نام پر خرافات کا چرچا عام ہے۔ مجاوروں کی اجارہ داری
داداگری کا یہ عالم ہے کہ ان کی "خر گوئی" "ابتر نگاری" اور "کذب مقالی" کو ادبِ عالیہ
رب ادبی کا اظہار برملا کیا جا رہا ہے۔ کہیں تو ایوانِ وسیع میں اپنے ہاتھوں کھوئی
ا جنت کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ ماضی کی خاکستر میں شرر پارہ کی تلاش میں شمع روشن
جاتی ہے۔ سخاوت کی شامت ہوتی ہے۔ رخِ انور پر زردی کی زیادتی برقی قمقموں کی
ہ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ مجاوروں کی توہین آئی ہے ایوانِ وسیع کے کرم خوردہ قالینوں
مل، لیپو، مچھر اور دیگر جراثیم کے ساتھ ساتھ قلی پلپلی نجس پلیدی، خر، ابتر،
ب، شامت۔ خلش نارسائی، حماقت دلرباسی، ابرلوری، خناس مردود اور صدر
شاعرہ، معہ مہمانانِ خصوصی تشریف فرما ہو کر لایعنی، لغویت سے بھرپور شعریت سے
ا تک بندی تھرتھراتے، لرزتے، اور کپکپاتے ترنم اور جسم کے ساتھ سناتے ہیں تو اس
ت غزل بیچاری قربانی کا بکرا بنی قصاب کی دوکان کے سامنے اپنی خیر مناتی محسوس
تی ہے۔ کیونکہ ان نام نہاد متشاعروں کی اکثریت کسی غیر معروف یا معروف استاد شاعر
غزلیں خرید کر اس کی ضرورت اور خود کی شہرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ایوانِ وسیع
شاعروں میں مرثیہ خوان اور نوحہ گر بھی تیر تکا بلوائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ

وسیع النظری اور لسانی عصبیت سے دوری کے ثبوت کے طور پر اور قومی یکجہتی کے مظاہرہ
کے لیے ہندی کے کوئی ایک سیاسی جماعت کی منعقد شدہ ممثی اپنے بستہ میں لیے ڈاکٹر ہندو
اور دیگر ہندی کے شاعروں کے ساتھ شریک مشاعرہ ہوتے ہیں اور اردو غزل اور شاعری
کے گلے پر چھری پھیرتے رہتے ہیں۔ بظاہر لسانی اور مذہبی تعصب سے ماورا ظاہر کرتے ہیں لیکن
اماوس کی اندھیری رات میں فکر کے ٹمٹماتے دیئے کسی چھت پر روشن کرتے ہیں لیکن ان
دیؤں سے اٹھتا ہوا کڑوا دھواں فکری دھارے کو اور زہریلا کر جاتا ہے اور انسانیت کے
شفاف لبادہ پر سیاہی تھوپی جاتی ہے ان کوئی مہاراج کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع
ہے حکومت کے ایوان عالیہ تک ان کی رسائی ہے اس وجہ سے ایوان وسیع کے مفت خور
دستر خوانی ان کے آگے پیچھے لگے ہوتے ہیں تاکہ حکومتی مشاعروں میں شرکت کے دعوت نامے
باسانی مل جائیں۔

ایوان وسیع میں چونکہ چائے مع لوازمات شاہی کے سربراہ کی جاتی ہے تو ان مفت خوروں
کی خوب شکم سیری ہو جاتی ہے گو کہ اس ناموری کے لیے صاحبِ ایوان کو اپنے بزرگوں کے عطا کردہ
جیب خرچ سے خرچ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قیمت پر شہرت ملتی ہے تو
غنیمت ہے۔ یہاں کی ادبی انجمنوں میں کہیں تو ماتمی کے مجموعے سے اور کہیں تاریخ کے اوراق
سے مرحومین کے لیے ایصالِ ثواب کا انتظام ہوتا ہے تو بھی اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دس دو چار
اور کچھ مجاور ادب کے جمع ہوں فوجدار بنے ہوئے اجلاسوں میں ایک خاص سوچے سمجھے منصوبے کے تحت
فوٹو گرافر کو باخبر کرتے ہیں کہ ایسی تصاویر لی جائیں جن میں صرف اور صرف ان ہی مجاوروں کے
ایسے پوز لیے جائیں جن میں صدرِ محفل مہمانانِ خصوصی اور ناظمِ اجلاس نمایاں نظر آئیں تاکہ انہیں
روزناموں میں اشاعت کے لیے بھیجا جائے۔ اور اپنے البم میں انہیں محفوظ کر لیا جائے تاکہ
ان کی توقیر میں اضافہ ہو۔

شہر کی ادبی انجمنوں کے نام ہی سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائیگا کہ اس شہر میں کتنے

اقسام کا ادب تخلیق پا رہا ہے مثلاً "خرابۂ ادب" ادارہ موقتی ادب، بزم گوہر، مجلس اصلاحی ادب، انجمن شرعی ادب، ہمارا دیش ہمارے باسی) ادارۂ زمانی ادب (خدارا زنانی نہ پڑھیے) بطلف (جہانگیر نگر لٹریری فورم) نے جدائی ادب اور ایسی کئی انگنت ادبی دکانیں ہیں جہاں تاجروں کی کثرت ہے لیکن کوئی خریدار ہی نہیں ہے۔ حالانکہ حکومتی رقمی امداد کی وجہ اردو شاعری و ادب کے کچرے اور کوڑے میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

شاعر / ادیب / اور افسانہ نگار اپنی کتابیں "رسم رونمائی" کے بعد اپنے ہر جانے پہچانے یہاں تک کہ انجان لوگوں کو تحفتاً دیتے ہیں جو بعد شکریہ قبول کرکے حیدرآباد کے مشہور بازار "چوک" کے دوکانداروں کو ردی کے مول بیچ دیتے ہیں۔ اور کوئی قسمت کا مارا جب کسی بلند قامت افسانہ نگار کا مجموعہ اس لیے خریدتا ہے کہ وہ اپنے شہر کا لکھنے والا ہے تو دوکاندار کی حیرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ کئی برس سے پڑے ہوئے ڈھیر سے دو روپئے میں کتاب دے کر یہ مشورہ دیتا ہے کہ جلتے ہوئے درد سر دور کرنے کے لیے pain Killer گولیاں خرید لے جائے۔

اس شہر میں شاعروں کا یہ عالم ہے کہ برساتی مینڈک مارے شرم کے اس سرزمین پر اپنے قدم رکھنا چھوڑ چکے ہیں۔ ایک خود ترید نے میدان شاعری میں قدم رکھتے ہی دھڑلے سے سو مشاعرے پڑھنے کا ریکارڈ قائم کیا جب کہ ان کی شاعری کی عمر سو دن کی بھی نہیں ہے ان صاحب نے اپنے نیم پلیٹ پر اپنی لاتعداد ڈگریاں اور ان کے مناسب اپنے القاب کی طویل فہرست لکھ دی ہے اسے دیکھ کر گیٹ میں داخل ہونے والا اُلٹے پاؤں سر پر پیر رکھ کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔ اپنے ادبی ادارہ کے صدر ہیں اپنے ادارہ کے ہر ادبی اجلاس کے ناظم ہیں اپنے ادارہ کو اس ارادے سے چلانے پر مصر ہیں کہ بیرون ملک کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لٹا دیں شاعروں اور ادیبوں کو اعزازیہ ہی نہیں عشائیہ بھی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ادبی اجلاس اور مشاعرہ میں جو ہمیشہ دیئے ہوئے وقت کے دو گھنٹے بعد شروع ہوتا ہے لگتا تو صرف دس پندرہ شاعر ہوتے ہیں البتہ عشائیہ میں پچیس تیس احباب پہنچ کر اپنی

غیر موجودگی میں ہونے والے ادبی اجلاس و مشاعرہ کی تعریف کرتے ہوئے حق نمک ادا کرتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا اور سچ کہا تھا کہ "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ" اور حیدرآباد میں اس رنگینی میں یہاں کی معزز خواتین شاعرات کی وجہ آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ نئی نئی خوبصورت شاعرات کو دیکھ کر غیر شاعر حضرات کو بھی شوقِ شاعری ہو چلا ہے۔ ان خواتین شعراء میں ایک تو خلیج فارس کی ہیں جو ماہی بے آب بنی ہوئی مشاعرہ گاہ میں آتی ہیں۔ جن کے قد کی لمبائی کم ہے اور جسم کی چوڑائی زیادہ۔ اپنی دانست میں بالو پاکیزہ نظم یا غزل تحت اللفظ میں پڑھتی ہوئی اپنی شعر خوانی میں اسقدر ڈوب جاکر حالتِ رقص میں از خود رفتہ پہنچ جاتی ہیں اور اپنے اس حال میں مدہوش "ہرے راما ہرے کرشنا" کا گھمر لاستاتے ہوئے رقص بناتی ہیں کہ نایاب تصویر کی طرح بمشکل بیٹھی دانتوں سے انگلیاں کاٹنے لگتی ہیں اور عینک کے عدسوں سے چنگاریاں برساتی آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں۔ ایک اور خاتون شاعر جن کی پہچان دوسروں کی نوازش سے ادبی حلقوں میں ہوتی ہے ان کی اردو دانی کے متعلق اسقدر اشارہ کافی ہے کہ موصوفہ نے اپنا مجموعۂ کلام ایک شاعر کو تحفتاً پیش کیا۔ اس شاعر کی رگِ شرارت کے ساتھ رگِ شرافت اور رگِ دیانت پھڑکی۔ انہوں نے فرمائش کی کہ محترمہ اس مجموعہ کلام پر اپنا کوئی شعر اردو رسم الخط میں لکھ کر دستخط سے مزین کیجئے تو جناب عالی اس شاعرہ کا عالم کچھ ایسا ہوا جیسے سورج کی چمکتی کرن پر سیاہ بادل چھا گیا ہو۔ اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا کہ جی اس کے سرورق پر جو شعر چھپا ہوا ہے اس کے نیچے دستخط کافی ہے واقف تماشا کر ۱۲ دیوان تک چار مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں اور مشاعرہ میں وہ جب بھی غزل سرا ہوتی ہیں تو نازک ہاتھوں میں تھمے کاغذ پر دیوناگری رسم الخط میں کورستا یا اردو غزل ہوتی ہے اب آپ ہی بتائیے کہ اگر کوئی اردو والا امریکہ کے کسی شہر میں بیٹھ کر اردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو یہ لوگ کیوں چراغ پا ہوتے ہیں جبکہ وہ وظیفہ خور

مصطفیٰ جنیدی
بالاپور

اُردو کا محبوب شاعر

محبوب راہیؔ

غالباً تین دہائیوں سے محبوب راہیؔ دشتِ شعر و سخن میں سرگرداں ہیں اور اپنے طویل شعری سفر کے دوران ان کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ وہ ہر قدم پر ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے ہیں محبوب راہیؔ اپنے ہم عصروں کے درمیان اپنی تخلیقی زرخیزی کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیات کے مجموعے "ثبات" "تردید" "بازیافت" اور "پیش رفت" کے علاوہ بچوں کی نظمیں بنام "رنگارنگ" (۳ اڈیشن) "گل بوٹے" اور تحقیقی مقالہ بعنوان "ڈاکٹر مظفر حنفی حیات، شخصیت اور کارنامے" شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے جنہیں علمی ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین بھی مل چکا ہے۔ اس تعلق سے محبوب راہیؔ کو مختلف اردو اکیڈمیوں اور ادبی انجمنوں کی جانب سے انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ بقول نذیر فتح پوری کہ "راہیؔ کی شعری کائنات اصنافِ سخن کے گوناگوں رنگوں سے سجی اور سنوری ہوئی ہے۔

میں اس وقت یہاں ان کے مجموعۂ کلام "پیش رفت" کو سامنے رکھ کر ان کے غزلیہ تجربہ کا ہی محاصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل غزل باطنی انکشاف کا وسیلہ ہے۔ اسکے ذریعہ انسانی جذبات اور احساسات شعری پیکر میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ غزل دیگر موضوعات

کے ساتھ عصری مسائل کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ غزل کا فن بہت نازک فن ہے۔ اسکو برتنے میں کافی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اگر اس کا لحاظ نہ رکھا گیا تو اسکی نازکی کو صدمہ پہنچنے کا خدشہ ہے۔ لیکن مجیب راہی اس فن کی نازکی کا احساس رکھتے ہیں اور تخلیق شعر کے وقت فنی تقاضوں کو نہیں بھولتے۔ مجیب راہی میرے علاقہ کے ان خوش نصیب شعرا میں سے ایک جن کو قدرت نے تخلیقی بصیرت سے نوازا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی خارجی اشیا سے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں پھر انہیں داخلی احساسات سے ہم آہنگ کر کے شعری تجربے میں خوش اسلوبی سے منتقل کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس تخلیقی عمل میں سخت مراحل سے گزرتے ہیں۔ لیکن اپنی منزل کو پا لیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مظفر حنفی "وہ جدید تر نسل سے متعلق ہونے کے باوصف اپنی شعری روایت سے یکسر غیر متعلق نہیں ہیں۔" مجیب راہی نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ

جدت کے تقاضے بھی ہوں پیش نظر لیکن × ہر زندہ روایت کی تقلید ضروری ہے

اسی لئے مجیب راہی نے اپنی فکری اور تخلیقی بصیرت سے نئے طرز اظہار کو اپنایا ہے۔ لیکن ان کے کلام میں ہم آہنگی بھی ملتی ہے۔ آج کے بگڑتے ہوئے سماج کے آئینہ میں انسانی زندگی کی شکل بھی نظر آتی ہے۔

قدم قدم مصیبتوں کی یورشوں کا سامنا
اٹھاتے حوصلوں کا ہے مگر بہت قلیل ہے
تاریکی بدن میں خونِ جگر جلا کر
روشن دل و نظر کی قندیل کر رہا ہوں
لوگ دانستہ بھی جھٹلاتے رہتے راہی کو
اسکے سچ کا تھا اگر سب کو مکمل احساس

مجیب راہی کی فکریں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ اپنی ذہنی مناسبت کے باعث کلاسیکیت کی تجدید خوش سلیقگی اور ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ عصری زندگی میں جو تہذیبی

سماجی، اور سیاسی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اس کے زیر اثر ذہنی انتشار، جذباتی بحران اور قدروں کے زوال کے مناظر سامنے آنے لگے ہیں موجودہ معاشرہ میں روحانی اور اخلاقی نظام درہم برہم ہو گیا ہے ہر شخص اپنی ذات کے حصار میں مقید ہے۔ معاشرہ میں سیاسی اقتدار کی ایک کشمکش شروع ہے ہر طاقت ور کمزور پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ ہر انسان خوفزدہ اور ناامید نظر آتا ہے۔ ایسے ماحول میں رہتے ہوئے ہر تخلیقی ذہن متاثر ہوتا ہے محبوب راہی جیسا شاعر بھلا اس سے کیوں بے تعلق رہ سکتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے بھی اپنے شعری تجربوں میں فرد کے بکھراؤ، اس کی بے چہرگی، ذہنی انتشار، درد و کرب، اخلاقی پستی کے تعلق سے نئے تخلیقی انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں ؎

ابھی ابھی تو یہاں اک سہانا منظر تھا
پلک جھپکتے کہاں اڑ گیا دھواں ہو کر

شائستگی، خلوص، محبت، یگانگت
ہر داستاں ہر ایک کہانی تمام شد

چہرہ چہرہ وحشت ٹپکے
آنکھوں آنکھوں حسرت ٹپکے

خاک و خون میں تر بتر ہر دامنِ فکر و نظر
ہر زباں پر ہر گھڑی جنگ و جدل کا تذکرہ

باہمی رنجش، ریاکاری، نفاق
نظارے تو بس گھر گھر کے

لمحہ لمحہ آج کے انسان کو درپیش ہیں
بدنصیبی، یاسیت، افسردگی، محرومیاں

شعری تخلیق اکثر شاعر کی شخصیت کا اظہار بھی ہوتی ہے۔ راہی کے کلام میں ان کے غم ناک پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ محبوب راہی وقت کی تپتی ہوئی دھوپ میں چلے ہیں تجربات کی بھٹی میں ان کی زندگی جلی ہے۔ زندگی کے سفر میں ہر قدم پر مختلف حادثوں سے ان کا سامنا ہوا ہے۔ حلقۂ احباب کے غیر ہمدردانہ رویہ سے بھی ان کا سابقہ پڑا ہے اور آج بھی وہ مسائل کے لشکر کے سامنے تنہا کھڑے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر مایوسی کے

آشنا نہیں ہیں۔ وہ انتہائی صبر و استقلال سے کام لیتے ہیں خلوص کی شمع کو جلائے ہوئے وہ نفرت کے اندھیروں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

حالات سے الجھا بر سر پیکار ابھی تک
گو جسم میں باقی نہیں کس بل مرے اللہ

کم ہیں کیا کہ پر و بال ابھی ذلت کے لیے
گھر میں تو عزت و توقیر سے رہتا جاؤں

جو پیش آتا رہا مجھ سے مہرباں بن کر
رہا پس پردہ حریف جاں بن کر

دشمنوں میں سر فہرست رہا ہے وہ شخص
آج احباب سا مجھ سے جو مخاطب کیا ہے

کینہ دلوں میں رکھنا ہونٹوں پہ چاہ رکھنا
ایسے منافقوں سے کیا رسم و راہ رکھنا

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا
اپنے احباب کو یہ بات بتائیں کیسے

ہر لفظ کے اندر معنی کا طلسم ہوتا ہے۔ خصوصاً غزل میں نئی لفظیات کی شان نظر آتی ہے محبوب راہی بھی الفاظ کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کے چند اشعار ان کے شعری نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں ؎

تاریکیٔ بدن میں خون جگر جلا کر
روشن دل و نظر کی قندیل کر رہا ہوں

زندگی بھر شہر سے باہر کبھی جھانکا نہیں
ہر غزل میں ہے مگر دشت و جبل کا تذکرہ

ہر لفظ کو سچائی کے میزان میں تولیں
تب جا کے اسے لہجۂ بیباک میں بولیں

ہر غزل میں مری راہی مل جائیں گے
کچھ نئے زاویئے کچھ نئے دائرے

محبوب راہی نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کی تشنہ
[illegible]

ایک محرک کی حیثیت سے زمانہ پر اثر انداز ہے۔ محبوب راہی نے جس حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے وہ انسان اور انسانی تجربات کا تسلسل ہے۔ انہوں نے انسانیت کے ضمیر کی خود شناسی اور خود کلامی کو اس انداز میں پیش کیا ہے ؎

تو پستیوں سے مرے قد کو کیسے ناپے گا
زمیں پہ پیر ہیں سر آسمان پر میرا

مجھ سے دنیا یونہی کھلواڑ کرے گی کب تک
تا کہ گیند کی مانند اچھالا جاؤں

کس طرح اپنے سچ کو ثابت کروں کہ میں
سب جھوٹ کے گواہ کروں بھی تو کیا کروں

زندگی بکھری پڑی ہے کرچیوں کی شکل میں
جوڑنا ہے ہر صورت اسکو سینا ہے مجھے

محبوب راہی آج کے بدلے ہوئے حالات میں زندگی سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کی شاعری آج کے دور کی ناانصافیوں کے خلاف ایک حساس ذہن اور پرخلوص، انتہائی شریف انسان کا احتجاج ہے۔ وہ حالات سے غم زدہ ضرور ہیں لیکن ان کی آنکھوں میں عزم و یقین کی چمک ہے۔ حوصلے جوان ہیں، وہ ہر حادثہ سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ ان کے اشعار انسان کو جینے کا استقامت دیتے ہیں ؎

دل جو فولاد کا پتھر کا جگر ہو تو چلو
تم بھی طرح جو بے باک و نڈر ہو تو چلو

آپ کا طرزِ عمل بھی دے شہادت اسکی
صرف باتوں ہی سے اخلاص کا اظہار نہ ہو

چند لمحات کو پرکیف بنانے کے لئے
اپنے اسلاف کے ناموس کا سودا مت کر

توہمات کی منزل کا ہے سفر در پیش
یقین و وہم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو

محبوب راہی کی غزلوں میں بڑا اثر آفرینی ہے۔ وہ اپنے خیالات کو حسین الفاظ کا لباس عطا کرتے ہیں۔ خوشنما ترکیبوں اور معنی خیز بندشوں سے ان کے کلام میں حسن نکھر

کے مسائل، انسانی ذہن کی الجھنوں کی مثالیں۔ جبر و تشدد، سماجی ناانصافیاں غرض موجود ہے۔ اس تعلق سے ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

یہ کرب کا احساسِ مسلسل مرے اللہ
کر دے گا کسی دن مجھے پاگل مرے اللہ

قدم قدم آزمائشیں سی
نفس نفس امتحان جیسا

لاشوں کے ہر اک شہر میں بازار سجے ہیں
ہر موڑ پہ ہے اک نیا مقتل مرے اللہ

ہر نیزہ تنا ہے مرے سینے کے مقابل
ہر تیغ کا لپکاؤ مرے سر کی طرف ہے

ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے مجموعۂ کلام "پیش رفت" میں لکھا ہے "محبوب راہی کو غالب کا انداز مرغوب ہے۔ اور ان کے شعر کہنے کی لگن جوان رہی تو وہ غالب کی شعری روایت کو زندہ رکھنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

اسی مجموعۂ کلام میں ڈاکٹر مظفر حنفی فرماتے ہیں "محبوب راہی جدید ترنسل سے متعلق ہیں لیکن اپنی شعری روایت سے یکسر غیر متعلق نہیں ہیں۔ محبوب راہی کے اشعار میں ہم یہ رنگ دیکھ سکتے ہیں ؎

میر و غالب سے راہی تک کتنوں کے
خونِ جگر سے روپ غزل کا روشن ہے

نکھرا جو کچھ اور غالب و مومن کے بعد بھی
راہی وہ رنگِ حسرت و فانی تمام شد

دورِ غالب سے عہدِ راہی تک
اے غزل تیری آبرو ہے وہی

غالب و میر کا ہمسر تو نہیں راہی بھلے
پر شاعر تو ہے اچھا برا جیسا ہے

وہ جو نسبت سے سخن فہم بھی ہو جائے راہی
غیر ممکن ہے کہ غالب کا طرفدار نہ ہو

روایتوں کے پیڑ سے راہی
پتہ پتہ جدت ٹپکے

جناب محمود سعیدی نے لکھا ہے "محبوب راہی مظفر حنفی سے بہت قریب ہیں اور ان کے کلام میں مظفر حنفی کے کلام کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں"
خود محبوب راہی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "مظفر حنفی کی شاعری میرے لیے سب سے زیادہ مرغوب، پسندیدہ، اور متاثر کن تھی"!
مظفر حنفی کے کلام سے محبوب راہی متاثر ہو ہی چکے تھے لیکن مظفر حنفی کی شخصیت کی اثر آفرینی نے اور محبوب راہی کے ان سے قلبی لگاؤ نے انہیں ڈاکٹر مظفر حنفی تحقیق کے لئے آمادہ کیا۔ محبوب راہی کا پر مغز تحقیقی مقالہ "مظفر حنفی شخصیت اور کارنامے" پر محبوب راہی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور ان کا یہ مقالہ ۱۹۸۹ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔
ہم اہل ودربھ ڈاکٹر مظفر حنفی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کے منفرد لب و لہجہ اور اچھوتے ذائقہ کے کلام کے اثر نے اردو کو محبوب راہی جیسا شاعر عطا کیا ہے۔
محبوب راہی علاقہ ودربھ کے آسمان ادب کا ایسا روشن ستارہ ہے جس پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے مشاہیر جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے۔ نشر و اشاعت کے میدان میں وہ ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ ملک کے علمی ادبی حلقوں میں ڈاکٹر محبوب راہی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص بہترین دوست بھی ہیں۔
آخر میں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں شاید احباب میری رائے سے اتفاق فرمائیں وہ یہ کہ آج کل ادب میں بھی سیاست داخل ہو گئی ہے ادب میں اس طرح کی گروپ بندیوں سے نئی نسل کو جو نقصان پہنچ رہا ہے ہم اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتے ہمارا تلخ تجربہ ہے کہ کہنہ مشق ارباب علم و ادب حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ ادب میں ان جماعات کے داخل ہونے سے اکثر علاقائی ادب کی تاریخ خون کے آنسو

گزرتے ہمیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی بھی ایسے ہی سنگلاخ راستوں سے گزر رہے تھے۔ لیکن محبوب راہی کی صلاحیتوں نے انہیں حوصلہ عطا کیا۔ ان کی دوررس نگاہیں ایسے نفرت بھرے ماحول سے نکل کر ڈاکٹر مظفر حنفی جیسی شخصیت پر مرکوز ہو گئیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کا شمار آج اردو ادب کی قد آور شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ جہاں اپنے انوکھے لہجہ کی شاعری کی وجہ سے ہندوستان اور بیرونی ممالک میں مشہور ہیں اتنے ہی وہ پرخلوص انسان بھی ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کی جوہر شناس نگاہوں نے محبوب راہی کی حوصلہ افزائی کی۔ مجھے انتہائی خوشی ہوتی ہے کہ میرے اپنے علاقہ کا یہ شاعر جو کل پرائمری اسکول میں ٹیچر تھا آج ایک کالج کا پرنسپل بھی ہو گیا ہے۔ کاش ہمارے بزرگ اہل قلم ڈاکٹر مظفر حنفی کی تقلید کریں۔ یقین کیجئے اگر نئی نسل کے باصلاحیت لکھنے والوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی گئی تو ہر علاقہ میں محبوب راہی جیسے فن کار علم و ادب کے چراغ جلا سکیں گے

ہم سے مغلوب، نظر تنگ ملی ہے ان کو
اپنے احباب سے کیا دادِ وفا لی جائے

ڈاکٹر محبوب راہی کا مجموعہ کلام "پیش رفت" میرے علاقہ میں زبان اردو کی ترقی کا ثبوت ہے۔ مجھے یقین ہے اسے علمی، ادبی حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھا جائے

ماہنامہ
شاداب حیدرآباد

جلد: [۱۲]
شمارہ: [۵] مئی ۱۹۹۶ء
قیمت: ۶ روپے

ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری
جائنٹ ایڈیٹر: رشید الدین : مینیجنگ ایڈیٹر: قسین انصاری

مجلس مشاورت

زر تعاون :

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	" ۲۰۰ "	" ۳۶۰ "	" ۳۷۰۰ "
امریکہ	" ۴۰ ڈالر	" ۷۰ ڈالر	" ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	" ۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	" ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	" ۱۱۵ پاکستانی روپے	۲۰۰ روپے	" ۳۰۰۰ پاکستانی روپے

:- ترسیل زر کا پتہ :-

ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱ ریڈ ہلز، حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے
پبلک پرنٹرس، چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب "۱۴۷-۵-۱ ریڈ ہلز حیدرآباد
سے بابت شائع کیا۔

فہرست

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

اصلاح معاشرہ

نکاح و طلاق

سب واقف جانتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جس کی تعلیمات وہدایات انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں پیدائش سے لے کر وفات تک جتنے مراحل آتے ہیں ان سب کے لیے احکام و ضوابط موجود ہیں، اس وقت ان تمام احکام کا بیان اور پیش کرنا مقصود نہیں صرف اس حصہ کا ذکر مقصود ہے جو شادی بیاہ، طلاق و وراثت وغیرہ سے متعلق ہے، جسے عام طور پر "عائلی نظام" کہتے ہیں۔ کیونکہ آج کل اس کی خلاف ورزی ہورہی ہے جس کے نتیجہ میں مسلمان دنیا میں بھی سخت پریشانی کا شکار ہو رہے ہیں ا آخرت میں بھی باز پرس اور سزا کا خطرہ ہے۔ عائلی قوانین کی پابندی نہ کرنے کی ایک وجہ مسلمانوں کی ان قوانین سے لاعلمی بھی ہے اس لئے بھی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ ان کا مختصر انداز میں تذکرہ کر کے عام مسلمانوں کو باخبر کیا جائے۔ اس قسم کے قوانین عائلہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اتنا ہی بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآن مجید کی چھ سورتیں۔ بقرہ نساء، نور، احزاب، ممتحنہ، اور طلاق میں تقریباً چالیس آیتوں کے اندر یہ بیان ہوئے ہیں

احادیثِ نبویہ کا تو شمار ہی مشکل ہے جن میں اس قسم کے احکام و ہدایت دی گئی ہے۔ ان میں بہت اہم ہیں ان پر علیحدہ علیحدہ یہاں گفتگو کی جاتی ہے۔

نکاح:

سب سے زیادہ شرعی قوانین کی خلاف ورزی بلکہ پامالی۔ نکاح یعنی شادی بیاہ کے موقع پر کی جاتی ہے اور عجیب قابلِ افسوس بات ہے کہ شادی کے موقع پر ہر ایک عزیز کو راضی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے حتیٰ کہ ملازموں، خادموں اور نوکروں کو بھی۔ مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے بجائے شرعی احکام کی خلاف ورزی کرکے ناراض کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے موقع پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنے کی پوری کوشش کی جاتی (خواہ اس کے نتیجہ میں کوئی بھی ناراض ہوتا) شادی کے موقع پر، عورت (دلہن) پر شرعاً کوئی خرچ لازم نہیں ہے نہ جہیز، نہ بارات کو کھانا کھلانا، نہ باراتیوں کی خاطر مدارت کرنا۔ بلکہ لڑکے (ہونے والے شوہر، دولہا) کی یا اس کے سرپرستوں کی طرف سے ہونے والی بیوی (دلہن) یا اس کے سرپرستوں (باپ وغیرہ) سے جہیز کا، یا بارات کو کھانا کھلانے کا یا ان کی خاطر مدارت کرنے کا مطالبہ کرنا اور انہیں اس پر مجبور کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ اگر بارات کے لئے کھانا یا ناشتہ کا۔ لڑکی یا اس کے سرپرستوں نے جبراً انتظام کیا تو اس کا کھانا کسی بلاتی، یا دولہا اور اس کے رشتہ داروں تک کے لیے جائز نہیں ہو سکتا۔ (حدیث شریف میں ہے) لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفسہ،) اسی طرح اگر فرمائش کرکے جہیز لیا گیا یا نقد رقم لی گئی تو وہ بھی مرد (دولہا) کے لیے جائز نہیں، نہ اس کا استعمال کرنا جائز ہے بلکہ شرعاً ایسے واپس کرنا ضروری ہوگا۔ نکاح کے وقت جو اور بہت سی رسمیں۔ غیر مسلموں کے دیکھا دیکھی مسلمانوں میں مدارج پا گئی ہیں ان سے بھی بچنا چاہیئے مثلاً گانا، باجا، "ویڈیو" کا استعمال غیر محرم مردوں اور عورتوں کا ایک ساتھ بیٹھنا اٹھنا، کھانا پینا۔ غیر محرم مردوں کے

سامنے عورتوں کا بے حجاب سامنے آنا وغیرہ، عقدِ نکاح کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ چند مسلمانوں کم از کم دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول ہو، چونکہ دلہن (عورت) گھر کے اندر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک اس کی منظوری لے کر آئے (ایجاب کرائے) اور اس وقت دو اور مردوں کو وہاں موجود رہنا چاہیئے تاکہ وہ ایجاب کی تصدیق کر سکیں۔ اور ضرورت پڑے تو گواہی دے سکیں۔ اجازت لینے والا شخص دولہا کے پاس آ کر دلہن کے ایجاب کو پہونچائے اور اسی مجلس میں دولہا اسے قبول کرے۔ نکاح (ایجاب و قبول) کے وقت خطبہ پڑھنا بھی مسنون ہے فرض نہیں ہے، (خطبہ کے بغیر بھی دو مردوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول ہو جانے سے نکاح صحیح ہو جاتا ہے۔ نکاح ہونے کے بعد کھجور یا چھوارہ تقسیم کرنا بھی مستحب ہے نکاح کے وقت ہی مہر مقرر ہو جانا چاہیئے، جو نہ بہت کم ہو کہ جس سے عورت کی بے وقعتی ظاہر ہو اور نہ اتنا زیادہ کہ جس کا ادا کرنا شوہر کے لیے ناممکن ہو، مہر کی ادائیگی یا کم از کم اس کے کچھ حصہ کی ادائیگی فوراً ہو جائے تو بہتر ہے۔ آجکل چونکہ روپیہ کی قیمت بہت جلد جلد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے (گھٹتی زیادہ ہے) اس لیے اچھا یہ ہے کہ مہر سونے یا چاندی کی متعینہ مقدار میں مقرر کیا جائے، ویسے کسی بھی مالیت رکھنے والی چیز (خواہ غلہ ہو، جائداد ہو، کپڑا ہو، یا اور کوئی قیمتی چیز ہو، بشرطیکہ متعین کی جا سکتی ہو) کا مہر مقرر کیا جا سکتا ہے، مہر کا ادا کرنا دوسرے قرضوں کی طرح ضروری ہے، مہر ادا کرنے کی جلد سے جلد کوشش کرنی چاہیئے۔ عورت کی طرف سے رسمی اور دکھاوے کی معافی سے مہر معاف نہیں ہوتا۔ ہاں واقعتاً خوشدلی سے بغیر کسی دباؤ اور دھونس کے وہ معاف کر دے تو معاف ہو سکتا ہے نکاح کے وقت جو مہر مقرر کیا گیا ہے اس میں اضافہ اور کمی بھی فریقین کی حقیقی رضامندی سے ہو سکتی ہے۔ نکاح کے بعد زوجیت کا عملی تعلق قائم ہو جانے، یعنی صحبت کے بعد ولیمہ کرنا مسنون ہے۔ اس میں نام و نمود اور دکھاوے کے لیے بہت سے لوگوں کو بلا کر کھلانا شرعاً پسندیدہ نہیں بلکہ بہ آسانی (بلا قرض لیے) جتنے لوگوں کو کھلایا جا سکے کھلایا جائے، غریبوں، اعزا داروں

کو اس میں ضرور دعوت دی جائے کیونکہ کھانے کی جس دعوت میں صرف مالداروں اور دولتمندوں کو بلایا جائے، غریبوں کو چھوڑ دیا جائے اسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بدترین دعوت قرار دیا ہے۔

زوجین کے حقوق و فرائض :

بیوی کے تمام اخراجات، کھانا، کپڑا، رہائش شوہر کے ذمہ ہیں، خواہ بیوی کتنی ہی دولت مند ہو اور چاہے شوہر غریب ہو، بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی (یعنی اس کی دل شکنی نہ کرنا) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اسے معقول اور مناسب وجہ کے بغیر ڈانٹ ڈپٹ کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ اس کے عزیزوں بالخصوص والدین کو بھی نامناسب انداز میں یاد کرنا جس سے بیوی کی دل آزاری ہو شرعاً ممنوع ہے اس کی جائز اور مناسب باتوں پر روک ٹوک کرنا درست نہیں البتہ ناجائز اور نامناسب باتوں پر روک ٹوک کرنی چاہیئے۔ مثلاً بے پردہ گھومنے پھرنے، غیر محرم کے سامنے آنے سے منع کرنا چاہیئے۔ کہنا نہ ماننے پر تنبیہ بھی کی جا سکتی ہے۔

بیوی کے ذمہ اپنے شوہر کی ہر جائز کام میں اطاعت کرنا اور اسے خوش رکھنا ہے اس کے مال اور اولاد کی نگہداشت کرنا بھی بیوی کی ذمہ داری ہے خاص طور پر جبکہ شوہر موجود نہ ہو (سفر وغیرہ پر گیا ہو)

اس وقت بیوی کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ خلاف شرع کام کرنے پر ہر ایک دوسرے کو ٹوک سکتا ہے (مگر مناسب انداز میں اور فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے) کسی خلاف شرع کام میں اطاعت نہ کی جائے چاہے اس پر شوہر ناراض ہی ہو، مثلاً شوہر اگر غیر محرم کے سامنے آنے کے لیے اپنی بیوی سے کہے تو بیوی اس کی یہ بات نہ مانے۔ دونوں ایک دوسرے کی دلجوئی کی کوشش کرتے رہیں اور دل آزاری سے بچیں۔ ایک دوسرے کے عیبوں کو حتی الامکان چھپائیں۔

تعلقات خراب ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیئے

خدانخواستہ اگر میاں بیوی میں سے کسی وجہ سے شکایات پیدا ہوجائیں تو انہیں آپس میں ہی دور کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے اس بارے میں شوہر کو اپنی بیوی سے اگر شکایات ہیں تو وہ بیوی کو پہلے سمجھائے بجھائے اس سے بھی شکایت دور نہ ہوں اور بیوی کے نامناسب رویہ میں تبدیلی نہ آسکے تو وہ کچھ عرصہ کے لیے بیوی کو خواب گاہ سے علیحدہ کردے اس سے بھی کام نہ چلے تو ہلکی تنبیہ کرسکتا ہے۔ یہ علاج بھی کارگر نہ ہو تو دونوں (میاں بیوی) کے قریبی رشتہ دار درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کرانے اور دونوں کے تعلقات درست کرانے کی پوری کوشش کریں۔ یہ تدبیر بھی دونوں کے تعلقات خوشگوار بنانے میں بے اثر ثابت ہو۔

طلاق کب اور کیسے دی جائے ؟

تو پھر صرف ایک طلاق دی جائے وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ عورت پاک ہو اور اس سے قریبی زمانہ میں یا اس پاکی کے زمانہ میں صحبت نہ کی ہو اگر یہ پہلی صریح طلاق ہے (یا دوسری) تو عدت پوری ہونے سے قبل تک شوہر کو حق ہوتا ہے کہ وہ بنا نکاح کیئے بغیر بھی جب چاہے اسے بیوی بنالے مثلاً وہ اس کے ساتھ اس طرح کا کوئی عمل کرے جو بیوی ہی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے یا زبان سے کہہ دے کہ میں پھر بیوی بناتا ہوں یا اسی جیسی کوئی اور بات کرے جس سے دوبارہ ازدواجی تعلقات قائم ہونے کا پتہ چلتا ہو۔ عدت مکمل ہونے کے بعد اس شخص کے لیے یہ عورت بالکل اجنبی ہو جائے گی۔ جیسے کہ نکاح سے پہلے تھی البتہ عدت ختم ہونے کے بعد دوبارہ نکاح کرکے بیوی بنا سکتا ہے (جس طرح پہلے نکاح کرکے بیوی بنایا تھا) عوام میں یہ غلط مشہور ہوگیا ہے کہ "تین سے کم طلاق ہی نہیں ہوتی بلکہ [illegible] رہتی ہے" حالانکہ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، عدت ختم ہونے کے بعد ایک طلاق دینے سے بھی عورت بالکل غیر اور اجنبی ہوجاتی ہے۔ البتہ تین طلاق دینے سے

خواہ ایک ساتھ دی گئی ہوں، یا الگ الگ، دوبارہ نکاح کرنے کا اختیار ختم ہو جاتا ہے اس لیے ہرگز تین طلاقیں نہ دی جائیں تینوں طلاقیں ایک ساتھ دینا بہت بڑے گناہ کی بات ہے اس سے دینی اور دنیاوی دونوں نقصانات ہوتے ہیں اس لئے اس سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔

طلاق کے اسباب دور کرنے کی کوشش

عام طور سے معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے طلاق دے دی جاتی ہے حالانکہ معمولی بات پر دفعتہً ایک طلاق دینا بھی گناہ ہے۔ طلاق دینے سے پہلے وہ تدبیریں کرنی چاہئیں جن کا ذکر ابھی ہوا۔ آجکل شرعی احکام سے غفلت اور بے دینی کی وجہ سے مردوں بالخصوص نوجوانوں میں نشہ (ڈرگ) کی بری عادت بھی طلاق کا اکثر سبب بن جاتی ہے اور لاٹری (جو درحقیقت شرعاً جوا ہے) کے ٹکٹ خریدنے اور معمے حل کرنے کے سے نہیں جمع کرنے جیسے اخراجات بڑھ جانے سے بہت سے شوہر اپنی بیویوں کے واجب حقوق ادا نہیں کرپاتے اس لیے بھی طلاق کی کثرت ہو رہی ہے ان اسباب سے جو خود اپنی جگہ بڑے گناہ ہیں اور خداوند تعالیٰ کو سخت ناراض کرنے والے ہیں۔ سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہئے تاکہ دنیا و آخرت کی بربادی سے بچا جاسکے۔ شریعت نے شوہر اور بیوی دونوں کے انتخاب کے لیے دینداری کو سب سے زیادہ اہم اور قابل ترجیح وصف بتایا ہے اس لیے شادی کے وقت ہی اس وصف کا خیال کیا جائے۔ اگر دیندار سے شادی ہو تو بہت سکون رہے۔

طلاق کے بعد شوہر کی ذمہ داریاں

طلاق، خواہ ایک دی ہو یا زیادہ، کے بعد عدت ختم ہونے تک مطلقہ (طلاق والی) عورت کے تمام ضروری اخراجات (کھانا، کپڑا، رہائش) طلاق دینے والے کے ہی ذمہ ہیں۔ البتہ تین طلاق کے بعد اس مطلقہ عورت کا، طلاق دینے والے سے پردہ ضروری ہو جاتا ہے

ہے

سید ولی حسن

نومسلم جرمن خاتون کے تاثرات

اسلام کے خاندانی نظام نے مجھے اعتماد عطا کیا ہے

پردہ ہی عورت کی عفت و پاکدامنی کا سرچشمہ ہے۔ مسلمان خاندان اپنے باہمی میل جول بلند اخلاقی قدروں اور اعمال روحانی پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ان سارے مغربی خاندانوں سے فائق و برتر ہے جہاں اخلاقی زوال ہے اور بے راہ روی کا دور دورہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلم خاندانوں اور مغربی خاندانوں کے درمیان مادی وسائل کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے۔ مختلف شعبہ زندگی میں مغرب زبردست ٹکنالوجی ترقی کی بنا پر آگے بڑھا ہوا ہے جس نے مغربی خاندانوں کے لیے زندگی میں کافی زیادہ راحت و آرام کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ مگر مغربی خاندان روحانی سکون و اقدار اور آپس میں تعلقات و میل جول کی کمی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ انہی چیزوں کی بنا کر مسلم خاندان کو برتری حاصل ہے۔ یہی اقدار، آپسی تعلقات اور روحانی مسلم خاندان کو اطمینان اور نفسانی روحانی سکون بخشتے ہیں اور اسے مغربی خاندانوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ انہی چیزوں نے مجھے اسلام کی طرف کھینچا۔

ان احساسات کا اظہار جرمن خاتون برتھا عدنے اس وقت کیا جب ہماری ان سے

ملاقات جامعہ ازہر میں ہوئی جہاں وہ اپنے اسلام کے اعلان کیلئے آئی ہوئی تھیں۔
انہوں نے مزید کہا " میرا بھی وہی حال تھا جو عام یورپین عورتوں کا ہے کہ ہم برابر سیدھا نہیں جاتے تھے اور نہ ہی کسی نئے دین کی تلاش و جستجو کرتے تھے۔ لیکن میں خود اندرونی کرب محسوس کرتی تھی۔ میں کسی ایسے خاندانی نظام کی متلاشی تھی جو مغرب کے عائلی نظام سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہو۔ یہ سوچ و فکر میرے اللہ کی بدولت سے بلکہ بچپن ہی سے پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سوچ و فکر میرے اندر بڑھتی رہی اور نشوونما پاتی رہی یہاں تک کہ میرا تعارف پورٹ سعید کے ایک مصری مسلم خاندان سے ہو گیا۔ میں نے ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ میں پورٹ سعید میں ان کے درمیان ان کے خاندان کے فرد کی طرح رہی۔ پورے خاندان والوں نے میرے ساتھ محبت تعلق کا معاملہ رکھا۔ میں نے ماں کو ایسا محسوس کیا گویا وہ میری سگی ماں ہیں۔ ان کے بیٹوں کو ایسا محسوس کیا گویا وہ میرے سگے بھائی ہیں۔ ان کے درمیان رہ کر میں اپنے آپ کو واقعی مسلمان تصور کرنے لگی۔ ماں مجھے اسلامی تعلیمات سے واقف کراتی رہیں۔ اور خاندان والے میرے ساتھ حسن سلوک اور محبت کے ساتھ پیش آتے رہے۔ جیسے ان کی ہر حرکت، ہر بات، ہر معاملہ یہ کہہ رہا ہو کہ اسلام ایک فائق اور پرکشش مذہب ہے۔
دوسری جانب میں خاندانی نظام پر غور کرنے لگی جسے میں پوری زندگی تلاش کرتی رہی تھی اور جسے میں نے اس مسلم خاندان میں پا لیا تھا۔ احترام، محبت، پاسداری، فضائل پر عمل کرنے کی حرص، آزادی میں حدود، نرمی، ومتانت، غرض کیا نہیں تھا اس خاندان میں۔ اس خاندان کے ایک فرد نے مجھے شادی کا پیغام دیا تو پورے خاندان والوں نے اس پر رضامندی ظاہر کی، حالانکہ میں ان کے دین پر نہیں تھی۔ میں نے بھی ہامی بھر لی اور ان سے میرے تعلقات و میل جول زیادہ ہوتے گئے اور میں باضابطہ طور پر اس خاندان کی ایک فرد بن گئی۔

ایک رات پورٹ سعید کی پرسکون اور خوبصورت فضا میں تنہا بیٹھی کافی دیر تک اس

خاندان کی ماحول کے بارے میں سوچتی رہی اور یقین کر لیا کہ اس خاندان کی خوبصورت ہم آہنگی اور آپس کے تعلقات کا راز اسلام ہی ہے۔ اسی سوچ نے مجھے اپنے اسلام کے اعلان کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔

میں ماں کے پاس رہی اور کچھ میرے دماغ میں کھلبلی تھا وہ میں کہہ دیا۔ میں نے سمجھا تھا ان کو بتلایا ماں نے خوشی کا اظہار کیا اور جب میں نے اسلام میں داخل ہونے کا طریقہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ کہو "اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ" میں نے کلمہ پڑھ لیا اس کے بعد وہ مجھے نماز کی تعلیم دینے لگیں اور قرآن پڑھانے لگیں۔ پھر مجھ سے کہا کہ اسلام کا اعلان ضروری ہے اس کے لیے ازہر جاکر سرٹیفکیٹ لانا چاہیئے۔

میں نے ازہر شریف میں وہاں کے علماء کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھا اور میرا نام فاطمہ رکھا گیا میری نظر میں یہ نام دو سبب سے بہترین نام ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کا نام ہے دوسرے اس محترم خاتون کا نام ہے جنہوں نے اپنے گھر میں میری مہمان نوازی کی، مجھے بتایا کہ میں کس طرح مسلمان ہوں اور اس وقت جبکہ میں نے جرمنی کی زندگی ترک کر دی تھی خاندانی مسرت عطا کی تھی اور مصر میں ان کے ساتھ زندگی گذاری۔

جرمن خاتون نے کہا: "مسلمان کبر و نخوت کے بجائے نرمی، قلب اور بہترین اخلاق سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہ چیز ان کے علاوہ میں نے کسی اور دوسرے کے اندر نہیں پائی اس وجہ سے اب میں مسلم ماحول میں رہوں گی۔ اور اب پردہ اور عفت و طہارت کا پورا پورا احترام کروں گی۔ پردہ و حجاب میں مجھے عورت کے حسن و جمال اور اس کی پاکدامنی و عفت کا سرچشمہ نظر آیا"

انہوں نے اپنی حکایت کا اختتام اپنی اس بات پر کیا کہ اب میں فقط ایک آپس میں محبت کرنے والے میل جول رکھنے والے با ادب مخصوص مسلم خاندان کی طرف نسبت کرتی ہوں اور بس اللہ مجھے اس پر قائم رکھے اور اپنے دین کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے اور مجھے دوسروں کے لیے نمونہ بنائے۔

(اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ) (منصف ۳ جون ۱۹۹۶ء سے ماخوذ)

برطانیہ میں

مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ

امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور یورپ کے بعض دوسرے ممالک اگر اپنی سرحدیں کھول دیں تو ایشیائی تارکینِ وطن ایک سیلاب کی مانند ان ممالک کا رُخ کریں گے اور محض چند ہفتوں میں ان ممالک پہنچ جانے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ بے شمار لوگ مذکورہ ممالک پہنچنے کے بے تاب ہیں۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ جس سہانے مستقبل کی تلاش میں وہ ترکِ وطن کرتے ہیں محض ایک سراب ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ کسی حد تک مالی لحاظ سے فارغ البال ہو جاتے ہیں مگر یہ آسودگی کی قیمت انہیں بے شمار مسائل کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ جس ملک بسنے کے رسم و رواج کے باعث ان کے سامنے اکثر پیش آتے ہیں۔ زیادہ مشکل مسلم تارکین پیش آتی ہے مسلم تہذیب و تمدن کے بعض ایسے گوشے ہیں جنہیں ترک کرنا آزاد خیال مسلمانوں کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہ مسائل اس وقت اور سنگین ہو جاتے ہیں جب مسلمان تارکین وطن کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ تعلیم کا ہوتا ہے۔ برطانیہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں مسلمان بچیوں کو جن مسائل کا سامنا ہے اس بارے میں خبریں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ نسلی اور مذہبی تعصب اور مسلمان تارکین وطن کے لیے مصائب

جاتا ہے۔ اس کا حوالہ ہے برطانیہ میں صورتحال کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے برطانیہ میں ایشیائی مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہے اسکولوں میں مذہبی تعلیم بھی دی جاتی ہے لیکن کسی ایک مذہب کے حوالے سے نہیں بلکہ کئی مذاہب کے بارے میں بتایا جاتا ہے نصاب تعلیم میں مختلف مذاہب کو شامل کیا گیا ہے اس طرز تعلیم کے باعث طلبا کے عقائد بری طرح متاثر ہوتے ہیں اور وہ مذہب کے بارے میں محض ایک تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں بریڈفیلڈ برمنگھم پرائمری اسکول کے پیرنٹ گورنر محمد مقدم کا کہنا ہے کہ "کثیر المذہبی تعلیم کے باعث طلبا مذہب کے بارے میں روحانی نہیں بلکہ معروضی انداز میں سوچنے لگے ہیں وہ محض تماشائی ہیں۔ ایسا نصاب تعلیم مذہب کے بارے میں تو بتاتا ہے مگر عقائد کو مستحکم نہیں کرتا۔ ویسے بھی اگر آپ تمام مذاہب پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا حتمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ آپ کسی مذہب پر بھی یقین نہیں رکھتے۔ واضح رہے کہ حال ہی میں برمنگھم پرائمری اسکول میں پانچ سو مسلم طلبا نے اس نصاب کو ترک کر دیا ہے مسلمان والدین گذشتہ تین سال سے اس مقصد کے لیے مہم چلا رہے ہیں اس اسکول میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد کا ستر فیصد مسلمان بچوں پر مشتمل ہے دو سال قبل والدین نے بچوں کے لیے علیحدہ عبادت کرنے کا حق تسلیم کرایا تھا۔ لیکن کثیر المذہبی تعلیم کی جگہ صرف اسلام کی تعلیم کا حق منوانا بہت اہم ہے اب عمران موکرا نامی مسلمان اسکالر ہر ہفتے مسلمان بچوں کو اسلام کی تعلیم دے گا۔

محمد مقدم اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اسلامی تعلیم نوجوانوں کو اپنے عقائد سے بے بہرہ نہیں ہونے دے گی۔ وہ کہتے ہیں "اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم نے اپنا روایتی عقیدہ برقرار رکھا تو ایک دن مسلمان نوجوان اسی طرح اسلام سے بے بہرہ ہو جائیں گے جس طرح عیسائی اپنے مذہب سے۔"

اسکول میں زیر تعلیم تین بچیوں کی ماں کا کہنا ہے کہ "میری بچیاں کثیر المذاہب تعلیم کے باعث شدید ابہام کا شکار ہو گئی تھیں میری ایک بیٹی اسکول سے گھر آئی تو اس نے بتایا کہ

حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ صرف اللہ کے پیغمبر ہیں لیکن میری بیٹی استاد سے دلائل دے رہی تھی کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔
سکریٹری ایجوکیشن کمیٹی میں کئے جانے والے اقدامات کی مخالفت نہیں کریں گے کیونکہ برمنگھم کونسل نے یقین دہانی کرائی ہے کہ نصاب تعلیم پر عمل کیا جائے گا جس میں عیسائیت کی تعلیم نہیں دی جائے گی۔ کیوں کہ اس ساری تگ و دو کا واحد مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دیں۔ بہرحال اس بحث سے قطع نظر برچ فیلڈ اسکول پر کئے جانے والے اقدامات دوررس نتائج مرتب کریں گے کیونکہ ان کے فوری بعد ویسٹ پارک شائر کے ۳۰ اسکولوں کے ۵۰ مسلم بچوں نے کثیر المذہبی تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے تاکہ صرف اسلامی تعلیم کا بندوبست کیا جاسکے۔ ان اقدامات کے باعث عیسائیوں کے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی واقع ہو رہی ہے عیسائی اساتذہ کی ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری رچرڈ ولکن کا کہنا ہے کہ "بنیاد پرست عیسائی سوچ رہے ہیں کہ پرائمری اسکولوں میں عیسائیت کی باقاعدہ تعلیم دی جائے۔ مسلمانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ قانون کے اندر رہتے ہوئے کیا کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے"۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ برچ فیلڈ اسکول میں زیر تعلیم مسلمان بچوں کے والدین نے بڑی فتح حاصل کی ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ فتح ان تمام مسائل کو حل کر دے گی جو مسلمان بچوں اور والدین کو درپیش ہیں۔

(دعوت ستمبر ۱۹۹۱ء سے ماخوذ)

انگریزی تحریر: ارشارینا
ترجمہ: اقبال احمد
ٹیج گنج بھوپال

کیا مسلمان خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں

مولانا وحید الدین خاں کے سلسلہ میں تنقیدی مضامین دعوت کو برابر موصول ہوتے ہیں۔ لیکن شائع نہیں کیے جاتے۔ ایک تو اس لئے کہ شخصیات کے افکار و خیالات کا مستقل تعاقب کرنا اخبار ہذا کی روایت نہیں ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اگر ایک طرف خاں صاحب محترم مسلمانوں کو درپیش مسائل میں سب سے الگ رائے رکھتے ہیں جسے بالعموم مسلمان پسند نہیں کرتے تو دوسری طرف غیر مسلموں کے سامنے اسلام اور بعض اسلامی احکام کا پرزور دفاع بھی کرتے ہیں اور یہ اپنے آپ میں ایک قابل قدر کام ہے۔ فسادات، بابری مسجد اور تحریک اسلامی جیسے امور میں مولانا موصوف کے خیالات کا تنقیدی جائزہ لینا کم از کم قارئین دعوت کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے طور پر خود ہی مولانا کے خیالات کے بارے میں ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔ البتہ ذیل کی تحریر جو نیشنل میل کے مضمون کا ترجمہ ہے اس لحاظ سے مفید اشاعت سمجھی گئی کہ ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم خاتون نے لکھی ہے جس میں خاں صاحب محترم کے انداز فکر کا قطعی بے لاگ جائزہ نہایت سنجیدگی اور شائستگی کے ساتھ لیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہو سکے گا کہ بعض غیر مسلم اہل علم بھی حالات و واقعات پر کس طرح غیر جانبدارانہ نظر رکھتے ہیں۔

ایڈیٹر دعوت سہ روزہ

عام طور سے مولانا وحید الدین ایسا نہیں کرتے۔ لیکن اس دفعہ انہوں نے ایسا کیا یعنی انہیں اپنی تحریر کی محور تو مسلمان قوم کو کیوں غیر محفوظ سمجھتے رہیں نہیں رکھنی چاہیئے تھی بلکہ اس کو دوسرے ڈھنگ سے رکھنا چاہیئے تھا مثلاً محفوظ رہنے کے لیے کیا کرنا چاہیئے کیونکہ ان کی تحریر کا تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل خود ان کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ دوسروں پر الزام رکھنے سے پہلے اپنا معاملات درست کر لینا بہت اچھی بات ہے لیکن اس پر ہمیشہ زور دیتے رہنے سے بھلائی نہیں ہوتی ایسے خیالات و افکار کا اظہار بے خوفی سے کرنا بھی بڑی خوبی کی بات ہے لیکن ہمارے سامنے جو حالات ہیں اس میں ہمیشہ اس قسم کا کردار مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

مولانا نے زیر حوالہ مضمون میں دونوں فرقوں کے درمیان مستقل فسادات روکنے کیلئے یہ ایک حل پیش کیا ہے یعنی لڑنے کے لیے دو فریق ہونے چاہئیں۔ لیکن ایک اگر کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو دوسرا اپنے زور کے جوش میں خود ہی ٹکرانے لگے گا۔ یقیناً ان الفاظ سے اچھی نیت کا اظہار ہوتا ہے اور بہت سے معاملات میں اچھی تدبیر بھی ہے لیکن ہر معاملہ میں نہیں۔

جب فسادی دروازہ توڑ کر لوگوں کو باہر کھینچ لیتے ہیں تو اس صورت میں ہمارے علا کا کیا نسخہ ہے؟ ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ آزاد ہندوستان میں زیادہ تر فسادات یکطرفہ ہوئے ہیں کیا ان لوگوں پر زبانی نسخے نے کوئی فائدہ کیا؟ ۹ برس سے قبل اتر پردیش کی ایک تحصیل سنبھل کی تاریخی جامع مسجد میں فسادی اندر کود گئے اور کے آخر میں عبادت کرتے ہوئے امام کو قتل کر ڈالا۔ اس کا قصور اتنا تھا کہ وہ اس مسجد کا امام تھا مسجد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی مندر کے کھنڈرات پر تعمیر کی گئی تھی۔ تصور کیجئے کہ کیا یہ ایسا قصور تھا جس پر امام واجب القتل ٹھہرا۔ یہ امام لوگوں کو سڑکوں پر فساد کے لیے نہیں بھڑکاتا لیکن اس کا ایسا انجام ہوا۔ کیا مولانا جناب صیفہ کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے۔ جب بھی فساد کوئی دو فریق ہی شروع کرتا ہے۔ مگر زیادہ تر معاملات میں حکام اور قانون کے محافظ کچھ بھی تو

۸۰ کی دہائی میں مراد آباد کے فسادات بھی تجزیہ کے مستحق ہیں۔ عید کے دن نماز کے فوراً بعد

کو نمازیوں کے درمیان تصادم ہانک دیا گیا۔ یہ معاملہ اتفاق سے بڑھ جانے کے لیے کافی تھا لیکن اس سے کوئی بے چینی نہیں پھیلی کیونکہ ہر آدمی اس کو بھگا دینا چاہتا ہے لیکن موقع پر تعینات پولیس نے جو اس بات کے لیے مقرر کی گئی تھی کہ اس ہجوم منتشر کا یہ فرض بخوبی کرے۔ اپنے زعم میں دوسرا راستہ اختیار کیا یعنی انہوں نے اس بدقسمت ہجوم پر فائرنگ شروع کر دی چونکہ فائرنگ شدید تھی اور دیر تک جاری رہی اس لیے سیکڑوں بے گناہ مرد اور بچے چشم زدن میں ہلاک کر دیئے گئے یہاں تک کہ اس شہر کے امام مرحوم ڈاکٹر کمال قسیم نے پی اے سی کو وارننگ دی کہ اگر اس نے فائرنگ نہ روکی تو وہ جہاد کا اعلان کر دیں گے اس کا ان مسلح کانسٹبلوں پر اثر پڑا اور انہوں نے گولی باری روک دی اس کے لیے کون ذمہ دار تھا۔ نمازی، امام یا وہ [illegible] جس کو ان کے درمیان ڈھکیلا گیا ہوگا۔ اس سے شہر میں ایک خوفناک فساد برپا ہو گیا اور ہلاکت و بربادی جس پیمانہ پر ہوئی اس نے ہر ایک کو ہلا کر رکھ دیا۔ مراد آباد جو تجارتی حلقوں میں برتن سازی کی وجہ سے ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے اس فساد سے تہس نہس ہو گیا اور ہر آدمی کو تکلیف پہنچی چاہے وہ فسادی گروہ کے غضب سے بھاگ رہا ہو۔ یا بلتے کڑھاؤ کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔ یہ کس کا قصور تھا؟ ایک دوسرے موقع پر ایک سیمینار میں جس کا عنوان تھا

MEDIA and RELIGION یعنی ذرائع ابلاغ اور مذہب' ملا نا نے بولتے ہوئے کہا کہ "مسلمان ذرائع ابلاغ میں اپنی شبیہ یا امیج کے خود ذمہ دار خود ہیں" وہ مسلمانوں کے سامنے درپیش ان مسائل کی طرف اشارہ کر رہے تھے جن کو ذرائع ابلاغ نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا۔ شاہ بانو کا معاملہ خود مسلمانوں کا اپنا داخلی معاملہ تھا لیکن خوب اچھالا گیا۔ لیکن کچھ ایسے بھی مسائل ہیں جن کو پریس اچھالتا ہے اور اچھالنے کے لیے مسلمانوں کو [illegible] نہیں پڑتی۔ مثال کے لیے شاہد امام کا منہ پھاڑ کر بولنا۔ شروع سے آخر تک یہ معاملہ صرف پریس کا اچھالا ہوا تھا۔ اگر مسلمان اس ناخوشگوار معاملہ کی تفصیل سے ناواقف تھے تو پریس کا معاملہ [illegible]

چھپایا جاتا ہے۔ دن رات اپنے پڑھنے والوں کو یہی یاد دلاتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ازدواجی اور خانگی زندگی کتنی پست ہے جو کہ اکثر طلاق پر ختم ہوتی ہے جبکہ اصل واقعات کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں حالانکہ مسلمانوں کے سامنے کچھ اور ہی مسائل ہیں جن کو سامنے لانا پریس کے لیے زیادہ مناسب ہوتا۔ لیکن یہ ایسے معمولی اور ناقابل توجہ موضوعات کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں گویا پورے مسلم فرقہ کا ایک ہی کام رہ گیا ہے یعنی شادی کرنا اور طلاق دینا۔ سڑک پر کسی جھگڑے سے یک طرفہ طور پر منہ موڑ کر چل دینا ایک اچھی تدبیر ہے لیکن فسادیوں کے گروہ کی مار دھاڑ کے سامنے کسی اور ہی چیز کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر سورت اور بمبئی کے حال کے فسادات کو لیجیے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد کے زمانہ میں ملک کے تجارتی دارالحکومت میں خوفناک ترین فسادات، لوٹ مار اور آتش زنی کے دروازے کھول دیئے گئے۔ یہ خالص مسلم کش فسادات زیادہ تر شیوسینا کے زیر اہتمام اور اسی کے گروہ کے بھڑکائے ہوئے تھے۔ جو اپنے اصلی روپ کو ہندو قومی پارٹی کے پردہ میں چھپاتی ہے۔

اب حالات نسبتاً پرسکون ہیں لیکن انہوں نے جو بات (مولانا وحید الدین) نے یکسر نظر انداز کر دی ہے وہ ہے فسادات کے شکار ہوئے لوگوں کی تڑپ اور احساس جو کہ وہ انصاف کا انتظار کر رہے ہیں مگر کس سے فریاد کریں کس طرف جائیں۔ کچھ تو ارشاد ہو مولانا۔

جب فسادی عادی ہو جاتے ہیں تو صرف تباہی کا راج ہوتا ہے ہر شخص لپیٹ میں آجاتا ہے ہندو اور مسلمان دونوں کا نقصان ہوتا ہے۔ اور دونوں برابر کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس طرح دونوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ زندگی سائنس سے پیچیدہ ہے۔ سائنسی مسئلوں کو حل کرنے کے فارمولے دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ کیلنڈروں پر بنی مقبول عام تصویریں مدد کے لیے کبھی نہیں آتیں لیکن مونا لیزا کی مانند ولی صفت لوگ ایک فارمولے کے بعد دوسرا پیش کرتے کراتے رہ جاتے رہتے ہیں۔ تھوڑے عرصہ بعد انہیں نہ کوئی چیز پریشان کر سکتی ہے نہ ان کے استعمال میں خلل انداز ہو سکتی ہے۔ یا احساس محرومی کا شکار بنا سکتی ہے ہر احساس سے عاری ہو جانا ہی ان کی کرامت انداز ہے جناب مولانا وحید الدین خان ایک عمر رسیدہ آدمی ہر بار ایک نیا منظر نامہ پیش کرتے ہیں لیکن وقت نیا ہو زندگی میں سب کچھ نہیں۔ (دعوت سہ روزہ بشکریہ ماہنامہ ...)

آل انڈیا ملی کونسل کی سرگرمیاں

رپورٹ

آل انڈیا ملی کونسل کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمقام الفا بلڈنگ جوگا بائی نئی دہلی جناب مولانا خلیل الرحمان سجاد نعمانی کی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوا۔ جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ ایم پی نے اجلاس کی صدارت کی۔ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا محمد اسرار الحق قاسمی، ڈاکٹر منظور عالم مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی لکھنؤ، جناب سید امین الحسن رضوی نئی دہلی، مولانا عبد الوہاب خلجی دہلی، جناب عبد الحفیظ خان حیدرآباد، جناب عبد الستار یوسف شیخ بمبئی، جناب اے عبد الصمد مدراس، جناب منظور عالم ایڈوکیٹ ٹونک، مولانا حکیم عبد اللہ مغیثی اجڑاڑہ میرٹھ، جناب احمد حسن عمران کلکتہ، جناب مفتی اشرف علی صاحب بنگلور، جناب یوسف حاتم مچھالا ایڈوکیٹ بمبئی، ڈاکٹر سید عبد الباری سلطان پور، پروفیسر مقیم الدین مسلم گڑھ، جناب کمال فاروقی نئی دہلی، الحاج عتیق احمد ایڈوکیٹ بنگلور، جناب حسین قاسم کچھی رانچی، مولانا احمد کمال ندوی پڈرونہ یوپی، جناب قمر عالم پٹنہ یوپی، جناب نذیر عالم جیبھا نوٹس، کیپٹن امیر علی مدراس، جناب عبد الغنی امرکر کولہاپور

مہاراشٹرا، ڈاکٹر آدم ایم عطار کولہاپور، جناب علاء الدین انصاری ایڈوکیٹ حیدرآباد
جناب سید الطاف حسین ایڈوکیٹ حیدرآباد۔ مولانا مفتی نسیم احمد قاسمی پھلواری شریف،
جناب محمد عبدالباری ایڈوکیٹ حیدرآباد۔ جناب عبدالرشید انجینئر پربھنی مہاراشٹرا، جناب
عبیدالرحمان وفا صدیقی بھوپال، ڈاکٹر ایم اعظم بیگ کوٹہ راجستھان، جناب عبدالمنان چپا
نئی دہلی اور جناب محمد سلیمان ایڈوکیٹ کا نپور نے بحیثیت مدعو خصوصی اجلاس میں شرکت کی۔

مجلس کی کاروائی کا آغاز کرتے ہوئے مولانا اسرارالحق قاسمی نے سابقہ کاروائی
پڑھ کر سنائی کی سماعت کے بعد صدر جلسہ نے توصیفی دستخط ثبت کئے۔ سکریٹری جنرل مولانا قا
مجاہدالاسلام قاسمی نے کہا کہ اس اجلاس کا خاص ایجنڈا ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال کا جا
لینا اور آئندہ کے لیے حکمت عملی کا تعین کرنا ہے۔ اس پر بحث شروع کرنے سے پہلے سالا
اجلاس کی تاریخوں کا تعین کر لیا جائے۔ اور یہ طے کیا جائے کہ یہ اجلاس کس مقام پر ہوگا۔ ملی کو
کی پہلی تین سالہ میعاد پوری ہو چکی ہے۔ اسلئے یہ اجلاس میعادی ہوگا۔ غور و فکر
بعد طے کیا گیا کہ اجلاس کی تاریخیں پہلی دوسری جون ۱۹۹۶ء رکھی جائیں۔ اور جگہ کا تعین کا
سکریٹری جنرل کو دیا جائے کہ موصوف مناسب جگہ کی تعیین کریں۔

مجلس عاملہ کے اجلاس میں سیاسی صورت حال کے ایجنڈہ پر بحث کا آغاز کر
سکریٹری جنرل مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی نے کہا کہ ہم لوگ جس سیاسی صورتحال کا جا
لے رہے ہیں اس میں کچھ اصولی باتیں ہیں۔ کچھ آئیڈیالوجی ہے اور کچھ عملی چیزیں ہیں
سلسلے میں ملی کونسل کا جو مزاج ہے وہ آپ سب حضرات بخوبی جانتے ہیں۔ اس ملک
ذات نے کمزوروں کا جس طرح سے استحصال کیا ہے، ملی کونسل نے اپنی متعدد میٹنگوں
کی مذمت کی ہے۔ اور ظالم و مظلوم کی صف کے قیام کی نشاندہی کی ہے ان
کے مقابلہ کا ایک راستہ یہ ہے کہ ان کمزور طبقات میں سے جتنا حصہ کو ہم ملا سکیں
ملالیں۔ جس حصہ کو ملانا ممکن نہیں ہو سکتا ہے اس میں انتشار مہیا کریں اور

پیدا کرنے کا راستہ اپنائیں، جو صرف ملی معیار ہی ہے اور وہ بیداری بنی ہوتی ہے اس حصہ کو اپنے ساتھ لائیں۔ ہمیں ان تینوں باتوں کو سامنے رکھ کر اپنی حکمت عملی طے کرنی ہے مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں نے کچھ نہیں کیا ہے مسلمانوں نے کئی موقعہ پر اہم اور موثر رول ادا کیا ہے۔ ترکمان گیٹ کھتولی، اور دیگر مقامات نیز شیلانیاس اور بھاگلپور کے سانحہ کے بعد مسلمانوں نے خوشعوری سے کام لیا۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد تو مسلمانوں نے زبردست شعور کا مظاہرہ کیا۔ ممکن ہے کہیں تجزیہ کی غلطی ہوئی ہو اور کہیں جذبات میں بہہ گئے ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر موقع پر مسلمان نے شعور سے کام کیا ہے۔ اور ان میں اس کی صلاحیت موجود ہے۔ ملک میں کمزوروں اور دلتوں کا ایک محاذ بنا وہ منصوبہ بندی کے ساتھ پنپا نہ کرسکا جس کا کہیں کہیں نقصان ہوا۔ دلتوں اور کمزوروں کا دوسرا محاذ مہاراشٹرا میں بنا۔

مہاراشٹرا کی صورت حال کئی وجوہ سے اہم رہا ہے۔ ہم لوگوں نے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی کوششوں کا آغاز وہیں سے کیا تھا۔ اسلئے کہ فتنوں کی زمین وہی رہی ہے اور وہیں سے ٹکراؤ اور مقابلہ بھی ہوتا رہا ہے۔

بابری مسجد کے واقعہ کے بعد بھی مہاراشٹرا نے زیادہ قربانی دی اور مولانا ضیاء الدین بخاری مرحوم نے وہاں کے مسلمانوں کو پست ہمت نہیں ہونے دیا لیکن میں معذرت اور افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اب وہاں چوٹ گولی کی نہیں سنہری زنجیروں اور سنہری کرسیوں کی ہے۔ بی جے پی کی صفوں میں بھی انتشار ہے اور وہ قومی سطح پر کمزور بھی ہوئی ہے۔ مہاراشٹرا میں کساد کی ایک بڑی طاقت ہے جو بی جے پی کے خلاف ہوگئی ہے۔ وہاں بھی بڑی بڑی میٹنگیں ہوئیں۔ مجھکو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ لیکن ان میٹنگوں میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔

مہاراشٹرا کے بعد گجرات ہے۔ وہاں بھی بی جے پی میں ٹکراؤ ہے۔ ہمیں کہاں کیا کرنا چاہیئے۔ طے کرنا ہے۔ اب آگے اندھیرا ہے۔ ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ وہاں زیادہ طاقتور بارورتی ہے یا چندرابابو، ان دونوں کے اتحاد سے کیا فائدہ ہوگا اور ان دونوں کے انتشار

سے کیا نقصان ہوگا۔ مغربی بنگال کی پوزیشن صاف ہے۔ اگرچہ وہاں کے مسلمان بائیں بازو کی حکومت کی کارکردگی سے ناراں ہیں لیکن وہ کانگریس سے بھی سخت مخالف ہیں۔ بہار کی صورتحال بھی واضح ہے۔ وہاں جنتا دل کی پوزیشن بنی ہوئی ہے۔ اگر یوپی میں جنتا دل کا ملائم سنگھ اور کانشی رام سے اتحاد ہو جاتا ہے تو وہاں کی پوزیشن بھی صاف ہے ہم لوگوں نے حتی الوسیع ملائم سنگھ اور کانشی رام سے اتحاد کی بات کی ہے ان دونوں سے کئی کئی ملاقاتیں کی ہیں۔

اڑیسہ، بنگال، بہار، کرناٹک میں نیشنل فرنٹ کی پوزیشن اچھی ہے۔ کیرالا میں کانگریس کافی کمزور ہوئی، اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ مہاراشٹرا کے حالات بھی بدل سکتے ہیں۔ ہم لوگ ۱۷ جنوری ۱۹۹۶ء کو جب سیاسی امور کمیٹی کی میٹنگ میں بیٹھے تھے تو اس میٹنگ میں یہ بات آئی تھی کہ ہم لوگ کچھ اسٹیٹ مثلاً راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش وغیرہ کو LOSS STATE مان لیں اور ان کے لیے الگ پالیسی طے کریں۔ ہمیں اپنے فیصلوں میں اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔

جناب عبدالحفیظ خاں حیدرآباد نے کہا کہ میں سیاسی حالات پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ البتہ چند بنیادی پہلو، ان کے پس منظر میں ضرور پیش کروں گا۔

(۱) جو حالات حوالہ وغیرہ سے پیدا ہوئے ہیں اس تحریک میں تغیر دکھائی دیتی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اگر صحیح رہنمائی ملے تو وہ سیاسی حالات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ملی کونسل کی نئی قیادت ابھارنے کے لیے رول ملی کونسل ادا کرے تو بڑی بات ہو سکتی ہے۔ علماء کونسل کی منگنگ سے مسلم قیادت کی جو بے آبروئی ہوئی ہے ملی کونسل اس کو دور کرے۔

(۲) پورے ملک میں ہمارے لیے ایک پالیسی طے کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اسکی روشنی میں مسلمان ملک کو بنانے کی ذمہ داری بھی لیں۔

(۳) تیسری قوت جو ابھری ہے اس میں جو انتشار ہے اس کو ختم کرنے کے لیے مسلم قیادت اہم رول ادا کرے۔ دیش بنانے، سماجی انصاف کی قوتوں کو متحد کرنے اور فاشسٹ نظام

کے قیام کے لیے مسلمان کوشش کریں۔

جناب بشیر الدین ایڈوکیٹ بنگلور نے کہا کہ پچھلی بار ملی کونسل کی ہدایت پر کرناٹک کے مسلمانوں نے وہاں کانگریس کا تختہ الٹ دیا اور جنتا دل کو برسر اقتدار لایا گیا لیکن جنتا دل نے وہاں مسلمانوں کے لیے کوئی اچھی کارکردگی نہیں دکھلائی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں مایوسی ہے اسلیے جنتا دل کے قومی سطح کے لیڈروں سے اس سلسلے میں بات کی جائے۔

جناب علاء الدین ایڈوکیٹ حیدرآباد نے کہا کہ آندھرا پردیش میں سیکولر طاقتوں کے ساتھ مسلم تنظیمیں ہیں۔ امید ہے چندرا بابو نائیڈو اپنی حکومت کے پانچ سال پورے کریں گے پارٹی کے ساتھ صرف ۲۵ - ایم ایل اے ہیں وہ زیادہ موثر نہیں ہے ایک ماہ قبل ملی کونسل نے ایک میٹنگ کی تھی جس میں ریاست میں اردو زبان اور سات مسلم امیدواروں کا مطالبہ کیا گیا تھا اور مولانا عاقل حسامی، جناب عبدالرحیم قریشی اور مولانا محمد رضوان قاسمی کے ہمراہ ان مطالبات پر مشتمل میمورنڈم وزیر اعلیٰ کو پیش کیا گیا تھا۔ چار اضلاع میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے پر راضی ہو گئے۔ سی پی آئی اور سی پی آئی ایم نے نائیڈو سے بات کرلی ہے، وہاں این ٹی آر کے بعد وہاں نیشنل فرنٹ کو سخت دھکا پہنچا ہے۔

سلسلہ ۲۵

جن میں سے ۷۰ فیصد مقدمات فیصل ہو کر لیے گئے جہاں عدالت کے رواں پروگرام کی آخری اور سب سے بڑی کارروائی ۳۱ مارچ کو احمد آباد میں ہوئی جس میں احمد آباد کی جہاں عدالت میں دو ہزار مقدمات کی سماعت کی جائے گی لیکن حقیقت میں یہ آخری کارروائی نہیں ہوگی کیونکہ جہاں عدالت نے پہلے مرحلے میں ۵ لاکھ مقدمات کے انفصال کا نشانہ طے کیا ہے البتہ ابھی یہ طے نہیں کہ اگلی سماعت کب ہوگی۔

(دعوت یکم ۹۶ء سے ماخوذ)

قومی خواتین کمیشن مہیلا عدالت

تقریباً چھ مہینے قبل مرکزی حکومت کے قائم کردہ قومی خواتین کمیشن کی نئی مجلس کا انتخاب ہوا تھا جس کے بعد اس کمیشن کی سربراہی موہنی گری کے ہاتھ آئی ہے۔ موہنی گر[illegible] کی رہنمائی میں قومی خواتین کمیشن نے ایک نمایاں کام یہ کیا ہے کہ ہندوستانی عدالتوں میں خواتین کے مقدمات برسہا برس سے معلق چلے آرہے تھے ان کے انفعال پر اولین توجہ دی[illegible] اس پروگرام کے لیے سب سے پہلے ملک گیر سروے کی ضرورت تھی اور یہ ایک پیچیدہ [illegible] کیوں کہ اس کے لیے تمام ہندوستانی ریاستوں کے قانونی اعداد و شمار عدالت بورڈوں سے ا[illegible] حاصل کرنی تھیں۔ بہرحال خواتین کمیشن نے یہ منزل بالآخر سر کر ہی لی۔ اور اس کے نتیجہ میں [illegible] سے متعلق مقدمات کی جو تصویر سامنے آئی ہے وہ نہایت تشویشناک ہے قومی خواتین کے ا[illegible] سروے کے مطابق اس وقت پورے ملک میں خواتین کے ایک کروڑ سے زائد مقدمات معلق[illegible] ہیں جن میں سے بعض مقدمات کو تو ۲۰ برس سے زائد عرصہ دوران سماعت گزر چکا ہے خوا[illegible] نے اس مسئلہ پر ترجیح دے کر اپنی مہیلا عدالت قائم کی ہے جس کی کارروائیوں کا پہلا دور ا[illegible] کو ختم ہو گیا۔

قومی خواتین کمیشن کے میلا عدالت پروگرام کی اصل روح رواں ہیں کوکیلا بیاس جو ۸۵-۶ اور ۱۹۸۹ء کے درمیان ریاست گجرات کی کانگریس حکومت میں سماجی بہبود اور سیاحت کی وزیر رہ چکی ہیں۔ کوکیلا بیاس کہتی ہیں۔

"خواتین ہمیشہ سے سماج کا سب سے زیادہ متاثرہ گروہ رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔ وہ یہ گمان کرتی ہیں کہ ان کی رواداری ان کا امتیازی وصف ہے جبکہ درحقیقت یہ ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔" قومی خواتین کمیشن کو یہ کمزوری عدالتوں میں بھی نظر آئی جسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی میلا عدالتوں کی کارروائی میں ملک کی متعدد غیر سرکاری تنظیموں کا تعاون بھی حاصل کر لیا ہے میلا عدالتوں کی کارروائی کا دعویٰ یہ ہے کہ خواتین کمیشن کے سروے میں جو مقدمات ریکارڈ میں آئے ہیں ان سے متعلق افراد کی نشاندہی کے بعد فریقین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مقدمہ کے سماجی اور معاشی اثرات کیا ہوں گے۔ پھر جو لوگ یہ استدلال قبول کر کے سرکاری عدالتوں سے باہر ہی انفصال کے خواہاں ہوتے ہیں ان کی قانونی خانہ پری ضلع جج کی عدالت میں کر دی جاتی ہے۔

خواتین کمیشن کے سروے میں جو ایک کروڑ مقدمات قلم بند کئے گئے ہیں ان میں ۲۵ یا ۳۰ فیصد تعداد صرف ان مقدمات کی ہے جو صنفی مظالم، نان و نفقہ، سرپرستی اطفال، حقوق جائداد، طلاق و شادی کے مسائل، جہیز اور خانگی تشدد۔" جیسے خواتین اسی سے متعلق ہیں۔ سرکاری عدالتیں مقدرہ زندگی کے اتنے اہم مسائل کو برسہا برس سے ملتوی کرتی چلی آئی تھیں شاید یہی وجہ ہے کہ میلا عدالتوں کو فوراً کے فوراً قبولیت عامہ حاصل ہو گئی۔ گو کہ اس کی کامیابیوں کا ریکارڈ پورے ملک میں یکساں نہیں رہا ہے میلا عدالتوں کو انفصال مقدمات میں ۲۵ سے ۶۵ فیصد کامیابی ملی ہے۔ ان میں گجرات، کیرلا اور آندھرا پردیش میں سب سے زیادہ کامیابی ملی جبکہ بہار اور اترپردیش میں کافی کم۔ ریاست گجرات میں میلا عدالت نے ۲۲ اضلاع میں جو ۴۴ سماعتیں کی تھیں ان کے دوران ۱۷۹۲ مقدمات زیر بحث آئے تھے

باقی صفحہ ۲۳ پر

خبر و نظر

جس رد عمل کا انتظار تھا

کچھ دن پہلے جب یہ خبر آئی کہ یورپی ملکوں نے بیماری کے ڈر سے برطانیہ کے ایک مویشی کے گوشت کی درآمد بند کر دی ہے جس سے برطانوی حکومت بہت پریشان ہے۔ پھر روز بروز خبر آگے بڑھتی گئی اور بات یہاں تک پہنچی کہ برطانیہ یورپی ملکوں کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے اپنے دس لاکھ مویشیوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس پورے واقعہ کے دوران انتظار رہا کہ ہمارے ملک میں بھی اس پر فرقہ تبصرہ ہوگا۔ خاص طور سے مویشی بچاؤ آندولن والے اس پر اپنا رد عمل ظاہر کریں گے۔ لیکن کئی دن بیت گئے کہیں سے کوئی بیان نہیں آیا۔ خیال گزر سکتا ہے مویشی کا تقدس اور اس کی قدر و قیمت اندرون ملک تک محدود ہو، باہر کے ان کی حیثیت نہ ہو۔ ایک صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بھی اس خیال کی تصدیق کی، اگر دل مانتا یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ اندرون ملک تو ایک مویشی کا یہ تقدس کہ اس کے تحفظ کے لئے ہر وقت دنگا دگولہ اور بیرون ملک اسی مویشی سے یہ لاتعلقی کہ کسی زبان پر ذکر تک نہیں۔ مویشی تو مویشی ہے باہر کے مویشی کا تحفظ اگر بس میں نہیں تو اظہار تشویش تو ہوتا۔ تشویش تو ظاہر کی جا سکتی۔

خبر آئی اور بہت دلچسپ آئی

مگر بالآخر تجسس کی کیفیت ختم ہوئی۔ خبر آئی اور بہت دلچسپ آئی۔ نئی دہلی سے نہیں، لندن سے آئی۔ چنانچہ "انڈین ایکسپریس" کے خصوصی نامہ نگار نے لندن سے خبر دی کہ وشو ہندو پریشد نے حکومت برطانیہ سے کہا ہے کہ ان گایوں کو ہلاک نہ کیا جائے بلکہ ہندوستان بھیج دیا جائے۔ گایوں کی تعداد انڈین ایکسپریس (۲۴ اپریل) نے بارہ ملین یعنی ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی ہے۔ اس سلسلہ میں پریشد کے لیڈروں نے برطانوی وزیر صحت اسٹیفن ڈورل سے رابطہ قائم کیا

پیشکش کی کہ اگر برطانوی حکومت ان گائیوں کو بھارت منتقل کرنے کے مصارف برداشت کرے تو پرلیشد ان کی دیکھ بھال کرنے کو تیار ہے۔ خبر کے مطابق مصارف کا تخمینہ ایک ملین پاؤنڈ یعنی تقریباً ۶۵۔ اب روپے لگایا گیا ہے جبکہ پرلیشد کے حساب کتاب کے مطابق ہلاک کرنے پر اس سے بیس گنا زیادہ خرچ آئے گا۔ پرلیشد نے برطانیہ کو یہ بھی بتایا کہ بھارت میں متعدد گئوشالائیں ہیں جہاں ان گایوں کی پوری زندگی تک دیکھ بھال کی جاسکتی ہے اور یہ کہ پرلیشد پچاس کروڑ مویشیوں کی دیکھ بھال پہلے ہی سے کررہی ہے۔ گویا مزید ایک کروڑ بیس لاکھ کی دیکھ بھال اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

یہ جذبۂ ترحم مبارک ہو مگر

چلئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ پرلیشد کو برطانوی مویشیوں کی زندگی کا خیال آیا۔ اس سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ گائے صرف بھارت ورش ہی کی نہیں دنیا کے ہر حصے کی عزت ہے۔ پرلیشد کے حوصلوں کی داد بھی دینی ہوگی کہ مویشیوں کی اتنی بڑی تعداد کے لیے وہ زمین، چارے اور پانی کا انتظام کرے گی۔ مویشیوں کے لیے اس جذبہ ترحم اور اس عقیدت و احترام پر پرلیشد کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے مگر فوراً خیال بھی آتا ہے کہ کاش یہ جذبہ انسانوں کے لیے بھی ہوتا۔ کیا یہ وہی لوگ نہیں ہیں جو انسانوں کے ایک طبقہ کے اندر دوسرے انسانوں کے خلاف نفرت بھرنے کا کام کرتے ہیں۔ فتنہ و فساد کو چھوڑئیے جس میں انسانی جانیں جاتی ہیں، غیرملکیوں کا بہانہ لیجئے۔ اندرون ملک یہ لوگ کچھ انسانوں کو بنگلہ دیشی قرار دے کر ان کے خلاف کشیدگی پھیلاتے ہیں کہتے ہیں وہ ہماری معیشت پر بوجھ ہیں، ہمارے حصے کا اناج کھا جاتے ہیں۔ بجلی کا سارا پانی پی کر قلت پیدا کر دیتے ہیں۔ اور یہ لوگ زبردستی ملک سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ کیا خوب، ایک طرف بدیشی مویشیوں کو لانے کے لیے یہ بے چینی، دوسری طرف دیسی انسانوں کو بھگانے کی کوشش۔ پتہ نہیں برطانیہ والے اس عجیب صورت حال سے کہاں تک باخبر ہیں۔

بحوالہ رحمانی ایڈیٹر دعوت (دعوت نمبر ۹۶ سے ماخوذ)

خبر و نظر

اور یہ تازہ واقعہ

اور تازہ واقعہ ایک معزز خاتون سے تعلق رکھتا ہے۔ مسز شیلا کول مرکزی شہری ترقیات کی وزیر تھیں، بعد میں ہماچل پردیش کی گورنر بنائی گئیں۔ اب انکشاف ہوا ہے مرکزی وزیر کی حیثیت سے انہوں نے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرتے ہوئے دہلی میں کچھ بڑی شخصیات کو مکانات اور دوکانیں اس طرح الاٹ کی تھیں کہ ضابطہ میں ابھی ان کا نمبر نہیں آیا تھا۔ یہ معاملہ اچانک روشنی میں آیا اور اتنا بڑا اسکینڈل بن گیا کہ پہلے سی بی آئی ان کے خلاف تفتیش کی اجازت سپریم کورٹ سے مانگی، سپریم کورٹ نے اشارہ دیا کہ کول کو گورنری سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ اس پر صدر جمہوریہ نے وزیر اعظم کی رائے طلب کی وزیر اعظم کے سامنے کوئی چارہ نہ تھا۔ اور مسز کول کو گورنری چھوڑنی پڑی۔ اس اسکینڈل کے سلسلے میں دیگر دس افراد کو بھی گرفتار کیا گیا جن میں دو ایڈیشنل پرائیویٹ سکریٹری اور ایک دوسرے وزیر کا پرسنل اسسٹنٹ شامل ہیں۔ گویا وزیر کے علاوہ کچھ اعلیٰ سرکاری افسران بھی بے ضابطگی کے اس معاملہ میں ملوث رہے۔

سیاسی چینل کا سیریل

اس طرح اسکینڈلوں کے سیریل کی یہ تازہ کڑی

ہے۔ ہندوستانی اسکرین کے سیاسی چینل پر اس سیریل کا آغاز جنوری کے اوائل میں ہوا تھا جب حوالہ پر مشتمل پہلی کڑی پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد بہار میں مویشیوں کے چارے میں بڑے پیمانہ پر خرد برد کے بارے میں بتایا گیا۔ وہ معاملہ گرم ہی تھا کہ آسام میں تقریباً دو ارب روپے کے لیٹر آف کریڈٹ میں بے ضابطگی کا معاملہ سامنے آیا جس میں کئی سرکاری ملازمین ملوث پائے گئے۔ یہ کہانی ابھی ٹھیک سے سمجھ میں بھی نہیں آسکی تھی کہ وزارت خارجہ کے چند موجودہ اور ریٹائرڈ افسران کے نام آئے جنہوں نے غیر ممالک میں اپنے تقرر کے دوران اسلحہ کی خرید و فروخت میں بھاری رقوم کھائی تھیں۔ اس کے بعد سامنے آیا "را" RAW کے ایک سابق سربراہ کا معاملہ جس نے منصب پر رہتے ہوئے ۱۹ لاکھ روپے کی رقم "را" کے فنڈ سے ہڑپ کرلی تھی۔ اسی دوران بہار میں دوسرے اسکینڈل کا انکشاف ہوا جس کا تعلق محکمہ ماہی گیری میں گڑبڑ سے ہے۔ اسی دوران ایک خبر آئی کہ دہلی کی مڈویسٹ سوسائٹی کی اس خاتون ایگزیکیٹو ڈائریکٹر کو گرفتار کرلیا گیا ہے جس پر دیہاتیوں کو دھوکا دے کر ان سے رقوم ہڑپنے کا الزام ہے۔

یہ ہم ہندوستانیوں کی عادت ہے

یہ فہرست ذرا محنت سے تیار کی جائے تو بہت طویل ہوسکتی ہے مگر یہاں ان معاملات کے ذکر کا مقصد اخلاقی وعظ و نصیحت کرنا نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی ایک عادت کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ ہم ہندوستانیوں کی عادت ہے کہ جب کوئی ایک سنسنی خیز واقعہ پیش آتا ہے تو اس سے متصل اسی نوعیت کے لگاتار کئی واقعات روشنی میں لاتے ہیں۔ ہر روز ایک نیا انکشاف ہوتا ہے اخبارات اسی سے بھرے ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے اب کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن تھوڑے دن بعد، کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ معاملہ اس طرح دب جاتا ہے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ ابھی تک کوئی دو سال پہلے ایک "گھپلا مار" پیدا ہوا تھا۔ ایک دو فسادوں کی [illegible] کی پہنچ پر کسی ملک [illegible] کی خرب

دیکھی گئی۔ بس پورا بمبئی چیخ پڑا۔ ہر شہری سونے سے پہلے اپنی کمپنی کی خیر مناتا تھا۔ گذر کر رات ہوئی اور وہ کمپنی ماد سب کے تصور میں گھوم گیا۔ اس سلسلہ میں کسی نوجوان معمولی چائے خانہ میں پکڑا گیا۔ اس کے بعد بالکل خاموشی۔ پھر کسی کو وہ کمپنی ماد یاد نہیں

اچانک شور اچانک خاموشی

ہندوستان میں عورتوں کے خلاف جرائم es against women ایک عام بات ہے پہلے بھی تھی، اب بھی ہے لیکن پانچ چھ سال پہلے اچانک شور بلند ہوا کہ ہر عورت مظلوم ہے، اس کی جان اور عزت محفوظ نہیں، مرنے اور جنسی جرائم کا شکار والیوں کی فہرست روزانہ شائع ہونے لگی، خواتین کی تنظیمیں چیخ اٹھیں۔ کئی خواتین نے آ کو اسلامی سزائیں دینے کا مطالبہ بھی کر ڈالا۔ کمیشن بیٹھنے لگے، علاج ڈھونڈا جانے لگا تھا کہ ہندوستانی عورت کی اس حالت حالت کے خلاف پورا ملک بیدار ہو چکا ہے۔ چند روز کی چیخ پکار کے بعد؟ کچھ بھی نہیں۔ جس شدت سے یہ مسئلہ اٹھا تھا، اسی تیزی بیٹھ گیا۔ ڈسمبر ۱۹۸۴ء میں بھوپال میں زہریلی گیس نے تباہی مچادی۔ اس کے بعد ہر تیسرے دن ملک کے کسی نہ کسی حصے سے زہریلی گیس کے اخراج کی خبر بڑی پابندی کے ساتھ آنے لگی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اور بعد میں بھی نہیں ہوا۔ اب کہیں سے کوئی زہریلی گیس نہیں نکلتی۔ پلیگ کے واقعہ کو زیادہ دن نہیں گزرے۔ کیسا طوفان آیا تھا۔ کیسے کیسے دہلی، بمبئی، کلکتہ میں دیکھنے کو ملے اب کوئی اسے یاد بھی نہیں کرتا۔

وبائی واقعات :

دہلی کا ذکر آ گیا تو اس کی یہ خصوصیت بھی جان لیجئے کہ وبائی واقعات میں شاید پہلا نمبر ہے۔ گزشتہ سال یہاں کسی اسکول سے بچے کا اغوا کر لیا گیا، اغوا کنندہ گان نے بھاری

رقم چاہتے تھے۔ پھر دوسرا واقعہ ہوا، پھر تیسرا، پھر واقعہ پر واقعہ ہونے لگا، شہر میں دہشت پھیل گئی۔ پبلک اسکولوں سے بچوں کی گاڑیاں بھاری سیکورٹی کے ساتھ جانے آنے لگیں۔ ایک خبر یہ بھی آئی کہ ایک بچے کو اغوا کرنے والوں نے تین لاکھ کی رقم طلب کی ہے جبکہ وہ بچہ جھگی جھونپڑی میں رہنے والی ایک غریب بیوہ کا لڑکا۔ دہلی کے اخباروں میں دہشت کا یہ ماحول کئی ہفتے رہا، پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔ اب کسی بچے کا اغوا نہیں ہوتا۔ چند ماہ قبل ایک ساتھ دو تین واقعات ہوئے کہ بدبخت باپوں نے اپنی ہی معصوم بچیوں کے ساتھ شیطانی حرکت کی۔ پھر ان واقعات نے بھی وبائی شکل اختیار کر لی۔ اخبارات میں مضامین اور بیان آنے لگے۔ ماہرین نفسیات حرکت میں آگئے۔ مگر کچھ دن بعد سناٹا۔ واقعات اب بھی ہوتے ہیں لیکن کوئی ان کی پرواہ نہیں کرتا۔ ابھی پچھلے دنوں ایک وبا یہ چلی تھی کہ دہلی میں معمر مگر خوشحال میاں بیوی ہلاک کیے جانے لگے ہیں۔ لگاتار کئی واقعات ہو گئے۔ اب بہت دن سے کوئی خبر نہیں آئی۔

سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔

تو اس حوالہ اسکینڈل کو بھی، کہ جس کے بعد اعلیٰ سطح پر کرپشن کے واقعات کے روشنی میں آنے کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے، اگر ہم اس پس منظر میں دیکھیں تو کوئی غیر معمولی بات نہیں لگتی۔ سب معمول کے مطابق ہے۔ تھوڑے دن کی بات ہے، پھر یہ سلسلہ اس طرح بند ہو جائے گا کہ کوئی اس کا نام بھی نہیں لے گا۔ جب بوفورس کا کوئی نام نہیں لیتا، جب سیکورٹی اسکینڈل جیسے سنگین واقعہ کو لوگ بھول چکے ہیں تو ان واقعات کی کیا حقیقت ہے، انتخابات کے بعد کوئی انہیں یاد بھی نہیں کرے گا۔ اور ہر کام حسب سابق ہونے لگے گا۔ ویسے بھی اس میں ہر بڑی پارٹی کا گلا پھنسا ہوا ہے۔ سب کی کوشش کہ کوشش ہو گی کہ اس پھندے کو نکال پھینکا جائے۔ بعد میں ہم سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارا تو مزاج ہی وہ ہے جس کی کچھ مثالیں اوپر پیش کی گئیں۔ یہ صبر تحمل بھی ہماری وبا پسند طبیعت کا مظہر ہے۔ مسز شیلا کول کے معاملہ کا تعلق اگرچہ حوالہ سے نہیں ہے

باقی صفحہ ۳۸ پر

بلاتبصرہ

ایک اخباری تصویر میں مسٹر نرسمہا راؤ کو لارڈ وینکٹیشور مندر کے سات پجاریوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتے ہوئے اور ان کا آشیرواد لیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ایک مقامی اخبار شائع ہونے والی دوسری تصویر میں ۱۰ اپریل کو سری سیلم شیو مندر کے پجاریوں کی طرف سے پیش کئے گئے پرساد کو مسٹر راؤ کو کھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وینکٹیشور مندر کے منتر میں سات پجاریوں نے۔ سپتا رشی "کا رول انجام دیا جیسا کہ "پوران" میں کہا گیا ہے "انسان کی خدمت بھگوان کی خدمت ہے۔ لیکن اس کا اطلاق مسٹر راؤ جیسے سیاستدانوں پر نہیں ہو سکتا جو غریبوں کی حالت بہتر بنانے میں یقین نہیں رکھتے ہمارے دستور کے مطابق ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اگرچہ ملک کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے لیکن یہ ہندو ملک نہیں ہے۔ حکومت کسی خاص مذہب کی طرفداری نہیں کر سکتی بلکہ ہمارا دستور مذہبی غیر جانبداری کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ سیکولرزم اس نقطۂ نظر کی حمایت کرتا ہے کہ تعلیم و اخلاقیات کی بنیاد مذہب پر نہیں ہونی چاہیئے۔ ایک سیکولر ملک کی حکومت کو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے مذہب پر انحصار نہیں کرنا چاہیئے۔ لارڈ وینکٹیشور اور سری سیلم شیو مندر میں وزیر اعظم کی طرف سے پوجا پاٹ کیا جانا ملک کے دستور کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔

وی منانیز، کلکتہ

اسٹیٹسمین ۱۹/اپریل ۱۹۹۶ء

(دعوت م ۲۵/۴/۹۶ء سے ماخوذ)

بلا تبصرہ

بی جے پی کے نائب صدر اور اقلیتی سیل کے سربراہ عارف بیگ کا پارٹی سے ناراض ہو کر استعفیٰ دینا اور اس کے بعد بی جے پی پر مسلم دشمن ہونے کا الزام لگانا پارٹی کے حلقوں میں بھلے ہی موقع پرستی قرار پائے لیکن اس سے بی جے پی کو بھی سخت جھٹکا لگا ہے۔ بی جے پی جس طرح کے سیکولرزم (مذہبی غیر جانبداری) میں یقین رکھتی ہے اور مسلمانوں یا دیگر اقلیتوں کے تئیں اس کا کیا رویہ ہے۔ اس کی بھی پول کھلتی ہے۔ عارف بیگ نے خاص طور سے دو الزامات عائد کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ بی جے پی پندرہ کروڑ مسلمانوں کو نظر انداز کر کے اقتدار میں آنا چاہتی ہے۔ یعنی بی جے پی کی سیاست کے اندر کہیں نہ کہیں ہندو راشٹر کا خواب پنہاں ہے جس کی موجودگی میں وہ مسلمانوں کو مسلسل نظر انداز کرتی رہی ہے۔ ۴۳۵ اعلان کردہ امیدواروں میں محض ایک مسلمان امیدوار ہونے سے عارف بیگ کے الزام کی صد فیصد تصدیق ہوتی ہے۔ دوسرا الزام یہ ہے کہ بی جے پی سیکولر ہونے کا اپنا مصنوعی کردار برقرار رکھنا چاہتی ہے جبکہ کیڈر سے کہہ رکھا ہے کہ ابھی پارٹی کے اسٹیج سے مسلمانوں کو برا بھلا کہیں اور ہندوؤں کی تعریف کریں۔ ان الزامات کا تعلق یقیناً بی جے پی کے کردار اور طریقۂ کار سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ایک دن میں نہیں اختیار کیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں جب ۵ ہزار مسلم ورکروں کے ساتھ عارف بیگ جن سنگھ میں شامل ہوئے تھے۔ اس وقت ان کے کردار میں کٹر واد کہیں زیادہ حاوی رہا ہوگا۔ پھر بھی وہ ان میں شامل ہوئے لیکن اس وقت کے جن سنگھ سے آج کی بی جے پی تک آتے آتے ایک طویل سفر طے کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی میں انضمام۔ ۱۹۸۰ء میں گاندھی وادی سماج کی راہ اختیار کرتے ہوئے بی جے پی کا جنم ہوا۔ اس وقت یہ سوال اٹھا کر اب بی جے پی مضبوط اور معتدل پسند پارٹی کی شکل میں ابھرے گی لیکن رتھ یاترا سے بی جے پی نے جو رخ تبدیل کی اس سے محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر کٹر جڑوں کی طرف واپس جا رہی ہے۔

[illegible] ۱۲-۴-۱۹۹۶ [illegible] ۱۳/۱/۱۹۹۶ء

ڈاکٹر سیدہ جعفر
پروفیسر شعبۂ اردو یونیورسٹی حیدرآباد

"غزل" پر ایک نظر

پیش گفتار

سعیِ اخفائے کمالات کہاں تک آخر
مضطرؔ اب حوصلۂ عرضِ ہنر پیدا کر

"حوصلۂ عرضِ ہنر" کا اظہار حضرت مضطرؔ کے مجموعۂ کلام کی صورت میں منظرِ عام پر آرہا ہے جس کے لیے وہ یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں۔ مضطرؔ بڑی انکساری اور خاموشی کے ساتھ کوئی پانچ دہائیوں سے شعر گوئی میں مصروف ہیں۔ نہ انہیں مشاعروں کی واہ واہ سے دلچسپی ہے اور نہ وہ اپنے کلام کی سستی تشہیر کے خواہاں رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت کتنے شاعر ہیں جو ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بلند نظر آتے ہیں۔

مضطرؔ کا کلام کلاسیکی طرزِ ادا اور کلاسیکی رچاؤ کا اچھا نمونہ ہے ان کے اشعار میں مجھے دو مختلف رجحانات کا پرتو دکھائی دیتا ہے بنیادی طور پر روایتی اسالیب اور موضوعات کی پذیرائی کا اثر ان کے کلام میں نمایاں حیثیت کا حامل معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مضطرؔ نے ایک باشعور فنکار کی طرح اپنے گرد و پیش کے بدلتے ہوئے معاملات اور زندگی کے جلوۂ صد رنگ اور ادراک کرنے کی پر خلوص کوشش بھی کی ہے۔ ان کے اشعار میں اندازِ ترسیل کے بدلے ہوئے پیکر اس حقیقت کے ترجمان ہیں کہ وہ اقدار و رجحانات کے تغیر پذیر نوعیت کے منکر نہیں ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام میں ایسے اشعار خاصی تعداد میں موجود ہیں جو نئے لب و لہجے اور نئے پیرایۂ ابلاغ کے آئینہ دار ہیں۔

میں رہا خاک بسر میرا سفر جاری تھا
میری راہوں میں خدا بن گئے پتھر کتنے
اس سمندر میں زندگی کے کنول
کتنے پیاسے ہیں تازگی کے لئے
خود کتنا حسین کتنا دلکش ہوگا
تتلی کے پروں میں رنگ بھرنے والا
کہاں تلک کوئی پتھر سے اپنا سر پھوڑے
اگر خدا بھی صنم ہے تو کوئی بات نہیں
جو نظر آتے ہیں سمندر سے
ہیں سراپا سراب اندر سے
قدم ایک انسان نے میرے چھوئے
میں اونچا اٹھا اور خدا ہوگیا

"مئے دوشینہ" کے عنوان سے جو کلام مزین کیا گیا ہے وہ نصف صدی پہلے کی تخلیقات ہیں۔ مضطر ایک طویل عرصے سے مسلسل شعر کہہ رہے ہیں اس لیے ان کا طرزِ ادا محض جدت طرازی کا مظہر نہیں ہے اس کا روایتی پیرایہ اظہار کا ترجمان ہونا ایک فطری امر معلوم ہوتا ہے۔ مضطر نے اس اسلوب کے جو شعر کہے ہیں ان میں اثر آفرینی کے علاوہ روانی و بیساختگی بھی موجود ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

زہر دینے میں بھی کس درجہ تامل ہے انہیں
میرا مرنا مرے جینے سے سوا ہو جیسے
زندگی گویا حریمِ ناز ہے
ہر نفس میں آپ کی آواز ہے

اہلِ جنوں کا اول و آخر نجز ہے
سودائے زلف سر میں ہے زنجیر پاؤں میں

وحشت کدے میں مجھ کو کہاں ڈھونڈنے چلے
رخسارِ کائنات کا رنگ پریدہ ہوں

وقت ٹھہرتا نہیں کسی کے لئے
آؤ مل بیٹھیں دو گھڑی کے لئے

نا فہم کو صیاد کا انعام بہت ہے
جو رزق میسر ہے تہہ دام بہت ہے

مجھے تلاش کے باوجود مضطر کے کلام میں ایسے اشعار زیادہ نہیں ہے جن میں ان کے پیشے کے متعلقات کی کوئی جھلک موجود ہو وہ ایک طویل عرصے تک پیشہ طب سے وابستہ رہے "غزال" میں صرف دو شعر ایسے موجود ہیں جو ان کے پیشے سے تعلق خاطر کو ظاہر کرتے ہیں اور جن میں ان کے پیشے کا عکس نظر آتا ہے۔

ہم نرگس بیمار کے بیمار ہیں مضطر
بیمار کیا مشغلۂ چارہ گری نے

خون بھی رنگ دکھاتا ہے عجب پیری میں
وہ وریدوں میں نہ لوٹا جو گیا شریانوں تک

اردو کے سربرآوردہ شاعر مومن خاں مومن پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے ان کے کلام میں ایسے اشعار موجود ہیں جو ان کے مشغلۂ حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مثلاً خلل پذیر رطوبت ہوا دماغ بہار
عجب کہ سبزۂ خوابیدہ کو نہ ہو کا بوس

"غزال" میں نعت سرورِ کائنات اور اہلبیت اطہار کی منقبت سے متعلق کوئی شعر میری نظر

نہیں گزرا سبب کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے مذہبی کلام اور رثائیہ نظموں وغیرہ کو علحدہ کتابی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہوں۔

مضطر کے کلام میں فلسفیانہ افکار بھی اپنی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔ ہمارے قدیم سرمایہ شاعری میں فلسفیانہ تصورات سے نسبت، علمیت کی پہچان تصور کی جاتی تھی۔ مضطر نے اپنی شاعری میں اپنے متصوفانہ اور فلسفیانہ انداز فکر کی بھی ترجمانی کی ہے چند شعر مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

لمحہ لمحہ ہوا سرمایۂ ہستی تاراج
سانس کیا لیتے ہیں ہم جیسے فنا کرتے ہیں

گمان جلوہ حجابات پر نگاہوں کو
جہاں فریب حقیقت نہیں تو پھر کیا ہے

ہے جویائے اہل نظر حسن معنی
تماشائے نیرنگ صورت کہاں تک

وجہ تخلیق دو جہاں اے دل
عشق خانہ خراب ہے شاید

اخلاق آموزی اور پند و موعظت کا شاعری سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن ان موضوعات کی فنکارانہ پیشکشی نے فارسی اور اردو شاعری میں اخلاقی قدروں کی تابناکی اور توانائی پیدا کی ہے اور انہیں شعر میں انسانی تجربہ کی معنویت کے طور پر پیش کیا ہے۔ شاعری میں موضوع کی قید نہیں لیکن اس کی پیشکشی کے حسن اور جاذبیت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں مضطر کے کلام میں اخلاقی عناصر کی پذیرائی کا انداز ملاحظہ ہو۔

نہ ہو خلوص تو علم و عمل ہیں ناکارہ
نئے چراغ جلے پھر بھی روشنی کم ہے

بہر تکمیل آدمیت ہیں
یہ حوادث کے دل شکن طوفاں

تذلیل نہ کر بہر خدا اہل وفا کی
پلکوں سے اٹھا اسکو جو گرجائے نظر سے

مضطر کے کلام میں کچھ تازہ تشبیہات بھی موجود ہیں اور وہ قاری کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتی ہیں ان تشبیہات میں ندرت اور اچھوتا پن محسوس ہوتا ہے

کتنے رنگوں میں ہے سوداگری یم و رجا
دل نہ ہو کوئی اجنتہ کی گپھا ہو جیسے

حرف شوق اس کے لبوں پر نہ تکلف آیا
کسی غنچے کے چٹکنے کی صدا ہو جیسے

نقرئی جسم سرمئی ملبوس
بادلوں میں چراغ جلتا ہے

مضطر نے نظمیں بھی پیش کی ہیں نظم نگاری سے بھی سروکار رکھا ہے اور صنف رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی غزلیں ان کی شاعری کا بہترین سرمایہ ہیں مجھے توقع ہے کہ ادبی حلقوں میں مضطر کے مجموعہ کلام کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی ۔



سلسلہ صدا ۱۵

لیکن بڑے سرکاری اور سیاسی لوگوں کو پکڑنے کا یہ سلسلہ تو اس کے بعد ہی شروع ہوا۔ پھر کچھ دن بعد اپنے آپ رک جائے گا۔ گویا ہم پر کسی چیز کا دورہ سا پڑتا ہے بعد میں حال پرسکون ہو جاتی ہے۔

(اعجاز رحمانی ۔ ایڈیٹر دہشت) (دہشت ۲۸/۴ ۱۹۶۱ء سے ماخوذ)



خورشید آفاقی
جواہر پیکری، بیچرس کالونی
محبوب نگر ۵۰۹۰۰۲ - اے پی

منظوم خراجِ تہنیت بسلسلۂ رسمِ اجرائی "غزال"

(مجموعۂ کلام حضرت خورشید حسین منظر)

بیٹھے ہیں لوگ جشنِ چراغاں کئے ہوئے
سامانِ عیش ہاتھوں میں اپنے لئے ہوئے
اک دوسرے کو جامِ محبت دیئے ہوئے
رہ رہ کے جھومتے ہیں خوشی میں پئے ہوئے
محفل میں روشنی کا سبب کس کا فن ہے آج؟
کس سے ضیاء بدوش چراغِ سخن ہے آج؟

سبزہ اُگا ہوا ہے، روش ہے ہری بھری
ہر شاخ ہے بہارِ ثمر سے لدی ہوئی
چاروں طرف نسیمِ سحر جھومتی ملی
بادِ صبا بھی شام یہ کہتی ہوئی بڑھی
مائل یہ لطفِ گردشِ چرخِ کہن ہے آج
گلشن میں لب کشائی غنچہ دہن ہے آج

نوکِ قلم کو جنبشِ پیہم دیتے ہوئے
کاغذ پہ نقشِ فکر نمایاں کئے ہوئے
دامن میں حسنِ لفظ و معانی لئے ہوئے
ہر حرف جھومتا ہے سیاہی پئے ہوئے
شاخِ سخن کی ہر کلی غنچہ دہن ہے آج
گل ہائے رنگ و بو سے معطر چمن ہے آج

مجموعے کو میں کیوں نہ دُرِ بے بہا کہوں
گلدستۂ خیال بہ رنگِ حنا کہوں
تسکینِ دل، سرورِ نظر، جاں فزا کہوں
از طفیلِ فیضِ حضرتِ مشکل کشا کہوں
اک مرکزِ نگاہ، شہِ انجمن ہے آج
تو، شاعرِ "غزال" بھی کتنا مگن ہے آج

مصرعے ہیں بے مثال تو ہر شعر لاجواب
تمثیل، استعارے، کنایے ہیں بے حساب
لفظوں کے ساتھ نقطے ہیں موتی نما جناب
چرخِ ادب پہ تارے ہیں ہمراہِ ماہتاب
نازاں ہر ایک شاعرِ ارضِ دکن ہے آج
مضطر کے ہاتھ لُٹ متاعِ سخن ہے آج

٥

غزل

خورشید حسین مضطر

ایک سایہ سا پاس رہتا ہے
جانے کیوں دل اُداس رہتا ہے

وہ حقیقت میں دور ہے کتنا
جو قرینِ قیاس رہتا ہے

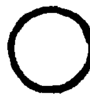
آدمی کی خرد مآبی سے
آدمی بدحواس رہتا ہے

کاش کوئی سنے نگاہوں کو
اک نہ اک التماس رہتا ہے

دَیر سے کعبہ کوئی دُور نہیں
دین دنیا کے پاس رہتا ہے

اس سرابِ وفا کا پیاسا ہوں
بن کے جو دل کی پیاس رہتا ہے

میرا دل ہے کہ ہے دلِ دشمن
تم سے مل کے اداس رہتا ہے



فصیح الدین احمد فصیح
ایم۔ اے (فنانس)
پیماکش لیبر کمشنر، حکومت پاکستان

غزل [1]

تم سے تو ہم نہ بات کرینگے نباہ کی
تم نے تو زندگی ہی ہماری تباہ کی

حد کر کے ظلم و جور کی ظالم ہوا خجل
اب راہ ڈھونڈتا ہے فرار و پناہ کی

کہدو رقیب سے کہ نہ روکے وہ راستہ
اس کو تو ہم سمجھتے ہیں گرد اپنی راہ کی

انکا مزاج اور طبیعت مری ہے اور
کیوں چھیڑ مجھ سے کرتے ہیں وہ خواہ مخواہ کی

ان کا غرور خاک میں مل جائیگا اگر
مجھ جیسے دل جلے نے کبھی دل سے آہ کی

میرا کلام مجھکو دلائے مرا مقام
حاجت نہیں فصیح مجھے واہ واہ کی

---

(۲)

فصیح الدین احمد فصیح

رقیبوں سے وہ کرتا ہے بڑی ہی پیار کی باتیں
ہمارے ساتھ ہیں کڑوی بہت دلدار کی باتیں

کبھی دو بوند بادہ ہم جو پی لیں جذب و مستی میں
پکار اٹھتی ہے دنیا مت سنو میخوار کی باتیں

نہ جانے لمحہ بھر کے واسطے آنکھوں نے کیا دیکھا
چلی آتی ہیں جو ابتک اسی دیدار کی باتیں

سنا ہے آجکل وہ ہے رقیبوں کی طرف مائل
خدا جانے یہ سچ ہے یا کہ ہیں اغیار کی باتیں

کبھی آغازِ الفت میں کہا تھا تم نے "ہاں" مجھ سے
زمانے بھر میں پھیلی ہیں اسی اقرار کی باتیں

وطن کی سرزمیں کا ذکر جب ہونے لگا ہمدم
زباں پر خود بخود آئیں گل و گلزار کی باتیں

فصیح رودادِ فرقت لیکے محفل میں نہ تم جانا
سنیگا کون اب سو بار کی تکرار کی باتیں

ڈاکٹر محبوب راہی، پرنسپال کالج
بارسی ٹاکلی ۴۴۴۴۰۴
ضلع آکولہ۔ مہاراشٹرا

کیا اب بھی نہیں جاگو گے

کیا اب بھی نہیں تم جاگو گے، کیا اب بھی نہیں تم جاگو گے۔

کیا اب بھی تمہاری آنکھوں پر پردے ہیں طلسمی خوابوں
کیا اب بھی تعاقب میں مبہم جاؤ گے یونہی سرابوں
کیا اب بھی تمہارے ذہنوں پر ماضی کے سنہرے جالے
کیا اب بھی تمہارے ہونٹوں پہ سونے چاندی کے تالے
کیا اب بھی تمہاری سوچوں پر ہیں یلغاریں اندیشوں
کیا اب بھی سروں پر لٹک رہی ہیں تلواریں اندیشوں

کیا اب بھی تمہیں احساس نہیں اپنی موجودہ حالت کا
کیا اب بھی تمہیں احساس نہیں اپنے ماضی کی عظمت کا
کیا اب بھی تمہیں احساس نہیں تم آج ہو کیا اور کل کیا تھے
کیا اب بھی تمہیں احساس نہیں تم رہبر دین و دنیا تھے
کیا اب بھی تمہیں احساس نہیں اپنے حالات بگڑنے کا
کیا اب بھی تمہیں احساس نہیں اپنی دنیا کے اجڑنے کا

کیا اب بھی تمہیں افسوس نہیں، مختار تھے اب مجبور ہو
کیا اب بھی تمہیں افسوس نہیں طاقتور تھے معذور
کیا اب بھی تمہیں افسوس نہیں آزاد تھے اب محصور ہو
کیا اب بھی تمہیں افسوس نہیں مسرور تھے اب رنجور

کیا اب بھی تمہیں افسوس نہیں محبوب تھے اب مقہور ہو تم
کیا اب بھی تمہیں افسوس نہیں منزل سے کتنی دور ہو تم
کیا اب بھی خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو گے نہیں
کیا اب بھی نہ عبرت پکڑو گے اپنی بربادی حالت سے
کیا اب بھی نہ عبرت پکڑو گے اپنی ... ذلت سے
کیا اب بھی اپنی غفلت پر رُو دو گے نہیں ... گے نہیں
کیا اب بھی نہ عبرت پکڑو گے اس شرمناک رسوائی سے
کیا اب بھی متحد ہونے کا احساس نہ تم میں جاگے گا
کیا اب بھی بیر رکھو گے اپنی ملت اپنے بھائی سے
کیا اب بھی باز نہ آؤ گے سرمستی سے سرشاری سے
کیا اب بھی باز نہ آؤ گے اپنی ملت بیزاری سے
کیا اب بھی باز نہ آؤ گے اس جھوٹی دنیا داری سے
کیا اب بھی باز نہ آؤ گے تم اپنی بدکرداری سے
جاگو کہ تمہیں اپنی کھوئی عظمت کو واپس لانا ہے
جاگو کہ تمہیں دین حق کا پرچم پھر سے لہرانا ہے
کیا اب بھی نہیں تم جاگو گے
کیا اب بھی نہیں
کیا اب بھی نہیں

ایک لاعلاج مرض

مشہور ماہر قانون نی پالکھی والا نے کہا ہے کہ ہندوستان کو آج ایک ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو ملک کو سیاسی و اقتصادی بحران سے نکال سکے۔ خلیج ٹائمز کے نمائندہ سے بات چیت کے دوران انہوں نے کہا کہ کوئی بھی ایسا لیڈر اس وقت نہیں ہے جو اس ذمہ داری کو انجام دے سکے۔ پالکھی والا نے مزید کہا کہ ملک کو ٹوٹتے ہوئے دیکھنے سے زیادہ بہتر ہے کہ کچھ دنوں کے لیے عوام کو آزادی سے محروم کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے عوام جن مخالف حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں ایسے حالات اگر دوسرے ملکوں میں پیدا ہوتے تو انقلاب آچکا ہوتا اور اسی طرح کے دیگر اسکینڈلوں کے سامنے آنے کے باوجود ہندوستانی عوام غیر جانبدار رہے جبکہ دوسرے ممالک میں اس طرح کے اسکینڈلوں کے سامنے آنے کے بعد عوام انقلاب برپا کر دیتے۔ لیکن ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ یہاں کے لوگوں میں ایسے عزم و حوصلہ کی کمی ہے جو لوگوں کو ایک دوسرے سے مربوط کر سکے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کے موجودہ سیاسی و اقتصادی بحران کا ایک اہم سبب کرپشن بھی ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران بوفورس، بینک اور ماروتی جیسے ملک کی اقتصادیات پر منفی اثر ڈالنے والے اسکینڈل سامنے آئے پتہ نہیں اس طرح کے کتنے اسکینڈل سیاسی اثرات کے سبب منظر عام تک آہی نہیں

آسکتے ہیں۔ ان اسکینڈلوں کے تحت کالے دھن کے استعمال کے بارے میں دہلی اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر سورج بھان گپتا نے ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے تین سو کروڑ روپے کا اندازہ لگایا تھا لیکن مالیات سے متعلق پارلیمانی کمیٹی کے مطابق ملک میں کالے دھن کی گردش ملک کی پیداوار سے بھی زیادہ ہے۔

حیرت تو یہ ہے کہ وہ سیاسی لیڈر اور پارٹیاں بھی کرپشن کے فروغ کی ذمہ دار ہیں جو اس کے خاتمہ کا عوام کو یقین دلانے میں جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ نرسمہا راؤ حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد کو ناکام بنانے کے لیے جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے ممبران پارلیمنٹ کو بڑی رقم دے کر حکومت کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کرنے کے الزام اور حوالہ اسکینڈل کے تحت متعدد قومی سطح کی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں پر جین برادران سے رقم لینے کے الزامات کے نتیجہ میں بھلا ہی ملک کے ووٹروں کو ان پارٹیوں پر اعتماد نہ ہے لیکن اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کالے دھن کا حصول اور استعمال سیاست کا اہم حربہ بن چکا ہے۔ جن کے تحت پارلیمنٹ و اسمبلیوں کے ممبروں کی خرید و فروخت بھی کی جاتی ہے پارٹیوں کے اندر اختلافات پیدا کرنے، حکومت کو گرانے اور انتخابات جیتنے کے لیے اس کالے دھن کے اہم کردار سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔

کالا دھن کہاں سے آتا ہے؟ یہ بھی پوشیدہ نہیں۔ مختلف وزارتیں بہت سے تجارتی سودے طے کرتی ہیں۔ تجارتی گھرانوں اور کثیر القومی کارپوریشنوں کو بڑے بڑے ٹھیکے دئے جاتے ہیں اس طرح ٹیکس سے بچنے کے لیے بھی کرپشن کا سہارا لیا جاتا ہے۔ صرف انکم ٹیکس کی ادائیگی کے معاملہ میں ہی ایسا نہیں بلکہ کارپوریشن ٹیکس، پیداوار ٹیکس اسپیشل ٹیکس اور کسٹم سے بچنے کے لیے بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بڑے صنعتی گھرانوں کو چندہ دینے کے ذریعہ سے اس بات کے لیے رضامند کیا جاتا ہے کہ وہ کالے دھن کا کچھ حصہ انتخابی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے فراہم کردیں۔ لہٰذا حالات میں سیاسی پارٹیوں سے جو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کرپشن کا سہارا لیتی ہیں کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ کرپشن کے خاتمے سے متعلق اپنے

وعدوں میں مخلص ثابت ہوں گی۔ آئندہ انتخابات کے پیش نظر تقریباً سبھی سیاسی پارٹیوں کے اندر اختلافات اور وفاداریوں کی تبدیلی کے جو مناظر سامنے آرہے ہیں۔ ان سے اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ سیاست دانوں کا کوئی مستقل اصول یا نقطہ نظر نہیں ہوتا بلکہ حالات کے تحت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ورنہ بی جے پی کو ایک فسطائی پارٹی ماننے والے کانگریسیوں یا کانگریس کو مسلمانوں کی خوشامد کرنے والی اور ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر میں سب سے بڑی رکاوٹ پیدا کرنے والی پارٹی ماننے والی بی جے پی والوں کی وفاداریاں اتنی آسانی کے ساتھ تبدیل نہیں ہو جاتیں۔ بی جے پی کو منو وادی پارٹی کا سرٹیفکیٹ دے کر دلت مفادات کی علمبرداری کا دعویٰ کرنے والے کانشی رام اور مایاوتی کے بارے میں کیا سوچا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے محض اقتدار کے لیے اسی منوادی پارٹی کا سہارا لیا جس کو رات دن کوسنا ان کے معمولات میں داخل ہو چکا تھا۔ چندر شیکھر اور فرنانڈیز جیسے سیکولرزم والوں کے بارے میں اچھی رائے کیونکر قائم کی جا سکتی ہے جو اپنے سیاسی وجود کو مٹنے سے بچانے کے لیے بی جے پی کی طرف امید و بیم کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

(دعوت سنہ ۹۶ سے ماخوذ)

سلسلہ ۸

اگر طلاق دینے والے کے گھر میں طلاق دینے والے سے مطلقہ کے پردہ کا اہتمام نہ ہو، ہو یا اس سے کسی قسم کا خطرہ ہو تو مطلقہ عورت کہیں اور محفوظ جگہ۔ مثلاً اپنے میکہ منتقل ہے اگر طلاق دینے والے شوہر سے اس مطلقہ کے چھوٹے بچے ہیں تو یہ چھوٹے بچے (لڑکا سال کی عمر تک اور لڑکی بالغ ہونے تک) اپنی والدہ (مطلقہ عورت) کے پاس پرورش پانے کے حقدار ہوں گے۔ اور ان بچوں کے تمام اخراجات باپ پر یعنی طلاق دینے والے پر ہی اگر یہ مطلقہ بچوں کی ماں بچوں کی پرورش کی خاطر اپنا نکاح کسی اور شخص سے نہیں کرتی تو وہ جب تک پرورش کرتی رہے گی اس کے اور ان کے بچوں کے تمام ضروری اخراجات بچوں کے باپ کے ذمہ رہیں گے۔ ہاں اگر وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لے گی اس کا بچوں کی پرورش کا حق ختم ہو جائے گا۔

ماہنامہ **شاداب** حیدرآباد

قیمت : ۶ روپے

جلد : ۱۳
شمارہ : ۶
جون : ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر : محمد قمرالدین صابری
جائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر :
قدیر انصاری

:- مجلسِ مشاورت :-

:- زرِ تعاون :-

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے'	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۔۔ ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	" ۲۰۰	" ۳۶۰ "	" ۳۷۰۰ "
امریکہ	" ۴۰ ڈالر	" ۷۰ ڈالر	" ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	" ۲۵ پونڈ	" ۴۵ پونڈ	" ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	" ۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ روپے

:- ترسیلِ زر کا پتہ :-

ماہنامہ "شاداب" ۔ ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد ۔ ۴

اڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے پیشل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپواکر دفتر "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دعوتِ ایمان

اور

پیامِ انسانیت

دعوت کی خاصیت

دوستو اور بھائیو! آج میں آپ کی خدمت میں دو باتیں عرض کروں گا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے جس طرح ملک شام میں خاصیتیں پیدا کی ہیں اور وہ ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں برسوں سے چلی آرہی ہیں، زمانہ میں کتنے انقلابات آئے، سلطنتوں کے چراغ گل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں خلیج عربی تھا کہیں دجلہ نہ تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبھی شام اور ہندوستان کی سرحد ایک تھی، مصر اور ہندوستان کی تہذیب میں جو مماثلت پائی جاتی ہے ان کے آثار میں بلکہ مزاج میں جو اشتراک ہے اس سے لوگوں نے اندازہ کیا ہے کہ کسی زمانہ میں مصر ہندوستان قریب تھے اور ایک تہذیب تھی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ سب انقلابات ہوئے لیکن اللہ تبارک تعالیٰ نے اس ملک میں جو خصوصیات رکھی ہیں وہ آج تک چلی آرہی ہیں، باقی

آگ بجھاتا ہے، آگ جلاتی ہے۔ سنکھیا اور زہر کی جتنی قسمیں ہیں وہ کام تمام کر دیتی ہیں، نسخہ گری کے یہی اوصاف ہیں اور انسانوں کو کھانے کی ضرورت ہزاروں لاکھوں برس سے ہے۔ غرض ہمیشہ سے پایا جاتا ہے، انسان کے لیے اس کے ماحول میں جو چیزیں رکھ دی گئی ہیں ان سے اس کا تعلق بہت قدیم ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اخلاق میں، اعمال میں اور معنویات میں تاثیر رکھی ہے۔ ایمان میں اس نے جو اپنے تعلق کی صفت رکھی ہے اپنی یاد میں، اپنے ذکر اور اپنی عبادت میں، توبہ میں جو خصوصیت رکھی ہے وہ لاکھوں برس سے ہے اور اگر ابھی دنیا کے مقدر میں ہزاروں برس باقی رہنا ہے تو یہ خاصیت رہے گی۔

تاریخ کی کسی ایک شہادت سے نہیں معلوم ہوتا کہ ان اخلاق، اعمال اور عقائد کی خاصیت کسی زمانہ میں کچھ اور تھی، تاریخ تو کیا بتاتی کوئی صحیفۂ آسمانی بتاتا کہ توحید میں جو خاصیت ہے وہ کبھی شرک میں تھی جو نیک اعمال میں خاصیت ہے وہ کبھی بے دردی میں تھی، جو عدل میں خاصیت ہے وہ کبھی ظلم میں تھی کوئی آسمانی صحیفہ یہ نہیں بتاتا، توریت ہو، انجیل ہو، صحف ابراہیم ہوں، زبور ہو اور پھر آخری صحیفہ قرآن مجید ہو، سب یہی بتاتے ہیں کہ ایمان میں توحید میں، نیک اعمال میں۔ عبادت میں، عدل میں، انصاف میں، ہمدردی میں محبت میں یہ ہے، جب یہ حقیر اشیاء جو انگلیوں سے مسلی جا سکتی ہیں، پیروں سے روندی جا سکتی ہیں جنہیں استعمال کر کے انسان نہایت خراب حالت میں پہونچ سکتا ہے جن کو جانور چر جاتے ہیں، کھا جاتے ہیں، جن کو پانی بہا لے جاتا ہے ان میں یہ خاصیت ہے تو وہ چیزیں جو خدا سے اور اس کی ذات عالی سے تعلق رکھتی ہیں ان میں یہ خاصیت کیوں نہ ہوگی۔

صفات میں تغیر پیدا کیجیے

میرے دوستو اور بزرگو! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے اور آپ کے لیے دنیا میں نجات کا، عزت کا اور حفاظت کا راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم خدا کے پیغمبروں کی تعلیمات پر چلیں اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کریں

جن کے متعلق خداتعالیٰ فرماتا ہے۔

"وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ"

بیشک ہمارا لشکر غالب آنے والا ہے بے شک ہمارے ہی لشکر کی مدد کی جائیگی

وہ اخلاق پیدا کریں جو دلوں کو کھینچتے ہیں، جو دشمنوں کو دوست بنا تے ہیں ہمارے اندر کچھ ہمدردی پیدا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے ہم اپنے اندر سے حسد کو نکال دیں کینہ کو نکال دیں اپنی غرض کو نکال دیں، ہماری سطح بلند ہو جائے، ہم مال و دولت کے پرستار نہ ہوں، ہم اکرام اور آسائیوں کے عبادت گذار نہ ہوں، ہم عروج و اقبال، طاقت و دبدبہ اور اقتدار کے پجاری اور غلام نہ ہوں، ہم ابن الوقت اور موقع پرست نہ ہوں، ہم ہیشہ پر جان دیتے اور جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہوں، یہ اخلاق اگر ہم اپنے اندر پیدا کرلیں گے تو سارے عالم کی کیفیت بدل جائے گی اور ہم خدا کے محبوب بن جائیں گے اور پھر آسمان سے صدا آئے گی کہ مجھے اپنے فلاں بندہ سے محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو، اس سے بڑھ کر کوئی شمشیر، اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر، پیغمبروں سے لے کر اولیاء اللہ تک اور اولیاء اللہ سے لے کر عام مسلمانوں تک نہ کبھی تھی اور نہ کبھی ہوگی۔ کوئی سیاسی رہنما کوئی دنیا کا فلسفی و دانشور آپ کو اس سے بہتر مشورہ نہیں دے سکتا اور کسی کے مشورہ سے آپ کو وہ فائدہ نہیں ہو سکتا جو آپ کو خدا کے پیغمبروں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے ہے۔ یہ عالم بہت وسیع ہے اور اس کثرت میں اتنا انتشار ہے اور اس میں اتنی چیزیں اتنی اسبابیاں پھیلی ہیں کہ آپ ان کو سمیٹ بھی نہیں سکتے، اس کثرت میں اگر آپ وحدت پیدا کریں، اس کثرت میں اگر اس ذات واحد سے آپ کا تعلق پیدا ہو جائے اور اس کو آپ اپنا بنالیں تو پھر سارا عالم آپ کا بن جائے گا۔ صفات میں جب تک تغیر نہ ہوگا حالات میں تغیر نہ آئے گا آپ اپنی صفات میں تغیر پیدا کیجئے، اپنی افادیت ثابت کیجئے اور اس بات کو ثابت نہ کیجئے کہ آپ... کو علاوہ ہو بلکہ آپ مجسم افادیت بن جایئے، ثابت کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ثابت کرنا بھی ایک طرح کا تصنع ہے، نہیں

آپ معتقد بن جاتے ہیں یہ نہ دیکھئے کہ دوسروں نے آپ کو مفید بتایا یا نہیں، پانی کتنا کھولتا ہے کہ جو
پانی میں پھینکتا ہوں، کیا آپ نے کبھی سنا ہے پانی کے ابلنے کا آپ نے ہو، یا فرق کے مطلق جانتے ہیں، یا
کبھی غور کیا کہ پانی کتنا ہے کہ میں بہت کم کہ جو چیز مجھے پینا چاہیئے مجھ سے پیا
نہیں جاتا، آپ نے کبھی کہا تھا یا اپنا سفر کیا تھا کہ میں کھانا پکاتی ہوں۔ میں بہت کام
ہیں، جیسے زبانیں جو چیزیں ہیں، کبھی نہ کبھی بولی ہیں اور نہ بولیں گی مگر ان کی فصاحت
ہے، ساری دنیا ان کی پابند اور محتاج ہے۔ ویسے ہی مسلمان کسی مکتب میں مجذوب بن کر
رہنا چاہتے ہیں تو اپنی صفات میں تغیر پیدا کریں۔ تمام سیرت کی کتابیں اور تاریخ کی
کتابیں اس کے دلائل سے بھری ہوئی ہیں، آپ نے بارہا یہ ایمان افروز واقعات سنے ہوں گے،
صرف دو واقعات سناتا ہوں۔

دریا کے سامنے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی

ایک واقعہ تو یہی دجلہ والا ہے جب مسلمان مدائن فتح کرنے کے لیے دجلہ کے قریب
تو مدائن کا شہر سامنے تھا لیکن پل توڑ دیئے گئے تھے، کشتیاں وہاں سے ہٹادی گئی تھیں،
مسلمانوں کے لیے اس کے پار کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، آپ کو معلوم ہے کہ جزیرۃ العرب
کے رہنے والے عرب دنیا میں گھوڑ سواری کے سب سے بڑے شہسوار تھے لیکن پانی سے ان
کا واسطہ کبھی نہیں پڑا تھا، یہ تیرنا کیا جانیں، اور سمندر ان کی جگہ نہیں ہے، صرف ساحل عرب
پر ہے، جو اس کے قریب رہتے ہیں اور وہ بھی اکثر کشتیوں پر بیٹھنے کے عادی ہوا کرتے تھے
عام طور پر تو عرب گھر ہی رہتے ہیں لیکن پیراکی سے ناواقف تھے، اب سوال یہ ہے کہ
اپنی تمام فوج کے ساتھ دریا عبور کرنا ہے مگر اس میں چلا کیسے جائے، حضرت سعد بن ابی وقاص
نے وہاں لشکر چند منٹ کے لیے روکا اور حالات کا جائزہ لیا، میں یہ واقعہ کئی بار
کر چکا ہوں، لکھ چکا ہوں، مگر آپ کے سامنے پھر یہ واقعہ تاریخ عالم میں نہیں مل سکتا۔

کہتا ہے، سچا واقعہ ہے کہ اس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی کہ انہوں نے حضرت سلمان کی طرف دیکھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ انہوں نے کہا "ایہا الامیر" اسے جانے دو، مگر میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے "ان ھذا الدین لجدید" اللہ کا یہ دین اس کو ابھی بہت کم عرصہ ہوا ہے، یہ ابھی ابھی آیا ہے دنیا کو نجات دینے کے لیے، میری عقل یہ تسلیم نہیں کرتی کہ اس کا بیڑا یہیں غرق ہو جائے جس کام کے لیے بھیجا جائے وہ کام پورا ہو بشرطیکہ بھیجنے والا قادر ہو آپ نے اپنے نوکر کو بھیجا اور آپ کی حکومت ہے آپ کا سکہ چل رہا ہے تو کیا مجال ہے کہ کوئی آپ کے نوکر کو روک کر راستے ہی میں اس کا کام تمام کر دے، کہ انہوں نے کہا یہ دین ابھی تازہ ہے اسے ابھی دنیا میں آئے کتنے دن ہوئے ہیں اور اللہ کے نام سے ڈوب جائیں۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ کہیں لشکر میں گناہ تو عام نہیں ہو گئے ہیں۔ لشکر میں گناہ کا رواج تو نہیں ہو گیا ہے بس انہوں نے یہ کہا اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے لشکر پر ایک نگاہ ڈالی، وہ نگاہ بھی کیا تھی، اور وہ لشکر بھی کیا لشکر تھا کہ اس کی صورتوں سے معصومیت ٹپکتی تھی، اور وہ نگاہ بھی کیا نگاہ تھی جو ایک نظر میں سب کا جائزہ لے لے، آج جانچنے کے لیے کیسے کیسے محکمے قائم ہیں، پھر بھی اس کا پتہ نہیں چلتا ہے اور انہوں نے ایک مرتبہ دیکھا اور کہا بسم اللہ چلو! بس سب نے دریا میں گھوڑے ڈال دیئے اور نہایت اطمینان سے باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ کسی بھائی کا ایک برتن گر گیا؟ انہوں نے کہا کہ جائے گا کہاں اس کی مجال کیا ہے۔ ایک لہر آئی اور برتن بہتا ہوا ان کے پاس آ گیا، انہوں نے اسے اٹھا لیا، ان کے اطمینان کی اس وقت یہ حالت تھی کہا ہے کہ اس طرح باتیں کر رہے تھے کانھم یمشون فی البیت پتہ چلتا تھا جیسے خشکی پہ چل رہے ہوں، جب ایرانیوں نے یہ منظر دیکھا تو کہا دیواں آمدند، دیوان آمدند یعنی دیو آ رہے ہیں دیو آ رہے ہیں۔

دوسرا واقعہ حضرت عقبہ بن نافع کا ہے جب وہ قیروان گئے اور وہاں چھاؤنی ڈالنے کا ارادہ کیا کہ وہاں سے بیٹھ کر سارے شمالی مغربی افریقہ کو فتح کریں اور جنگل کو

پسند آئی تو لوگوں نے کہا کہ یہ جگہ مناسب نہیں ہے، شیر کا نام تو خاص طور پر لیا اور بھی جانور رہے ہوں گے تو کہا کہ اب یہاں چھاؤنی نہ چھائیں آگے چھائیں، معقول بات تھی اور معمول بات تھی، اللہ کی بڑی زمین پڑی ہوئی تھی لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذہن ہی اور تھا وہ حالات کے ساتھ سپر انداز نہیں ہوتے تھے، حالات کو اپنے موافق بناتے تھے، انہوں نے کہا ہم تو جو اللہ کا پیغام لے کر آئے ہیں چلے جائیں اور یہ شیر اور چیتے یہیں رہیں؟ رہنا تو اسے چاہیے جس کی فطرت ہو اس لیے یہ تو الٹی بات ہوئی کہ ہم کہیں بھائی یہ جگہ مناسب نہیں ہے آگے چلو، اور شیر کون سا عہد کام کر رہے ہیں، یہ کون سا اللہ کا پیغام پہنچا رہے ہیں، یہ بھیڑیئے کون سے ہیں اس لیے ہم نکل جائیں گے، ان کو جانا چاہیے اور یہ کہہ کر انہوں نے ایک آدمی کو بلایا، ایک تاریخی واقعہ ہے، افسانہ نہیں ہے اور عرب الف لیلوی اور ہندوستانیوں کی طرح تاریخ میں افسانہ لکھنے کے بالکل عادی نہیں ہیں، تاریخ بالکل سچی لکھتے ہیں، جبھی تو حدیث محفوظ رہ تو انہوں نے ایک آدمی کو بلایا اور کہا دیکھو اعلان کر دو کہ اے شیرو! اور اے چیتو! کہنا گھبرانا نہیں، تم کو اس سے غرض نہیں کہ وہ سنتے نہیں اور بے زبان ہیں، ایسے ہی کہنا اے شیرو اے چیتو! اے بھیڑیو! اے درندو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، ہم یہاں چھاؤنی چھانا چاہتے ہیں، ہم یہاں بیٹھ کر اللہ کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں اور اللہ کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جن کو اپنی جان پیاری ہو فلاں وقت تک مہلت ہے چلا جائے اور وہ رہے گا تو اس کی جان کی خیر نہیں، لوگوں نے کہا واللہ العظیم ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چیتا بھاگا چلا جا رہا ہے، اور اس کی مادہ اپنے بچے کو گود میں لیے ہوئے ہے، بغل میں دبا ہے اور بھاگی چلی جا رہی ہے تھوڑی دیر میں میدان صاف۔

یہ تھا ان کا طریقہ، انہوں نے ایک بار [illegible] تغیر پیدا کیا اور اس کے بعد ثابت قدم رہے ان کا طرز عمل یہ نہیں تھا کہ [illegible] ہو جاؤ پھر تقاضہ ہو تو لیں [illegible] پارٹی جوائن کر لو، وہ کوٹ بدلا نہیں کرتے تھے اور دل بدلا بھی نہیں کرتے

وہ دل بدلتے تھے اور نہ دل بدلنے دیتے تھے' ایک دل اور ایک دل' یہ صفات میں تغیر تھا۔

ہندوستان میں ہمیں کس طرح رہنا ہے

مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے' عزت کے ساتھ رہنا ہے۔ محبوبیت کے ساتھ رہنا ہے تو یہ لڑتے بھڑتے کب تک یہ شکوے شکایت کہ ہمیں چھیڑتے ہیں جیسے بعض بچے ہوتے ہیں' احساس کمتری کے مریض ہوتے ہیں' وہ چلاتے ہیں ہمیں چھیڑتے ہیں دیکھئے ہمیں چھیڑتے ہیں' بعض کسی چیز سے چڑھتے ہیں' یہ ایک نفسانی مرض ہے۔ اس میں خبط سا ہو جاتا تھا کہ دیکھئے بچے چھیڑ رہے ہیں کوئی کریلے سے چڑھتا ہے اور کوئی جلیبی سے چڑھتا ہے' کوئی کسی نام سے چڑھتا ہے اور بچے اسے چھیڑتے ہیں۔ تو ہم کب تک ہندوستان میں نعرے لگاتے رہیں گے کہ بچے ہمیں پریشان کرتے ہیں' یہاں کی صورت یہ ہے کہ ایک تو اپنے اندر صفات میں تغیر پیدا کریں آپ اپنے اندر ایمان پیدا کریں' عمل صالح پیدا کریں جیسے ہمارے دوست ناصر العبودی نے بڑی اچھی بات کہی کہ اگر آپ کے اخلاق درست ہیں۔ اور آپ کے معاملات درست ہیں تو لوگ آپ کو دیکھ کر کہیں گے کہ ان کا دین بھی اچھا ہے' اور انہوں نے یہ بات بھی خوب کہی تھی کہ اکثر لوگ سطحی نظر کے ہوتے ہیں' زیادہ گہرائی میں نہیں جاتے' وہ آدمی کو دیکھتے ہیں۔ کتاب پڑھنے کی کسے فرصت ہوتی ہے' یہاں جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مسلمانوں کو دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے' انہوں نے خواجہ معین الدین چشتی کو دیکھا تھا' خواجہ معین الدین چشتی قطعاً مصنف نہ تھے' چشتی حضرات یہ کہتے ہیں کہ خواجہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا ہمارے بزرگوں نے کتاب نہیں لکھی نہ جس کتاب کی نسبت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف ہے وہ صحیح۔ نہ جس کتاب کی نسبت خواجہ قطب الدین کاکیؒ کی طرف ہے وہ صحیح' نہ جس کتاب کی نسبت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی طرف ہے وہ صحیح' خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے بھی کتاب نہیں لکھی' ان حضرات نے

تصنیف و تالیف کے ذریعے اور تقریر و خطابت کے ذریعے دلوں کو نہیں جیتا، انہوں نے اپنے اخلاق سے جیتا ہے، قربانی سے، ایثار سے، کسی سے چھیننے والے تھے، جیت سکتے تھے لیکن ہار مان لی، دب گئے، غم پی گئے، گالی سن لی، کسی نے برا بھلا کہا، اپنی توہین کو معاف کردیا، غریب کو دیکھا اور بڑھ کے اس کو سینہ سے لگا لیا، دوسروں کو کھلا کر خود کھایا، بھوکے رہے، یہ اخلاق تھے جنہوں نے دلوں کو کھینچا ہے اور انہیں اخلاق نے، انہیں صفات نے انڈونیشیا میں بھی اپنا کام کیا ہے، سارا انڈونیشیا عرب تاجروں کے اخلاق دیکھ کر یا صوفیائے کرام کی روحانیت دیکھ کر مسلمان ہوا اور آج تک کوئی سراغ نہیں لگا سکا کہ انڈونیشیا میں یا چین میں کوئی اسلامی لشکر گیا ہو، اسلامی لشکر ان دور دراز مقامات تک گیا ہی نہیں اور آج دیکھ لیجئے ہندوستان میں جن مقامات پر سات سو برس تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی وہاں آج تک مسلمان اقلیت میں ہیں، یہ آپ کو یو پی کا علاقہ، مدھیہ پردیش کا صوبہ، بہار کا صوبہ اور راجپوتانہ بھی ان سب جگہوں میں اسلامی حکومت قائم رہی، خاص دلی میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے، لیکن مسلمان اکثریت میں کہاں ہیں؟ کشمیر میں جہاں ایک اللہ کا بندہ امیر کبیر سید علی ہمدانی تشریف لائے اور سارا کشمیر ان کے ہاتھوں پر مسلمان ہوگیا، اسی طرح بنگال ہے خاص طور پر مشرقی بنگال سارا کا سارا صوفیائے کرام کے حلقہ میں ہے۔

تو اخلاق بدلنے کی ضرورت ہے یعنی یہ کہ آپ دعوت دے کر کر رہے ہوں اور پہلے مسلمانوں ہی داعی بنیں مسلمانوں کو آپ تبلیغ کریں تاکہ آپ کی بات کا مسلمانوں میں وزن ہو اور آپ مسلمانوں پر اثر انداز ہو سکیں اور مسلمانوں میں اصلاح کی رو چلے، اخلاق بلند کی رو چلے، ان کے اخلاق درست ہوں جو محمودی ہیں، تو پہلے تو مسلمانوں میں ضرورت ہے پھر مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ بجائے علمی انداز میں تبلیغ کرنے اور اس طرح دعوت دینے کے کہ غیر مسلم مسلمان ہو جاؤ، اپنے اخلاق سے ان کے قلب میں، ان کے دل میں جگہ پیدا کرنی چاہئے۔

اور ہمدردی کا جذبہ ہو کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ ملک [illegible] نہ بنے۔

طفلانہ ذہنیت

[illegible] مسلمانوں کی ذہنیت ایسی ہو گئی ہے کہ کوئی سیلاب بھی آجاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں، [illegible] جاتی ہیں [illegible] ٹھیک ہے، کہیں آگ لگ جاتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں، اب ایسی ذہنیت پست ہو گئی ہے کہ اگر کرکٹ میں، ہاکی میں ملک کی ٹیم ہار جائے تو خوش ہوتے ہیں اور کسی اسلامی ملک کی ٹیم جیت جائے تو خوش ہوتے ہیں، یہ بالکل طفلانہ ذہنیت ہے۔ اس سے کام نہیں چلے گا، سچی ہمدردی آپ کے اندر پیدا ہونی چاہیے کہ ہم جس ملک میں بستے ہیں اس سے ہمیں ہمدردی ہو، دیکھئے اگر آج ہمارے اسلاف کرام نے اس ملک کو نہ بنایا ہوتا نہ سنوارا ہوتا تو آج ہم اس ملک کو دکھانے کے قابل نہ ہوتے، ستے آدمیوں کو ہم نے دکھایا آپ ہماری نمائش گاہ میں جائیے دارالعلوم میں جہاں نمائش ہال ہے وہاں دیکھئے کہ اس ملک کو ہمارے بزرگوں نے کیا دیا ہے اور اس ملک کو کیسا مالا مال کر دیا، اگر ان کے اندر یہ جذبہ ہوتا اور ہمیشہ ان کا ذہن مصائب سے خوش ہونے کا ہوتا کہ لعنت ہو اس سرزمین پر، غضب ہے کہ یہ ملک ہمارے ساتھ یہ ناانصافی ہو رہی ہے، وہ ناانصافی ہو رہی ہے۔ تو کچھ بھی نہ ہوتا، لیکن انہوں نے اس ملک کو اپنا ملک سمجھا، اور اس ملک کی مخلوق کو اللہ کی مخلوق سمجھا، الخلق عیال اللہ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اس کو سمجھنے بچانے کی کوشش کی، اللہ کا پیغام پہنچایا، اس کو انسان بنانے کی کوشش کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محبوب بن گئے، ہر دلعزیز بن گئے، مخلوق کا ملجا بن گئے۔ ●

ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی
ناظم دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

عہدِ نبوی میں خواتین کی تعلیم

انسانی معاشرہ مرد و عورت دونوں کی قوتوں، صلاحیتوں اور سرگرمیوں سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں کسی ایک کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اہمیت میں تخفیف نہیں کی جاسکتی۔ ایک مہذب باوقار ترقی یافتہ معاشرہ کے لازم ہے کہ اس کے افراد مہذب اور تعلیم یافتہ ہوں۔ جس طرح کمزور اینٹیں کی قوت حیات حیات گھٹا کر اُسے کمزور بنا دیتی ہے اسی طرح جاہل افراد بھی اس کو پستی اور تنزلی سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ کمزور افراد پر مضبوط معاشرہ تعمیر ممکن ہی نہیں۔

اسلامی معاشرہ کی بنیادی خصوصیت اس کے افراد کے ایمان، علم اور کردار کی مثالیت ہے۔ اس معاشرہ میں ایمان کا رشتہ علم سے قدیم سماج کی طرح کمزور نہیں بلکہ حد درجہ مضبوط اور مستحکم ہے بلکہ اسلامی معاشرہ کی سنگِ بنیاد ایمان و علم کے جڑواں نظریہ پر ڈالی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم و ایمان کے اس مقدس و مستحکم رشتہ کا اعلانیہ ہے جس میں عرب کے ناخواندہ ماحول میں علم کی شمع روشن کی گئی ہے اور پہلی مرتبہ پڑھنے لکھنے اور علم حاصل کرنے کا شعور پیدا کیا گیا ہے۔

اگر اِس بات پر غور کیا جائے کہ اسلام کے آنے کے وقت گنتی کے چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے جن کی تعداد ۲۴ سے زیادہ نہیں۔ صرف ۲۳ سال کے اندر وہ کیسے دنیا کی علمی امامت کے منصب پر فائز ہو گئے؟ تو سراغ یہ ملتا ہے کہ علم اور تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا اور بلا امتیاز و تخصیص معاشرہ کے ہر صنف اور ہر ممبر کو زیورِ علم سے آراستہ کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی مشن کا بنیادی حصہ تھا چنانچہ جب آپ صلعم یہ فرماتے ہیں کہ "بعثت معلما" (میں اللہ کی طرف سے معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) تو گویا آپ علم کی وراثت کو سب سے اعتبار اور تحصیلِ علم کو انسانی معاشرہ کی شاہ کلید بنا دیتے ہیں۔

انسانی تاریخ کے اوراق اُلٹ جائیے۔ شاید ہی آپ کو کوئی ایسا قائد مصلح یا پیغمبر نظر آئے جس نے جنگی قیدیوں کو علمی کام پہ مامور کیا ہو اور اُس کے علم پھیلانے کی بنا پر پاکبازوں سے جنگ کرنے جیسے بھیانک انسانی جرم کا فدیہ مان کر اُس کو آزاد کر دیا ہو مگر رسول کریم نے جنگ بدر کے مجرم قیدیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔

دنیا کے سارے مذاہب کا زور عبادت، ریاضت، مشقت اور اوراد و وظائف پر ہے مگر تعلیمات نبوی کی خصوصیت یہ ہے کہ ان سب کے مقابلہ میں علم کی فضیلت اور اہمیت کو محسوس کرایا گیا ہے۔ آنجناب صلعم نے فرمایا کہ! عبادت گزار پر عالم کی فضیلت دوسرے ستاروں پر چودھویں کے چاند جیسی ہے' (ابوداؤد، ترمذی)

دنیا کے دوسرے مذاہب نے علم کو مردوں کی میراث بنا کر پیش کیا ہے کیونکہ اُن کی نظر میں عورت کسب فضیلت اور کمال کی مستحق نہیں۔ مگر اسلام نے علم کی روشنی کو مرد و عورت ہر دو کے قلب و ذہن تک پہنچایا ہے۔ اور حصول علم میں مرد و عورت کی تخصیص کو تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ مرد و عورت دونوں پر علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! طَلَبُ العلم فریضۃ علیٰ کل مسلمٍ و مسلمۃٍ (ابن ماجہ، کتاب العلم) (ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و

عورت بحیثیت [illegible]

عہد نبوی صلعم کے تعلیمی نظام پر نظر ڈالئے۔ یہاں تعلیم کے مختلف طریقے اور وسیلے اختیار کئے گئے ہیں۔ اس میں مرد و عورت دونوں کو یکساں استفادہ کا موقع دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقے اپنی امت کی تعلیم و تربیت کے لئے اختیار فرمائے ان میں ابلاغ و ترسیل کے نقطہ نظر سے اہم یہ ہیں۔

۱۔ مسجد نبوی میں نمازوں کے بعد تعلیم و تلقین، اس میں مرد و عورت سبھی شریک ہوتے تھے۔

۲۔ جمعہ، عیدین اور حج کے خطبات کے ذریعہ عمومی تعلیم و تہذیب، اس میں بھی مرد و عورت سبھی شریک ہوتے تھے۔

۳۔ مجلس خصوصی جو مسجد نبوی یا دوسرے مقامات پر مردوں کے لئے ہوتی تھی۔

۴۔ ازواج مطہرات کی علمی مجلس جو خاص عورتوں کے لئے ہوتی تھی۔

۵۔ جنگ یا دوسرے ایسے اسفار جن میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک رہتیں وہاں بھی تعلیم کا موقع ملتا تھا۔

۶۔ روزمرہ کے مسائل جو مختلف [illegible] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے جاتے اور نبی اکرم صلعم ان کے تفصیل اور تشفی بخش جوابات عطا فرماتے۔

۷۔ عورتوں کی تعلیم کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی مجلسیں، یہ عورتوں کی درخواست پر خاص اوقات کے لئے مقرر کی جاتی تھیں۔

۸۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ازواج مطہرات کو خاص تعلیم و تربیت سے آراستہ فرمانا تاکہ وہ دوسری عورتوں کی تعلیم و تربیت میں مدد دے سکیں۔

۹۔ بیعت کے موقع پر [illegible] عورتوں سے [illegible] بیعت لیتے اور ان کو بنیادی ہدایات سے [illegible]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات [illegible]
[illegible] حضرت عبد اللہ بن عباس [illegible]

(عید کے موقع پر بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلے۔ آپ کو یہ خیال تھا کہ آپ کا خطاب عورتیں اچھی طرح نہ سن سکیں لہٰذا آپ نے از سرِ نو ان کو خطاب کیا اور ان کو صدقہ کا حکم دیا۔ عورتیں اپنے پازیب اور انگوٹھیاں صدقہ کرنے لگیں۔ اور بلال اپنے کپڑے میں ان صدقات کو سمیٹتے گئے۔

(بخاری، کتاب العلم، باب عظة الامام النساء)

روزمرہ کے پیش آنے والے مسائل میں عورتیں اپنی مشکلات لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتیں اور اپنے سوالات کا جواب حاصل کرتیں، عورتوں کے بعض سوالات ایسے بھی ہوتے جن میں براہِ راست اللہ تعالیٰ اپنی آیات نازل کر کے رہنمائی فرماتا۔ مثال کے طور پر خولہ بنت ثعلبہ نے اپنے شوہر اوس کی شکایت کی اور ان کے قصہ ظہار میں استفسار کیا تو جواب میں سورہ المجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن سے متعلقہ مسئلہ میں سارے مسلمانوں کی رہنمائی ہوئی۔

عورتوں کے بعض سوالات طبعی طور پر اُن کی نسوانی ضروریات اور مشکلات سے متعلق ہوتے مگر علم کی فرضیت کا احساس ان کی شرم و حیا پر حاوی ہوتا اور وہ نبی کریم سے سارے سوالات کرتیں۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت (انس بن مالک کی والدہ) ام سلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ حق بیان کرنے میں حیا نہیں کرتا تو کیا عورت کو اگر احتلام ہو تو اس پر غسل کرنا لازم ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر وہ پانی دیکھے، تو ام سلمہ نے اپنا چہرہ ڈھانک لیا اور پوچھا اے اللہ کے رسول کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں اگر ایسا نہ ہو تو اس سے بچے کی مشابہت کس طرح ہوتی ہے؟

(بخاری، کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم)

عہدِ نبوی کی عورتیں بالخصوص انصاری خواتین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر قسم کی بات پوچھنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتی تھیں۔ یہ کمال تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ آپ نے خواتین اور حضرات کو علم سے واقف کرایا اور علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض قرار دیا اور

اس سے شرم و حیا کی دولت بھی وابستہ ہوگئی۔ حضرت عائشہؓ انصار کی عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتی تھیں کہ "بہترین عورتیں انصار کی عورتیں ہیں۔ ان کو دین کا حاصل کرنے میں حیا رکاوٹ نہیں بنتی۔

خود حضرت عائشہؓ جب رسول کریمؐ سے کوئی بات سنتیں تو جب تک اس کو تفصیل نہ سمجھ لیتیں خاموش نہ ہوتیں۔ صحیح احادیث میں حضرت عائشہؓ کے استفسار کے بہت سے واقعات مذکور ہیں۔

تعلیمات نبویؐ کی وہ مجلسیں جہاں عورتیں پچھلے حصہ میں موجود ہوتیں، فطری طور پر مردوں کے غلبہ کی وجہ سے بہت سی باتوں کی تفصیل وضاحت اور تشریح کی محتاج رہتیں۔ ان کی خواہش ہوتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مردوں سے الگ ہو کر کوئی خاص وقت ہمارے لئے مقرر فرمائے جس میں ہم آپؐ سے پورے طور پر اطمینان سے دین کی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ بہ روایت حضرت ابوسعید خدریؓ عورتوں نے مل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی۔ آپ کے پاس مرد ہم پر سبقت لے جاتے ہیں اسلئے آپ اپنی طرف سے ایک دن ہمارے لئے مقرر فرما دیں چنانچہ آپ نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرمایا۔ آپ اس دن ان عورتوں سے ملاقات کرتے ان کو وعظ و نصیحت کرتے اور ان کو احکام عطا فرماتے۔

(بخاری، کتاب العلم، باب ھل یجعل للنساء یوم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازدواج مطہرات کی خصوصی تعلیم و تربیت فرماتے تھے۔ قرآن کریم نے بھی ازدواج مطہرات کی خصوصی تعلیم و تربیت پر زور دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عام عورتوں سے ممتاز قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ !

وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ وَ اَطِعْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ۔ وَ اذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَ الْحِکْمَۃِ ۔ (احزاب۔ ۳۳۔۳۴)

(ترجمہ): اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے گندگی دور کر دے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے اور یاد کرو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معمولات اور سیرت سلوک کی عملی تعلیم کے علاوہ بھی ازواج مطہرات کے تزکیہ و تربیت کے لئے بعض طریقے اختیار فرماتے مثلاً کبھی کبھی آپ رات کو ازواج مطہرات کو جگاتے اور ان کو رات کی عبادت اور آخرت کی فکر کی تعلیم دیتے۔ ایک مرتبہ آپ نے ازواج مطہرات کو یہ کہہ کر جگایا " اے حجروں والیو! اٹھو! بہت سی خوش لباس عورتیں قیامت میں برہنہ ہوں گی۔ (بخاری، کتاب العلم، باب العلم والعظہ باللیل) یعنی جو دنیا میں بظاہر لباس میں ہیں مگر ایمان و عمل صالح سے خالی ہیں وہ آخرت میں اللہ کے غضب میں ہوں گی۔ یہ تربیت اس لئے بھی ضروری تھی کہ ازواج مطہرات کو دوسری عورتوں کے لئے نمونہ اور معلمہ بننا تھا، علم کو پھیلانا اور آگے بڑھانا تھا۔

اسلام پر قائم رہنے اور اللہ کے فرمان کے مطابق زندگی گذارنے کے لئے رسول اللہ مرد و عورت دونوں سے بیعت لیا کرتے تھے۔ عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لیا کرتے تھے وہ قرآن میں اس طرح مذکور ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ - (الممتحنہ: ۱۲)

ترجمہ

بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے سامنے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے دعائے مغفرت کرو بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی آیت کی تفصیل کے مطابق عورتوں سے بیعت لیا کرتے تھے (بخاری، کتاب الاحکام)

حضرت ام عطیہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو انصار کی عورتوں کو ایک گھر میں جمع کیا پھر حضرت عمرؓ کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے رسولؐ کی جانب سے بیعت کریں جس کی تفصیل آیت میں گزری (تفسیر ابن کثیر ۴/۳۵۴)

مذکورہ طریقے وہ تھے جن میں خواتین کو براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ اور علم حاصل کرنے کا موقع ملتا۔ ان کے علاوہ صحابہ کرامؓ کو یہ حکم تھا کہ وہ اپنی بیویوں، بیٹیوں، باندیوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں۔ ان کو دینی احکام سے غافل اور اسلامی تعلیم سے جاہل نہ رہنے دیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کو دوہرا اجر ملے گا۔ ان میں ایک وہ شخص ہے جس کے پاس شب باشی کے لئے باندی تھی۔ اور اس نے اس کی اچھی تربیت کی اچھی تعلیم دی۔ پھر اسے آزاد کر کے شادی کر لی تو اسے دو اجر ملیں گے۔

(بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل امتہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم و تربیت کا اثر یہ ہوا کہ صحابہ نے اپنی باندیوں کو تعلیم دینی شروع کر دی۔ آپ نے لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ فرمائی۔ عرب کے معاشرہ میں لڑکیوں کا [illegible] اس معاشرہ کو تبدیل کرنے پر بہت زور دیا۔ یہ حدیث ابو سعید خدریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی، ان کو ادب سکھایا، ان پر رحم کیا اور ان سے [illegible]

کیونکہ ان کے لئے جنت ہے۔ (مسند احمد ۱/۹۷)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ لڑکوں کی تعلیم و تربیت اور ان سے حسن سلوک پر بھی یقیناً اجر ہے۔ مگر آپؐ نے لڑکیوں کی تادیب و تربیت پر جنت کی بشارت سنائی۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ ایک لڑکے کی تعلیم محض ایک فرد کی تعلیم ہے اور ایک لڑکی کی تعلیم ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک خاندان کی تعلیم ہے کیونکہ بچوں کی تعلیم و تربیت ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے۔ ماں اگر جاہل ہو تو بچے پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔

اس انقلابی تعلیم و تربیت کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ عورتیں اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تکمیل اور اسلامی علوم کی اشاعت و ترویج میں برابر کا کردار ادا کرنے لگیں، اسلامی معاشرہ تیزی سے ترقی پر گامزن ہوا، اور دنیا کی علمی امامت جس سے عزت، اقتدار اور احترام سبھی کچھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھ آگئی۔ عورتوں کا علم و فہم اس درجہ قابل رشک اور معتبر ہوگیا کہ بسا اوقات علماء، امراء اور خلفاء کو مشوروں سے نوازتیں۔ ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتیں اور ان کو راہ عمل سمجھاتیں۔ مشکلات میں ان کی مدد کرتیں اور ان کو اجتماعی معاملات سے نبٹنے میں اپنا تعاون دیتیں۔ مثال کے طور پر حضرت عمر فاروقؓ اپنے معمول کے مطابق ایک رات گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر سے کسی خاتون کی آواز سنائی دی وہ اپنے شوہر کی جدائی میں یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

تطاول هذا الليل واسود جانبه ● وارقني ان لا خليل الاعبه

فوالله لولا الله تحت راقبه ● لحرك من هذا السرير جوانبه

یعنی رات طویل ہوگئی اور اس کا کنارہ سیاہ ہوگیا

[illegible] میرا کوئی دوست نہیں ہے [illegible]

[illegible] قسم اللہ کی اگر اللہ کا خوف نہ ہوتا [illegible]

[illegible] اس چارپائی کے پائے حرکت میں آجاتے [illegible]

[illegible]

گئے اور پوچھا ایک عورت اپنے شوہر کی جدائی کتنے دنوں تک برداشت کر سکتی
انہوں نے جواب دیا۔ چار یا چھ ماہ، تب حضرت عمر نے فیصلہ کیا کہ میں کسی
کو اس سے زیادہ نہیں روکوں گا۔ (طبقات الشافعیہ ۱/۲۸۴)

حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی زوجہ رسولؐ حضرت عائشہؓ سے نہ صرف
دین کی تعلیم حاصل کرنے آتے بلکہ وہ دینی، سماجی اور سیاسی معاملات میں صحابہ
کی رہنمائی فرماتیں۔ بہت سے جلیل القدر صحابہ کی علمی دینی اور سماجی اصلاحات بھی انہوں
نے کیں غلط فہمیاں جو علمی لحاظ سے نقصان دہ تھیں ان کو دور کرنے کا سہرا حضرت عائشہ کے سر
ہے۔ حضرت عائشہؓ کی علمی و دینی اصلاحات کا تذکرہ مختلف کتب حدیث میں
بکھرا ہوا ہے مگر علامہ بدرالدین زرکشی نے "الاجابہ لایراد ما استدرکتہ
علی الصحابہ" ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم نبوی
کو کس قدر علم و فہم میں مستحکم بنا دیا تھا۔ کہ جن مسائل کی کنہ تک صحابہ کرام نہ پہنچ سکے
حضرت عائشہ کی رہنمائی کام آئی۔

حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو
مشکل معلوم ہوتی تو ہم حضرت عائشہؓ سے پوچھتے اور ان کو اس کا علم ہوتا۔
مالک تعلیق ص ۹۵۶) اسی طرح دوسری صحابیات کی عقل و فہم اور اصابت
اصحاب کرام کے استفادہ کا تذکرہ ملتا ہے، ازواج نبی کے علاوہ شفا بنت عبداللہ
سے حضرت عمر مشورہ لیتے اور عمرو بنت فاطمہ جن کے گھر حضرت عمر کی شہادت
خلیفہ کے انتخاب کے لئے مجلس شوریٰ بیٹھی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

غرضیکہ عہد نبوی میں خواتین کی تعلیم و تربیت کا انتظام مردوں سے کچھ کم نہ
تھا اور تعلیم کے معیار و مقدار میں کوئی کمی نہیں برتی گئی، اس زمانہ میں باقاعدہ مدرسہ کا
مردوں کیلئے کوئی مدرسہ قائم کیا جاتا تو [illegible] عورتوں کیلئے بھی الگ مدرسہ قائم
[illegible]

رون سمتھ
مترجم: محمد شاہد ندوی

نماز میں مساوات کے منظر نے مجھے مسلمان بنا دیا

امریکہ میں ٹیلی ویژن ڈائریکٹر نے اسلام قبول کر لیا

امریکہ کے صوبہ "کنٹاکی" کے ٹیلی ویژن ڈائریکٹر "رون سمیث" کو اسلامی مساوات کے طریقۂ نماز اور اس کے نظام مساوات نے اسلام کی طرف کھینچ لیا۔

وہ کہتے ہیں کہ میری نشو ونما اور پرورش خالص عیسائیت کے ماحول میں ہوئی۔ چنانچہ جب میں نے شعور آگہی کی آنکھیں کھولیں اور کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو برابر میرے ذہن میں یہ خیال ابھرتا کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور کائنات عالم کا خالق کون ہے؟ بسا اوقات اس تصور میں میری راتوں کی نیند حرام ہو جاتی اور برابر مجھے مذکورہ سوالات کے جوابات کی تلاش و فکر دامن گیر رہتی۔

وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے بارے میں میری معلومات کوئی زیادہ نہیں تھیں۔ بس اتنا جانتا تھا کہ مسلمان شب و روز میں پانچ بار نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی نماز اور دین اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت محمد مصطفیٰ [illegible]

خشوع اور اطمینان سے تمام نمازیوں کے ساتھ باجماعت نماز پڑھتے دیکھا۔ اس جیسا منظر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میرے دل میں یہ بات جاگزیں ہوگئی کہ دینِ اسلام میں چھوٹے بڑے اور غریب و امیر کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔

میری بیوی چونکہ ایک پاکستانی خاتون تھیں تو ان کے ذریعہ سے اور دیگر مسلمانوں سے تعلق کا نتیجہ یہ ہے مجھے اسلام کو اچھی طرح سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا کہ اسلام صلہ رحمی، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، عدل و انصاف اور بھلائی کرنے کی تاکید کرتا ہے یہ صرف مذہب اسلام کی خصوصیت اور اس کا منفرد امتیاز ہے جس سے دنیا کے دیگر ادیان و مذاہب یکسر خالی ہیں۔ جب میں نے امریکہ کے صوبہ "کنتاکی" میں اپنے اسلام قبول کر لینے کا اعلان کیا اور اس نعمتِ عظمیٰ کے ملنے پر اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے تاریکی اور گمراہی سے نکال کر روشنی کی طرف رہنمائی فرمائی اور ہدایت سے نوازا۔ (من الظلمت الی النور) تو اس موقع پر میرے خاندان کے لوگوں نے باوجود اس کے کہ وہ عقائد اور مذہب میں مجھ سے مختلف تھے میرا بھرپور تعاون کیا۔ جبکہ عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص مذہب تبدیل کرتا ہے تو اس کے گھر کے لوگ اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ اس کو میں اپنے لئے نصرتِ الٰہی اور غیبی مدد تصور کرتا ہوں۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میری زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلی آگئی ہے اور میں حرام و ناجائز چیزوں سے اجتناب کرتا ہوں، حلال و جائز چیزوں کو اختیار کرتا ہوں اور نماز کا وقت آتے ہی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد چلا جاتا ہوں۔ میں اپنے مالک و خالق خاوند قدوس کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں کہ اس نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور اسلام کی خدمت کے لئے مجھے قبول کر لیا۔

"روان نعمت" کی جہاں تک ملی اور دعوتی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو وہ مسلمان ہونے کے بعد ملی و جرن کی خبروں کے ذریعہ ملی اصلاحی، دعوتی اور تبلیغ

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

چنڈی گڑھ میں اسلامی کتب کے تعارف کا
حوصلہ افزا تجربہ

چنڈی گڑھ۔ پنجاب اور ہریانہ کی راجدھانی چنڈی گڑھ میں ہر سال تین روز کا Rose Festval منایا جاتا ہے یہاں سترہ ایکڑ میں خاکر حسین روز گارڈن ہے جو کافی بڑا ہے اور گلاب کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں گلاب کے پھول کے مقابلے اور کچھ کلچرل پروگرام ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک تماشہ مارکیٹ کے نام پر لگائی جاتی ہے اس مارکیٹ میں میوہ و تفریح کا سامان فروخت ہوتا ہے

اس سال ۲۴ واں روز فیسٹیول تھا اس میں تقریباً تین سو اسٹال لگائے گئے تھے جن میں کچھ اسٹال کتابوں کے بھی تھے ایک تھا الہ کتاب گھر دوسرا آرٹ ارام جی اور تیسرا اسٹال اسلامی کتب کا پہلا تھا۔

یہ اسٹال پھر سے نہ تحریک سنگھم اور اسلام دلّن گیندر ناکر ڈاکٹر منجانب کتابوں سے لگایا گیا تھا۔ یکم مارچ تا ۳ مارچ ۹۴ء روز فیسٹیول میں اسٹال لگایا گیا تھا۔ اسٹال کا سائز ۱۵ × ۱۵ تھا اسٹال پر ہندی، انگریزی، اردو اور پنجابی چار زبانوں میں کتب دستیاب تھیں۔ اسٹال کے اوقات صبح ۱۰ بجے سے رات ۹ بجے تک تھے ان تین دنوں میں

اسٹال پر تقریباً پانچ ہزار افراد تشریف لائے جن میں ۹۹ فیصد غیر مسلم تھے۔ آنے والے حضرات کو ایک ایک فولڈر مفت دیا گیا اور اگر کسی نے خاص دلچسپی سے دیکھا اور مانگا تو اس کو پمفلٹ دے دیا گیا۔ اس طرح کل ۵۰۰۰ فولڈرس تقسیم ہوئے۔

سب سے زیادہ شارٹ کٹ ٹو اللہ کتاب فروخت ہوئی اس کے بعد ہندی قرآن مجید اور انگریزی قرآن مجید یعنی ۱۲ عدد اور باقی کتب بھی تھوڑی تعداد میں فروخت ہوئیں۔ تقریباً پانچ سو روپے کی کتب مفت تقسیم کی گئیں۔ اسٹال کا کل خرچ پانچ ہزار پانچ سو روپے ہوا۔

چنڈی گڑھ کے روز فیسٹیول میں اسلامی کتابوں کے تعارف کا یہ تجربہ کامیاب رہا۔ یہ شہر پنجاب اور ہریانہ دونوں کی راجدھانی ہے۔ ان دونوں ریاستوں کے افراد اس فیسٹیول میں آئے تھے اور انہوں نے اسلامی کتابوں میں دلچسپی ظاہر کی۔

(رپورٹ: ناصر الدین)

(دعوت ۱۶ مارچ ۱۹۹۶ء)

(بقیہ صفحہ ۲۴۳)

اسلامی پروگرام نشر کرتے ہیں تاکہ امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خصوصیات لوگ جان سکیں۔ کیونکہ امریکہ کی اکثر آبادی اسلام کی سچی تصویر اور مسلمانوں کے صحیح احوال و کوائف سے بالکل ناواقف ہیں اور اس بات سے وہ بالکل نابلد ہیں کہ اسلام کی عظمت اور اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ ان دعوتی پروگراموں کے ذریعہ دین اسلام کی طرف راغب بھی ہوں گے۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اپنا فرمانبردار بندہ بنائے اور اپنی رضامندی سے نوازے اور اسلام کا داعی بنائے۔ (آمین) ●●

(ماخوذ: المسلمون جدہ)

(ماخوذ از تعمیر حیات ۲۵ مئی ۱۹۹۶ء)

حق گوئی و بے باکی

رستم نے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ اپنا کوئی نمائندہ بھیج دیں، جس سے یہ معلوم کیا جائے کہ آپکے اس حملہ کا مقصد کیا ہے؟ یہ واقعہ قادسیہ سے پہلے کا ہے، حضرت سعدؓ نے حضرت ربعی بن عامرؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر فارس کے سپہ سالار اعلیٰ (کمانڈران چیف) رستم کے پاس بھیج دیا، حضرت ربعیؓ وہاں پہنچ گئے۔ رستم نے اپنا دربار نہایت شاندار طریقہ سے سجا رکھا تھا، اعلیٰ درجہ کی نقشین قالینیں بچھی ہوئی تھیں جن پر سونے اور موتیوں کی مینا کاری تھی، ہر طرف ہیرے، موتی اور لعل و یاقوت کی چمک دمک تھی، رستم کے سر پر جواہرات کا قیمتی تاج تھا، حضرت ربعیؓ وہاں پہنچتے ہیں جسم پر ایک بھدے قسم کا جھونپے ہاتھ میں تلوار اور ڈھال ایک معمولی سا چھوٹے قد کا گھوڑا جس پر سوار ہیں، اور اسی پر سوار قصر شاہی میں داخل ہو گئے نظریں نہ منقش در و دیوار پر ہیں اور نہ ہیرے جواہرات کی آرائش و نمائش پر آگے بڑھ کر گھوڑے سے اترتے ہیں اور اس کو باندھنے کے لئے کوئی کھونٹا نہیں ملا تو قصر شاہی کے ایک گاؤ تکیے اس کو باندھ دیتے ہیں اور اس شان استغنا سے بڑھتے ہیں کہ زرہ جسم پر ہے خود سر پر، اور تلوار ہاتھ میں۔

دربار کے کسی چوبدار نے کہا : آگے بڑھنے سے پہلے اپنے اسلحہ اتار کر یہاں رکھ دو۔

حضرت ربعیؓ نے کہا: میں (اپنے کسی کام سے) نہیں آیا ہوں، میں تم لوگوں کے بلا
آیا ہوں، جی چاہے مجھے اس طرح جانے دو اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو میں لوٹ جاتا ہوں
رستم نے کہا: اس کو آنے دو، آپ آگے بڑھے، ہاتھ میں تلوار تھی جو چھڑی کا کا
دے رہی تھی، اس پر ٹیک لگاتے ہوئے چلے تو فرش قالین جگہ جگہ سے ادھڑ گئی

رستم نے پوچھا! یہاں تم کس کام سے آئے ہو؟

جواب دیا :

ہم اٹھے ہیں کہ ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی پر لگا
دنیا کی تنگی سے ان کو نکال کر اس کی وسعت عطا کریں، مذاہب کے پیدا کردہ مظالم سے
اسلام کے عدل کا راستہ دکھائیں، اللہ نے ہم کو مامور کیا ہے کہ اس کی مخلوق کا رخ اللہ کی
طرف پھیر دیں، جس کو یہ راستہ پسند ہو اور اسکو قبول کرے تو اس سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں،
لوٹ جائیں گے اور جو انکار کرے گا اس سے ہم اس وقت تک برسرپیکار رہیں گے جب تک
وعدہ پورا نہ ہو جائے۔

پوچھا گیا : اللہ کا کیا وعدہ ہے۔

فرمایا: انکار کرنے والوں سے جنگ میں جو مر جائے گا اس کے لیے جنت، اور جو زندہ
اس کے لیے کامیابی و کامرانی۔ (فاروق)

جناب صلاح الدین نیّر کے مجموعۂ کلام

"خوشبو کا سفر"

کا

سرسری جائزہ

"ادب کے مجاہد" انشائیہ کی قسطِ اول کے شائع ہوتے ہی ہنگامہ کھڑا ہوا۔ شعر و ادب کے قلم کے پاسبانوں نے "قلم کی جرأت" کو اپنے مغلظات سے بھرپور منظوم "دشنام ناموں" سے پامال کیا۔ حالانکہ انشائیہ ایک AERIAL SURVEY تھا۔ "شائستہ" اور "مہذب" شاعروں نے اخلاق و تہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا اور "فنی شریف" شاعری کے دامن کو اپنی غلاظتِ فکر سے داغدار کر دیا۔ اور اُن "دشنام ناموں" کے ذریعہ اپنا اصل چہرہ خود ہی لوگوں کو دکھلا دیا۔ جن کے نام "دشنام ناموں" کی زیراکس کاپیاں تھیلے [illegible] سے اُن "شریف زادوں" نے بھجوایا اور اس بات کا اعلان کر دیا کہ "اُن کا [illegible] زور چلتا ہے گالیوں پر"۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کار اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ادب کے مجاہد کی قسطِ اول اَلحق مبنی بر حق ہے۔ [illegible] "دشنام ناموں" نے یہ ظاہر کر دیا کہ سنجیدہ شریفانہ طرزِ تحریر کی صلاحیتوں اور لیاقتوں سے وہ یکسر محروم ہیں۔

راقم الحروف نے قسطِ اول کے بعد ہمارے شہرِ ادب کے "باکمالوں" کی تخلیقات پر اردو ادب کے ایک قاری کی حیثیت سے اظہارِ خیال کے سلسلہ کو جاری

لکھا ہے۔ اس سلسلہ کی ضرورت کے لئے بھی حق کی حد ہے۔ جناب صلاح الدین نیر نے انھوں نے "خوشبو کا سفر" میں یہ دعوت دی کہ "جب کسی تخلیق کار کا حسن احساس اور آواز کے توسط سے کاغذی پیرہن اختیار کر لیتا ہے تو اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی تخلیق شعر کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے یہ جاننا قارئین کا کام ہے"۔ اردو کے ایک کلاسیکی کی حیثیت سے حیدرآباد کے شاعر جناب صلاح الدین نیر کے پانچویں مجموعہ کلام "خوشبو کا سفر" کا ایک سرسری جائزہ لیا جا رہا ہے۔ سرسری اسلئے کہ فنی نزاکتوں کا احاطہ ماہرین عروض کا کام ہے۔

اس کے ما سواء اس سلسلہ کا آغاز جناب صلاح الدین نیر سے کرنے کی اہم وجہ یہ ہے کہ محترم عابد علی خان صاحب (اللہ پاک ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین) نے "خوشبو کا سفر" میں "ایک حساس شاعر" کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے کہ "نیر حیدرآباد کے ہر مشاعرے کے نہ صرف لازمی شاعر ہیں بلکہ مشاعروں میں پہلے پڑھنے والے بھی وہی ہیں"۔ اس لحاظ سے اس سلسلہ کی اولیت کا سہرا ان کے سر پر موزوں ہے۔ علاوہ ازیں پیش لفظ میں مشہور نقاد و شاعر ڈاکٹر مغنی تبسم نے لکھا ہے کہ "صلاح الدین نیر قابل رشک حد تک پُرگو اور زود گو شاعر ہیں"۔ اس سلسلہ کا آغاز ظاہر ہے کہ ایسے ہی شاعر سے ہونا چاہیئے جن کے تصانیف کی تعداد نو سے بڑھ کر ہے (یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی تصنیفات کے کھاتے میں مرتب کردہ دو شعری مجموعوں اور دو دیگر زبانوں میں منظوم دوسروں کے ترجمہ کو بھی شامل کرتے ہیں)

کسی کے ذہن میں یہ خیال اُبھر سکتا ہے کہ آخر پانچویں مجموعہ کلام کا سرسری مطالعہ کیوں سپرد قلم کیا جا رہا ہے تو عرض ہے کہ کسی بھی شاعر کے ابتدائی کلام میں ممکن اور عین ممکن ہے کہ فنی یا فکری گہرائی و گیرائی یا گرفت مضبوط نہ ہو۔ جیسے جیسے فکری اور فنی اعتبار سے مجموعہ کلام مسلسل شائع کرے گا تو کچھ نہ کچھ وزن و کیفیت پیدا ہوگی۔ اس سلسلہ میں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ پیش لفظ میں ڈاکٹر مغنی تبسم نے

اظہار فرمایا ہے کہ "نیر زود گو شاعر ہیں" پتہ نہیں کہ ہمارے محترم نقاد نے "زود گوئی" کو شاعری کی تعریف کے لئے استعمال کیا ہے یا پھر مجموعۂ کلام "خوشبو کا سفر" کے مطالعہ کے بعد انہوں نے نہایت لطیف انداز میں اظہار خیال کیا ہے جس کی معنویت اور تہہ داری کا لطف اہل نظر بخوبی کر سکتے ہیں۔ نیر صاحب کے پانچویں مجموعہ کلام کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ راقم الحروف نقد و نظر سے جناب نیر کے کلام کا تجزیہ نہیں کر رہا ہے بلکہ محض اردو کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے محسوسات کو قلمبند کر رہا ہے

پانچویں مجموعہ کلام "خوشبو کا سفر" کا آغاز کرتے ہوئے کہ بقول جناب نیر "اس میں کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے"۔ پاکستان کے ایک کالم نویس "خامہ بگوش" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے مجھے یہ احساس ہے کہ قارئین بھی اس سے متفق ہوں گے کہ "ہمارے سامنے کئی مثالیں ایسی ہیں کہ کسی شاعر کے بارے میں اچھی رائے اس وقت خراب ہو گئی جب اس کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا۔ دوسرے مجموعے کی اشاعت پر مزید خراب ہو گئی۔ تیسرے مجموعہ کے چھپنے کے بعد خرابی بھی خوابیدہ سی شاعری منتقل ہو گئی"۔ یہ تو خیر خامہ بگوش کا تبصرہ اور اپنے مطالعہ کے بعد کا احساس ہے۔ اس کی صداقت کا اعتراف جناب نیر کے پانچویں مجموعہ کلام کے مطالعہ کے بعد ہوتا ہے۔

رگ گل سے بلبل کے پر کھو بھی باندھے گئے۔ نیر صاحب کی سادہ لوحی ملاحظہ فرمائیے کہ

اس فصل گل کا ایسا ہے کچھ ماجرا سنیں

پھولوں کی پتیوں سے بھی کٹنے لگا ہیں میں

پھولوں کی پتیوں سے کٹنے والے کے ذہن میں بغیر تری نیر کے ماخوذ اقبال کا یہ شعر نہ رہا ہو گا

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے [illegible]

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

میں اپنے تجاہل کی بے ادبی کا قائل ہو رہا ہوں کہ بساط بھر کوشش کے باوجود بھی اس مقطع کی معنویت یا معنویت (اگر آپ کہنا چاہیں) یا پھر شاعر کے مشاہدہ کی باریک بینی خلاف حقیقت ہے۔ آپ شعر کا پڑھنے والا یقیناً اپنے ذوقِ شعر کو جراحت کا سامان چاہے گا۔ لیکن نیر صاحب نے مزید ظلم یوں ڈھایا۔ مقطع میں فرماتے ہیں۔

جب تاج ہی نہیں ہے تو پھر پاس کس لئے
نیر خود اپنے گھر سے نکالا گیا ہوں میں

مقطع کی دو لختگی کو اگر نظر انداز کر بھی دیا جائے تو شاعر کے پاس اپنے گھر سے نکالے جانے کا کیا جواز ہے؟ اس پردہ پوشی کے لئے شاعر کو تہنیت دیجئے۔

جناب نیر کا رختِ شعر "خوشبو کا سفر" میں اگر کچھ ہے تو "اہمال" ہے۔

ایک اور مطلع ملاحظہ فرمائیے
میت کو مری شب بھر اس طرح سجا رکھنا
تم میرے سرہانے اک یادوں کا دیا رکھنا

مطلع فکر کی کجی اور غیر واقعیت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

یہ شعر دیکھئے اور آپ خود نصف فرمائیے گا کہ آپ کے ذہن پہ کیا کچھ گزر رہا ہے

چھن گیا ہم سے "آدھی نیند" ہمسے کا سر یک
دفعتاً زندگی پھر مرگِ مفاجات ہوئی

مرگِ مفاجات دفعتاً ہی ہوتی ہے اور اس کے بعد مصرعِ اول کی کیفیت مہمل ہے۔
تضاد بیانی میں شاعری کی اوجِ فکر ملاحظہ کیجئے

مدتیں
آئینہ میرے ہاتھوں سے پھر چھوٹ گیا تھا
جب پہلے پہل آپ کو محسوس کیا تھا۔

غزل کے مطلع کے مصرعِ اول میں لفظ "پھر" پر غور فرماتے ہوئے مصرعِ ثانی کے "پہلے پہل" پر توجہ کیجئے اور شاعر کی ہوشمندی پر عش عش فرمائیے۔

[illegible] جناب نیر کی شاعرانہ فکر کے [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] کی [illegible] سے [illegible] فرمائیے۔

جو گرد سے ہیں بہار سے [illegible]
کسی کے جو بھی لگے پاؤں اب بھی زخمی ہیں

[illegible] سکون قلب کی خاطر جو تھک کے جینا تھا
کسی کے بن کے لگے پاؤں دھو کے پینا تھا

[illegible] تنگ بندیوں کو اگر آپ کا خلاق شعر مانتا ہے [illegible] اس میں کوئی بھی اور کسی بھی قسم
[illegible] معنی بغیر کسی کراہیت کے آپ نکال سکتے ہیں تو پھر یقیناً جناب نیر خوش فکر
[illegible] ہو سکتے ہیں۔ نیر صاحب کی فکر شعر میں جدیدیت جب شامل ہو جاتی ہے تو [illegible]
[illegible] کی تلاش میں [illegible] کوئی اپنی منزل پہ نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

کبھی تو آپ کی آنکھوں میں آئیں گے آنسو
اس انتظار میں خالی گلاس رہتا ہے

[illegible] کی آنکھوں میں آنسو اور شاعر [illegible] بیان کا "خالی گلاس" آپ کے ذوق [illegible]
[illegible] نظم [illegible] چاہیے [illegible] شاعر کو کوئی احساس [illegible]
شاعر نیر کی فکر عالیہ نے [illegible] آنکھیں [illegible]
[illegible] آنکھ کہیں [illegible] نظر آئے۔ [illegible]

[illegible] حال [illegible] یاد [illegible]
[illegible] پیغام [illegible] آنکھوں کا [illegible]

[illegible]
[illegible] خیال شاعری [illegible]

[illegible]
[illegible]

دیکھا آپ نے کمالِ تحیر۔ طرفہ تماشا معروضات کا معرعہ اولیٰ سے کیا تعلق ہے۔ اس دو لخت مطلع پر داد شاعر کا حق ہے اور دیکھیں غالب نے تعلّی فیصلہ صادر کیا ہے جس پر ہر صاحب کچھ صاد کرتے گا کہ۔ یک سد [illegible] جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شاعر خوش ہوا جناب تیر کی آسیائے فکر میں کویتا کی کومتا کس وجہ پس رہا ہے ملاحظہ کیجئے۔

مری کویتا مگر تو ہی میرا سپنا تھا
ورق ورق پہ مرے دل کا ٹکڑا چھپنا تھا
پھر میری زندگی میں تم آئے تو ہو مگر
میرے لئے وہ پہلی کویتا تو مرگئی

جناب تیر کے پاس مجموعۂ کلام "خوشبو کا سفر" کا مطالعہ کرتے ہوئے مشہور کالم نویس "خامہ بگوش" کا یہ جملہ ذہن و فکر کے صدموں کو کم کرتا ہے کہ "بعض تحریریں کتابی صورت میں شائع ہونے کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔ ہم نے بہت سے ایسے شاعر دیکھے ہیں جو زندگی بھر مشاعرے پڑھتے (لوٹتے) رہیں اور جب اُن کا دیوان شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود لُٹ گئے ہیں اور ایسے بے شمار دیوانوں کا ادب کی تاریخ میں تو نہیں کاغذ کے ضیاع کی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے۔"

راقم الحروف کو تعجب اور حیرت اس قابلیت پر ہے کہ اُردو کے مشہور و معروف شاعر اور نقاد پروفیسر مغنی تبسم نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "تیر کی شاعری کا بڑا حصہ حُزن و ملال کے احساسات سے مملو ہے۔ ان اشعار میں ایک سوز و گداز ہے جس کا نتیجہ عمِ طلب گمشدگی ہوا مجموعہ سے ملتا ہے (اُردو کے چند بڑے اشعار یہاں صرف دو شعر پیش ہیں)۔

خدا سے [illegible]
[illegible]

مجھ سے مل کر ایک دن جب وہ جدا ہو جائے گا
کون جانے شہر میں اُس روز کیا ہو جائے گا

پروفیسر مغنی تبسم ہیں جنھوں نے فانی پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر ادبی دُنیا کو دیا تھا۔ مندرجہ بالا اشعار یا پیش لفظ میں دیے گئے اشعار میں کیا ہمارے کو حزن و ملال، سوز و گداز، کی کیفیت ملتی ہے۔ پتہ نہیں پروفیسر مغنی تبسم کا اشعار کی آنچ میں کیسے اور کیونکر پگھلا۔ شعر و حکمت کی خدمت یا مروت نے اس اظہار پر ممکن ہے کہ پروفیسر صاحب کو مجبور کیا ہو۔

اُردو شاعری میں "آنکھوں" کے متعلق اِس قدر خوبصورت انداز ت کو پیش کیا گیا ہے کہ اِس پر مستقل عنوان کے تحت ایک مقالہ لکھا جا سکتا جناب نیر کے تخیل میں آنکھ دیکھئے اور اپنی آنکھیں بند کر کے گزر جائیے۔ نیر کی شاعری ہے جس میں آپ کو ایسے سینکڑوں شعر ملیں گے

آپ کی بکھری ہوئی آنکھوں میں نفرت ہے کہ پیار
جھوٹ سچ جو بھی ہے آ کر سرِ منبر کہنا

"آنکھیں" اور پھر "سرِ منبر" آنے کی دعوت آپ کو یقینی شاعر کو ینے پر مجبور کر رہی ہوگی۔

"پھولوں کی چادر" نیر صاحب کے شاعرانہ ذہن میں کیا اثر مرتب کر رہی فرمائیے

بکھرے بکھرے سے ہیں کیوں پھولوں کی چادر کی طرح
گفتگو آپ سے کب ہوگی، گلِ تر کی طرح

در [illegible] صرف [illegible] یہ جملہ [illegible] نیر صاحب

کی خوش [illegible] نے اِس تشبیہ کے ذریعہ معشوق کا سراپا کھینچا ہے اُسے شاعری سمجھا جائے یا خارِ گلشن کہا جائے۔ بکھرے بکھرے بال تو ہو سکتے ہیں۔ شاعر کے ذہن میں نہ جانے کونسا خیال کلبلا رہا تھا کہ پھولوں کی چادر سے اپنے معشوق کو گُلِ تر چھونے اور گفتگو کرنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ جناب نیر ہی اِس اہل خیال کی تشریح کر سکتے ہیں جناب نیّر کے ذیل کے مصرعہ اوّلیٰ کی تعریف تو یقینی ہر صاحب ذوق کرے گا کہ

پھر میں سو جاؤں گا تنہائی کی چادر اوڑھ کر

لیکن جب مصرعہ ثانی پڑھے گا تو شاعر کی فکر کا ماتم کرے گا۔ مصرعہ ثانی میں شاعر نے کہا کہ سایہ ابرِ رواں جب سائباں ہو جائے گا۔ ' ابرِ رواں کا سائباں ہونا ' اُستاد شاعر نیر کی " علمیت " اور شاعرانہ عظمت کا عکاس ہے۔

جناب نیّر کی " شاعرانہ فنکاری " اور " نازک خیالی " نے شعریت کو کس حد مجروح کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

چمن سے نہ اتنے کبھی پھول چنتا
کلائی اگر تیری پھیروں کی ہوتی

قارئین محترم اِس شعر کی تشریح مفہوم اور مطلب کے لئے آپ تمام کو نیّر صاحب سے رجوع ہونا ہوگا۔

میں جناب نیّر کا شکر گزار رہوں گا اگر وہ قارئین کے لئے اس مضمون کا سنجیدہ اور شریفانہ پیرایہ میں تشفی بخش جواب دیں اور " خار گلشن " کے اس خیال کی تردید فرمائیں کہ " انا اور خود پرستی انسانی دماغ کی دشمن ہیں تو جہاں یہاں معاملہ ایک شاعر کا ہے اور شاعر کے دماغ میں یہی کچھ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ کسی دوسری چیز کی گنجائش نہیں رہتی " ●●

(باقی آئندہ)

انشائیہ ہجر کا سفر جہاں سے گلستاں تک شاداب کے آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے

۔ مرزا بیگ ۔ بی ایس سی' ایم اے' بی ایڈ
رچ اسکالر ۔ ممبئی یونیورسٹی

منشی پریم چند اور کردار نگاری

جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط جمایا اور سارا ملک غلامی اور زنجیروں میں سسکنے لگا ایسے وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ تسلط اور ظلم و جبر نے آواز اٹھائی جائے اور جذبہ آزادی ہر دل کی دھڑکن بن جائے۔ اہل قلم نے مد آزادی میں شروع سے حصہ لیا۔ گو اس عہد میں بیوروکریسی نے ہماری اخلاقی اور روحانی قدروں کو اس طرح کچل کر رکھ دیا تھا کہ ہمارے حوصلے پست سرد' بازو شل اور پاؤں معطل ہو گئے تھے۔ دل امنگوں' جوش و خروش س پڑ گئی تھی۔ ایسے حالات میں ہمارا افسانوی ادب اہم رول ادا کرتا ہے سے نفرت اور آزادی کی ایک بے چین آرزو نے فنکاروں سے ایسے موثر حوائی جس میں آزادی کے اسی شدید جذبے کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ زادی کے فروغ' اشاعت اور کامیابی میں ہمارے اہل قلم کا زبردست ہے۔ رائے عامہ کی تربیت قومی اور ملی جذبات کو ابھارنے میں ہمارے نے بڑاں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان لوگوں نے قلم: کا میابا

ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ احتجاج کیا۔

پریم چند نے خصوصیت سے سماجی اخلاقی اور روحانی قدروں کو جلا بخشنے کی کامیاب کوشش کی۔ اِن موضوعات پر قلم اٹھایا۔ موضوعات کے ساتھ انصاف ہی نہیں کیا بلکہ کمال معراج تک پہونچایا۔

پریم چند کی کامیابی دراصل اُن کی کردار نگاری میں پنہاں ہیں۔ کہانی کی موثریت کا دارو مدار مربوط پلاٹ پر مبنی ہوتا ہے تو دوسری طرف کردار وہ اہم جز ہے جو پلاٹ میں رنگ بھرتا ہے اور کردار انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے مستعار لیا جاتا ہے۔ افسانوی ادب میں کردار نگاری ہی وہ اہم جز ہے جس پر فنکار اپنا تمام تر زورِ قلم صرف کرتا ہے۔ یہ فنکار کے لئے انتہائی اہم وعرق ریزی کا کام ہے۔ افسانوی ادب میں کردار نگاری کی اہمیت کے پیشِ نظر مشہور مفکر جیمز لیو یوں رقم طراز ہے۔

"افسانہ کسی ایک کردار کی زندگی کے سب سے اہم موقع کو ڈرامائی صورت میں مختصر طور پر پیش کرنے کا نام ہے۔"

جیمز لیو نے جہاں انتہائی جامع انداز میں افسانہ کی تعاریف مرتب کی وہاں کردار نگاری کی اہمیت کو بھی ظاہر کیا۔ افسانہ کی ایک مخصوص تخیلی دُنیا ہوتی ہے۔ جس میں کردار نگاری کے ذریعہ اُس دُنیا کے لوگوں میں رکھ رکھاؤ سوچ و فکر کا امتیاز پیدا کر دیا جاتا ہے جو اُن کی پہچان بن جاتی ہے

فن کار جب کسی واقعہ سے متاثر ہوتا ہے تو اظہار کے لئے ذریعہ کا متلاشی ہوتا ہے۔ افسانہ نگار واقعہ کے اظہار کے لئے اپنے افسانہ میں جو کردار ڈھالتا ہے وہ ٹھیک اُسی طرح ہوتے ہیں جو اُس کی مقصد آوری کا ذریعہ بن سکے نہ صرف ذریعہ بلکہ وہ اِتنے مکمل ہو کہ ہر لحاظ سے جیتے جاگتے انسان معلوم ہوں۔

منشی پریم چند کی کردار نگاری پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ بات دُہراتا چلوں کہ پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے ہوا۔ پہلا افسانہ "دُنیا کا

سب سے انمول رتن ؟ ۱۹۰۷ء میں نواب رائے کے فرضی نام سے چھپا۔ ۱۹۰۸ء میں "سوزِ وطن" اور اس کے بعد منشی جی کا ایک طویل ادبی سفر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اُردو میں ادب برائے زندگی کے قافلہ سالار پریم چند نے اپنی کہانیوں میں صدہا کیرکٹر پیش کئے۔ ۲۵-۱۹۲۰ء پریم چند کی ادبی زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں اُن کی کہانیوں و ناولوں کے کردار جذبہ حب الوطنی میں سرشار نظر آتے ہیں۔

حاضرین دل تو چاہتا ہے کہ اُن کے شاہکار ناولوں اور افسانوں کے وہ کردار جن پر اصلیت کا دھوکہ بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ جو من و عن سچے معلوم ہوتے ہیں یہاں بیان کروں لیکن مقالے کی طوالت اور وقت کی کم مائیگی کے پیشِ نظر کوئی مثال پیش کرنے کے بجائے کردار نگاری کی فنی لطافتوں اور کردار نگار کے فرائض پر بات کروں گا۔

دراصل کردار نگاری ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ تاریخ، نظم، ناول، ڈرامہ جیسے افسانہ کے علاوہ تمام پلاٹ دار اصناف کا یہ اہم جز ہے۔ کیا ہم مختلف اصناف میں کردار نگاری کی حد بندی یا فرق و تمیز واضح کرسکتے ہیں؟

ڈرامائی کردار نگاری اور ناول کردار نگاری میں ایک واضح فرق تو یہ ہے کہ ڈرامہ میں کردار کے ترکیبی عناصر کم وقت، کم الفاظ میں جامع طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ ناول، مختصر افسانوں، کہانیوں میں کرداروں کے مختلف پہلوؤں کو تفصیلی طور سے نمایاں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے فنکار بہانہ کا سہارا لیتا ہے۔ یہ دراصل ایک کمال ہے کہ افسانہ نگار اپنے افسانوی کردار کی ایسے موثر الفاظ میں تصویر کشی کرے کہ قاری کردار کو اپنے سے ذہنی طور پر قریب تر محسوس کرے۔ منشی پریم چند کو یہ کمال حاصل ہے کہ اُن کے ناولوں کے کردار انتہائی مانوس محسوس ہوتے تھے۔ یہاں میں اُن کے معرکتہ الآرا افسانہ کفن کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں جو "نگارے" کی اشاعت کے چار سال بعد لکھا گیا۔ کرداری نگاری کا بہترین

نمونہ ہے۔ اس افسانہ میں پریم چند نے تفصیلی بیانات کی مدد سے کرداروں کو موثر اور لافانی بنا دیا۔

کردار کو نمایاں اور موثر طور پر پیش کرنے کے لئے بیانیہ DESCRIPTIVE طریقہ جہاں سرفہرست ہے تو دوسری طرف مکالمہ کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شخصیت کی شناخت میں طرز گفتگو اہم رول ادا کرتی ہے۔ افسانہ نگار اپنے کرداروں سے مکالمہ کے ذریعہ اپنی کہانی میں اصلی زندگی کا رنگ بھرتا ہے۔ منشی پریم چند کو اس بات پر مکمل عبور حاصل تھا کہ اُن کا کردار جب مکالمہ ادا کرتا ہے تو اس افسانوی کردار کے منہ سے نکلی ہوئی بات ایسی محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے درمیان وہ کھڑا بول رہا ہے۔ ایک دیہاتی بیوہ کا کردار مکالموں کے ذریعہ کس قدر متاثر ہو جاتا ہے ملاحظہ فرمائیے۔ پس منظر یہ ہے کہ ایک راجکمار شکار کھیلتے ہوئے راہ بھول جاتا ہے۔ طوفان میں گھر جاتا ہے۔ ایک عورت اُس کی رہبر بن جاتی ہے یہاں دونوں کے درمیان جو مکالمہ ہیں وہ قابلِ رقم ہیں۔ راجکمار کے استفسار پر وہ عورت یوں گویا ہوتی ہے۔

" ابھی تو کل چھ مہینے ہوئے ہیں بابوجی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے۔ ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی بس آنکھیں بند ہوگئیں..

.... تب سے بابوجی گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں۔"

راجکمار جیب سے پانچ روپے نکال کر اُس عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا

" میری طرف سے یہ بچوں کی مٹھائی کے لئے لے لو۔ مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا "

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔

" نہیں بابوجی یہ رہنے دیجئے۔ میں غریب ہوں لیکن بھکارن نہیں "

" یہ بھیک نہیں ہے۔ بچوں کی مٹھائی کھانے کے لئے ہے۔"

"نہیں بابو جی"

"مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو"

"نہیں بابو جی، جس سے بیاہ ہوا اُس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں"

آپ حضرات کی توجہ اِن مکالموں کی طرف مبذول کراؤں گا جو دو بچوں کے درمیان ہے اور اپنی نظیر آپ ہے۔ (خاکِ پروانہ سے ماخوذ)

شیاما نے پوچھا۔ "کئے بچے ہیں بھیا ؟

کیشو ۔ "تین انڈے ہیں، ابھی بچے نہیں نکلے"۔

شیاما۔ "ذرا دکھا دو بھیا۔ کتنے بڑے ہیں ؟"

کیشو ۔ "دکھا دوں گا۔ پہلے ذرا چیتھڑے لے آ نیچے۔ بچھا دوں۔ بچارے انڈے تنکوں پہ پڑے ہیں"۔

(شیاما دوڑ کر کپڑے لے آتی ہے)

شیاما۔ "ہم کو بھی دکھا دو بھیا"۔

کیشو ۔ "پہلے ذرا ٹوکری تو دے دے اوپر سایہ کر دوں"

شیاما نے ٹوکری لاکر دے دی اور بولی۔

"اب تم اُتر آؤ میں بھی دیکھوں"۔

کیشو نے کہا۔ "جا دانہ اور پانی کی پیالی لے آ"۔

بھائی کا چھوٹی بہن سے بار بار کام لینا اور بہن کا اِس لالچ میں دوڑ کر کام کرنا کہ بھیا بچے دکھا دیں گے کس قدر نیچرل ہے۔ اِن کی بات چیت مجسّم حقیقت بن آتی ہے۔ یہ مکالمے اِس بات کا ثبوت ہیں کہ افسانہ نگار مکالموں سے افراد کی خصوصیات اور کردار کو نمایاں کرنے میں مدد لیتا ہے۔ بہتر طور سے یوں بھی کہا

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

عالمی صحافیوں کی بپتا

یروشلم سے ایک تشویشناک خبر آئی ہے اس خبر سے دانشوروں اور صحافیوں کی عالمی برادری کی حالت زار کا پتہ چلتا ہے اس برادری کا سیاست دانوں اور جاہ پسند حکومتوں نے اس بری طرح استحصال کیا ہے کہ راست گو اور حق پسند دانشوروں اور صحافیوں کا عرصہ حیات ہی تنگ ہو گیا ہے جبکہ نام نہاد اور سماج دشمن افراد صحافت اور دانشوری پر چھاتے چلے جا رہے ہیں۔ یروشلم کی ایک حالیہ کانفرنس نے اسی عالم بے چارگی کے ساتھ اپنی آواز بلند کی ہے اخباری اطلاعات کے مطابق بین الاقوامی سطح کے تین سو سے زیادہ مدیروں اور میڈیا ناظموں نے یروشلم میں ایک کانفرنس منعقد کی تھی تاکہ طباعتی میڈیا کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر غور و خوض کیا جائے۔ کانفرنس نے اپنے اختتامی اجلاس میں دنیا کی تمام حکومتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ افراد پر پابندی عاید کریں جو عملاً کسی خفیہ ایجنسی سے وابستہ ہیں لیکن بظاہر صحافی بنے پھرتے ہیں۔ بعض اخبارات نے یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ یہ سوانگ رچانے میں کلنٹن انتظامیہ اپنی سی آئی اے کے ذریعہ بہت سرگرم ہو گئی ہے۔

بین الاقوامی پریس انسٹی ٹیوٹ کی عالمی کانگریس کے ایک ترجمان نے ۲۶ر مارچ ۹۶ء کو یروشلم میں کہا تھا۔ "صحافی حضرات خفیہ کارروائیوں میں ملوث ہو سکتے ہیں اس بات کا امکان ہی

تمام صحافیوں کے بارے میں شبہ پیدا کر دیتا ہے اور ان کی زندگیاں خطرے میں ڈال دیتا ہے" یہ بات انہوں نے ریاستہائے متحدہ کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے ڈائریکٹر جان ڈیوش کے ایک بیان دعویٰ کے جواب میں کہی تھی سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے ابھی حال میں دعویٰ کیا تھا کہ یہ حق ان کے لیے محفوظ ہے کہ وہ صحافیوں کے ذریعہ خفیہ کارروائیاں کرائیں یا خفیہ ایجنٹوں کو رپورٹرز کے بھیس میں رہنے کی اجازت دیں۔ عالمی کانگریس کے لیے یہ بات اولین تشویش کا سبب بن گئی۔ کانگریس نے ایک اور قرارداد میں ان حکومتوں کی مذمت کی ہے جو صحافیوں سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ لائسنس حاصل کریں۔ حال میں صحافیوں کو لائسنسنگ کا قانون دینے زویتیلا میں نافذ کیا گیا ہے اسی طرح یوگینڈا کا ایک نیا قانون صحافیوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ صحافت کی ڈگریاں حاصل کریں۔ عالمی کانگریس کے نزدیک "اصل وجہ ہے کہ جو رپورٹنگ حکام کو پسند نہ ہو اس پر پابندی لگانا چاہتے ہیں"۔ عالمی کانگریس ان پابندیوں کو غیر دستوری سمجھتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں وہ کوسٹاریکا کی نظیر پیش کرتی ہے جہاں یہ پابندیاں قانوناً غیر دستوری قرار دی گئی ہیں۔

بین الاقوامی پریس انسٹی ٹیوٹ کی عالمی کانگریس عالمی میڈیا میں ۸۵ ممالک کی نمائندگی کرتی ہے یروشلم کانگریس اس کی ۴۵ ویں جنرل اسمبلی تھی جس کی تیسری قرارداد میں ایک نہایت اہم مطالبہ سامنے آیا ہے۔ عالمی کانگریس نے اس قرارداد میں مقبوضہ فلسطین کی یہودی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ پریس سنفر شپ میں نرمی پیدا کرے۔ کیوں کہ یہ سنفر شپ اب سے پچاس برس قبل کی برطانوی حکومت کی باقیات میں سے ہے اس قرارداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلنٹن انتظامیہ جس حکومت کو جمہوری اور امن دوست حکومت بتاتا ہے اس حکومت میں صحافیوں اور میڈیا کی کیا حالت ہے؟ عالمی کانگریس میں شریک مدیروں نے ایک بیان میں کہا ہے۔ کہ "اسرائیل کی یہودی حکومت سلامتی اقدامات کے باب میں سنفر کرتی رہی ہے جبکہ سیکیورٹی کو کوئی حقیقی خطرہ درپیش نہیں تھا"

اسرائیلی فارن پریس ایسوسی ایشن نے بھی شکایت کی ہے کہ یہودی حکومت لبنانی تصادموں پر مبنی کہانیوں کی اشاعت اس وقت تک موخر رکھتی ہے جب تک ان تصادموں میں مرنے والے سپاہیوں کے تمام اعزہ باخبر ہو جائیں ۔ یہ امتناع ان کہانیوں پر بھی لاگو ہوتا ہے ۔ کہ جن میں مرنے والے سپاہیوں کی واضح نشاندہی نہ کی گئی ہو یا ایسی کوئی کہانی اسرائیل سے باہر شائع ہو چکی ہو ۔ علاوہ ازیں ۔ یہودی حکومت نے غازہ پٹی اور مغربی کنارے کے کئی ادیبوں کے خلاف کارروائی بھی کی ہے اور فلسطینی صحافیوں کے اندرون ملک سفر پر پابندی بھی لگا رکھی ہے ۔ عالمی کانگریس نے ان باتوں پر بھی ناراضگی کا اظہار کیا ہے لیکن اس ناراضگی کے بعد ؟

صحافیوں کی اس کانفرنس کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ یہ اس شہر یروشلم میں ہوئی جس پر اسرائیل نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے ۔ اور یہ اسرائیل انہا یہودیوں کی مملکت ہے جس نے دنیا بھر کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں ۔

(دعوت ستمبر ۱۹۹۶ء سے ماخوذ)

(بقیہ صفحہ ۳۹)

جا سکتا ہے کہ مکالمے افراد کی خصوصیات اور کردار کو نمایاں کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں پریم چند کے پاس کردار نگاری جہاں مندرجہ بالا اوصاف پر مبنی تھی وہاں پریم چند نے کردار نگاری میں مزید ترکیبی عناصر کو بروئے کار لایا جن میں کردار کے نام ، کرداروں کی ظاہری شکل وصورت کا بیان ۔ لباس اور اُس کی وضع کو بھی کیرکٹر نگاری کے لئے مددگار و معاون بنایا ۔ یہ وہ عناصر ہیں جن کو صرف اور صرف وہی افسانہ نگار برت سکتا ہے جس کا مشاہدہ عمیق اور وہ گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو ۔ ●●

علی حیدر نظم طباطبائی

تلخیص عروض و قافیہ

وہ حرف جو نہ ساکن ہے نہ متحرک

وزن شعر میں کچھ حروف ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا متحرک ہونا ضروری ہے کچھ ایسے ہیں کہ ان کا ساکن ہونا لازم ہے، کچھ حروف ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے متحرک اور ساکن لانے کا شاعر کو اختیار ہے۔ اس تیسرے قاعدے کو کسی عروضی نے بھی صاف طور پر بیان نہیں کیا ہے۔ یعنی اگر ساکن کے بعد کئی متحرک ہوں تو پہلا متحرک وہی حرف ہوگا جو ساکن ہے نہ متحرک۔ مثلاً فاعلاتن فاعلاتن اس وزن میں یے وہی حرف ہے کہ شاعر اس کے مقام پر چاہے حرف ساکن لائے چاہے متحرک جیسے دل شکستہ آہ لب پر "ش" متحرک ہے "ہ" ساکن۔ اسی ہر وزن میں چند حروف ایسے ہوتے ہیں کہ شاعر کو ان کے متحرک اور ساکن لانے کا اختیار ہے۔ اور اس سبب سے اس کو موزوں کرنے میں مزاحمت کم محسوس ہوتی ہے۔ ہاں جو حروف کہ واجب الحرکت اور واجب السکون ہیں اُن میں شاعر کو مجبور ہونا پڑتا ہے۔

حروف کا ملفوظ ہونا شرط ہے

وزن شعر میں اُنہیں حروف کو حروف سمجھتے ہیں جو ملفوظ ہوں۔ خواب کا (و) وزن شعر کے شمارے میں نہیں آئے گا۔ اسی طرح کیا اور کیوں شاعر کے نزدیک ایک ہی بات ہے یعنی ایک متحرک اور ایک ساکن ہے' اس سبب سے کہ (ن) غنہ بھی شمار میں نہیں ہے (چکر) اور (خرّم) لکھنے میں تین ہی حروف لکھے جاتے ہیں۔ مگر تلفظ کے اعتبار سے چو حرفی لفظ ہیں۔ (ھ) جو مخلوط ہوجاتی ہے۔ جیسے (کھا) اور (تھا) میں (ک) اور (ھ) مل کر ایک حرف بن گئے ہیں یا (ت) (ھ) مل کر ایک حرف بن گئے ہیں۔ شاعر ان کو ایک ہی حرف سمجھتا ہے۔ یعنی (کا) اور (کھا) ایک ہی وزن پر ہیں۔ جو حروف علت کہ وہ آخر لفظ میں واقع ہوں' وہ الف جو سرے پر ہو' اُن کو شاعر کبھی چھوڑ دیتا ہے اور کبھی لے لیتا ہے۔ دو ساکن کے بعد اگر کسی لفظ میں تیسرا ساکن ہو' وہ بھی غیر معتبر ہے۔ مثلاً دوست اور گوشت میں (ت) تقطیع میں نہیں لی جاتی گویا کہ غیر ملفوظ ہے۔

نثار احمد بشر

کتاب

(خیر الوجود)

اے کہ تجھ میں فکرِ انسانی کا بے پایاں نچوڑ
ذات میں تیری فسادِ نفسِ انسانی کا توڑ

مکتب و شالا، دھرم و دین کی بنیاد تو
مرجعِ علم و بصیرت، مطلعِ ایجاد تو

سینۂ صد چاک تیرا پاسدارِ آرزو
تو حریفِ صد گلستاں بے نیازِ رنگ و بو

تُو امینِ گنج ہائے عظمتِ عہدِ کہن
تُو حیاتِ جاودانِ صاحبانِ فکر و فن

فکر کا حُسنِ تخیل کا، زباں کا پیرہن
تو ہے تو انوارِ بہشتِ وجود کا تازہ چمن

ساقیِ نطق و نظر، حشاطِ عقل و شعور
بادۂ علم و خبر، سرمایۂ ہوش و سرور

جہل و نادانی کی ضد پیرایۂ ایقان تو
ہر اندھیرے کے لئے ہے صبح کا فرمان تو

نام و رتبہ میں بڑا آغوشِ ادب ہے و لے
حضرت انسان ہیں انسان تیرے فیض سے

تیری مٹھی میں دساتیر ممالک کو اماں
ترے دامن میں تمدن کے عناصر گلفشاں

تو نشانِ ہستی یزداں و ذاتِ اہرمن
سیلِ طوفاں ہو کہ صرصر شانِ آب بے شکن

اشرف المخلوق مجبور و گرفتارِ قیود
تو مگر آزاد و تاباں سربسر خیرالوجود

نامۂ اعمالِ انساں خود نوشتِ آدمی
مژدۂ اوجِ بشر اے سرگذشتِ آدمی

منشاء الرحمٰن خاں منشاؔء
ستار کی ٹاؤن
ناگپور

غزل

مجھ کو مرغوب ہے اے خدا روشنی
کر مرے فکر و فن کو عطا روشنی

لحظہ لحظہ ہے مجھ کو اسی کی تلاش
کچھ نہیں چاہیئے ماسوا روشنی

زخم پر زخم دے تازہ تازہ مجھے
تاکہ پھیلا سکوں جابجا روشنی

گوشہ گوشہ پہ ہے حکمراں تیرگی
جانے کیوں ہو گئی ہے ہوا روشنی

ہم نے اک عمر کی صرف اس کے لئے
ہم سے پوچھو کہ ہوتی ہے کیا روشنی

چھین لیتی ہے آنکھوں سے بینائیاں
جب بھی بڑھتی ہے بے انتہا روشنی

کسی نے تو کچھ اور بھٹکا دیا
یہ اگر روشنی ہے تو کیا روشنی

ایسا فن منشاؔ کا اس پہ صد ہو ناز
جس سے ہوتی رہے رونما روشنی

ڈاکٹر دِل ہاشمی
الیکٹرو۔ انٹرپرائزس
انصار کمپلکس۔ مہدی پٹنم حیدرآباد
فون: 3530068

غزل

تو نرم لہجے میں اُس سے کلام کر کے دِکھا
عدو کے دل میں بھی اپنا مقام کر کے دِکھا

چلے گی تیری حکومت سوادِ عالم پر
تو اپنے نفس کو پہلے غلام کر کے دِکھا

سکونِ، خلق کی خدمت میں ہی ملے گا تجھے
سحر کو گھر سے نکل اور شام کر کے دِکھا

یقین حق پہ اگر ہو تو پھر ملے گا خدا
تو اپنے حصے کی کوشش تمام کر کے دِکھا

ٹھکانا یوں بھی یہاں مستقل نہیں ہے ترا
یہاں کا جو ابھی باقی ہے کام کر کے دِکھا

تری ہی راہنمائی کے واسطے اب کے
کسی کو زیست کا اپنی امام کر کے دِکھا

قرار دِل کو فقط ذکرِ یار ہی سے ملے
پیام دِل کا مِرے خاص و عام کر کے دِکھا

ماہنامہ	جلد : ۱۳
	شمارہ :
قیمت : ۶ روپے	

ایڈیٹر : محمد قمرالدین صابری	منیجنگ ایڈیٹر :
جائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین	نذیر انصاری

مجلس مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم ـ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشاء ـ محمد حسن ـ پروفیسر ـ
ڈاکٹر یوسف الدین ـ محمد منظور احمد منظور ـ منیر احمد صدیقی ـ

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۰۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۲۰۰	۳۶۰	۳۴۰۰
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۷۵ روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ "شاداب" ۱۱-۵-۱۷۲ ریڈ ہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نقش پرنٹنگ پریس ... چھتہ بازار میں چھپواکر دفتر "شاداب" ۱۱-۵-۱۷۲ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

[illegible]

[illegible]

لوگوں نے مجھ سے فرمائش کی [illegible]

[illegible]

مجھے وہ دن یاد نہیں جب مکہ اور مدینہ کا نام میں نے پہلا [illegible]
جب میں نے رسول اللہ [illegible] اسلام کے گہوارے
رسول ؐ کے شہر ولادت و ہجرت کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

جب میں کچھ بڑا ہوا اور مجھے معلوم ہوا کہ جیتے جی جنت کو دیکھنا ممکن نہیں ہے ہاں حجاز تک رسائی ممکن ہے۔ حجاج کے قافلے برابر آتے جاتے ہیں تو میں نے کہا کہ پھر ایمان کی اس جنت کی سیر کیوں نہ کی جائے۔ دن پر دن گزرتے گئے اور میں بڑھتا گیا۔ جب میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا تو میرا پرانا شوق تازہ ہو گیا۔ تھپکی دے دے کر سلائی ہوئی تمنائیں جاگ گئیں اور میں دل ہی دل میں زیارت حج و زیارت کی تمنا کرنے لگا۔

پھر ایسا ہوا کہ میں اسی جگہ آ پہنچا جس کی زمین پر نہ تو سبزہ کا فرش ہے اور نہ اس کی گود میں ندیاں کھیلتی ہیں ہے بلکہ چاروں طرف جلے ہوئے پہاڑ کھڑے پہرہ دے رہے ہیں لیکن بقول حفیظ:

نہ اس میں گھاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

جب میں نے حسن ظاہری سے خالی یہ سرزمین دیکھی تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ شہر مناظر سے کتنا تہی دست ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس شہر نے انسانیت اور تمدن پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اگر یہ شہر جس کا دامن گلکاریوں سے خالی ہے روئے زمین پر نہ ہوتا تو دنیا ایک سونے کا پنجرا ہوتی اور انسان محض قیدی۔ یہی وہ شہر ہے جس نے انسان کو دنیا کی تنگنائے سے نکال کر وسعتوں سے آشنا کیا، انسانیت کو اس کی کھوئی ہوئی سرداری اور چھینی ہوئی آزادی دلائی۔ اسی شہر نے انسانیت پر لدے ہوئے بھاری بوجھوں کو اتارا۔ اس کے طوق و سلاسل کو جدا کیا جو ظالم بادشاہوں اور نادان قانون سازوں نے ڈال رکھے تھے۔

جس وقت میں نے یہ سوچا۔ اگر یہ شہر نہ ہوتا تو اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں دنیا کے بڑے بڑے شہروں کا اس شہر سے موازنہ کروں اور دیکھوں کہ اگر

یہ شہر نہ ہوتے تو دنیا میں تمدن اور انسانیت میں کیا کمی ہوتی ! ۔ میرے سامنے ایک ایک شہر آئے اور میں نے دیکھا کہ یہ تمام شہر مٹھی بھر انسانوں کے لئے زندہ اور آباد تھے ۔ انھوں نے انسانیت کے سرمایہ میں کسی بڑی چیز کا اضافہ نہیں کیا ۔ یہ مختلف زمانوں میں انسانیت اور تمدن کے مجرم رہے ہیں ۔ اپنے ذرا سے فائدہ کے لئے بارہا ایک شہر نے سیکڑوں شہروں کو بے چراغ کر دیا ۔ ایک قوم نے بہت سی قوموں کو اپنی خوراک بنا لیا کتنی بار چند آدمیوں کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں انسان برباد کر دیئے گئے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے نقشہ پر اگر یہ شہر نہ ہوتے تو انسانیت و تمدن کا کچھ نہ بگڑتا اور دنیا میں کوئی بڑی کمی نہ ہوتی ۔

لیکن اگر مکہ نہ ہوتا تو انسانیت ان معانی و حقائق ، اخلاق ، و عقائد اور علوم و فضائل سے تہی دست ہوتی جو اس کا سب سے قیمتی سرمایہ اور اس کا سب سے بڑا حسن ہے ۔ اسی کی بدولت دنیا نے ایمان کی اس لازوال دولت کو پھر سے پایا جسے لوگ ضائع کر بیٹھے تھے ، عالم نے اس صحیح علم کو پایا جو ظن و تخمین کے پردوں میں چھپ چکا تھا ۔ وہ حریت دنیا کو دوبارہ ملی جو سرکشوں اور ظالموں کے ہاتھوں پامال ہو چکی تھی ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں انسانیت نے نیا جنم لیا ۔ اور تاریخ نئے سرے سے ڈھل کر نکلی ۔

لیکن مجھے ہوا کیا ہے جو میں کہتا ہوں ، اگر مکہ نہ ہوتا ___ ؟ اگر مکہ نہ ہوتا تو کیا ہو جاتا ؟ مکہ تو اپنے خشک پہاڑوں ، ریتیلے ٹیلوں بلکہ خانہ کعبہ اور زمزم کے متبرک کنویں کو اپنی گود میں لئے ہوئے چھٹی صدی مسیحی تک برابر سوتا رہا ہے لیکن اس نے مدد کا کوئی ہاتھ نہ بڑھایا ، مکہ اس وقت تک خشک پہاڑوں اور ریتیلے ٹیلوں سے گھرا ہوا دنیا سے الگ تھلگ اس طرح زندگی کے دن کاٹ رہا تھا گویا انسانیت کے کنبہ سے اس کا کوئی جوڑ نہ تھا ، دنیا کے نقشہ سے الگ تھا ۔

اس لئے مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ مکہ نہیں بلکہ مکہ کا وہ عظیم الشان فرزند اگر

نہ تھا جس نے تاریخ کے بہتے رخ کو پہلے پہل زندگی کے دھارے کو موڑ دیا اور دنیا کو نیک نیا راستہ دکھایا تو دنیا کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔

یہ سوچتے سوچتے میری آنکھوں کے سامنے چند منظر پھر گئے، مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قریش کا سردار تن تنہا خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے، لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اسی سے بدزبانی کر رہے ہیں لیکن وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ طواف کر رہا ہے جب وہ طواف ختم کرتا ہے تو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے لیکن خانہ کعبہ کلید بردار عثمان بن طلحہ اُسے سختی سے روک دیتے ہیں، سردار صبر سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے "عثمان! وہ دن بھی کیا ہوگا جب یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا دوں گا؟" ۔ عثمان کہتے ہیں۔ ایسا دن کیا قریش ختم ہو چکے ہوں گے؟ ۔ وہ کہتا ہے "نہیں بلکہ اس دن انہیں حقیقی عزت ملے گی۔"

پھر میں نے دیکھا کہ وہی سردار فتح مکہ کے دن خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے۔ وہ ساتھی جنھوں نے اپنے کو اس پر قربان کر دیا تھا اس کے ارد گرد پروانہ وار جمع ہیں، اس وقت وہ کعبہ کے کلید بردار کو بلاتا ہے اور کہتا ہے "عثمان! لو یہ تمہاری کنجی ہے، آج کا دن نیکی اور ایفائے عہد کا دن ہے۔"

تاریخ شاہد ہے کہ وہ شخص صرف اس کنجی کا مالک نہیں تھا جس سے وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو کھول سکتا تھا بلکہ اسی کے پاس وہ کنجی بھی تھی جس سے وہ انسانیت کے ان تالوں کو بھی کھول سکتا تھا جو کسی حکیم اور فلسفی سے اس وقت تک نہیں کھل سکے۔ یہ کنجی قرآن کریم ہے جو اس پر نازل کیا گیا۔ رسالت ہے جو اُسے سونپی گئی جو انسان کی ساری گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے اور ہر زمانہ کی مشکلات کا حل پیش کر سکتی ہے۔

حج کے بعد میں اپنے تخیل کے پروں پر اُڑتا ہوا مدینہ منورہ کی طرف چلا اور وہاں کی کشش مجھے مدینہ منورہ کی طرف بے ساختہ کھینچ رہی تھی۔ راستہ کی زحمتو

رحمت کہہ رہا تھا اور میری نگاہ کے سامنے اس بات کا منظر گھوم رہا تھا جس کا تاثر اس وقت منکشف ہوا تھا اور اس نے اس وقت کو میرے لئے کٹھن صبر آزما بنا دیا تھا۔

جب میں مدینہ منورہ پہنچا تو سب سے پہلے میں نے مسجد نبوی میں دو رکعت نماز ادا کی اور مسافت کے نصیب ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر میں آپ کے روضہ پر حاضر ہوا۔ میں آپ کے ان احسانات کے نیچے دبا ہوا تھا۔ محبت سے بے حد سرشار ہوتا ہوا میں نے درود و سلام پڑھا اور گواہی دی کہ بیشک آپ نے اللہ کا پیغام کما حقہ پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سونپی ہوئی امانت کو پورا پورا ادا کر دیا۔ امت کو سیدھی راہ دکھائی اور اللہ کی راہ میں دم واپسیں تک پوری پوری کوشش کی۔ اس کے بعد میں نے آپ کے دونوں محترم دوستوں کو سلام کیا۔ یہ دونوں ایسے دوست ہیں جن سے بڑھ کر مصاحبت کا حق ادا کرنے والا تاریخ انسانی میں نظر نہیں آتا۔ اور نہ کوئی ایسا جانشین دکھائی دیتا ہے جس نے ان سے زیادہ اچھی طرح جانشینی کے فرائض کو ادا کیا ہو۔

درود و سلام سے فارغ ہو کر میں جنت البقیع کی طرف گیا، یہ زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جہاں صدق و صفا، مہر و وفا کا انمول خزانہ دفن ہے۔ ع

دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

یہیں وہ لوگ سو رہے ہیں جنہوں نے آخرت کے لئے دنیا کی زندگی کو تج دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے یقین اور اپنے دین کی خاطر وطن پر غریب الوطنی کو ترجیح دی جنہوں نے رسول کے قدموں پر پڑے رہنے کے لئے رشتہ داروں اور دوست احباب کے مجلس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔

بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے جو عہد کیا اُسے سچ کر دکھایا۔

یہاں سے فارغ ہو کر میں اُحد کی طرف گیا، اُحد وہ پاک اور دلکش سرزمین ہے جہاں محبت و وفاداری کا سب سے دلکش منظر دیکھنے میں آیا۔ اسی میدان میں انسانی

تاریخ نے ایمان و یقین کے جیتے جاگتے کرداروں کی شکل میں دیکھا۔ یہیں سے بہادری اور شجاعت کے الفاظ لغت کو میسر ہوئے۔ اسی خطے نے پاک محبت اور ناموس دوستی کا نمونہ دنیا کو دکھایا۔ یہاں پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں۔ "مجھے اُحد پہاڑ کے اسی طرف سے جنت کی خوشبو آرہی ہے"
مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر شہادت سن کر کہہ رہے ہوں۔ "اب آپ کے بعد جنگ و جہاد کا کیا لطف ؟"۔
اور انس رضؓ بول اُٹھے ہوں"۔ لیکن آپ کے بعد زندگی کا بھی کیا مزا ؟"۔

اسی اُحد پہاڑ کی گود میں حضرت ابو دجانہ رضؓ نے اپنی پشت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈھال بنا دیا تھا۔ تیر ابو دجانہ رضؓ کی پشت کو چھید رہے تھے لیکن اُنھیں جنبش بھی نہ ہوتی تھی۔ اسی جگہ حضرت طلحہ رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر برسنے والے تیر کو اس طرح اپنے ہاتھ پر لیا کہ ہاتھ شل ہو کر رہ گیا۔ اسی میدان میں حضرت حمزہ رضؓ شہید ہوئے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو قریش کے ناز پروردہ نوجوان تھے۔ اسی جگہ اس حالت میں شہید ہوئے کہ ان کے لئے کفن بھی میسر تھا۔ ایک کمبل تھا جس سے اگر سر چھپایا جاتا تو پیر کھل جاتے' پیر ڈھانکے جاتے تو سر برہنہ ہو جاتا۔

اے کاش! اُحد دنیا والوں کو اپنے اس محبت کے خزانے سے کچھ دے دے! کاش آج دنیا کو اس پچھلے ایمان اور یقین کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہو جاتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس دنیا کی قسمت بدل جائے اور یہ دنیا جنت بن جائے۔

لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ہمیں قاہرہ کی سیر کرائی اور وہاں کی اہم شخصیتوں سے تعارف کرایا' تم نے دمشق اور اہل دمشق کی باتیں سنائیں اور وہاں کے ادباء و علماء سے ملایا' تم ہمیں شرق اوسط لے گئے اور وہاں کی سیر کرائی۔ اب حجاز اور حجاز کی

(باقی بر صفحہ ۲۹)

قرآن حکیم میں موجودہ سائنسی تجربات و ایجادات کی بھی نشاندہی موجود۔ پسماندگی اور پستی قرآن سے دوری کا نتیجہ

ڈاکٹر عبد الکریم کی تقریر

ممتاز اسلامک اسکالر ڈاکٹر ذاکر عبد الکریم نائیک نے کہا کہ قرآن حکیم
موجودہ سائنسی تجربات و ایجادات کی آج سے ۱۴۰۰ سال قبل ہی نشاندہی کر دی تھی۔
ڈاکٹر آج (۳ راگست) دکن میڈیکل کالج میں اسلام اور سائنس کے موضوع پر لکچر دے
رہے تھے۔ اُنہوں نے مختلف قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ سائنس کے میدان
میں آج دنیا نے جو ترقی کی ہے اور جس پر اُسے ناز ہے اُس کے بارے میں قرآن نے اپنی
آیات کے ذریعہ تفصیلات کے ساتھ واضح کر دیا ہے۔ ان میں سائنسی شعبہ کے مختلف
شعبہ جات شامل ہیں۔ ڈاکٹر نائیک نے قرآن کو جدید سائنس سے ہم آہنگ قرار
دیتے ہوئے کہا کہ کئی یورپی سائنسداں اس کے معترف ہو چکے ہیں۔ ماضی میں جبکہ
معجزات اور ادب کا دور تھا قرآن نے ان کے ادب کرشموں کے لئے
ایک چیلنج بن کر کھڑا تھا۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہ اُمت مسلمہ قرآن مجید
سے دور ہو کر پسماندگی اور پستی کا شکار ہو چکی ہے۔ قرآن کو صرف ثواب حاصل کرنے
کے لئے پڑھا جا رہا ہے اور طاقتور قومیں قرآن سے قریب تھیں اور وہ ہر موقع پر غالب
رہیں لیکن آج صورتحال مختلف ہے۔ ڈاکٹر نائیک نے کہا کہ کئی مسلم سائنسدانوں نے

غیر معمولی معلومات کی ہیں۔ لیکن مغربی صحافت نے آج تک کوئی مقام نہیں دیا۔ ڈاکٹر نائیک نے کہا کہ اگر آج بھی مسلمان قرآن کو اپنا لیں تو وہ دنیا میں بلند اور مسابقت میں تمام سے آگے نکل سکتے ہیں۔ [illegible] کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ قرآن نے چودہ سو سال قبل [illegible] اور آسمانی نظام کے بارے میں بتا دیا تھا جسے آج [illegible] کی جنت کے بارے میں بھی بتایا۔ اور آج سائنس نے اس کی تحقیق کی۔ سورہ انبیاء اور قرآن میں سورج کے اطراف سیاروں اور زمین کے گھومنے کو [illegible]۔ قرآن مجید نے بتایا کہ ایٹم بھی قابل فہم ہے۔ سورہ صبا میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی چیز سے بھی واقف ہے۔ سورہ حجر میں پانی کے بخارات بن کر آسمان میں جانا اور پھر اس سے بارش کے بارے میں بتایا گیا۔ اس موقع پر دکن میڈیکل کالج کے طلباء و طالبات اور معززین شہر کی کثیر تعداد شریک تھی۔ ڈاکٹر نائیک نے کئی سوالات کے جوابات دیئے۔ مسز ناصر الدین اویسی ایم ایل اے، اکبر الدین اویسی، اسد الدین اویسی، ڈاکٹر حامد علی بیگ پرنسپل دکن میڈیکل کالج، ڈاکٹر سلیم اللہ سپرنٹنڈنٹ اسری ہاسپٹل اور دوسرے ڈاکٹرس موجود تھے۔

سلسلہ صفحہ ۲۰

دینی علوم کی بقا اور شریعت اسلامیہ کے تحفظ کے لئے دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم جیسے شاندار مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ ندوۃ العلماء جس کی تاسیس حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جن کے رفیق علامہ شبلی نعمانی تھے۔ یہ ادارہ قدیم اور جدید دونوں میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ اس کے مایہ ناز فرزندوں کی تصانیف [illegible] اعتبار حاصل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو نیک ہدایت دے [illegible] حضرت مولانا کے بے مقصد جہاد اور غیر مسلموں کی جنگ لڑنے پر آمادہ ہیں کیا یہ نادانی کی باتوں کا ہے۔

یہ کتاب عربی میں لکھی گئی تھی [illegible] ترجمہ میاں جعفر مسعود حسنی نے کیا ہے۔ ایسی سلیس عبارت لکھنا [illegible] مولانا واضح رشید ندوی

تعلیم پر خواتین کی زیادہ توجہ درکار

جامعۃ البنات میں جناب احمد دیدات کے شاگرد کا خطاب

عالم اسلام کے ممتاز مبلغ اسلام جناب احمد دیدات کے شاگرد جناب ڈاکٹر ذاکر عبد الکریم نائیک نے کہا کہ اسقاط حمل اور مانع حمل زمانہ جاہلیت کی یادگار ہیں جن کو آج کے ترقی یافتہ دور میں خوشنما بنا کر پیش کیا جا رہا ہے جبکہ اس سے معاشرہ بے شمار معاشرتی برائیوں اور خرابیوں سے دوچار ہے اور بدچلنی اور بدکاری عام ہوتی جا رہی ہے اور پورا سماج عصمت ریزی اور عصمت فروشی کے بڑھتے ہوئے واقعات کا شکار ہے۔ ان خیالات کا اظہار وہ جامعۃ البنات ملک پیٹھ میں طالبات کے ایک اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کہا کہ ملک میں جرائم کے اعداد و شمار اس بات پر شاہد ہیں کہ ان بڑھتے ہوئے جرائم میں ان خواتین کا زیادہ رول رہا ہے جو اسلام اور قرآنی تعلیمات سے دور ہیں اور جن کا ایقان یہ ہے کہ دنیا محض عیش و عشرت کی جگہ ہے کہ جہاں پر خوب جسم پرستی کی جائے اور نفس کی خواہشات کو پورا کیا جائے وہ کم ہے۔ جناب ڈاکٹر نائیک نے طالبات پر زور دیا کہ وہ اس خراب ماحول میں جبکہ مغربی تہذیب اور ٹی وی اور فلم کلچر معاشرہ کو پراگندہ کر رہا ہے اپنے

آپ کو پاکیزہ رکھیں اور عصمت وعفت کی حفاظت کو اپنا نصب العین بنائیں
چاہئے۔ جناب ذاکر نائیک نے طالبات پر زور دیا کہ وہ تعلیم پر زیادہ
توجہ دیں اور اعلیٰ تعلیم کو حاصل کرنے کی کوشش کریں کہ جس سے وہ نہ
خاندان کی تعلیم وتربیت اچھے طریقے سے کرسکتی ہیں بلکہ مخالف اسلام
مقابلہ بھی کرسکتی ہیں اور مخالفین کا منہ توڑ جواب دے سکتی ہیں۔ جناب ذ
نے کہا کہ وہ معاشرہ میں علم کی شمع کا کام سنبھالیں اور بیٹی، بہن، ماں اور
شکل میں ایک مثالی اور قابل تقلید نمونہ بنیں جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ
پیش کیا تھا۔ جناب ذاکر نائیک نے ان نام نہاد تعلیم یافتہ خواتین پر سخت
جو کہ خود کو حقوق نسواں کا محافظ ظاہر کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات پر ت
اس موقع پر جناب غیاث الدین بابوخاں، جناب انوار الحسن سکریٹری
نے خیر مقدم کیا۔ اور مولانا عبد العلیم اصلاحی بورڈ نے رپورٹ پیش کی اور
معراج الدین نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر نائب صدر جامعۃ البنا
احمد محی الدین صاحب نے ڈاکٹر نائیک کو جامعہ کا تفصیلی مشاہدہ کروایا

سلسلہ ص ۳۶

اردو ٹیچروں کی تقرری سے قبل اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کی شرط
میمورنڈم میں مزید کہا گیا کہ سرکاری دفتروں اور ایک ڈاک خانہ میں اردو
کا تقرر کیا جائے۔ میمورنڈم میں اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا ہے کہ
کے امتحانات میں اردو کے نمبر شامل نہیں کئے جاتے ہیں۔ اس سے اردو
کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ اسلئے پرائمری سطح ہی سے تمام کلاسوں
میں اردو کے نمبر بھی ضرور شامل کئے جائیں۔

شمس الحق ندوی
مدیر تعمیر حیات۔ لکھنؤ

ربیع الاوّل کا پیغام

ربیع الاول کا مہینہ قمری سال کا تیسرا مہینہ ہے۔ تاریخ انسانی میں یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں بھولی بھٹکی اور گم کردہ راہ انسانیت کو فلاح و صلاح کی اہ دکھانے والا وہ دستور حیات ملا جو ہر قوم و ہر ملک کے لوگوں کیلئے ہر زمانہ و ہر دور کے رلوں کے لئے کافی کیا ہے۔ اس دستور حیات میں نہ کالے گورے کا فرق رکھا گیا ہے نہ ربی و عجمی کا، نہ امیر و غریب کا، نہ بادشاہ و فقیر کا۔ کرہ ارض پر جہاں کہیں بھی انسانی ادی پائی جاتی ہے یہ دستور حیات سب کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کلکم ابناء دم و آدم من تراب۔ "تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے"، اس تور حیات میں عزت و شرف کا معیار امیری، غریبی اور قوم و قبیلہ نہیں بلکہ حسن کردار تایا گیا۔ فرمایا: یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم عوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اے انسانو! ب کو خدا نے ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تم کو قبیلہ قبیلہ و خاندان خاندان اسلئے بنایا ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ خدا کے نزدیک سب سے شریف ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو"۔

دنیا کی قومیں جس عظیم الشان غلطی کا شکار رہی ہیں وہ ہے ۱۲ ربیع الاول یدا ہونے والے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو نہ ماننا۔ جو دنیا کی ساری قومیں

کے لیے نسخہ شفا ہے۔ اس پیغام میں جو سب کے لیے ہے، سب جگہوں کے لیے [illegible]
اس میں مرد و عورت، لڑکے، بوڑھے، جوان، کنبہ و خاندان، حاکم و محکوم سب کے
راحت و آرام اور سکون و اطمینان کا سامان ہے۔ اور اس کا عملی نمونہ بھی خلافت راشدہ
کے زمانے میں پورے ۳۶ سال تک دنیا دیکھ چکی ہے [illegible]
بارہ ربیع الاول کو آنے [illegible]
حیات دیا گیا نہ صرف دستور کی حد تک نہیں رہا بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم
اس کے ایک ایک حکم پر عمل کر کے اور عملی طور پر نافذ کر کے دکھا دیا حتیٰ کہ یہ اعلان
کیا گیا کہ جو کوئی اس دستور کا عملی نمونہ دیکھنا چاہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
زندگی میں دیکھ لے اور اس کی روشنی میں چلے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ
والیوم الآخر۔ تم کو پیغمبر خدا کی پیروی (کرنی) بہتر ہے (یعنی) اس شخص کو
خدا (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو۔

اس وقت دنیا جن حالات سے گذر رہی ہے اور انسانی آبادی سارے
اور سہولتوں کے باوجود جن خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ ظلم و زیادتی کی جو گرم بازاری
ہے اور انسانی خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج اگر کہیں مل سکتا
اسی پیغام اور اسی دستور حیات میں جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے

اس پیغام نے پیغمبر کا تعلق صرف ربیع الاول کے میلادی جلسوں تک
نہیں کہ جب یہ مہینہ آئے تو اس کی یادگار منائی جائے۔ جلسے جلوس کئے جائیں
بارہ ربیع الاول کی آمد تو تجدید عہد کا ایک موقع ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے
نے اس پیغام کو سینے سے لگایا اور دل میں اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت
کا دعویٰ کیا وہی اس کو جشن کے طور پر منا لینے ہی پر اکتفا کرنے لگے ہیں

اسلامی تعلیمات کو ... [illegible] مسجدوں تک محدود کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اور وہ اس طرح کی تعلیمات کی سراسر خلاف ورزی کر کے مطلق [illegible] جاہلی کا ماحول بنا دیا۔

کیا اچھا ہوتا کہ ہم مسلمان دوسری قوموں کے سامنے پیغامِ محمدی کا وہ عملی نمونہ پیش کرتے جس کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی آجاتا اور وہ اس کی طرف بے تابانہ بڑھتیں اور اس کا کلمہ پڑھنے لگتیں۔ [illegible] سرگردانی [illegible] دنیا کو معلوم ہوتا کہ ہمارے درد کا درماں اس دستورِ حیات میں ہے جس کو ان انسانوں کے پیدا کرنے والے اس خالق نے اتارا ہے۔ جو ان کے مزاج، طبیعت، ضروریات و تقاضوں اور ان کی ان کمزوریوں کو خوب جانتا ہے جو انہیں آمادہ شر کرتی ہیں۔ "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" "کیا وہ نہ جانے گا جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔"

اسی لئے اس خالق نے اس کو وہ اصول و ضابطے بتائے ہیں جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین آئے دن بدلتے رہتے ہیں مگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے انسانوں کو جو دستورِ حیات ملا ہے، اس میں کسی تبدیلی اور رد و بدل کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ ہاں چونکہ یہ اس خدا کا بنایا ہوا دستورِ حیات ہے جو مستقبل میں پیش آنے والے تغیرات کو بھی جانتا ہے اور تغیرات پیدا بھی اسی کی قدرت و مرضی سے ہوں گے۔ اس لئے اسلامی دستورِ حیات میں وہ لچک رکھی ہے کہ ہر زمانہ کے ماہرین اصول سے فروع اور کلیات سے جزئیات کا استنباط کر کے آسانی پیدا کر دیں اور کہیں کسی زمانہ میں دشواری نہ پیش آئے۔ چنانچہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ نے اس بات کا کھلا ہوا ثبوت پیش کر دیا ہے کہ جب [illegible] انسانوں نے [illegible] اعلیٰ اور اکمل و افضل اور ضابطۂ حیات سے روگردانی کریں گے اور اپنی عقل کے [illegible] دوڑائیں گے۔ اور اپنی [illegible]

خواہش و چاہت کے مطابق قانون بنائے گا۔ تو یقینی بات ہے کہ دنیا میں فساد و بگاڑ پیدا ہو۔ اور انسان اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان پیدا کرے جس کو اس وقت کھلی آنکھوں دیکھا جاسکتا ہے۔

اسلام نے بندوں کا تعلق براہِ راست خدا سے جوڑ دیا ہے۔ جو اپنی تعلیمات کی روشنی میں جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں تک پہنچائی گئیں بلا کسی واسطہ کے اپنے رب سے راز و نیاز کی باتیں کرسکتا ہے۔ وہ دعا کرکے براہ راست اپنی خطائیں معاف کرا سکتا اور اس کی رحمت و عنایت کو اپنی طرف متوجہ کرسکتا ہے۔ اس میں برابری اور مساوات ایسی رکھی رکھی گئی ہے کہ ہر شخص جو مسلمان ہے وہ مسائل سے واقف ہے تو نماز کا امام بن سکتا ہے۔ روزہ ہر ایک رکھ سکتا ہے اس میں امیر و غریب اعلیٰ و ادنیٰ کا کوئی فرق نہیں' نماز میں ایک غریب و ادنیٰ درجہ کا مسلمان اور ایک بادشاہِ وقت دونوں کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہوسکتے ہیں۔ اسلامی مساوات کا یہ وہ نمونہ ہے جس کو دیکھ کر بہت سی سعید روحوں کو اسلام اور ایمان کی دولت نصیب ہوگئی۔ ابھی قریبی زمانہ کی بات ہے کہ امریکہ کے صوبہ "کنتاکی" کے ٹیلی ویژن ڈائرکٹر "روبن سمیث" نے نماز میں مساوات کا منظر دیکھ کر اسلام قبول کرلیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ایک دن میں نے ٹیلی ویژن پر ایک عرب بادشاہ کو خشوع و خضوع اور اطمینان سے تمام نمازیوں کے ساتھ باجماعت نماز پڑھتے دیکھا تو میرے دل میں یہ بات اتر گئی کہ اسلام میں چھوٹے بڑے امیر و غریب کا امتیاز نہیں" اور میں نے اسلام قبول کرلیا۔

پیغام محمد یعنی اسلامی تعلیمات کے وسیع و ہمہ گیر دفتر کو بطور خلاصہ ایمان اور عمل صالح دو لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ ایمان اور عمل یہی دو چیزیں ہیں جو ہر قسم کے محمدی پیغام پر حاوی ہیں اور قرآن پاک میں انہیں دونوں چیزوں پر انسانی نجات کا مدار ہے جب حقیقت یہ ہے تو ہم ربیع الاول کے جشن اور جلسوں کے وقت اپنا جائزہ لیں کہ ہمارے اندر تعلیمات نبوت محمدی کا عملی حصہ کتنا پایا جاتا ہے۔ ●●

پروفیسر وصی احمد صدیقی

کتاب (بصائر)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تازہ تصنیف "بصائر" ہندوستان کی اسلامی، علمی اور دینی تاریخ کا ایک منصفانہ جائزہ

یہ مختصر تحریر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف "بصائر" کے تعارف میں ہے۔ لفظ تعارف کے استعمال کی جسارت کے لئے میں قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔ "ایاز قدرِ خود بشناس" کی ہدایت سے واقف ہوں مگر میں نے سوچا کہ مناسب لفظ ڈھونڈھنے میں وقت لگانے کے بجائے شاہ کتاب "اولی الابصار" کی نظروں کے سامنے رکھ دوں۔ کتاب اپنے زعیموں کی داستان، ان کے کارنامے، ان کا دبستان، ان کے کارنامے، ان کا دبستانِ فکر، ان کے بناکردہ اعلیٰ دینی مدارس، تربیتی مراکز، ان کی لاثانی اصلاحی تحریکات کا ایک مختصر خاکہ ہے۔ یہ اختصار ایک بحر ناپیدا کنار کو ایک جرعۂ نوش آب میں تبدیل کرنا ہے جس کا سلیقہ ہر کس و ناکس کے قابو میں نہیں۔ بیان میں جذبات کا ایک ہم آہنگ تلاطم ہے۔ اور سطروں کے بیچ سے یہ بات اُبھری نظر آرہی ہے کہ جن کا بیان ہے اُن کی محبت اور عقیدت سے مولانا کا

دل سرشار ہے، حضرت مولانا کے قلم میں جو ہمہ گیری اور [illegible] ہے وہ سب پر جو
کوئی بھی ذکر ہو اس کا رشتہ مذہب سے ہوتا ہے۔ یہ مذہبی جذبہ دل کی گہرائی
بروئے کار آتا ہے اور کوئی شک نہیں ابدیت کا احساس دیتا ہے۔

یہ کتاب مولانا نے کیوں لکھی ہے اس کا بیان [illegible] آئے گا۔ ابھی تو کتاب میں
اِن قدسی صفات عالی نفوس [illegible] کے بانی مبانی تھے جو
پا؛ وقت کے سینہ پر ثبت ہے۔ یہ وہ مبارک لوگ ہیں جنھوں نے مذہب کی
ساتھ معاشرے کی تجدید بھی کی ہے۔ حضرت مولانا مجدد الف ثانی حضرت
سرہندی سے ابتدا کی ہے۔ اور علامہ سلیمان ندوی پر خاتمہ کیا ہے۔ بیچ میں
جلیل القدر ہستیوں کا بیان آتا ہے۔ گو زیادہ فاصلہ نہیں لیکن زمانے بدلے ہوئے
مگر ان زعیموں کی قوتیں اپنے اپنے مرتبہ اور اہمیت کے مطابق ایک دوسرے
عمل ہیں۔ یہ شیرازہ بندی مکاں اور زماں کی کارفرمائی نہیں بلکہ حقیقت کا نتیجہ
اِن بزرگوں نے اپنے پیش روؤں کے افکار میں رد و بدل نہیں کیا ہے بلکہ
بصیرت کے خزانے کو بانٹتے چلے گئے ہیں۔ وہ خزانہ جو کبھی خالی نہیں ہوتا، یہ
کہ کوئی زمانہ (خیر القرون کو چھوڑ کر) گناہ سے مبرّا معصوم لوگوں کا زمانہ
ہے۔ ہر زمانہ کو مصلح اور مجدد کی ضرورت رہی ہے۔ ان بزرگوں نے جو قدر
کی تھیں وہ ازلی اور ابدی قدریں ہیں۔ اسلامی معاشرے کے عناصر ترکیبی
ہیں۔ اِن بزرگوں کو خیر کا بے مثال شعور تھا۔ ان کا اول اور آخر قرآن مجید
جس سے شریعت بنی ہے۔ سنّتِ رسول سے ذرا سی بھی روگردانی ان
ناقابل برداشت تھی۔

اِدھر ایک طبقہ نے ذاتی مفاد یا شخصی مصلحت یا ایک خاص
طریقہ کو قائم رکھنے کے لئے ان بزرگوں کو بنا کر وہ دینی تحریکیں، ذکر و

اپنی اصلاحی کوششوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے اور تعلیمی مرکزوں کے سلسلے میں شکوک اور شبہات پیدا کرنے کی کوششیں شروع کی ہیں۔ یہ کتاب اس کے ازالہ کے لئے لکھی گئی ہے۔

مصنف کتاب نے اس رکاکت آمیز شماتت کے تدارک کے لئے کوئی الزام نہیں لگایا ہے۔ ان کی تحریر خالص ایجابی ہے۔ خیالات اور احساسات کا طلسم پیچ دتاب نہیں کہیں شک اور نا امیدی نہیں۔ کہیں شک اور نا امیدی نہیں۔ ایسی حقیقتوں کا بیان جو خود اپنی سچائی کی گواہ ہیں۔ بہت ضروری مقصد کو سامنے رکھ کر کتاب لکھی گئی ہے۔ حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ انھوں نے غیر جانبدارانہ طریقہ پر تاریخ کے صحیح واقعات کی روشنی میں پوری دیانت داری کے ساتھ ان دعوتی اور اصلاحی تحریکوں، تعلیمی ادارو ں اور فکری اور تربیتی مراکز کا مختصر تعارف پیش کرنے اور عقائد کی تصحیح کرنے، قرآن اور حدیث سے عوام کا رشتہ جوڑنے اور شرک و بدعت کی نفرت ان کے دلوں میں بٹھانے میں ان دینی مدرسوں اور دعوتی تحریکوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اُن پر روشنی ڈالی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کو پڑھ کر قارئین اُن عالمگیر دعوتی اور اصلاحی تحریکوں، تعلیمی اور تربیتی اداروں اور ان سے نسبت رکھنے والی قابل احترام شخصیتوں کی دینی خدمات سے واقف اُن کی اصلاحی کوششوں سے آگاہ، اور عقائد کو صحیح کرنے میں ان کی قربانیوں اور حیرت انگیز کامیابیوں سے روشناس ہوں گے۔

ان بزرگانِ دین کے احوال کا بیان حضرت مولانا نے جس طرح کیا ہے وہ یاد دلاتا ہے کہ مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ المسلمان النشاء، ابدی صداقتوں پر حیوانگی۔ ان بزرگوں کے فکر اور عمل کے رنگ میں جس کے مظاہر کا تخیلاتی طاقتور کی زندگی اور مذہب میں جاندار تعلق پر زور، بغرض یہ وہ کتاب ہے جو ایسا کوئی

شخص نہیں لکھ سکتا جس کا علم بے پناہ اور مزاج غیر معمولی حساس نہ ہو۔ صریر خامہ سروش ہے میں نے لکھا ہے کہ کتاب اولی الابصار کے لئے ہے۔ اس سے یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ یہ صرف خواص کے لئے ہے۔ ایک عامی کے لئے بھی غالب کا یہ حسب حال ہوگا۔ " میں سنے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے " میرا مطلب کی نہیں بلکہ دل کی بصارت اور بصیرت سے ہے۔

جن کا بیان ہے ان پر پہلے بھی حضرت مولانا بڑے شاندار مضامین کتابیں لکھ چکے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ پر تاریخ دعوت وعزیمت کی دو ضخیم جلدیں تصنیف کی ہیں جو دائرۃ المعارف کا درجہ ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ پر مولانا کی تصنیف وہ معرکۃ آلارا تصنیف ہے جس کے ٹکر کی کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب میں حضرت مولانا اسمٰعیل کے کارنامے کا مفصل بیان ہے۔ مولانا قاسم نانوتویؒ۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے حوالے حضرت مولانا کی بیشتر کتابوں میں مل جائیں گے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، حضرت مولانا محمد الیاسؒ۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ پر مولانا کے لکھے ہوئے بہترین اسکیچ پرانے چراغ شامل ہیں۔ یہ کرامتی اسلوب ہے کہ اس کتاب میں ان بزرگوں کے سوانح کارناموں کا بیان اختصار سے ہے مگر سرسری نہیں، ان بزرگوں کی عظمت کا حق ادا ہوگیا ہے۔ بقول حضرت مولانا ان حضرات نے آدم گری، مردم اور روحانی تزکیہ اور تربیت کا کارنامہ انجام دیا۔ ایسے مردان کار تیار کئے حمایت شریعت اور محو بدعت کا عظیم الشان کام انجام دینے کی صلاحیت تھے۔

(باقی بر صفحہ ۱)

سید حامد
سابق وائس چانسلر
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اردو زبان اور دیوناگری رسم الخط

جناب علی سردار جعفری کا شمار بجا طور پر اکابرین اردو میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ ان کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں بہت سلیقے سے کہتے ہیں۔ ان کی بات وقعت اور احترام کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ اسی لئے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جو کچھ کہیں گے، جو کچھ لکھیں گے، ناپ تول کر کہیں گے مضمرات اور نتائج اور ردعمل کو ملحوظ رکھ کر لکھیں گے۔ اور جب موضوع اردو زبان ہو جس کے ادب میں وہ اعتبار اور استناد کا درجہ رکھتے ہوں اور جس زبان پر ایک عرصے سے متواتر یلغار ہو رہی ہے تو سامعین اور قارئین کی یہ توقع اور بڑھ جاتی ہے کہ ہمارا ترجمان دانشورانہ سنجیدگی اور حزم و احتیاط کو بروئے کار لائے گا۔ علی سردار جعفری صاحب کے اس عقیدت مند کو افسوس ہے کہ حال میں مشہور صحافی خوشونت سنگھ صاحب سے گفتگو کے دوران انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ خوشونت سنگھ نے سوال کیا کہ اردو والے دیوناگری رسم خط کیوں نہیں اختیار کرتے۔ ان کے جواب کا مفہوم یہ تھا کہ (۱) میں تیار ہوں بشرطیکہ ہندی والے اپنی دیوناگری لپی میں وہ بندی یعنی نقطہ واپس لے آئیں جو اردو تلفظ کو بکاڑنے کے لئے خارج کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے غزل "گزل" ہو گئی ہے۔ غالب "گالب"

[illegible]

شامل کرلیں اور شروع سے آخر تک اُردو ادب کی تعلیم جاری رکھیں۔

غور فرمائیے یہ بیان نہ غور و فکر کا غماز ہے، نہ ذمہ دارانہ سنجیدگی کا۔ نہ احساس
کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اُس کا کوئی [illegible] ہندوستان میں سننے والے اور وہ لوگ
گوشۂ خاطر اُردو کی طرف نہیں [illegible] ارتحال کے لیے گوش
ہیں۔ وہ اُسے لے دوڑیں گے اپنی محفلوں میں اس پر بغلیں بجائیں گے اور ایوان
تک یہ بات پہنچائیں گے [illegible] اس کا جواب کیا آپ صرف لطیفہ، چٹکلہ
سنجی کہہ سکتے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ یہ دونوں شرطیں مان لی جائیں [illegible] اردو کا کیا بھلا؟
کی شناخت ابتدا ہی سے کیونکر محفوظ رہے گی۔ اس کے فروغ بلکہ اس کی بقا کی سبیل کیسے
نکلے گی؟ اہلِ بہار "ش" کا تلفظ بالعموم "س" کی طرح کرتے ہیں۔ اہلِ دکن "ق"
"خ" کی طرح ادا کرتے ہیں۔ تلفظ کے ان انحرافات سے اردو کا کچھ نہیں بگڑتا تو "
اوز "گجل" اور "گالب" سے کیوں بگڑنے لگا۔ دکن نے اُردو زبان کی جو خدمت
اور بہار جو خدمت کر رہا ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں۔ دوسری شرط کا موضوع سے ربط ؟
موہوم ہے۔ غالب اور میر ہندی کا نصابِ تعلیم میں شامل ہو گئے تو اُردو کو فروغ کیسے
ہوا؟ شروع سے آخر تک اُردو ادب کی تعلیم ہندی ادب کے ایک جزو کی طرح دی گئی
اُردو زبان و ادب کے فروغ کا سرو سامان کیونکر ہوا؟

محترم مضمون نگار کو یقیناً اس بات کا علم ہے کہ ہندی والے ہمیشہ سے
ایک شرط پر گلے ملانے کے لیے کمربستہ ہیں۔ وہ ناگری لپی اختیار کر لے اور اُ
خط کو جو رنگ زبان کی حیثیت رکھتا ہے خیرباد کہہ دے۔ آنجہانی پرشوتم داس ٹنڈن
سمپورنانند بھی جو اُردو دشمنی کی علامت بن گئے تھے یہی تو کہا کرتے تھے کہ اردو
ایک شیلی ہے۔ اُردو والے اس طرح [illegible]
ہندی کو اپنا [illegible]

میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اگر سردار جعفری صاحب اردو والوں کے ترجمان ہیں تو وہ بنا آنکھ جھکائے ان کو قبول کر لیں گے کہ ایسا ہندوستان میں جو اردو کے خطرے کو سدا کے لئے دور کر دے کا اُن کے ہاتھ پھر نہیں آئے گا۔ ہندی کے تحت اردو ادب کو پڑھانے کا انتظام جیسا "ذہن ہندی" کرے گا، اس کا بات قیاس کرنا دشوار نہیں ہے۔ اگر نظیر کی تلاش ہو تو دور جانا نہیں پڑے گا۔ ہندی ریاستوں خصوصاً یوپی، مدھیہ پردیش، راجستھان میں اسکولوں میں اردو کو بہ حیثیت ایک زبان کے پڑھانے کے جو اعلان و انتظامات نصف صدی سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ ان کا نتیجہ صفر رہا ہے۔ ان انتظامات کی تکمیل حکومت کے پاس تھی اور یہاں اردو کو مستقل مضمون زبان کی حیثیت سے پڑھائے جانے کی بات تھی۔ اب جب کہ اردو کو (بطور ایک ذیلی زبان کے یا ہندی کی ایک شیلی کے) پڑھانے کی ذمہ داری خود ہندی والوں کو سونپی جائے گی تو ایسی تعلیم کا جو حشر ہو گا وہ ظاہر ہے۔

ثابت ہوا کہ دونوں مذکورہ شرطیں بے مصرف اور بے اثر رہیں گی۔ زمینی حقیقتوں اور عملی صداقتوں سے بغایت دور۔

اگرچہ فاضل مضمون نگار نے یہ نہیں کہا ہے لیکن مضمون میں دلائل و حقائق کی ترتیب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورہ شرطوں یا تجویزوں کا سرچشمہ یہ حقیقت ہے کہ "اب اردو کا کوئی معاشرہ باقی نہیں ہے" یعنی اردو پسپا ہو گئی ہے۔ لہذا اُسے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اردو کا پھیلاؤ جہاں تک کہ زبان و ادب کا تعلق ہے کم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مالیگاؤں، بھیونڈی اور حیدرآباد وغیرہ ہی تک محدود ہو گئی۔ بہت سے علاقوں کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ کلکتہ اور ممبئی کے بڑے شہر اور فصیل ہند یعنی بہار اور کرناٹک کی ریاستوں کی بات کیا کیجئے گا؟ اور ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ان مدارس و مکاتب کو کس خانے میں رکھئے گا جو دین کے ساتھ اردو کا پرچم بھی بلند کئے ہوئے ہیں؟

علی سردار جعفری صاحب کی مرکزی تجویز یہ ہے کہ " اردو زبان کی بقا اور
کے لئے یہ ضروری ہے کہ اردو کتابیں اور رسالے اور اخبارات بیک وقت اردو اور دیو
رسم خط میں شائع کئے جائیں۔ اس تجویز کا علامتی پہلو یہ ہے کہ اردو کی حیثیت اب
زبان کی نہیں رہی۔ اسے ہر وقت ہندی کا سہارا درکار ہوگا۔ اب عملی طور پر غور کیجئے۔
وسائل کے اعتبار سے پہلے ہی تنگ دست ہے۔ اس پر دوہرا بوجھ ڈال دیجئے تو اب
رسائل اور اخبارات جانبر کیسے ہو سکیں گے۔ جہاں تک راقم السطور کا حافظہ کام کرتا ہے
جعفری صاحب کے ایما و سے ایک عرصہ ہوا ایک بہت ہی دلنواز اور کارآمد سلسلہ بمبئی
شروع ہوا تھا۔ اردو کے اساتذہ کے کلام کو دونوں ایک ہی کتاب میں آمنے سامنے رسم
خط میں چھاپنے کا۔ یہ محدود اور منتخب کام بھی زیادہ دن تک چل نہیں سکا۔

جیسا کہ فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے " بعض ہندی پبلشر اپنے طور پر
کتابیں دیوناگری میں شائع کر رہے ہیں۔ اور اردو کو وسیع تر حلقوں تک پہنچا رہے ہیں
" انھیں یہ کام کرنے دیجئے۔ اس طرح اردو ادب سرفرازی کے ساتھ ہندی زبان میں
ہوگا۔ ہندی زبان و ادب کی انگلی پکڑ کر نہیں، اس کا سہارا لے کر نہیں، علی سردار
صاحب سے بہتر اس بات کا احساس کسے ہوگا کہ افراد و اقوام کی طرح زبان کی بقا
اس کی غیرت، اعتماد ذات اور عزت نفس پر منحصر ہوتی ہے۔ کسی زبان کو سائل بنا
ذیلی یا ثانوی حیثیت دیجئے تو یہ پیش گوئی کرنا بہت آسان ہے کہ وہ جلد دم توڑ
گی۔ "بونزائی" میں باغبان کی تجربہ کاری تو نظر آتی ہے لیکن شجر قد چھپل اور بر
آگے وہ بہرحال حقیر گنی جائے گی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہمارے ممتاز شاعر اور نثر نگار نے انتہائی
بات کہی اور اس کی شرح جو " ہماری زبان " میں کی وہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ را
صرف یہ کہہ رہا ہے کہ ہمارے شاعر کی توقعات میں سادہ لوحی (NAIVETE)

تک ہوا ہے۔ اُردو کے تئیں اس کے امڈتے ہوئے جذبہ خیر اندیشی نے تھوڑی دیر کے لئے اُسے زمینی حقیقتوں اور تلخ تجربوں سے غافل کر دیا ہے۔ وہ اپنی زبان کی محبت میں خوابوں کی دنیا میں چلا گیا۔ چنانچہ زیرِ نظر مضمون میں اس کا ہر قول درجہ اعتبار اور منصب منطق سے ساقط ہے۔ ان میں سے کوئی بھی جانچ کی تاب نہ لا سکے گا۔ ہزیمت خوردہ شعور اصابت رائے کے لئے مہلک ہوتا ہے اور اس کی کوکھ سے جو بیانات جنمے جاتے ہیں وہ بے ہنگام ہوتے ہیں

اُردو والوں کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ تاہم ان کا سوادِ اعظم اس بات پر متفق ہے کہ اگر اس کے رسم خط سے اُردو کو محروم کر دیا گیا تو یہ زبان زندہ نہیں رہے گی۔ رسم خط اور زبان کا تعلق لباس اور جسم کا سا نہیں۔ دراصل یہ جسم و جان کا تعلق ہے۔ اگر آپ اس حد تک میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہیں تو یہ تو تسلیم کر ہی لیجئے کہ یہ تعلق جلد اور جسم یا کھال اور بدن کا ہے۔ بدن کی کھال اُتار لیجئے گویا بدن کو فنا کرنے کا انتظام کر لیا اور وہ بھی بڑے اذیت ناک ڈھنگ سے۔

کوئی ۲۷ سال ہوئے راقم سطور برطانیہ کی سسیکس (SUSSEX) یونیورسٹی میں وکالس سے متعلق ایک کورس کرنے گیا تھا۔ اس تیس سال پہلے ایم اے میں ہمارے انگریزی کے اُستاد پروفیسر ایف جے فیلڈین نے بعض ایسے انگریزی الفاظ اور محاوروں کے استعمال کے خلاف ہمیں متنبہ کیا تھا جو ہندوستان میں رواج پا گئے تھے۔ ان میں سے بعض کو میں نے انگلستان میں مستعمل پایا۔ ان سے کہیں زیادہ تعداد امریکی محاوروں کی تھی۔ میں نے انگریزوں سے وجہ پوچھی۔ جواب ملا کہ امریکہ والے بیس کروڑ ہیں۔ ہم پانچ کروڑ۔ لہٰذا اُن کی زبان غالب رہے گی۔ کتابوں اور اخباروں کے اوراق میں ہندی اور اُردو کو جس طرح ملانے کی تجویز ہے ملا کر دیکھئے آدھ لیپسی کر معطون ہو جائے گی۔

نہ ہمارا ہماری زبان سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جس سے اُردو کی لسانی غیرت اور استقلال اور سرفرازی کو کسی طرح کی ٹھیس پہنچے۔ ایسی بات زبان یا نوکِ قلم

یہ اتنا ہی حقیقت اور زیادہ بے محل ہے جب ہندو قوم اردو میں تازہ خون دوڑانے کے لئے روشن ہوگئے ہیں۔ جب ہندوستان کو ایک ایسی پر فریب پارٹی سے نجات مل گئی ہے جس نے چالیس سال کے طویل عرصے میں اُردو کو اعلان و بیان کے انبار کے نیچے دبا دیا۔ نہ اُردو کے لئے خود کچھ کیا نہ اُردو والوں کو کرنے دیا۔ اُمید ہو چلی ہے کہ ہندوستان لفظ جمہوریت شرمندہ معنی ہو جائے گا اور محروموں اور مظلوموں کے ساتھ اب انصاف ہوکر رہے گا۔ اُردو والوں پر واجب ہے کہ یہ ایک آواز نئی مرکزی حکومت سے اُردو کی سلامتی، استقلال، وقار اور فروغ کے لئے مطالبات کریں۔ کوئی بات ایسی کہی جائے جس سے یہ مطالبات کمزور پڑ جائیں۔ اُردو والے اگر مختلف سمتوں میں چلنے لگے تو نئی حکومت بھی اُن کی بات نہیں سُنے گی اور لوٹ کر کہے گی کہ ناگری لپی اختیار کرلو ترقی کے دروازے تم پر کُھل جائیں گے یا پھر کانگریس کی طرح ان سے دل لبھانے اور دل فریب وعدے کرنے لگے گی۔

ہم جانتے ہیں کہ سردار جعفری صاحب اُردو رسم خط کے مخالف نہیں لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ ان کی تجاویز روبہ عمل آجائیں تو کسی کو اس رسم خط کی مخالفت کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ●●

(سلسلہ صفحہ ۸)

نمایاں شخصیتوں کا بھی تعارف کرائیے۔ لیکن میں کیا کرتا حجاز کی تو ایک ہی ہستی۔ جس کی باتیں کئے جایئے جس کی وجہ سے حجاز، حجاز ہے اور عالم اسلام، عالم ہے

آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

سورج کے سامنے ستاروں اور چراغوں اور اس کی روشنی سے روشن ہونے والوں کا کیا ذکر، بس یہی حجاز کی کہانی ہے اور یہی حجاز کا تعارف!

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ماخوذ۔ از کاروان مدینہ)

سید امین الحسن رضوی

متنازعہ بابری مسجد

اور دفعہ ۱۳۸ (۲)

مرکز میں متحدہ محاذ کی مخلوط حکومت کا مختصر پروگرام سامنے آیا ہے اس میں بابری مسجد کے متعلق اِس ارادے کا اظہار کیا گیا ہے کہ اِس معاملہ کو دستور ہند کے آرٹیکل ۱۳۸ (۲) کے تحت سپریم کورٹ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ اقدام یکسر نامناسب اور عنقریب ختم ہو جانے والے معاملہ کو خواہ مخواہ طوالت اور اُلجھاوے میں ڈالنے کا باعث ہوگا۔ آرٹیکل ۱۳۸ (۲) کا تجزیہ اور اس کے تحت اِس مجوزہ اقدام کے مضمرات کو بیان کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اب کس مرحلہ میں ہے۔ اس کو واضح کر دیا جائے اور اس مرحلہ تک آنے کی مختصر تاریخ بھی بیان کر دی جائے۔

سمہاراؤ کی کانگریسی حکومت نے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد اُتر پردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی ریاستی حکومت کو برخاست کر کے وہاں صدر راج نافذ کر دیا۔ پھر ۱۹۹۳ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعہ اس خطہ اراضی کو جس پر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء تک بابری مسجد موجود تھی اور اس سے ملحقہ کچھ اراضی کو قانون حصول اراضی (LAND ACQUISITION ACT) کے تحت اپنی ملکیت میں لے لیا اور ساتھ ہی بابری مسجد سے متعلق حق ملکیت کے تمام مقدمات کو جو یکجائی طور پر الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں زیر سماعت تھے ختم (ABATE) کر دیا۔ اس کے

خلاف سپریم کورٹ میں چارہ جوئی کی گئی تو سپریم کورٹ نے آرڈیننس کو کالعدم
دیتے ہوئے تمام مقدمات کو تسلیم کیا اور انہیں الہ آباد ہائی کورٹ لکھنؤ بنچ
ہدایت کے ساتھ واپس کر دیا کہ تحویل کے مطابق ان [illegible] کا جلد [illegible] نیز یہ بھی ہدا
کہ اگر حق ملکیت کا فیصلہ مسلمانوں (بابری مسجد) کے حق میں ہو تو وہ ساری زمین
بابری مسجد قائم تھی اور بابری مسجد کے تحت ملحقہ اراضی مسلمانوں کے حوالہ کر دی
گی اور مقدمات کا فیصلہ ہونے تک یہ اراضیات بحیثیت رسیور (بہ الفاظ
امانت) مرکزی حکومت کی تحویل میں رہیں گی۔

ان مقدمات کے لکھنؤ بنچ کو واپس کئے جانے کے بعد ایک فریق کی طرف
ان مقدمات کی پیش رفت میں رکاوٹیں ڈالنے کی مختلف طریقوں سے کی جا
کوششوں کو نمٹاتے ہوئے اب بالآخر یہ مقدمات اس مرحلہ میں داخل ہو گئے
گواہوں کے بیانات قلمبند کئے جانے شروع ہو جائیں اور امید کی جا سکتی ہے
۱۹۹۶ء کے ختم ہوتے ہوتے یا سال ۱۹۹۷ء کے اوائل تک سارے مراحل طے
کی نوبت تک یہ مقدمات پہنچ جائیں گے چونکہ ان مقدمات کی سماعت ایک آ
کر رہی ہے اسلئے اگر بنچ ان کو عاجلانہ سماعت کا طریقہ اختیار کرلے تو اس
پہلے ہی ان مقدمات کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی جانب سے پوری مستعدی
ساتھ اس بات کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ ان کی جانب سے کوئی وجہ تاخیر پیدا نہ
جب کہ فریق مخالف کا انداز اس کے بالکل برعکس ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے آئیے اب دستور ہند کے
۱۳۸(۱) اور اس کے تحت مجوزہ اقدام کے مضمرات کا جائزہ لیں۔

آرٹیکل ۱۳۸ (۱) کہتا ہے کہ پارلیمنٹ اگر اس بارے میں ایک قا
کرے تو سپریم کورٹ کو کسی بھی ایسے امر (MATTER) کی سماعت کا اختیا

دیا جائے گا جس کو مرکزی حکومت اور کوئی ریاستی حکومت باہمی رضامندی سے سپریم کورٹ کے اختیار سماعت میں دے دیں۔

اس آرٹیکل کے روبہ عمل میں آنے سے پہلے دستور میں درج چند مراحل سے لازماً گزرنا ہوگا۔ [illegible] پہلا مرحلہ تو ہے مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کی باہمی رضامندی کا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اتر پردیش میں (جس ریاست سے یہ معاملہ متعلق ہے) کوئی عوام کی منتخبہ حکومت موجود نہیں ہے۔ ریاستی اسمبلی تحلیل کی جا چکی ہے اور وہاں صدر راج نافذ ہے۔ وہاں کی حکومت کو آرٹیکل ۱۳۸ (۲) کے معنی میں "ریاستی حکومت" نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتر پردیش میں جب تک اسمبلی کے انتخابات ہو کر وہاں ایک نمایندہ حکومت تشکیل نہیں پا جاتی اس وقت تک آرٹیکل ۱۳۸ (۲) کے تحت پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس غرض کے لئے "ریاستی حکومت" کی رضامندی ضروری ہے۔ لیکن بہ فرض محال اگر مرکزی حکومت کو یہ قانونی رائے حاصل ہو جائے کہ صدر راج کو بھی آرٹیکل ۱۳۸ (۲) کے اغراض کے لئے "ریاستی حکومت" سمجھا جا سکتا ہے تو ایسی صورت میں ریاستی حکومت کی رضامندی تو خیر فوراً ہی حاصل ہو جائے گی لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس نوبت پر اس کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے گا اور پھر یہ معاملہ ایک غیر معینہ مدت تک کھٹائی میں پڑ سکتا ہے لیکن اگر دوسری شکل ہو کہ اتر پردیش میں نافذ صدر راج کو ریاستی حکومت نہ سمجھا جائے تو وہاں اسمبلی کے انتخابات مکمل ہو کر نئی حکومت کے وجود میں آنے تک سال ۱۹۹۶ء کا ماہ نومبر ختم ہو جائے گا۔ ابھی [illegible] بھی نہیں کہہ سکتا کہ انتخابات کے نتیجہ میں وہاں کسی ایک پارٹی کی حکومت قائم ہوگی یا چند پارٹیوں کی مخلوط حکومت۔ تاہم یہ تو طے ہے کہ اگر بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہو یا بھارتیہ جنتا پارٹی کی سربراہی میں کوئی مخلوط حکومت بنے تو پھر ریاستی حکومت کی رضامندی اس مجوزہ اقدام کو حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے بھارتیہ جنتا پارٹی کے [illegible] اٹل بہاری باجپئی [illegible] کو اس

زیر تجویز اقدام کو علی الاعلان اور واضح طور پر مسترد کر چکے ہیں۔ لیکن اگر بھارتیہ جنتا
کے علاوہ کسی اور ایک پارٹی یا چند پارٹیوں کی مخلوط سرکار بنے تو بھی یہ نہیں کہا جا
اس سرکار کا اس بارے میں رویہ کیا ہوگا۔ اگر نہ سرکار رضامندی دینے سے انکا
تو یہ معاملہ اول نوبت پر ہی ختم ہو جائے گا۔ ممکن یہ بھی ممکن ہے کہ مرکزی حکومت
حکومت کے درمیان اس مسئلہ پر گفت و شنید کا باب کھل جائے اور بالآخر ریاستی
کی رضامندی حاصل کرنے میں ایک اچھا خاصا عرصہ لگ جائے۔

اس مرحلے سے گزرنے میں سال ۱۹۹۷ء یقیناً ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد
آئے گا اس موضوع پر ایک مسودہ قانون مرتب کر کے پارلیمنٹ میں پیش کرنے اور پا
کے دونوں ایوانوں سے اُسے منظور کروانے کا۔ چونکہ بھارتیہ جنتا پارٹی اس کو پہلے
کر چکی ہے۔ اسلئے وہ پارلیمنٹ میں بھی یقیناً اس کی مخالفت کرے گی اور اس
پارٹیوں یعنی شرومنی اکالی دل، ہریانہ وکاس پارٹی اور سمتا پارٹی کی تائید بھی اُسے
ہوگی جس کی وجہ سے اس مسودہ قانون کا دونوں ایوانوں سے منظور ہو جانا آسان نہ
جمہوریہ کی منظوری کے مرحلے سے اُسے گزرنا ہوگا۔ جس میں کچھ وقت لگے گا تب کہیں
یہ معاملہ سپریم کورٹ میں پہنچ جائے گا۔

الہ آباد ہائی کورٹ میں ان مقدمات کی سماعت شروع ہو چکی ہے ا
الاروئے قانون سپریم کورٹ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ از خود ان مقدمات کو
ہائی کورٹ سے اپنے پاس منتقل کر کے ان کی سماعت کر سکے۔ اسلئے بظاہر آرٹیکل
رس کے تحت اقدام صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک قانون کے ذریعہ ان تمام مقد
الہ آباد ہائی کورٹ سے ہٹا کر سپریم کورٹ کو بہ غرض سماعت و فیصلہ منتقل کر
پیدا کی جا سکے۔ لیکن بات یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔ قانون سازی کے ذریعے سپ
کو اختیار سماعت دے تو سکتی ہے لیکن وہ تو پارلیمنٹ اور حکومت سپریم

اس بات کا پابند کر سکتی ہے کہ وہ اس حاصل شدہ نئے اختیار کو استعمال کرے ہی کرے اسلئے ہونا یہ چاہیئے کہ حکومت ہند اس قانون کے عمل میں آنے کے بعد اٹارنی جنرل کے ذریعہ سپریم کورٹ سے یہ درخواست کرے کہ وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں زیر دوران تمام مقدمات کو اپنے پاس منتقل کر کے خود ان کی سماعت کرے اور یہ بہرحال سپریم کورٹ کے اختیار تمیزی پر منحصر ہوگا کہ وہ اس درخواست کو قبول کرے یا مسترد کر دے۔ لیکن سپریم کورٹ کوئی بھی فیصلہ بہرحال بجرد اٹارنی جنرل کی درخواست پر نہیں دے گا بلکہ لازماً تمام فریقین کو وجہ نمائی کی نوٹس جاری کرے گا کہ وہ حاضر ہو کر اپنے عذرات پیش کریں۔ خود اس مرحلے سے گذرنے میں چند مہینے لگ جائیں گے۔ پھر تمام فریقین کے وکلاء کی بحث کے لئے تاریخ مقرر کی جائے گی۔ بحثیں ہوں گی پھر فیصلہ ہوگا جس میں ایک بہت طویل عرصہ لگ جائے گا۔ اس کے بعد بھی اگر سپریم کورٹ حکومت کی درخواست نامنظور کر دے اور اپنے نئے حاصل شدہ اختیارات کو استعمال کرنے سے انکار کر دے تو یہ ساری محنت اور یہ سارا طویل عرصہ محض رائیگاں جائے گا۔

اگر متحدہ محاذ کی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اس طریقہ کار کو اختیار کرنے سے ان مقدمات کا فیصلہ نسبتاً جلد ہو سکے گا تو اس سے یہ منشا کسی طرح بھی پورا نہیں ہو سکتا اوپر جو تفصیل میں نے پیش کی ہے اس کے مطابق اس اقدام سے تو ان مقدمات کا فیصلہ ہونے میں مزید اور بہت زیادہ تاخیر ہونے کا امکان ہے۔ جبکہ بہ صورت موجودہ الہ آباد ہائی کورٹ میں ان مقدمات کا فیصلہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینوں میں ہو جائے گا۔

پھر اس طریقہ کار کو اختیار کرنے میں ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ اگر ان مقدمات کا فیصلہ پہلے الہ آباد ہائی کورٹ ہی میں ہو تو وہ فیصلہ جس فریق کے بھی خلاف ہوگا اس کے لئے سپریم کورٹ میں اپیل کرنے میں ایک چارہ کار باقی رہے گا۔ لیکن اگر براہ راست سپریم کورٹ ان مقدمات کی سماعت کرے تو اس کا فیصلہ ایسا

قطعی ہوگا جس کے خلاف کہیں بھی اپیل نہیں ہو سکتی اور اس طرح فریقین مقد
اپنے اپیل کے ایک حق سے محروم ہو جائیں گے۔
ان وجوہ سے متحدہ محاذ کی مرکزی حکومت کا یہ فیصلہ دانشمندانہ نہ
ہے اور حق و انصاف کے تقاضے اسی طرح بہتر طریقہ پر پورے ہو سکتے ہیں کہ
حکومت اپنے اس مجوزہ اقدام کو منسوخ کر کے ان مقدمات کو الہ آباد ہائی کورٹ
میں چلنے دے۔ البتہ اگر حکومت واقعی یہ چاہتی ہے کہ ان مقدمات کا فیصلہ
ہو جائے تو اُسے چاہیئے کہ الہ آباد ہائی کورٹ میں اپنے ایڈوکیٹ جنرل کو ہدایت
کرے وہ ہائی کورٹ سے ان مقدمات کے عاجلانہ فیصلہ کی درخواست کرے اور
طرف سے کوئی ایسا عمل نہ کرے جو ان مقدمات میں تاخیر کا سبب بن سکے۔
(نوٹ :۔ یہ مضمون دراصل ایک مراسلہ ہے جو صاحب تحریر نے مسلم پرسنل ا
بورڈ کے پاس برائے غور و خوض بھیجا ہے۔ افادہ عامہ کیلئے اس کا متن یہاں شائع
کیا گیا ہے۔) ●●

(سلسلہ صـ۳۳)

صاحب، ہارون ایوب صاحب، پروفیسر محمد زاکر، ڈاکٹر عبد العزیز (ممبئی)
سید عبد العزیز (آگرہ)، اسرار اکبرآبادی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، جناب سید شا
اس جلسے میں جامعہ اُردو کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے کچھ کمیٹیا
تشکیل دی گئیں۔ دستور کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر رفیق زکریا، مالی کمیٹی کے چیرمین سـ
صدیقی صاحب اور پبلیکیشن کمیٹی کے چیرمین پروفیسر جگن ناتھ آزاد وغیرہ منتخب
جامعہ اُردو ایک امتحانی ادارہ ہے۔ اس سال ایک لاکھ سے زاید
اس ادارے سے ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل، اور معلم اردو کے امتحا

جامعہ اردو علی گڑھ کے انتخابات

ڈاکٹر رفیق زکریا (چانسلر) اور خلیق انجم وائس چانسلر منتخب

جامعہ اردو (علی گڈھ) کی مجلس عام کی میٹنگ ۲۰ر جولائی ۹۶ء کو اردو گھر نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں جامعہ اردو کے عہدے داروں اور مختلف کمیٹیوں کے انتخابات عمل میں آئے۔ ہندوستان کے مشہور' ممتاز دانشور' مفکر' انگریزی اور اردو کے ادیب اور سیاست داں ڈاکٹر رفیق زکریا چانسلر اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری' اردو کے صف اول کے نقاد اور محقق ڈاکٹر خلیق انجم وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ انگریزی کے نامور صحافی کلدیپ نیر پرو چانسلر' پروفیسر ظہیر احمد صدیقی پرو وائس چانسلر اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ خازن منتخب ہوئے۔

مجلس عام کے اراکین میں ماہر اقبالیات اور اردو کے ممت[illegible]اد اور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور "عوام" کے ایڈیٹر شاہد صدیقی' "انقلا[illegible]" کے ایڈیٹر ہارون رشید صاحب' پروفیسر عبد المغنی' رشید حسن خاں صاحب' پروفیسر آفاق احمد کشمیری لال ذاکر صاحب' ڈاکٹر طیب ابدالی' ایم حبیب خاں' [illegible]ث الدین فریدی

(باقی [illegible])

پروفیسر عنوان چشتی نے

اولڈ بوائز علی گڈھ کے آل انڈیا مشاعرے میں کامیابی کا نیا ریکارڈ قائم کر دیا

اولڈ بوائز علی گڈھ کا آل انڈیا مشاعرہ فکی اڈی ٹوریم میں شا
شوکت سے پروفیسر شہریار کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں پروفیسر
عنوان چشتی مہمان خصوصی تھے ان حضرات کے علاوہ اس میں نفیس قازی پو
منظور ہاشمی، ڈاکٹر نشہر رسول، ڈاکٹر اسعد بدایونی، اسد رضا، عمران عظیم (ایڈیٹر
اسلم چشتی ڈبائیوی، سکندر عاقل، نظر برنی، نورجہاں ثروت، شہباز ندیم،
سعیدی، ثریا رحمان، مظہر امام، مائل حیات وغیرہ اور دوسرے بہت سے
شاعروں نے کامیابی کے ساتھ مشاعرے کے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

اولڈ بوائز کا یہ پہلا آل انڈیا مشاعرہ تھا، جس کی ابتدا میں ہنیم افا
(آئی پی ایس) نے ایک جامع تقریر کی۔ اور نظامت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس مشا
میں اگرچہ پروفیسر عنوان چشتی نے اپنے مقام پر ہی اپنا کلام پیش کیا۔ مگر ان کے
چند نثری جملوں نے سامعین کے دلوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی اور جب انہوں
اپنا کلام شروع کیا اور اپنے مخصوص انداز میں شعر خوانی کی تو سامعین نے دل کھو
داد دی، اور ونس مور، مکرر ارشاد، "دوبارہ" جیسے فلک شگاف نعروں سے

آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ پروفیسر عنوان چشتی نے جم کر کئی غزلیں سنائیں۔ چند شعر نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں۔

یہ فسادات کے بیوپاری نہیں دیکھے جاتے [illegible] چاقو نہیں دیکھے جاتے
اُس کی آنکھوں میں کئی چاند اُتر آئے ہیں [illegible] مرے جگنو نہیں دیکھے جاتے

اُنہوں نے داد [illegible]

بات تو یہ سچ ہے لیکن [illegible] رسوائی ہے
جس کے ہاتھ میں تیر کماں ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے
میرے گھر سے اُس کے گھر کا فاصلہ کوئی خاص نہ تھا
وہ بھی پانی مانگ رہا ہے جس نے آگ لگائی ہے

ڈاکٹر شہر رسول نے اِس شعر پر خوب داد پائی

عزیز کہتے رہیں لیکن حسد بھی کرتے ہیں
منافقین مجھے مستند بھی کرتے ہیں

اسلم چشتی نے اس شعر پر بے حد داد پائی

میں نے بارہا اسلم تجربہ کیا پیہم
جھونپڑوں سے جلتی ہیں کوٹھیاں امیروں کی

سکندر عاقل نے کہا۔

دیکھنا یہ ہے ترے شہر میں کیا رکھا ہے
جس نے ہر شخص کو دیوانہ بنا رکھا ہے

●●●

اُردو سے متعلق گجرال کمیشن کی سفارشات پر عمل کا مطالبہ

آل انڈیا اُردو جرنلسٹ آرگنائزیشن نے صوبائی گورنر اور مرکزی سرکار
مطالبہ کیا ہے کہ حکومت اُردو سے متعلق جو وعدے کرتی چلی آئی ہے اُن پر عمل
کیا جائے۔

آرگنائزیشن کے ایک ترجمان کے مطابق اس سلسلہ میں ایک میمورنڈم صوبائی
اور وزیر اعظم کو بھیجا گیا ہے جس میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ اقلیتوں اور اُر
متعلق گجرال اُردو کمیشن اور گوپال سنگھ کمیشن نے جو سفارشات کی تھیں اُن
عمل درآمد نہیں ہوا ہے۔ ان کمیشنوں کی سبھی سفارشات بالائے طاق رکھ دی گئی
میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ حکومت کے اس رویہ سے اقلیتوں اور اردو حلقوں
بے چینی پائی جا رہی ہے۔ میمورنڈم میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ سرکار اپنے وعدے
مطابق اُردو محض دوسری سرکاری زبان ہونے کا نام نہ دے بلکہ اُردو کو
روزگار سے جوڑ کر ان کمیشنوں نے جو سفارشات کی تھیں اُن کو عملی جامہ پہ
اس کے ساتھ ساتھ ریاست کے ہر ایک پرائمری اسکول' جونیر ہائی اسکول
انٹرمیڈیٹ' سرکاری و نیم سرکاری اسکولوں میں لازمی طور پر اُردو پڑھا

(۱۰ صفحہ نمبر

اُردو اکاڈمی دہلی کے انعامات

۱۹۹۶ء کے کل ہند نوعیت کے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے لئے جو ۵۱ ہزار روپے مالیت کا ہے، اُردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کے نام کا اعلان کیا گیا۔ علمی و ثقافتی تحقیق کا ایوارڈ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی کو، اُردو صحافت کا ایوارڈ مولانا وحید الدین خاں کو، تخلیقی نثر کا ایوارڈ جناب ضمیر حسن دہلوی کو اور اُردو شاعری کا ایوارڈ جناب امیر آغا قزلباش کو دیا جائے گا اور بہترین اُستاد (اُردو میڈیم) کا ایوارڈ محترمہ شاہین اختر خاں کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا۔ یہ تمام ایوارڈ ۱۱ ہزار روپے مالیت کے ہیں۔ اُردو خطاطی ایوارڈ جو گیارہ ہزار روپے مالیت کا ہے، محمد سالم کو دیا جائے گا۔ اسی موقع پر ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والی اُردو کتابوں پر بھی انعامات کا اعلان کیا گیا۔ چار چار ہزار روپے کے پندرہ اور دو دو ہزار روپے کے سات انعام کل ۲۲ کتابوں پر دیے گئے تفصیل حسب ذیل ہے۔

چار ہزار روپے مالیت کے انعامات

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (مولانا ابوالکلام آزاد) پروفیسر صغرا مہدی

(سپہر کرینا کی نائل)۔ آمنہ ابوالحسن (یادش بخیر)۔ ڈاکٹر محمد شاہد حسین
(ڈرامہ فن اور روایت)۔ ڈاکٹر سید جمال الدین [illegible] راج میں مذہب
سیاست [illegible] محمد عثمان [illegible]
خطوط اور مجنوں کی ڈائری)۔ قاضی عبیدالرحمن ہاشمی (سید عابد حسین
شارب ردولوی (تنقیدی مباحث)۔ پروفیسر عتیق اللہ (ادبی اصطلاحات
کی وضاحتی فرہنگ)۔ [illegible] جہاں ثروت (بے نام
عطاء الرحمن قاسمی (دہلی کی تاریخی مساجد)۔ ڈاکٹر خالد محمود (اردو
تنقیدی جائزہ)۔ عادل اسیر (بچوں کی رباعیاں)۔

دو ہزار روپے مالیت کے انعامات

ڈاکٹر اسد رضا زیدی (ماہیت الامراض)۔ کرشن پری (میری
میری منزل)۔ عبدالمعروف خاں (کاسۂ خیال)۔ ابرار کرتپوری (خالق
شہباز ندیم ضیائی (شہباز)۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں (شعریات بال جبریل
مسعود الحق (اساتذہ کی تعلیم و تربیت)۔

اردو ناشرین ایوارڈ برائے ۹۴ء اور ۱۹۹۵ء

معیار پبلی کیشنز (چار ہزار روپے)۔ مائکرو بک ڈپو (چار
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (چار ہزار روپے)

(پریس ریلیز اردو اکادمی، دہلی)

ممتاز شاعرہ نایاب سلطانہ کا انتقال

یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ممتاز شاعرہ محترمہ نایاب سلطانہ کا ۲ر اگسٹ کو بعد نماز جمعہ طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ تدفین قبرستان گوشہ محل میں عمل میں آئی۔ محترمہ نایاب سلطانہ جناب عبدالکریم مرحوم کی اہلیہ تھیں۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ محترمہ نایاب سلطانہ کو حیدرآباد کے بعض کل ہند مشاعروں میں کلام سنانے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ محفل خواتین کی بانی ممبروں میں سے ایک تھیں۔ شاعروں ادیبوں میں اپنی خوش مزاجی کی وجہ سے مشہور تھیں۔

نوجوان شاعر قوی سیف کا انتقال پر ملال

جدید لب و لہجہ کے ممتاز نوجوان شاعر محمد عبدالقوی المعروف قوی سیف ولد عبداللہ بن سعید مرحوم فٹبال کوچ اے پی پولیس کا ۴ر اگسٹ اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ قوی سیف کا شمار نوجوان نسل کے ممتاز شاعروں میں ہوتا تھا۔ آپ کی شاعری مجموعہ ایک جلتی آگ ۱۹۹۳ء میں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی جزوی اعانت سے شائع ہوا تھا۔ قوی سیف ایک اچھے افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار بھی تھے۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے کئی محفل شعر میں بھی انہوں نے کلام پیش کیا۔ مرحوم ممتاز افسانہ نگار جناب عوض سعید مرحوم کے بھتیجے اور جناب اوصاف سعید کے چچازاد بھائی تھے۔ پسماندگان میں والدہ، اہلیہ، دو بھائی اور بہن بھی شامل ہیں۔

محمد ضیاء عرفان حیاتی

(قسط اوّل)

دارالسلام کا کُل ہند نعتیہ مشاعرہ

کُل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے زیرِ اہتمام ہر سال عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر سالارِ ملت سلطان صلاح الدین اویسی صدر کل ہند مجلس اتحاد و معزز رکن پارلیمنٹ کی نگرانی میں یوم رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم و کل ہند نعتیہ زیر نگرانی محترم نواب زاہد علی خاں صاحب چیف ایڈیٹر روزنامہ سیاست منعقد ہوا ان دو روزہ سالانہ تقاریب میں سالارِ ملت کی خصوصی دلچسپی، انتھک محنت مساعی اپنے رفقاء کے تعاون سے جلسہ و مشاعرہ کو مرکزی حیثیت دینے میں جو نمایاں رول ادا رہا ہے وہ قابلِ صد آفرین ہے۔ مشاعرے حیدرآبادی تہذیب کی یادگار ہیں جو کو مشاعرہ کا شہر کہا جاتا ہے۔ مشاعرہ اردو کی زندگی کی علامت ہے خصوصاً نعتیہ نجاتِ اُخروی کا ذریعہ ہے۔ حیدرآباد کی تاریخ میں اتنا عظیم الشان کامیاب مشاعرہ نظیر آپ ہے۔ شاید ہندوستان میں ایسا کوئی مشاعرہ دیکھنے میں آیا ہو۔ دارالسلام یوم رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم اور کل ہند مشاعرہ' کا جو اہتمام کیا جاتا ہے اس مثال مشکل سے ملتی ہے۔ مشاعرہ گاہ کو جو برقی قمقموں سے بقعہ نور بنا دیا جاتا ہے اس کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ رات دن میں تبدیل ہو گئی ہے۔ باب الداخلہ کے پاس ہی پرکشش فواروں کا منظر اور عوام کی چہل پہل واقعی ایک جشن کا منظر پیش کرتا ہے۔ شمع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانے جوق در جوق شریک ہو کر حضور سے اپنی اٹوٹ وابستگی اور وار

اظہار کرتے ہیں یا پھر ایسے منفی جذبات میں کینہ، حسد، تنگ نظری، رقابت، مخاصمت، انتقام، ذاتی عناد شامل ہو کر شاعر کے دل کو فیضان نعت سے محروم کر دیتا ہے لیکن یہ خصوصیات اگر کسی نعت گو معتبر شاعر میں موجود ہوں اور وہ اپنے ہمعصر شعراء کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھتا ہو انہیں مشاعروں میں مدعو کرنے اور ذکر رسول سے محروم کرنے کا منصوبہ رکھتا ہو تو وہ خود فیضان نعت اور چشم رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مجھے اس موقع پر حضرت روح لکھنوی مرحوم کا شعر یاد آ رہا ہے:

ہم نعت [illegible] کیا ہے سرکار جانتے ہیں
کس کس کے دل میں کیا ہے سرکار جانتے ہیں

نعتیہ محفلوں میں اپنے ہمعصر شعراء کو نعت پڑھنے سے محروم کرنا گویا یاد ذکر رسول سے روکنا ہے۔ اونچے کہلانے والوں کی اگر ایسی ذہنیت ہو تو پھر قوم کا خدا حافظ ہے۔ نعت گوئی کا ایک مزاج اور سلیقہ ہوتا ہے۔ ہر غزل گو شاعر نعت گو شاعر نہیں ہو سکتا حیدرآباد میں کئی طرح کے نعتیہ مشاعرے ہوتے ہیں لیکن جن مشاعروں میں وہ شعراء شریک نہیں ہوتے جو دارالسلام میں مشاعرہ پڑھنے کو باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے جو شعراء دن رات صحیح نعت گوئی میں مصروف ہوں ان کی نعت گوئی کی مشق اور مزاج نکھرا ہوا ہوتا ہے لیکن [illegible] نہیں کرتے بلکہ ان ہی لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے جو معتبر [illegible] ان کی اطاعت گذاری کرتے ہیں دارالسلام [illegible] جن شعراء کو مدعو کیا گیا تھا معتبر شاعر ہونے [illegible] فہرست سے نکال دیئے۔ ان کی جگہ [illegible] معتبر شاعر کے اعزاز میں مشاعرے منعقد [illegible] رہتے ہیں۔ اپنے اختیارات سے [illegible] کام لینا مناسب بات نہیں۔

سالارملت اور شعرائے کرام کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے
اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے شعرا اور سامعین میں بے چینی پیدا کی جا رہی
مشاعرہ جب معتمد مشاعرہ کا تقرر فرماتے ہیں تو کیا وہ دوسرے شعرا کو نظر انداز کر
بنتے ہی منتظمین کو فراموش کر دیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ دار السلام کے مشاعرے میں
نے ایک شاعر کو مدعو کرنے سے پہلے فرمایا کہ میری فہرست میں ان کا نام نہیں ہے
کی سفارش پر ان کو پڑھایا جا رہا ہے۔ اس اعلان سے ان کی تنگ نظری
ڈکٹیٹرشپ، احساس برتری اور دوسروں کو رسوا کرنے کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے
سے قبل موصوف نے خود میزبان اول کی حیثیت سے تعارف کروایا۔ میزبان اول
قابل غور ہے۔ دار السلام کے پلیٹ فارم کو ذاتی دشمنی کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا
جماعت سے اچھے شعراء کو سرکار کی محفل میں آنے سے روکنا ایک ذمہ دار معتمد مشاعرہ کے
شایان شان نہیں۔ جناب ثقلین حیدر جو شعرا کی کثیر تعداد کے باوجود مشاعرہ
برقرار رکھتے ہیں۔ ہر شاعر کا تعارف بڑے سلیقے سے کرواتے ہیں اور سامعین کو بور
نہیں دیتے۔ قابل تقلید ہے اسکول میں جس طرح ایک مدرس اپنے بچوں کی حا
اس طرح ناظم مشاعرہ صرف شاعر کا نام پکارے تو مشاعرے کی کیفیت برقرار رہ
اچھے شعراء کا انتخاب باذوق سامعین کی اور ناظم کی بجائے ناظم مشاعرہ
کامیابی کے ضامن ہیں۔ معتمد مشاعرہ ایک ذہین و باصلاحیت شخص
ہوتا ہے۔ وہ سامعین کی نفسیات اور شعرا کے مزاج کے مطابق شاعر کو پیش کرتا ہے
میں شاعر کا تعارف اور اس کی حوصلہ افزائی ناظم مشاعرہ کی مقبولیت کو چار چا
ہے۔ مشاعرہ گاہ میں جناب زاہد علی خان چیف ایڈیٹر سیاست کے علاوہ
مستقل اور سید سجاد سابق رکن اسمبلی، صلاح الدین اویسی، مدینہ منورہ، ایم
ایم ایل اے، اکبر الدین اویسی، حاجی سیٹھ اعظم خان، سیلو... وغیرہ تشریف رکھتے

۵ منٹ پر منتظمین کی جانب سے مشاعرے کے آغاز کا اعلان کیا گیا اور سب سے پہلے جناب سلطان مرزا نقشبندی نے قرأت کلام اللہ پیش کی۔ بعدازاں جناب عزیز حسین عزیز نے بھی تلاوت فرمائی۔ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد ناظم مشاعرہ نے اعلان فرمایا کہ شعراء کی کثیر تعداد اور وقت کی کمی کے پیش نظر وہ کسی شاعر کا تعارف نہیں کروائیں گے اور نہ ہی کوئی شعر سنائیں گے۔ خود کا میزبان اول کی حیثیت سے تعارف کروا کر اپنا مطلع یوں پیش کیا۔

اے چشم نم مدینہ کی گلیوں میں کیا نہیں ● یہ وہ مقام ہے جہاں سورج ڈھلا نہیں

نوجوان شاعر جناب فاروق عارفی کا تعارف کروایا گیا۔ اسی مشاعرے میں ان کے والد محترم قاضی انجم عارفی صاحب نے بھی کلام سنایا۔ جناب فاروق عارفی کا شعر ملاحظہ ہو۔

جب بھی قرآن کی تلاوت کی صدا آتی ہے ● یاد سرکار کی اس دل میں اتر جاتی ہے

جناب منوہر لعل بہار کے نام کا اعلان کیا گیا وہ مائیک پر آئے اور نعت شریف کا مطلع اس طرح پیش کیا۔

بک گیا ہوں میں محمد مصطفے کے نام پر
عظمت خیر الوریٰ صلی علیٰ کے نام پر

حالانکہ اس شعر کو اٹھا کر ناظم مشاعرہ سامعین اور شاعر کے درمیان ربط پیدا کر سکتے تھے لیکن مشاعرے میں سکوت کی کیفیت طاری تھی۔

جناب صادق نقوی کے نام کا اعلان کیا گیا لیکن مکمل تعارف نہ ہونے کے باعث وہ بھی پانچ شعر سنا کر خاموش ہو گئے۔ ان کی نعت شریف کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سو جاؤں کالحد میں بطور کرم حیات ● تھوڑی زمیں چاہیے سرکار کے قریب

ڈاکٹر راہی فدائی برزم کے روح رواں ہیں خدمت خلق کی مصروفیات کے باوجود شعر گوئی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کی نعت شریف کا شعر ملاحظہ ہو۔

جب تک ہو صاف دل کو بنا عطا ہے نعت پاک سے
اہم ضیا ہے قلب میں اذکار شہ لولاک سے

جناب ساقی امروہی تحت اللفظ میں سناتے ہیں لیکن خوب سناتے ہیں۔ اور یہ شعر ملاحظہ ہو۔

روضہ کہاں کہاں یہ گنہگار کی جبیں

طیبہ میں مجھ کو دیکھ کے حیرت ہوئی مجھے

ممتاز شاعر جناب جوہر ہاشمی نے اپنی نعت شریف کا آغاز اس شعر سے

جو غلامی سے شہ دیں کی سرافراز نہیں

وہ کسی وقت بھی کونین میں ممتاز نہیں

آٹھویں نمبر پر جوڑچولہ کے شاعر جناب جلال عارف کے نام کا اعلان کیا گیا جو سال سے دارالسلام کے مشاعرے میں شرکت فرما رہے ہیں۔ موصوف کی نعت شریف ملاحظہ ہو۔

حضور جن کو بلاتے ہیں اپنے قدموں میں

ان ہی کو خاکِ مدینہ قبول کرتی ہے

جناب منان منتظر نے بھی نعت شریف سنائی۔

اپنی خطاؤں کے راز داں ہیں حضور

دیکھ کر بڑھ کے کہو ہم سب پر مہرباں ہیں حضور

حیدرآباد کے کہنہ مشق جناب معین بزمی نے بھی بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ میں نذرانہ نعت پیش کیا۔ نظام زندگی میں جب کوئی مشکل مقام آیا

شہ کونین و مکاں کا اسم اعظم میرے کام آیا

جناب افضل تسلیم نے بھی نعت شریف پیش فرمائی۔

حیات فانی میں لمحہ لمحہ ہزار غربت میں بھی رہا ہوں

کرم ہے آقا کا پھر بھی ایسا کسی بھی شئے کی کمی نہیں ہے

جناب شفیع اقبال مائیک پہ ہیں اور نعت شریف سنا رہے ہیں۔

جہاں کے آگے نہ جھک سکا سر نہ عظمتوں میں کمی ہوئی ہے

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے (باقی)

شائق احمد
۲۲-۶-۳ محلہ ہٹر
عادل آباد - ۱

غزل

سکھاتا ہوں میں دشمن کو ادا اپنی محبت کی
مرے اپنے مگر مجھ کو ہوا دیتے ہیں نفرت کی

خدا سے کر رہے ہیں ہم دعا اس کی حفاظت کی
جلاکر شہر دیکھیں مشغلہ ہے ارباب سیاست کی

بڑا پاگل ہے دل تہمت اٹھائے گا ہزیمت کی
خطا اک روز کر ڈالے گا اس کے ہاتھ محبت کی

ذرا بازار جا کر گھر کو لوٹ آنا قیامت ہے
لگی ہے آگ ہر سو شہر میں بغض و عداوت کی

نئے اقدار کا مالک ہے انساں اس زمانے کا
ہے اس کو اپنی سیرت سے زیادہ فکر صورت کی

ہوا احساس تم کو اجنبی لوگوں میں آئے ہو
بڑی ہی بھول کی تم نے وطن سے اپنے ہجرت کی

فرائض زندگی کے ربط باہم سے عبارت ہیں
نہیں تو کیوں ہدایت ہے نماز با جماعت
وہ سر جو آج بھی روشن ہے نیزے کی بلندی پر
نشاں ہے صداقت کی، شجاعت کی، شہادت
سفر میں جب بھی میرے سامنے تاریکیاں آئیں
تو روشن کی ہے مشعل میں نے اپنے عزم کی
اسی دنیا میں ہے زر دار کوئی، کوئی مفلس ہے
نہیں معلوم ہے کیا مصلحت اس میں ہے قدرت
ہوئی ہے حاصل ایمان یہ جب سے مصلحت آلود
کوئی جرأت نہیں کرتا ہے اظہار حقیقت کی

●●

(سلسلہ ...)

بجھنے لگے ہیں حق و مساوات کے دیئے
انصاف و عدل میں نہیں مربوط سلسلے
کچھ لوگ کر رہے ہیں زمانے میں تجربے
"مردانگی کے کیجئے پیہم مظاہرے
ہنگامے، توڑ پھوڑ، فسادات

خالد رحیم
منی سا ہو چاک
کٹک ۔ ۷۵۳۰۰۱
(اڑیسہ)

تضمین

بر غزل ۔ ڈاکٹر محبوب راہی

اچھا نہیں کہ شکوۂ حالات کیجئے
دل پر ہجومِ غم کی عنایات کیجئے
اب زندگی کو نذرِ خرابات کیجئے
"پھر جیسے چاہے وضعِ ملاقات کیجئے
دنیا سمجھ سکے جو وہی بات کیجئے"

جلتا ہوا چراغ بجھانا جو شرط ہے
بے نور راستے کو بنانا جو شرط ہے
مجھ کو مری نظر سے گرانا جو شرط ہے
"مجھ سے مری انا کو مٹانا جو شرط ہے
مجھ پر نوازشات کی برسات کیجئے"

ہیں آپ غوطہ زن تو سمندر کھنگالئے
اک زخم اور دیجئے نشتر سنبھالئے
دیوار و در پہ نام کی عظمت اچھالئے
"مجھ میں کے عیب غنچہ و گل میں نکالئے
توصیف سنگ و خشت کی دن رات کیجئے"

(۱۱ ۔ ۱۹۹۱ء)

منظر زملی
۱/۸۱-۱۵ کاشانۂ رحمت
شاد نگر۔ عادل آباد۔ ۱

غزل

خودی کے بدلے عطا کر نہ تاج و تخت مجھے
میں تیرا بندہ ہوں کر دے انا پرست مجھے

ہوئی نزاکتِ احساس اس قدر افزوں
کہ فرشِ گل بھی ہے اب مثلِ راہِ سخت مجھے

سکون دن کو میسر نہ چین راتوں کو
کہاں کہاں لئے پھرتا ہے میرا بخت مجھے

یہ سوچتا ہوں کہ جب تو ہی میرا قاتل
تو دل بھی لگتا ہے سینے میں لخت لخت مجھے

تمام شہر میں چھایا ہوا ہے سناٹا
اب اپنی آہ بھی لگتی ہے بازگشت مجھے

میں جان بوجھ کے دل سے کہاں الجھتا ہوا
ہجوم غم نے بنایا ہے دل بدست مجھے

مثالِ قیس ہوں منظر بہ فیضِ عشق و جنوں
بجائے شہر کے راس آگیا ہے دشت مجھے

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

قیمت : ۶ روپے

جلد : ۱۳
شمارہ : ۸
اگسٹ ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر : محمد قمرالدین صابری
جائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین
مینیجنگ ایڈیٹر
قدیر انصاری

مجلس مشاورت

زر تعاون

ہندوستان	سالانہ [illegible] روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	〃 ۲۰۰ 〃	〃 ۳۶۰ 〃	۳۷۰۰ 〃
امریکہ	〃 ۴۰ ڈالر	〃 ۷۰ ڈالر	〃 ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	〃 ۲۵ پونڈ	〃 ۴۵ پونڈ	〃 ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	〃 ۱۷۵ پاکستانی روپے	〃 ۳۰۰ روپے	〃 ۲۴۰۰ پاکستانی روپے

(ترسیل زر کا پتہ)

ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز ۔ حیدرآباد ۔ ۴

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیپٹل پبلک پرنٹرس
بازار میں چھپواکر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد ۔ ۴ سے شائع کیا

فہرست

پروفیسر افضل محمد
[illegible] حیدرآباد

ڈاکٹر حمید اللہ

پیرس میں حیدرآباد

(حکومت فرانس کے کئی اعزازات اور شہریت)

"سیاست" میں جناب حسن الدین احمد صاحب کا مختصر مضمون ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے بارے میں پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اہل حیدرآباد اور بالخصوص اہل علم و ادب آج بھی حیدرآباد کے اس علمی نادرہ شخصیت کو بھولے نہیں ہیں جو حیدرآباد سے ہزاروں میل دور پیرس کے ایک قدیم محلے میں سکونت پذیر ہے۔ لیکن ان کا دل آج بھی حیدرآباد میں دھڑکتا ہے۔ خوش قسمتی سے پچھلے پچیس، تیس برسوں کے دوران مجھے متعدد بار فرانس جانے اور وہاں رہنے کا موقع ملا۔ اور ہر بار مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے نہ صرف نیاز حاصل رہا بلکہ انھیں قریب سے دیکھنے، ان کے تبحر علمی کا اندازہ لگانے اور ان کی عظیم شخصیت کو سمجھنے کا بھی موقع ملا۔ یہ چند سطور قارئین کے لئے شاید دلچسپی کا باعث ہوں۔

ڈسمبر ۱۹۶۷ء کی ایک نہایت سہانی شام کو میں پہلی مرتبہ حیدرآباد سے فرانس کے دارالخلافہ پیرس پہنچا تھا۔ مجھے دیگر شناسا حیدرآبادیوں کے

علاوہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے بھی ملنا تھا جو کافی طویل عرصہ سے پیرس میں مقیم ہیں۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی میں اس زمانے میں ایک جرمن پروفیسر شعبہ اسلامیات کے کام کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے جن کا نام پروفیسر [illegible] کروزے تھا۔ پروفیسر کروزے [illegible] ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بہت گہرے دوست ہیں۔ [illegible] پروفیسر کروزے نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کے دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے لئے کسی قدیم مخطوطے کی ایک مائیکروفلم اور ایک خط لے جاکر انھیں پہنچادوں چونکہ وہ اپنے تحقیقی کام کیلئے اس مواد کے بے چینی سے منتظر ہیں۔ میں نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ کروزے صاحب نے مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا پتہ تو دے دیا تھا۔ لیکن پیرس جیسے عظیم شہر میں مجھ جیسے نووارد کے لئے وہ پتہ ڈھونڈنا کارے دارد تھا۔ مجھے دیگر اصحاب کے علاوہ ایک اور نامور حیدرآبادی ڈاکٹر عبد الماجد صاحب سے بھی ملنا تھا جو کافی عرصہ سے پیرس یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں۔ چنانچہ ڈسمبر کی اس یخ بستہ صبح کو جب میں سب سے پہلے ڈاکٹر عبد الماجد صاحب سے ملنے گیا تو اس دن جمعہ تھا۔ اور صبح کے ۱۱ بج چکے تھے۔ ماجد صاحب بڑے تپاک سے ملے اور باتیں کرتے کرتے تقریباً ۱۲ بج گئے۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انھیں کہیں جانا ہے۔ میں نے اجازت چاہی تو انھوں نے پوچھا کہ جمعہ کی نماز کے لئے چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں۔ مجھے خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی کہ پیرس جیسے شہر میں جمعہ کی نماز۔ میں نے فوراً حامی بھرلی۔ چنانچہ دس منٹ ہی میں ہم دونوں میٹرو کی انڈر گراؤنڈ ٹرین سے پیرس کے ایک جگہ پہنچے جسے (MONGE) کہا جاتا ہے۔ یہاں پیرس کی قدیم اور نہایت خوبصورت (جامع) مسجد ہے جو مسجد مرشد کہلاتی ہے۔ راستے میں جب ماجد صاحب نے بتلایا کہ وہاں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے بھی ملاقات ہوگی تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کہ ان سے اتنی آسانی سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

کا ایک عرصہ سے یہ معمول ہے کہ وہ جمعہ کی نماز اسی مسجد میں پڑھتے ہیں اور نماز کے بعد مسجد کے ایک مخصوص ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بے شمار چاہنے والے، دوست، طلبا، محققین اور حکومت و یونیورسٹیز کے نمائندے ان سے وہیں آکر ملتے ہیں۔ جن سے وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان سے بحث مباحثے کرتے، کام کی باتیں بتلاتے اور مدد کرتے ہیں۔ بیشتر لوگ ان سے علمی و دینی مسائل پوچھنے آتے ہیں اور وہ سب کی تشفی کرتے ہیں۔ کئی اسلامی ممالک کے سفیروں کو بھی میں نے وہیں آکر ان سے ملتے دیکھا۔

اس دن نماز کے بعد دو بجے ہم دونوں مسجد کے اس مخصوص ستون تک جا پہنچے۔ جہاں پہلے سے ۵۰، ۶۰ افراد جمع تھے۔ چھوٹی سی سفید داڑھی، سیاہ کشتی نما اونی ٹوپی پہنے، کوٹ پتلون میں ملبوس، نہایت منحنی، دھان پان سی ایک شخصیت ان سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ یہی تھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ ان کے قریب ہونے کی کوشش کرنے لگے تب ان کی نہایت ہلکی لیکن نرم و شفیق آواز کانوں میں پڑی چونکہ ملنے والوں میں فرنچ، عرب، جرمن، ترک، افغانستان، ایرانی، ہندوستانی، پاکستانی، برٹش، امریکن۔ ہر قوم کے لوگ تھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کسی سے انگریزی میں بات کرتے، کسی سے فرنچ میں، کسی سے جرمن میں، کسی سے ترکی زبان میں، کسی سے عربی میں اور ہر زبان میں نہایت روانی اور شگفتگی سے گفتگو کر رہے تھے۔ جب ہماری باری آئی تو تین بج چکے تھے۔ غالباً ڈاکٹر ماجد صاحب کا حمید اللہ صاحب کو انتظار تھا۔ اسلئے انھیں دیکھتے ہی خوش ہوگئے اور پوچھا کہ اتنی دیر کہاں رہے؟ جب معلوم ہوا کہ ہم لوگ پیچھے منتظر بیٹھے تھے تو کہنے لگے کہ سامنے آجاتے تو میں دیکھ لیتا۔ پھر جب میرا تعارف ہوا اور میں نے کہا کہ حیدرآباد سے آپ کے لئے آپ کے دوست کا ایک خط اور فلاں مخطوطہ کا مائیکرو فلم لایا ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ پھر میں نے بتایا کہ میں ان کے بھتیجے سیف اللہ صاحب کا اُستاد بھی ہوں تو کھڑے

عزیزوں کے بارے میں پوچھا ہے۔

یہ تھی میری ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے پہلی ملاقات۔ اس پہلی ملاقات کے بعد گویا یہ ہو گیا۔ اتفاق سے مجھے چند دن بعد ہی چار ماہ کے لئے اسٹراسبرگ یونیورسٹی بھیج دیا گیا۔ جب میں اسٹراسبرگ جانے سے پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوا افسوس کرنے لگے۔ لیکن تاکید کی کہ خطوط کے ذریعہ رابطہ قائم رکھوں۔ پھر نہایت شفقت سے نصیحت کی کہ اگلے ہفتے سے رمضان المبارک کا آغاز ہے۔ خبردار وقت گھٹنے کی ہے۔ اس وجہ سے روزے ترک نہ کرنا ہمت کر لینا تو اللہ مرضی سے روزے آسانی سے کٹ جائیں گے۔ پھر ڈاکٹر ماجد کو ہدایت کی کہ افضل صاحب نئے فرانس آئے ہیں۔ انھیں سردی، بخار، نزلے وغیرہ سے مدافعت کی کچھ دوائیں ساتھ کر دو۔ کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔ اس محبت اور اپنائیت سے یہ باتیں انھیں نے کہیں ایک حیدرآبادی ہم وطن ہی کہہ سکتا تھا۔

١٩٦٨ء میں فرانس میں میرا تقریباً ٨ ماہ قیام رہا اور میں مختلف یونیورسٹیوں میں ٹریننگ اور ریسرچ کے لئے گھومتا رہا۔ پیرس میں بمشکل دو ماہ قیام کر سکا۔ لیکن ہر جمعہ کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے ملاقات ضرور ہوتی۔ وہ جس محبت سے جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور دائرۃ المعارف وغیرہ کے بارے میں دریافت کرتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا دل اب بھی حیدرآباد کے لئے تڑپ رہا ہے۔ جب میں کہ آپ ۱۹۴۸ء سے اب تک حیدرآباد واپس کیوں نہیں آئے تو ایک دم خاموش اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا " کاش میں حیدرآباد جا سکتا " ڈاکٹر ماجد نے اشارہ سے منع کیا کہ میں اس موضوع پر مزید گفتگو نہ کروں۔ بعد میں پتہ چلا کہ ریاست حیدرآباد کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک مختصر سے وفد کے ساتھ پیرس گئے

حیدرآباد کو مسلمانوں سے کر گئے تھے۔ اسی دوران پولیس ایکشن ہو گیا تو وہ پیرس ہی میں ٹھیر گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ان کی بین الاقوامی قانون اور اسلامی فلسفہ میں اعلیٰ درجہ کی مہارت کے بے حد معترف تھے۔ چنانچہ انھوں نے کئی بار ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو پیغام بھجوایا کہ وہ ہندوستان واپس آ جائیں تاکہ اہل ہند ان کی بیش بہا علمیت سے فیضیاب ہو سکیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ جب فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوستان واپس نہیں جائیں گے تو پھر اسی پر اٹل رہے۔

فرانس میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا وہ مقام ہے جو شاید فرانس کی حکومت میں وزراء اور بڑے بڑے عہدیداروں کا بھی نہیں ہوگا۔ حکومت فرانس نے انھیں فرانسیسی شہریت عطا کرنے پر فخر و مسرت کا اظہار کیا اور ان کو بین الاقوامی قانون کا مشیر اعلیٰ مقرر کیا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ فرانس کی کئی یونیورسٹیز میں اعزازی پروفیسر بھی رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کا جو فرانسیسی ترجمہ کر کے شائع فرمایا اس میں بھی حکومت فرانس کی مدد شامل رہی۔ فرانس میں میں نے ڈاکٹر صاحب کے عقیدت مندوں سے سنا کہ قرآن پاک فرانسیسی ترجمے کی اشاعت و تقسیم کے بعد بہت مختصر سے عرصے میں سابق فرانسیسی نوآبادیوں کے تقریباً ۶۰۰۰ سیاہ فام مردوں اور عورتوں نے اسلام قبول کیا جن میں سے بیشتر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو اپنا رہنما و رہبر مانتے ہیں اور ان سے قرآن، فقہ، حدیث اور تفسیر کا درس لیتے ہیں۔

ایک مرتبہ ۱۹۸۵ء کے دوران قیام میں اور ڈاکٹر عبدالماجد صاحب، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ہمراہ پیرس کے ایک محلے میں گئے جہاں زیادہ تر مراقش، الجزائر، کیمرون اور دیگر افریقی علاقوں کے نو مسلم خاندان آباد تھے۔ انہوں نے ایک بہت بڑے ہال کو مسجد میں تبدیل کر لیا تھا جہاں مرد، خواتین اور بچے بہت بڑی تعداد میں نماز کے لئے آیا کرتے تھے۔ ہم جب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ساتھ وہاں پہنچے اور ہمارا

تعارف کرایا گیا تو لوگ ہم سے بے حد محبت اور خلوص سے ملے۔ نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے نصف گھنٹہ درس قرآن دیا۔ پھر ترجمہ تفسیر بیان کی۔ اس کے بعد تقریباً گھنٹہ بھر ان افریقی لوگوں کے شخصی مسائل وغیرہ پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر چند افریقی لوگوں نے بڑے اصرار سے ہم تینوں کو کھانے پر مدعو کر لیا اور نہایت محبت سے اپنے گھر لے جا کر دو پہر کا کھانا کھلایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے تو برائے نام کھایا لیکن ہم دونوں کو بہت سے کھلاتے رہے تاکہ میزبان ناخوش نہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ افریقی نو مسلموں میں بیشتر وہ لوگ ہیں جن کا تعلق پسماندہ قبائل سے ہے اور وہ بہت عرصہ ترک وطن کر کے فرانس میں جبری محنت مزدوری کے لئے لائے گئے تھے۔ اب وہ آزاد اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان میں غیر معمولی خود اعتمادی اور جوش و ولولہ پیدا ہوا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نہ صرف عالم اسلام میں بلکہ سارے مغربی ممالک میں اپنی اسلامی طرز فکر، اسلامی تحقیق، بین الاقوامی قانون کی بلند پایہ معلومات اور کئی یورپی و مشرقی زبانوں کے ماہر کی حیثیت سے عظیم شہرت کے مالک ہیں۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ دس سال کے دوران وہ ترکی کی انقرہ یونیورسٹی میں اسلامی فلسفہ اور قانون کے پروفیسر رہے۔ ہر جمعرات کو انقرہ یونیورسٹی میں ان کا ایک لیکچر ہوتا تھا جس کے لئے ترکی کی جانب سے ایک چارٹرڈ طیارہ انھیں پیرس ایئرپورٹ سے انقرہ لے جاتا۔ وہاں لیکچر دینے کے بعد اسی روز رات کو وہ اسی طیارہ سے واپس پیرس آجاتے۔ اس بات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت ترکی کے نزدیک ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا کیا احترام رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی عزت و توقیر اور ان کی جامع شخصیت سارے اسلامی ممالک میں یکساں ہے۔ ۸۵ء میں میں تین ماہ کے لئے حکومت فرانس کی دعوت پر پیرس پہنچا۔ مجھے بے حد خوشی تھی کہ پھر ایک بار ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر

ان کی علمی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ میں اور ڈاکٹر عبدالماجد صاحب اکثر و بیشتر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کی نہایت عالمانہ گفتگو اور دینی مسائل پر گہری فکر سے بےحد متاثر ہوتے۔ اپنے پیرس کے دورہ کے اختتام سے قبل میں نے سوچا کہ ہندوستان واپس ہوتے ہوئے میں عمرہ کی سعادت حاصل کرتا ہوا آؤں چنانچہ پیرس میں سعودی سفارت خانہ پہنچا اور عمرہ کے ویزے کے لئے درخواست دی۔ تین دن بعد جواب ملا کہ چونکہ حج کے لئے اب صرف تین ہفتے باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے شوال کے مہینے کے ختم ہوتے ہی عمرہ کے ویزے بند کر دیئے گئے ہیں۔ مجھے یہ سن کر سخت ملال ہوا۔ جمعہ کے دن بعد نماز جب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ مجھے سعودی سفارت خانہ نے عمرہ کا ویزا دینے سے انکار کر دیا ہے اور اب میں عمرہ کی سعادت حاصل کئے بغیر ہی سیدھا حیدرآباد واپس جا رہا ہوں۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر جب سارے ملاقاتیوں اور عقیدت مندوں سے فرصت ہو گئی تو ماجد صاحب سے کہا کہ آپ گھر جائیے۔ افضل صاحب کو میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مسجد سے باہر آ کر ایک سڑک پر پیدل چلنے لگے۔ تقریباً دس پندرہ منٹ تک جب ایک سڑک سے دوسری اور دوسری سے تیسری پر چلنے کا سلسلہ جاری رہا تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کہیں دور جانا ہو تو ٹیکسی لے لیں؟ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا کہ جس کام کے لئے ہم جا رہے ہیں اس کے لئے پیدل سعی کرنا بہتر ہے۔ اب میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مجھے کہاں ساتھ لے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ پیرس کے ایک قدیم محلہ میں پہنچے جہاں بیشتر قدیم طرز تعمیر کی عمارتیں تھیں اور چار پانچ منزلہ عمارتوں میں لفٹ نہیں تھی بلکہ سیڑھیوں سے جانا پڑتا تھا۔ ایسی ہی قدیم وضع کی عمارت میں ڈاکٹر صاحب مجھے لے کر داخل ہو گئے اور سیڑھیاں چڑھ کر تیسری

منزل پر ایک فلیٹ کے سامنے رک گئے۔ اتنی دیر تک پیدل چلتے رہنے اور تین منزل سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی سانس بحال ہو چکی تھی۔ ایک دو منٹ تک سانس درست کی تھی۔ پھر دروازے پر لگی گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد ایک نہایت ضعیف لیکن بے حد معتبر اور نورانی صورت بزرگ نے دروازہ کھولا۔ وہ اپنے چہرے اور لباس سے ہی پہچانے جا سکتے تھے کہ وہ عرب تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کو دیکھتے ہی "السلام علیکم" اور "اھلاً و سھلاً" کہتے ہوئے ان سے بغلگیر ہو گئے۔ پہلے تو عربی میں گفتگو ہوتی رہی پھر فرانسیسی زبان میں باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا تعارف کرایا کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں اور ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ مہربانی مجھے اپنا بے حد عزیز نوجوان دوست کہہ کر متعارف کرایا اور کہا کہ سعودی سفارت خانے والے عمرہ کرنے کے لئے ویزا دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ان سے درخواست کرنے آئے ہیں۔ ان صاحب نے (غالباً ان کا نام فخری عالمی تھا) ڈاکٹر حمید اللہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ صرف اتنی سی بات کے لئے آپ نے آنے کی زحمت کیوں کی؟ کیا آپ ٹیلیفون پر یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے؟ اس پر ڈاکٹر صاحب نے انہیں جواب دیا "مجھے پیدل چلنے کا شوق تو ہے ہی لیکن کسی نیک انسان کے پاس ایک نیک کام کے لئے پیدل چل کر جانے سے اور زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔" مولانا فخری صاحب نے اسی وقت سعودی سفارت خانے کو فون ملا کر کسی سے بات کی اور مجھ سے کہا کہ کل صبح وہاں جا کر میرا وزیٹنگ کارڈ لے جا کر دیجئے۔ آپ کو انشاء اللہ ویزا مل جائے گا۔ بعد میں پتہ چلا کہ فخری عالمی صاحب اردن کے رہنے والے ہیں اور سابق میں سعودی عرب کے امور اسلامی کے مشیر رہ چکے ہیں۔ قرآن اور حدیث کے مفسر کی حیثیت سے سارے یوروپی ممالک کے مسلمانوں میں نہایت احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ حکومت سعودی عرب نے انہیں کئی اعزازات سے نوازا ہے۔ اب پیرانہ سالی

جناب ہاشم حسن سعید

حسنِ خدمت پر سبکدوش

ممتاز دانشور اور ماہر تعلیم جناب ہاشم حسن سعید پرنسپل کالج آف لینگویجس حیدرآباد کے عہدہ سے ۳۱ جولائی کو وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے۔ موصوف کا شمار اِس کالج کے معماروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی سعی مسلسل، فہم و فراست اور انتظامی صلاحیتوں سے اس کو ترقی زندگی اور استحکام بخشا۔ واضح ہو کہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے قائم کردہ یہ ادارہ ۱۹۷۴ء میں تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ کانفرنس کی جانب سے اپنا سرمایہ کالج کے نام منتقل کرنے سے انکار کے سبب عثمانیہ یونیورسٹی نے شرائط کی تکمیل تک اپنا الحاق روک لیا تھا۔ اِس صورت حال سے دوچار ہونے کے بعد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ نے کالج کو چلانے سے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے اِس کالج کو بند کردینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، ہاشم حسن سعید، شوکت علی مرحوم اور اساتذہ کی تحریک پر طے پایا کہ اِس کالج کو اسٹاف کمیٹی کے حوالے کردیا جائے جس کے سربراہ ہاشم حسن سعید تھے۔ اِس قرارداد کی منظوری کے بعد اِس کالج کا حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس سے تعلق ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ چونکہ کالج آف لینگویجس حیدرآباد سوسائٹی ایکٹ کے تحت بذات خود ایک مسلمہ ادارہ تھا۔ اسی لئے اس کی جگہ مجلس انتظامی تشکیل دی گئی اور اسی انتظامی کمیٹی کے تعاون سے جناب ہاشم حسن سعید نے کالج کے لئے ایک عارضی عمارت [illegible] مارکٹ حاصل کرکے یونیورسٹی قواعد کے مطابق [illegible]

کے تقررات کروائے نیز اس کالج کا عثمانیہ یونیورسٹی سے استقلالی اثر کے ساتھ الحاق حاصل کیا۔ اور شبانہ روز جد و جہد کے بعد حکومت آندھرا پردیش سے کالج کے لئے ایک پرنسپل، آٹھ لکچررس، ایک کلرک، ایک لائبریرین اور ایک اٹنڈر کی جائیدادیں منظور کروائیں۔ جس کے بعد نومبر ۱۹۸۴ء سے (جبکہ این ٹی راما راؤ چیف منسٹر آندھرا پردیش نے بارش اور طوفان کی تباہ کاریوں کے سبب تمام فنڈز منجمد کردئے تھے) کالج کو باقاعدہ مستقل گرانٹ جاری ہوئی۔ آج یہ ادارہ اپنے شاندار نتائج اور کارکردگی کی وجہ سے حیدرآباد کی ایک معیاری درسگاہ سمجھا جاتا ہے جہاں سے ہر سال لگ بھگ پونے دو سو طلباء فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ ●●

(سلسلہ ص ۲)

باوجود پیرس کو اپنا ہیڈکوارٹر بنالیا ہے اور تفسیر و اشاعت قرآن کے لئے سارا یورپ دورے کرتے رہتے ہیں۔ دونوں بزرگوں نے میرے شکریہ ادا کرنے پر کہا کہ ہمارا شکریہ ادا کرنے کی بجائے حرم شریف میں ہمارے لئے دعا فرمائیے یہی کافی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی یہ منکسر المزاجی اور باوجود ایک اعلیٰ مرتبہ کی حامل شخصیت ہونے کے ایسی سادگی کہ کسی کے چھوٹے سے کام کے لئے خود پیدل چلکر اور خرابی صحت کے باوجود تکلیف اٹھاکر جانا ان کی اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔

جب سے ڈاکٹر صاحب کی علالت اور ناتوانی کی اطلاعیں ملی ہیں دل سخت بے چین ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو صحت عطا فرمائے اور تادیر سلامت رکھے تاکہ وہ دین کی خدمت کا مقدس فریضہ اسی جوش و خروش سے ادا کرتے رہیں۔ (آمین) ●●

ڈاکٹر عبدالمغنی

رسم خط کی بحث

[illegible] ۸ جون ۱۹۹۶ء کے "ہماری زبان" (نئی دہلی) میں جناب سردار جعفری کا بیان مصطفائی پڑھ کر مسرت کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ وہ یقیناً اردو کے ایک عاشق ہیں اور ان کے خلوص پر مجھے کوئی شبہ نہیں لیکن اردو رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں جناب خشونت سنگھ نے جو بیان اپنے ہندوستان ٹائمز کے کالم میں موصوف سے منسوب کیا تھا۔ اس کی پوری وضاحت جعفری صاحب کے مضمون سے نہیں ہوتی۔ وہ فکرمند ہیں کہ اردو کی نئی نسل اپنی زبان کے رسم خط سے زیادہ واقف نہیں اور اردو پڑھنے والوں کا حلقہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ان کی تجویز ہے کہ اردو دیوناگری رسم خط میں بھی لکھی جائے تاکہ اس کے جاننے والوں کا حلقہ وسیع ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ بمبئی کی فلموں سے اردو کو ہندی کہنے کا جو چلن شروع ہوا ہے اور جس طرح پورے شمالی ہند کو زبردستی ہندی کا علاقہ قرار دیا جا رہا ہے اس کے نتیجے میں بالآخر ہندی پوری اردو زبان کو غصب کر لے سکتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہندی کے چہیتوں کے اردو دشمن منصوبے میں جو چیز حائل ہو رہی ہے وہ رسم خط ہی ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف ایک سازش جو کبھی مدت سے چل رہی ہے تیز ہوتی جا رہی ہے تاکہ "ہندی ہندوستانی" کا خواب پورا ہو سکے۔ اصل اس مشترکہ قومی تہذیب پر ایک فسطائی حملہ ہے جس کا سب سے بڑا ہدف اردو زبان اور اس کا ادب اپنے مخصوص رسم خط میں ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ رسم خط بھی زبان ہے۔ اسلئے کہ یہ زبان کے جسم کی کھال ہے جس کے ساتھ اس کی پیدائش ہوتی ہے، یہ کوئی لباس نہیں کہ اس کو بدل لیا جائے اردو زبان و ادب کا حسن در حقیقت اس کے رسم خط ہی سے ہے۔ اردو کے الفاظ، تراکیب اور محاورات و اصطلاحات وغیرہ کے تلفظ کسی دوسرے رسم خط میں منتقل ہو ہی نہیں سکتے خواہ وہ دیوناگری ہو یا لاطینی۔ اردو رسم خط کو عام طور پر فارسی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اسے عربی بھی کہا جا سکتا ہے لیکن اپنے حروف تہجی کے اعتبار سے یہ صحیح معنوں میں اردو یا ہندوستانی رسم خط ہے۔ اسلئے کہ اس میں عربی و فارسی کے ساتھ سنسکرت اور پراکرت کی آوازیں بھی مل گئی ہیں اور ان سب زبانوں کی آمیزش سے اردو کا خمیر اٹھا ہے اور اس کا ہیولیٰ تیار ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندی بھی اردو ہی کا ایک نام تھا جب کہ دیوناگری ہندی تقریباً ایک سو سال سے ہندوستانی زبان اور ہندوستانیوں کو تقسیم کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج میں ڈھالی جا رہی تھی اس کے بیسویں صدی میں ۱۹۴۷ء سے لگاتار سرکاری ادارے ہندی کو اگر پورے ملک پر نہیں تو کم از کم شمالی ہند پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اردو کا وجود اس کے رسم خط کے ساتھ ان کے ارادوں کی تکمیل میں حائل ہے۔ چنانچہ اردو دوستی کا تقاضا ہے کہ اردو رسم خط کو محفوظ رکھا جائے ورنہ بے چاری اردو ہندی پرستوں کے بقول ہندی کی ایک شیلی بن کر رہ جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ ناموافق سیاسی حالات میں کس طرح اردو زبان و ادب کو اس کے اصلی و حقیقی رسم خط کے ساتھ نہ صرف محفوظ رکھا جائے بلکہ ترقی دی جائے؟ اس سوال کا صرف ایک کارگر جواب ہے۔ وہ یہ ہے کہ اردو زبان کی تعلیم و ترویج [illegible] اپنے رسم خط کے ساتھ بہ کثرت اور بہ شدت کی جائے۔ بچوں اور نوجوانوں کو سبق پڑھانے سے لے کر دفتروں و تقریبات میں استعمال تک ہو جانا

کہا جائے۔ جسے کہ وہی ان کی مادری زبان بھی ہے، تہذیبی زبان بھی اور بالفعل
واحد قومی زبان بھی، عوامی بول چال اور تبادلہ خیال کے اعتبار سے، لہٰذا اس
حال میں ہندی کا نام دیا جائے یا پھر انی تحقیقات میں ہندوستانی کا، جب کہ یہاں کی
ں (۱۸۲۷ء۔ ۱۹۹۶) کی سرکاری سرپرستی اور زبردستی کے باوجود آکاش وانی
کی، زبردستی بانی نہیں بن سکی۔ بہرحال اُردو کی تعلیم و ترویج کے لئے قومی کمیٹی کی
پیل دئے گئے۔ ثانی فارمولے کو خاص کر شمالی ہند میں، جو مسئلہ زبان کے حل کا
تھا، اس کی حقیقی شکل میں ابتدائی سے ثانوی مرحلوں تک تعلیمی اداروں میں رائج
کے پہلی زبان کلاً مادری زبان یعنی اردو بولنے والے بچوں اور بچیوں کیلئے اُردو
مری اور جدید ہندوستانی زبان کے طور پر ہندی بولنے والے اسی طرح اپنی
سے اُردو پڑھیں جس طرح ہندی بولنے والے ہندی پڑھ رہے ہیں۔ جبکہ تیسری
سب کے لئے عموماً انگریزی ہے ہی۔ واضح رہے کہ اُردو زبان کی تعلیم ہر حال میں اور
اُردو رسم خط میں ہی ممکن ہے۔ اور بولنے والوں کے لئے اُردو ہندی کی تفریق
سیاست کی بنا پر کی گئی ہے ورنہ حقیقت کچھ اور ہے۔ وہ ہندوستانی زبان
والوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی دوسری بڑی زبان، چینی کے بعد ہے
سوا کوئی اور نہیں اور وہی ہندوستان میں رابطے کی واحد عوامی زبان ہے
ستان کے تازہ ترین سیاسی واقعات اشارہ کرتے ہیں کہ دیوناگری ہندی کی
اری کا خواب ٹوٹ چکا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے مقابلہ میں تمام قومی پارٹیوں کا
اتحاد دراصل ہندی ہی کے خلاف ہے اور اگر آئندہ فسطائی بی جے پی
تدار اگر خدانخواستہ ہندی کو جبراً ملک پر مسلط کرنا چاہے گی تو ہندوستان کو
یں بٹ جانے سے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ جنوب اور مشرق کے علاقے تو
فقط ہندی سے زبان کے سوال پر بھی الگ ہو جائیں گے۔ جعفری صاحب کہتے ہیں کہ

اُردو کا حلقہ سکڑتا جا رہا ہے تو سوال یہ ہے کہ ہندی کا حلقہ کہاں پھیل رہا ہے؟ ملک کی لسانی پالیسی کے غلط ہونے اور ایک مصنوعی زبان کو ملک پر مسلط کرنے کی سرکاری کوشش کے سبب آزاد ہندوستان تو قومی سطح پر گونگا ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی لیڈر خاص کر منسٹر عام طور پر کسی قابلِ فہم زبان میں روانی کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکتے ملک کوئی زبان صحیح طور پر بول نہیں سکتے۔ ایسی حالت میں بول چال کی فطری زبان کی حیثیت سے جعفری صاحب ہی کے بقول اردو کی عوامی مقبولیت و طاقت آج بھی باقی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے مگر اگر اُردو زبان کو دیوناگری رسم خط میں منتقل کیا گیا تو یہ ایک فریب ہوگا جس کا انجام دیوناگری ہندی سے مختلف نہیں ہوگا۔ جس کے خلاف ملک کے بڑے حصے میں عوام کے جذبات حد درجہ برانگیختہ ہو چکے ہیں۔

رہی بات اُردو ادب کو دیوناگری رسم خط میں بھی پیش کرنے کی تو یہ کام پہلے ہی کچھ لوگ کر رہے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر سے بھی فائدہ مند ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اس کاروبار سے کوئی نہ تو روک سکتا ہے نہ روکنا چاہے گا۔ لیکن عام طور پر اُردو کے اداروں کو اِس کاروبار میں مشغول ہونے کی ضرورت نہیں۔ دیوناگری میں اردو ادب کی پذیرائی، اردو زبان کی مقبولیت کی ایک دلیل ہے۔ یہ اردو زبان اپنے رسم خط سے پہچانی جاتی ہے۔ لہٰذا تمام اردو دوستوں کا فرض یہ ہے کہ اردو زبان کو اس کے اپنے رسم خط میں پھیلائیں۔ اگر ہمارے گھروں میں اس رسم خط کی تعلیم ختم یا کم ہو رہی ہے تو یہ سخت تشویش کی بات ہے جو بیوقوفی اور بدبختی دونوں پر مشتمل ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری تہذیب کی تباہی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں بلکہ اجتماعی وجود کے فنا ہونے کا اندیشہ لاحق ہو رہا ہے۔ لہٰذا تحریک اُردو کو دیوناگری

محمد ضیاء عرفان حسامی

(قسط دوم)

دارالسلام کا کل ہند نعتیہ مشاعرہ

جناب موسیٰ خاں شوق نے اپنے مخصوص مترنم انداز میں نعت شریف سنائی۔

میں چاہوں کہ دنیا کی مشکل ہو جائے جو آسان حل ہے
تمہارے شوق دو عالم کی مشکل وہ چاہیں تو آسان ہو جائے

معتمد مشاعرہ نے گلبرگہ کے شاعروں کو آواز دیتے ہوئے کہا کہ جناب وقار ریاض کہنہ سال شاعر ہیں۔ اچھے شعر کہتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

نہ دولت کھینچ لائی ہے نہ طاقت کھینچ لائی ہے
وہ لالچ کوئی دنیا کی نہ شہرت کھینچ لائی ہے

جناب ممتاز قادری کی نعت شریف کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اللہ رے کتنی شان کا یہ فرش خشک ہے • طیبہ میں ہے اور زیر قدم عرش بریں ہے

جناب حسن فرخ نے شعر گوئی کے لئے آسان راستہ تلاش کیا۔ مبتدیوں کے لئے اساتذہ کے شعر یاد کرنا ان کی شعر گوئی کے لئے بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

ہم پہ عجب وقت آن پڑا ہے صلی اللہ علیہ وسلم
وقت دعا ہے وقت دعا ہے صلی اللہ علیہ وسلم

گلبرگہ سے تین شعراء کو مدعو کیا گیا تھا جن میں وقار ریاض۔ محب کوثر اور جناب عبدالحکیم آفندی شامل ہیں۔ اب جناب محب کوثر کو ملاحظہ فرمائیں۔

عشق رسول پاک مقدس کتاب ہے • میری حیات کتنی مقدس حیات ہے

شاعر دلی جذبات کا اظہار ہے۔ شاعر جو کہتا ہے وہ کر دکھاتا ہے۔ سجاد
اور غزل کا شعر ملاحظہ ہو۔

وہ وہ پاک جذبے ہو جنا ● وہ لب پہ بھی ذکر خدا ہے

اب جناب رئیس اختر کی باری ہے۔ مترنم آواز میں آپ شعر سناتے ہیں۔ نعت
شریف کہنے میں کمال حاصل ہے۔ آج کل جلسوں میں بھی آپ کو مدعو کیا جا رہا۔
بعض شعراء آپ کے شانہ بشانہ جلسوں میں شعر سنانا چاہتے ہیں۔ جناب رئیس اختر
بھی ملنساری اور خوش اخلاقی کے باعث عوام میں مقبول ہو رہے ہیں۔ ان کا شعر ملاحظہ

اک نگاہ کرم یا نبی چاہیے ● میں اندھیرے میں ہوں روشنی چاہیے

جناب منظر بھوپالی جو ادبی ٹرسٹ اور شکر جلد کے مشاعرے میں اپنی غزل
گیتوں کو سنا کر عوام کے مقبول شاعر ثابت ہوئے۔ اس مشاعرے میں جمالی مشاعرہ کو!
سے نعت شریف سنا رہے ہیں۔

صرف اہل باطل کا فلسفہ نہیں آتا ● ورنہ ہم فقیروں کو اور کیا نہیں آتا

جناب منظر بھوپالی نے اس مشاعرے میں اپنی کئی نعتیں سنائیں۔

پڑا ہے امت پہ وقت آؤ شہ مدینہ مدینہ
جمال اسلام پھر دکھاؤ شہ مدینہ مدینہ
کہیں گناہوں کی آندھیوں میں چراغ ایماں بجھ نہ جائے
ہمیں سنبھالو ہمیں بچا لو شہ مدینہ شہ مدینہ

حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر جناب سلیم رضوی نے بھی اپنا کلام سنا

عزت افزائی منظور تھی ہم پہ شاہ اُمم آ گئے
کوئی ڈھائے گا کعبہ کو اب پاسباں آ گئے

مدیر ہفت روزہ "تعمیر" جناب عبدالعزیز (مجیب نگری) نے جو پچھلے

اپنی شاعری میں شرکت فرمایا ہوا ... شریعت ...
اس زمین کا بشر آسمان تک گیا ● اپنے معراج سب سے بڑا معجزہ

ضلع محبوب نگر حیدرآباد سے قریب ہونے کے باعث حیدرآباد کی محبوب نگر کے شعراء اکثر محفلوں میں شرکت فرماتے ہیں۔ محبوب نگر کے ممتاز شعراء میں جناب سلیم عابدی۔ حلیم بابر۔ انور آفاق قابل ذکر ہیں جو ادبی محفلوں کے روح رواں سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو بھی موقع دیا جانا چاہیئے۔

مہمان مقرر و شاعر مولانا اشتیاق عالم سیف بھی نعتیہ شعر سنائے ایک ماہ قبل موصوف نے یوم رحمۃ للعالمین کے جلسہ میں بحیثیت مہمان مقرر اپنی ولولہ انگیز تقریر سے سامعین کو متاثر کیا تھا۔

یہ عطا کس کے گیسوؤں کی ہے ● اتنی شہرت جو خوشبوؤں کی ہے
یہ سہی ہے وہ مدینے میں ● کیسی قسمت ان آنسوؤں کی ہے

بھر گئی جب ظلم سے روئے زمین
بھیج دی تب خدا نے کوئی امین

حیدرآباد کے جواں سال شاعر ... شعر بھی نکھرے ہوئے کہتے ہیں۔ کل ہند مشاعرے میں وہ برابر داد تحسین حاصل کرتے ہیں۔

صحابہ کو جو پہچانے جمال مصطفےٰ جانے
... سے نظر ... کیا نے

جہاں آپ کے آنے سے ... پھیلا ہے
جہاں خدا کا گھر رونق جہاں میں ہے

گلبرگہ کے ایک ... شاعر جناب عبدالرحیم آرزو نے بھی اپنا کلام سنایا۔

ہے تصور میں مرے دور کے ● سجدہ گاہ قلب روئے نبی

اب حضرت بیکل اتساہی کی باری ہے جن کو سننے کے لئے سامعین بہت دیر سے

بے چینی [illegible] کے [illegible] تو فریضہ ادا [illegible] ۔ [illegible]
شعر کہتے [illegible]

[illegible] نعت [illegible] شیو [illegible]

[illegible] آنکھ [illegible]

ذکر [illegible] معروف [illegible] چلتا

اے اجل مجھکو تو فرصت ہی نہیں آج کی رات

[illegible] کو بات جہاں کی بھولی لگتی ہے

بات [illegible] محبوب کی ہونٹ [illegible] ہے

[illegible] عربی میں [illegible] ہے

[illegible] گنٹیا اب [illegible] سے اونچی [illegible] ہے

جناب بیکل اُتساہی کو سامعین نے کھڑی [illegible] جلا [illegible] انھوں نے نعت شریف [illegible]
محفل میں جان پیدا کر دی ۔

[illegible] سوز نے پُر سوز لہجہ میں نعت
شریف پیش کی [illegible] ہندوستان پر جو نعت [illegible]
تو داد دینے [illegible] سے [illegible] آئے

ضلع نظام آباد سے دو شعراء [illegible] نظام آبادی [illegible]
کو بھی نعت شریف سنانے کا موقع مل گیا ۔

[illegible] سانچے میں [illegible] ہے

[illegible] کے [illegible] سارے [illegible] ہے

[illegible] حضرت [illegible] صاحب نے بارگاہ خیر الانام
[illegible] پیش فرمایا [illegible]

دنیا میں کب ہوا ایسا آقا کوئی ہوتا ہے
جو اپنے غلاموں کی تکلیف سے روتا ہے

ارمان مرے دل کا ہو پورا کبھی کبھی ● طیبہ ہے تو اشکوں کا صدقہ بھی کبھی
مرزا غریب اک نکما غلام ہے ● ابر کرم کا اس پہ بھی چھینٹا کبھی کبھی

حیدرآباد کی نعتیہ محفلوں میں جس عظیم شاعر کی دھوم ہے جو میدان نعت شہسوار ہے جن کی نعتیں سننے کا سامعین کو اشتیاق رہتا ہے۔ امام الشعراء حضرت خواجہ شوق کو ایسے موقع پر پیش کیا گیا کہ محفل میں وہ کیفیت نظر آئی جو شوق صاحب سناتے وقت دیکھنے میں آتی ہے۔ پانچ شعر [illegible] کا اطلاق اگر اساتذہ کے لئے کم سے کم ختم کر دینا چاہیئے حضرت شوق کے شعر ملاحظہ ہو۔

خدا کی جلوہ گری کا عجب زمانہ ہے ● نبی کو دیکھ کے ایمان خدا پہ لاتا ہے
اللہ کے رتبہ کو پہنچنا تو رہا ایک طرف ● ان کے نعلین کے رتبے کو نہ پہنچا کوئی

مہمان شاعر جناب سلطان کلیم نے اپنا کلام یوں پیش کیا۔

عظمت محمد کی بات ہی نرالی ہے ● پھول پھول چرچے ہیں ذکر ڈالی ڈالی ہے
جب بھی غم کی راتوں میں نعت پڑھتا ہوں ● مجھ کو ایسا لگتا ہے صبح ہونے والی ہے
کر سکے تو، تو اپنی دین کی حفاظت کر ● جان کی حفاظت کیا یہ تو جانے والی ہے

کوششیں جو کرتے ہیں دین حق مٹانے کی
جب بھی ہاتھ ملتے تھے اب بھی ہاتھ ملتے ہیں

ڈاکٹر عقیل ہاشمی ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی جو دینی محفلوں میں پابندی شرکت کرتے ہیں ایک ممتاز ادیب و خطیب اور نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شفیق استاد بھی ہیں جو اپنے تلامذہ کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے ہیں نعت شریف سنائی۔

ظلمت کدے میں نور کا ساماں لئے ہوئے ● غار حرا سے شمع فروزاں لئے ہوئے

جناب قاضی اکرم عارفی محتاج تعارف نہیں۔ نعتیہ نعت کے جلسوں میں موصوف اپنے مخصوص انداز میں نعت شریف سناتے ہیں۔

او جھل نہ ہو آنکھوں سے کبھی کعبۂ محمد ● دیکھا ہی کرے شام و سحر روئے محمد

نظام آباد کے ایک اور شاعر اظہر قادری جو صرف نعت کہتے ہیں۔ بارگاہ رسالت میں نذرانہ نعت پیش فرمایا۔

زبان مرہم۔ نگاہ کوثر۔ قدم بہ جنت گرد زلف رحمت
کہاں سے لاؤں کدھر سے آئے کوئی تمہارا جواب لے کر

کریم نگر کے ممتاز شاعر جناب عبدالعلیم پرواز جو اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ترنم انداز میں کلام سناتے ہیں' نعت شریف سنائی۔

وہ جانتے ہیں کس پہ ہے فیضان محمد ● عرفان حق ہے اصل میں عرفان محمد

بڑی ہی مشکل سے جس شاعر کو آواز دی گئی وہ کوئی اجنبی نہیں۔ دارالسلام کے مشاعروں میں ضیاء عرفان' ڈاکٹر منیر الزماں ہر سال پابندی سے نعت شریف سنانے کی سعادت حاصل کرتے ہیں پچھلے سال سے معتمد مشاعرہ نے ان شعراء کو فہرست سے خارج کر دیا۔ ان کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈہ اختیار کیا گیا۔ یہاں تک ان کو موقعہ نہیں دیا گیا۔ سالار ملت کی منصف مزاج طبیعت جلسہ میں نہ تھی اور جناب سید سجاد صاحب سابق ایم ایل اے کی مداخلت سے ضیاء عرفان کو موقعہ دیا گیا لیکن یہ نام نہ مشاعرے سے پہلے شعراء کی فہرست میں شائع کیا گیا نہ مشاعرہ کے بعد روئداد میں شائع کیا گیا۔ البتہ رہنما' منصف اور عوام" نے مشاعرہ کی صحیح رپورٹنگ کی ہے۔ یہ معتمد مشاعرہ کی کرم فرمائی ہے۔

ضیاء عرفان کے شعر ملاحظہ ہوں: ممکن ہی نہیں خیر بھی شامل ہو شر کے ساتھ
شر شر کے ساتھ' خیر ہے خیر البشر کے ساتھ

دنیا مجھے کہتی ہے تجھے کس کا بھرم ہے
فلاں کا ہے بھرم جن کا لقب شاہ امم ہے

نوجوان شاعر نعیم ندیمؔ کو پہلی مرتبہ یہاں مشاعروں میں دعوت دی گئی۔

خود صداقت کا نمونہ ہیں رسولِ عربی
اُن کی راہوں میں تو ہم خود بہ بہی دیکھتے ہیں

پیر طریقت حضرت خواجہ ڈاکٹر گوہر شاہ ثانی نے بھی نعت شریف سنا کر داد تحسین حاصل کی۔

ہے تشہد لازمی تکمیلِ ایماں کے لئے
ہے کلام حق تعالیٰ آپ کی سیرت کا نام
ایک وہ ٹکڑے ہوا اور ایک پلٹ کر آگیا
آپ کا جناب ڈاکٹر آپ کا صبح غلام

حضرت خلد بادہ بیکسی کا اعلان کیا گیا آپ سے کون واقف نہیں۔ آپ کے آتے ہی مشاعرہ کی فضا بن گئی۔ سامعین کے اصرار پر آپ نے کئی ایک نعتیں سنائیں۔ ایک نعت کے چند شعر ملاحظہ ہوں

قیامت میں اور اک قیامت بپا ہے ● مرے اشک ہیں دامنِ مصطفےٰ ہے
یہ احسان صورت نہیں ہے تو کیا ہے ● محمد ہیں جس کے اسی کا خدا ہے
یہ کون آج دنیا میں پیدا ہوا ہے ● زمیں کی زیارت کو عرش آگیا ہے
یہ کیوں سانس اکھڑی ہوئی بتوں کی ● یہ کیوں چہرۂ کفر اترا ہوا ہے
خالدؔ اپنے آقا کو کیا منہ دکھائے ● سرِ حشر اپنے گردن جھکائے کھڑا ہے

بزرگ شاعر جناب بشیر احمد نے بھی اپنا کلام سنایا۔

یہ موقع ملا ہے نہ غفلت میں کھونا ● کرم سے بھری ان کی سرکار ہے آج

اُردو کے خاموش خدمتگزار جناب منظور احمد منظور نے بھی نعت شریف پیش کی۔

مرے دل کی تمنا تو بس اب یہ تمنا ہے
میسر ہو مدینے کا نظارہ یا رسول اللہ

جناب گلفام سنگھی نے بھی حسن عقیدت میں نعت پیش کی۔

تو اسے تقدیر تاج عظمت کونین لکھ دینا
میرے حق میں جو حضور پاک کے نعلین لکھ دینا

استاذ شاعر حضرت حبیب اللہ نے بھی اس مشاعرے میں شرکت فرمائی۔

ہے سنت مجسم جان شاہ شفاعت
کیسے یہ ہوا آ شکرانہ محمد
ملتا نہیں کسی سے ہوکر دماغ اس کا
سکتا نہیں کسی کا دیوانہ محمد۔

بزرگ شاعر جناب کیف شکیل کا نعتیہ شعر ملاحظہ ہو۔

خوشنودی خدا بھی اجر و ثواب بھی
کیا ذکر ہے یہ ذکر رسالت مآب بھی

استاذ شاعر خورشید ہند حضرت خورشید جنیدی جن کے دو شعری مجموعہ تحریر مثبت اور ذہن قلعی شائع ہو چکے ہیں بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

دیدار مصطفےٰ کی دعا کر رہا ہوں میں
میرا جو فرض ہے وہ ادا کر رہا ہوں میں
روئے رسول پاک کے انوار کی قسم
نظارۂ جمال خدا کر رہا ہوں میں

بزرگ شاعر جناب حبیب گنگوہی نے نعت شریف کے چند اشعار پیش کئے ایک شعر ملاحظہ ہو

کبھی طیبہ کبھی عرش بھی سیر لیتے ہیں
نبی کے چاہنے والے بھی کیا کیا دیکھ لیتے ہیں

ممتاز شاعر جناب ساغر نظامی نے کلام پیش فرمایا۔

[illegible] مدینے والے ● دونوں عالم کے [illegible]

[illegible] گوشہ غوث الثقلین حضرت روحی قادری نے بھی ایک نذرانۂ عقیدت پیش فرمایا۔

نبی کے عشق [illegible] ہے ● خدا کا کام بندہ کر رہا ہے

[illegible] زندگی [illegible] ہے کسی [illegible] ● تیرا [illegible] کے پاس ہے

جناب [illegible] ہے۔

کونین کی دولت کچھ بھی نہیں اس نور مجسم کے آگے

جب ان کا تصور ہوتا ہے ایمان میں حرارت ہوتی ہے

اس مرتبہ سنی دعوت اسلامی کے دو شعراء کو پہلی مرتبہ شامل کیا گیا وہ بھی اس استفسار پر کہ وہ معتمد مشاعرہ کے مخالفین میں سے تو نہیں ہیں ؟

جناب [illegible] نعت شریف سنائی

[illegible] ● [illegible]

عرفان احمد عرفان سنی دعوت اسلامی کے دوسرے شاعر نے بھی نعت شریف سنائی۔

[illegible] ایمان [illegible] ● جو آئیں گے شاہ [illegible]

آخر میں حضرت [illegible] نے اپنا کلام پیش فرمایا۔

[illegible] لب پہ جب نام محمد آتا ہے

[illegible] ایک ایک گناہ ڈھل جاتا ہے

[illegible] اسد عباسی اور جناب رئیس [illegible] حضرات [illegible] معتمد مشاعرہ کی زیادتیوں کے باعث حجابا حضرات [illegible] دیگر [illegible] شعراء [illegible] نصیر الدین [illegible]۔ [illegible] مشاعرہ ۲ بجے شب اختتام کو پہنچا مجلس [illegible] جناب [illegible] نے شکریہ ادا کیا۔ ●●

ســـ تاج سمانی بمبئی

(افسانچہ)

درد بٹورے پاگل تنہا

وہ اپنے مکان میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹیا پہ لیٹا۔ وقت کے منکر نکیر کو دن بھر کا حساب دے رہا تھا...... رات چاند سے مصروفِ سخن تھی۔ چاند کی ٹھنڈی سفید چادریں ماحول کو چکا چوند کر رہی تھیں۔ چھت کا سوراخ دور سے روشنی کی پھواریں اُس کے چہرے کو زرد کرنے لگیں اور اچانک ہی حساب کتاب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کھجاتا مسکرانے لگا۔ کافی دیر تک وہ اسی کیفیت میں مبتلا رہا۔ پھر اچانک ہی اُس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ آنکھیں حیرت و استعجاب سے اپنے حلقوں میں گردش کرنے لگیں۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے مکان میں رینگنے والی کرنوں کی تمازت اور تمکنت سے لمحہ بہ لمحہ اُس کا کمرہ روشن ہو رہا ہے اور پھر اک آن کی آن میں سارا کمرہ منور ہو گیا...... وہ یکلخت اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اسی غیر متوقع اُفتاد پر انگشت بہ دنداں سارے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اُس کی آنکھیں اُس کے حلقے میں گردش کرتی ہوئیں اچانک ٹھہر گئیں۔ اور پیشانی پر منحنی لکیروں نے اِس بات کا اعلان کر دیا کہ وہ گویا اب اِس حقیقت کو جان چکا ہے۔ اُس کی نظریں یکلخت چھت کی طرف اُٹھ گئیں اور بغور جائزہ لینے لگیں...... وہ کچھ دیر اِسی طرح

چھت کو تکتا رہا۔ اور پھر اچانک ہی ایک جست لگا کر فوراً کمرے کے باہر دوڑ پڑا۔ مکان کے باہر آتے ہی وہ ایک چبوترے پر کھڑا ہو کر اپنے مکان کی چھت کا جائزہ لینے لگا اور اچانک ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ چھت پہ ایک روشن ہیولیٰ کھڑا ہوا اُسے دیکھ کر مسکرائے جا رہا ہے ـــ لیکن یہ جان کر اور بھی تعجب ہوا کہ وہ روشن ہیولیٰ ایک بے حد حسین و جمیل دوشیزہ ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ دوشیزہ کنیا کماری کی کوئی راجکماری ہے اور اُس سے ووٹ مانگنے آئی ہے ـــ دوشیزہ یونہی اُسے دیکھتی اور مسکراتی رہی۔ وہ پاگلوں کی طرح سر کھجاتا حیرت و استعجاب میں غوطہ زن رہا۔ پھر اچانک اُس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے دوشیزہ کو نیچے اُترنے کے لئے کہا۔ نازک اندام منور دوشیزہ بڑی ہی ناز و ادا سے نیچے اُتر آئی اور اپنے اُجالوں کے ساتھ اُس کے اندھیرے کمرے میں چلی گئی ـــ کمرے میں پہنچ کر پاگل نے نہایت ہی انکساری سے پوچھا۔

کون ہو تم ـــ اور کہاں سے آئی ہو ـــ؟

مجھے رعنا کہتے ہیں ـــ چاند کی رہنے والی ہوں۔ اس دنیا کو دیکھنے کی کافی عرصے سے تمنا تھی۔ اور آج ارادہ کر کے چلی آئی۔

پاگل بے حد حیرانی کے عالم میں آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھے چلا جا رہا تھا ـــ رعنا کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن ہونٹوں پر خفیف سا تبسم بھی نمودار ہونے لگا۔ پھر اُس نے پوچھا ـــ!

یہ اس طرح ـ آنکھیں پھاڑے کیا دیکھ رہے ہو مجھے۔

تعجب ہے ـ کہ تم چاند کی رہنے والی ہو اور اتنی فصیح اور بلیغ اردو بول رہی ہو۔

[illegible] ہماری زبان اُردو ہی ہے۔

عجیب ہے۔

ویسے تم نے اپنا نام نہیں بتایا

مجھے طلعت سلمیٰ تبسم کہتے ہیں

اچھا نام ہے ۔ اچھا تو کیا ہوا ۔

یہ ہماری اپنی ماں جی کا مستقل تعارف ہے

خیر ایک بات بتاؤ ؟

فرمائیے ۔ ہاں

یہ جگہ کون سی ہے ۔

یہ ہندوستان کا ایک بہت ہی تہذیب یافتہ شہر حیدرآباد ہے ۔

اچھا اچھا ۔ تو یہ حیدرآباد ہے ۔

ہاں لیکن ۔ جو لوگ تہذیب یافتہ ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے وہ دھیرے دھیرے
اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں ۔

تو پھر میرا اندازہ صحیح نکلا ۔

کونسا اندازہ ۔۔ ؟

میں شہر حیدرآباد کا ادبی سروے کرنا چاہتی تھی اور اتفاق سے ٹھیک
جگہ پر پہنچ گئی ہوں ۔ اور اگر تم میرا ساتھ دو ۔ تو یہ سروے پایہ تکمیل
پہنچ سکتا ہے ۔

بہت مشکل ہے میڈم ۔ یہ کام بہت ہی مشکل ہے ۔

کیوں ۔

کیونکہ جو اچھے ادیب اور محقق مشہور ہیں ۔ وہ یہاں کی ریشہ دوانیوں
سے عاجز آکر یہاں کے ادب سے قطع تعلق کر کے کب کا ترک شاعری کر چکے ہیں ۔
اور رہے سہے لوگ ۔ اسی طرح تو ادب میں جمود آ جائے گا ۔

ابھی آچکا ہے۔ ادب کی قیادت نا اہلوں کے ہاتھوں میں آچکی ہے۔
پھر بھی میں یہاں کے ہر شاعر سے ملنا چاہوں گی اور اس سلسلے میں مجھے تمہاری
مدد درکار ہے۔
ٹھیک ہے۔ چلو میں تم کو یہاں کے جملہ ساڑھے بیاسی شعراء سے ملوا دیتا ہوں۔
رعنا نے یہ سنتے ہی ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ قیاچہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہنے لگی
کیا میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے تمہیں ؟
جی ہاں بیاسی تو سمجھ میں آتے ہیں۔ یہ ساڑھے بیاسی شعراء چہ معنی دارد
تم نے بالکل صحیح اطلاع پہنچائی ہے تمہیں۔
ابھی بیاسی شاعر کے بعد کوئی آدھا شاعر بھی ہے یہاں۔
ہاں ہے نا۔ وہ فرشتہ ساڑھے چھ فٹ کا بھی ایک شاعر ہے یہاں جس کی
شاعرانہ صلاحیتیں بھی اسی RANGE کی ہیں لیکن اس کا دعویٰ یہ ہے
کہ وہ مومن کے بعد کا سب سے بڑا شاعر ہو چکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کا
یہ بھی کہنا ہے کہ ایک مرتبہ اس کی غزل سن کر دلیپ صاحب غش کھا کر گر پڑے تھے۔
رعنا حیران ہوتی ہوئی بے ساختہ کہنے لگی۔
اوہو۔ وہ مشہور فلمسٹار دلیپ کمار کی بات کر رہے ہو۔
ہاں ہاں۔
اچھا۔ پھر کیا ہوا ؟
پتہ نہیں۔
[illegible]
رعنا مسلسل حیرت و استعجاب میں ڈوبتی ہوئی استفسار کرنے لگی۔
ارے بھلے آدمی یہ تو بتاؤ کہ دلیپ صاحب کے ہوش میں آنے کے بعد کیا ہوا ؟

کہا نا۔ کچھ نہیں۔
لیکن مجھے پتہ کرنا چاہیے تھا۔
ہم حیدرآبادی کسی بھی بات یا واقعہ کی تصدیق کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔
لیکن کیوں۔
یہ ہمارے CULTURAL SECRETS ہیں۔ ہم تمہیں نہیں بتا سکتے۔
لیکن مجھے یہ جاننا ضروری ہے ورنہ میرا کلچرل سروے ضائع ہو جائے گا۔
اور میرے بتا دینے سے یہاں کے شاعر کا بھرم ضائع ہو جائے گا۔
پھر بھی بو تمہیں بتانا ہوگا۔
صرف اتنا ہی بتا سکوں گا کہ اگر ہم واقعہ کی تصدیق کرنے لگ جائیں تو حقیقت سامنے آ جائے گی۔ اس لیے ہم حیدرآبادی شرمندگی کو زیادہ تر AVOID کرتے رہتے ہیں۔
ٹھیک ہے۔ مت بتاؤ۔ لیکن اب چل کر کم از کم کچھ شعراء سے ہی ملا دو۔
ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ہم سب سے پہلے بھر ۳ چلتے ہیں۔
وہاں کون ہے۔
ایک طوائف زادہ ۔۔ شکی اِخبار نام ہے اُس کا۔
یہ کیسا نام ہے۔
پرانے زمانے کی طوائفیں اپنی کلاس برینڈ نسلیں کا ایسا ہی نام رکھتی تھیں۔
پھر تو شاعری اُسے ورثے میں ملی ہوگی۔
بس یہ ایک ہی چیز نہیں مل سکی۔ باقی یہ بیماریوں کے جو حقوق اسی کے پاس محفوظ ہیں
پھر یہ شاعر کیسے بن گیا۔

جس کوٹھے پر یہ پیدا ہوا تھا۔ وہاں پر ایک دلال تھا۔ اُس نے ایک دن عقلی صلاحیتوں کے محلول کو شکی اخبار کے جسم میں INJECT کر دیا۔ تب سے یہ شاعر ہو گیا اور میرا خیال ہے کہ اِس کی صنفِ سخن کی وجہ سے اِس کو گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں بھی جگہ مل جائے گی۔

بھئی وہ کونسی صنفِ سخن ہے ہم بھی تو جانیں۔

یہ بڑی سے بڑی گالی کو بھی بڑی آسانی سے منظوم کر لیتا ہے۔ پہلے یہ مشق وہ اپنے آباؤ اجداد پر کیا کرتا تھا اور آجکل کسی بھی بڑے ادیب و شاعر کو منظوم دشنام نامے بھیج کر اپنے شاعر ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

رعنا کی آنکھیں یہ سُنتے ہی بھر آئیں۔ شاید اُسے بھی اس بات کا احساس تھا کہ ادب میں اس طرح کے عنصریت اگر شامل ہو جائیں تو اُس شہر کی تہذیب ایک گالی بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی کہنے لگی۔

تباچہ — ؟ یہ تو اخلاقی جرم ہوا۔

آپ بھی محترمہ طوائف زادوں کو کہاں اخلاق کا مطلب سمجھانے چلی ہیں۔

لیکن ہم نے تو سُنا تھا کہ طوائف زادوں میں بھی اخلاق کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے ہیں

اوہو۔ رعنا۔ تم بھی کس دور کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ وہ وقت اور تھا۔ وہ طوائفیں اور تھیں ___ وہ طوائف زادے اور تھے ___ پہلے طوائفوں کے کوٹھوں کو ادب کا گھرانہ کہا جاتا تھا ___ ان کے اڈوں کے نام بھی بڑے محترم ہوا کرتے تھے۔ ہمارے پاس تو اِسے محبوب کی مہندی کے نام سے پکارا جاتا تھا ___ لیکن جب سے جسم فروشی کا کاروبار شروع ہوا۔ تب سے یہ تہذیب عنقا ہو گئی۔ اب تو اسے ریڈ لائٹ ایریا کہا جاتا ہے ___ اب ریڈ لائٹ ایریئے سے نکلے ہوئے شکی اخبار سے تم کیا توقع کر سکتی ہو۔

اچھا ایک بات بتاؤ

ہاں کہو —

تم نے ریڈ لائٹ ایریے کے اُس دلال کا نام نہیں بتایا جس نے کملا کے جسم میں سفلی صلاحیتوں کے محلول کو INJECT کر دیا تھا۔

دغاؤ الدین خچر۔

یہ کیا نام ہوا ؟

دلالوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔

کیا یہ اب بھی اُسی ریڈ لائٹ ایریے میں دلالی کرتا ہے۔

نہیں — یہ آجکل ایک اخبار کے دفتر میں دلالی کرتا ہے۔

اخبار کے دفتر میں بھی دلالی ہوتی ہے ؟

ہاں ہاں — بڑی زبردست دلالی ہوتی ہے اور اس کی خوب کمائی ہو رہی اُسکو۔ دوسروں کی تصویریں اور غزلیں چھپوا کر اپنا کمیشن سیف کرتا ہے یہ — اور پھر اُدھر کی کمائی الگ۔

جیسے — ؟

جیسے ہندی کویتا کے ساتھ حرکتِ ناروا

کیا مطلب ؟

تو مجھے مطلب سمجھ میں آنے تک دو تین مجموعے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔

تو کیا سماج اسے ناجائز قرار نہیں دیتا ؟

شاگردی کا جو لیبل لگائے رکھا ہے۔

یہ تو کویتا کا استحصال ہے۔

یہ تو غزل کا بھی استحصال کرتے ہیں۔ کویتا کس کھیت کی مولی ہے۔

یہ تو ادب کے قزاق ہوئے

اس کے باوجود تم ادب کا بسرو ہے کہنے پہ مصر ہو۔

اچھا ایک اور بات بتاؤ

کہو۔

اس دفاؤ الدین نجّر اور شکی اخبار میں کیا رشتہ ہے۔

بھئی رعنا ــ SORRY YAAR ــ میں یہ نہیں بتا سکوں گا۔

کیوں ؟

ارے بھئی کسی ناجائز رشتہ کی وضاحت کتنی معیوب بات ہے۔

اچھا اچھا۔ اب میں سمجھی ــ یہ اسکی ادب سے بھی وابستہ ہو چکے ہیں۔

تم ٹھیک سمجھیں۔

اچھا یہ بتاؤ۔ اِس دفاؤ الدین نجّر نے کبھی کوئی نیک کام بھی کیا ہے۔

شاید ایک بار کیا تھا۔

وہ کیا تھا۔

اپنے دوست شکی اِخبار کی بیوی کو فرضی نام سے منظوم محبت نامہ ارسال کیا تھا۔

یہ بات منظرِ عام پر آئی ؟

منظرِ عام پر تو صرف ان کے مجموعے آتے ہیں۔ کارہائے نہاں نہیں۔

تو پھر اِس کا RE-ACTION کیا ہوا ؟

آگ دونوں طرف بھڑک اُٹھی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اچھا اِس دفاؤ الدین نجّر کی ادبی کاوشوں کے بارے میں مزید کچھ بتا سکتے ہو۔

نہیں رعنا ــ ادبی کاوش کا تو مجھے علم نہیں۔ ہاں اس کی ادبی نگارش کی تفصیل بتا سکتا ہوں۔

چلو وہی بتادو ۔
آج کل اس کو غلمی شاعری کی خارش ہو گئی ہے ۔ چھندوں اور ناکرآؤں میں
پھنکنے لگے ہیں آجکل یہ ۔
بھئی تباچہ ..... اس کی تو اردو شاعری ہی عین غین ہے ۔ پھر یہ فلمی شاعری کا
دورہ کیونکر پڑ گیا ۔
حسد ـــــ جلن ـــــ
یہ کیونکر پیدا ہوئی ۔
یہاں حیدر آباد میں ایک سیریئل بن رہی تھی ۔ جس میں سارا ٹیلنٹ بمبئی کا
تھا سوائے پروڈیوسرز موسیقار اور شاعر کے ۔
کیا نام تھا اُس سیریل کا ؟
کامیڈی سیریئل تھی ۔ نام تھا " جھٹکے ذرا ہٹکے " ۔ جو فی الحال ڈی ڈی
وَن میں اپروول کے مراحل سے گذر رہی ہے ۔

پھر ؟
اِس سیریئل کا جو گیت کار تھا وہ دغاؤ الدین فجر کے بیٹے کی عمر کا تھا ۔ جس نے
اِس سیریئل میں دو گیت لکھے جو معرکتہ الآرا کہلائے ـــــ بس " جھٹکے ذرا ہٹکے "
میں اُس بے چارے نے گیت کیا لکھے کہ دغاؤ الدین کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی
ایسے جھٹکے لگے کہ شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا ـــــ صبح جب ہوئی تو سارے
بدن پر چھندوں اور بحروں کے پھوڑے پھنسیاں نکل آ ئے ۔ اِس کا ایک
ہی علاج تھا ۔ وہ یہ کہ یہ بھی گیت کار بن جائے ۔
پھر کیا ہوا ۔
ایک دن اِسے پتہ چلا کہ ایک فلم پروڈیوسر ہے جو اپنی نا اہلی اور نا مقبولیت کا

بناء پر حیدرآباد کے اعلیٰ ادبی حلقے سے راندہ گیا تھا) کو ایک نامعقول نغمہ نگار کی تلاش تھی جو بنا اُجرت گیت لکھ دیے [illegible] شاعر اپنے نو مجموعوں کے ساتھ (جن کی اشاعت اپنے [illegible] کی اعانت سے تکمیل پائی جو اپنی غزلیں مع تصاویر اُس کے اخبار میں شائع کروا لیتا تھا۔ ویسے ہم حیدرآبادی LITRARARY CORRUPTION کہتے ہیں جو ہمارا جامیاتی حسن ہے) صبح کی اولین ساعتوں میں پروڈیوسر کے در پر پہنچ گیا۔

پھر کیا ہوا" رعنا کے چہرے پر بدستور حیرانی چھائی ہوئی تھی اور وہ مسلسل استفسار لئے جا رہی تھی — قباچہ خلاؤں میں گھورتا ہوا اپنی بات کہ [illegible] ہوئے تھا۔

دغاؤالدین نے اپنی ادبی جماقتوں کا بوجھ (نو مجموعہ کلام) کندھوں سے اُتار کر پروڈیوسر کے قدموں پہ رکھ دیا۔

پروڈیوسر نو مجموعے دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہوگا۔؟

ہاں۔ بے چارہ اُردو نہیں جانتا تھا نا! اِسی لئے کتابوں کے ڈھیر سے متاثر ہوگیا ورنہ وہ اُردو جانتا اور اُس کا ایک بھی مجموعہ پڑھ لیتا تو خدا کی قسم گولی مار کر ہلاک کر دیتا اُسے ....

کیوں۔؟

ادب میں نا اہلی کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا رعنا!

یہ تو واقعی بہت گھٹیا آدمی نکلا۔

اجی نکلا کہاں — یہ صفت تو موروثی ہے۔

اچھا سنو۔؟

ہاں کہو —

کافی دیر سے میں دیکھ رہی ہوں.... وہ سامنے جو بجلی کا کھمبا نظر آرہا ہے نا؟

ہاں ہاں ۔

وہاں تینوں اشخاص کھڑے بڑی عجیب نظروں سے ہمیں دیکھے جا رہے ہیں۔

ہنسا ہی نہیں — صرف تمہیں دیکھ رہے ہیں — بوالہوس ہیں وہ تینوں۔

جانتے ہو تم اُن تینوں کو۔

ہاں — تینوں ادب کے کینسر ہیں۔ اُن میں جو لمبا اور نیم گنجا نظر آ رہا ہے نا؟

ہاں ہاں۔

وہ یہاں کا نامور شاعر ہے۔

کیا مطلب ؟

مطلب ادب کے موسم میں اپنا مجموعۂ کلام شائع کرنے نکلا تھا لیکن سنگِ تنقید ایسے برسے کہ اُس کی تمام تخلیقی صلاحیتیں مجروح ہو کر رہ گئیں۔ آج کل اپنے آپ کو علامہ اقبال کا اوتار کہہ کر شہر میں اپنی عقیدت کے شکوے بجا رہا ہے۔

رعنا نیم گنجے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی —

اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بھی شاعر ہے۔

یہاں پہ مترجم بھی شاعر ہونے کا دعویٰ کر دیتے ہیں۔

اِس کا کوئی BIO-DATA ؟

کیا اتنا کہنا کافی نہ ہوگا کہ یہ ادب کا منافق ہے۔

وہ کیسے ۔ ؟

اپنے آپ کو اُردو کا خادم کہتا ہے — نا خلف گروپ میں اُردو کی بقاء کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

لیکن اس کی اولاد اُردو کی الف بے سے بھی بے بہرہ ہے۔
اس کی شاعری کس قسم کی ہے ؟
اتنے بڑے شہر میں صرف دو آدمی کی ہی سمجھ میں آتی ہے۔
کون ہیں وہ دونوں۔ ؟
وہی جو اس کے ساتھ کھڑے ہیں۔ اُن میں سے ایک عثمانیہ یونیورسٹی کا ریٹائرڈ پروفیسر ہے۔
اور دوسرا ؟
وہ جراح ہے۔
کیا یہ بھی شاعر ہے ؟
ہاں۔ آزاد نظموں کا شاعر کہلاتا ہے۔
یہ آزاد نظم کیا ہوتی ہے۔
ادب کی بدعتِ حسنہ۔
ہونہہ۔ کیا نام ہے اس آزاد نظم کے شاعر کا۔
خلاف جتین
یہ کیا نام ہوا
جراحوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔
اِس کی شاعری کس قسم کی ہوتی ہے۔
وہ صرف نیم گنجے کو ہی سمجھ میں آتی ہے
یہ دونوں دوست ہیں ؟
شاید۔ ویسے یہ اپنی ادبی حماقتوں کے P.R.O ہیں
کیا مطلب ؟

ایک دوسرے کی پبلسٹی میں خوب ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں

تم نے اُس نیم گنجے شاعر کا نام نہیں بتایا۔

SORRY بابا۔ مجھے اُس کا نام لیتے ہی متلی ہونے لگتی ہے

ہوں۔ ویسے۔ دیکھنے سے تو بڑا گھمنڈی اور مغرور لگتا ہے۔

نہیں نہیں بھئی۔ تم غلط عکاسی کر رہی ہو۔ دیکھنے میں تو کافی میٹھا لگتا ہے چال چلن میں بھی تھوڑی مٹھاس ہے ۔ بات کرنے کا انداز بھی میٹھا ہی ہے۔

میٹھا ؟ YOU MEAN SWEET?

اوں ہوں ۔ سویٹ نہیں بابا۔ اب میں اس مٹھاس کی کیسے وضاحت کروں۔

کوئی ضروری نہیں۔ بس صرف اتنا بتا دو کہ کیا یہ بھی بڑا شاعر کہلاتا ہے۔

پہلے تو نہیں تھا۔ پر اب ہو گیا ہے۔

وہ کیسے۔

ابھی حال ہی میں یہ لندن اور امریکہ کا دورہ کر کے آیا ہے۔ وہاں سے آتے ہی اِس پر بڑا شاعر ہونے کا دورہ پڑ گیا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ارے بھئی یہاں سب ایسا ہی ہوتا ہے۔ پُرانے شہر میں ایک پاشو رکشا والا تھا۔ وہ اچانک دوبئی چلا گیا ___ دوبئی سے آتے ہی وہ پاشو سے پاشو بھائی ہو گیا ___ اور جب دوسری بار دوبئی سے لوٹے تو وہ پاشو صاحب ہو گیا ___ آجکل تو ہز ہائی نیس پاشو میاں بنے ہوئے ہیں۔

تو مطلب یہ ہوا کہ یہ نیم گنجا شاعر اگر دو چار بار لندن، امریکہ کا دورہ کر لے تو یہ بھی ہز ہائی نیس ہو جائے گا۔

نہیں ہو سکے گا تو ہم زبردستی کر دیں گے۔ کیونکہ ہم لوگ بے حد کھرڈ ہو گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے واپس آنے والوں کی اہمیت ہمارے پاس اتنی نہیں جتنی کہ دوبئی، لندن اور امریکہ سے آنے والوں کی ہے۔
اچھا یہ بتاؤ قیاچہ ؟ یہ مشاعروں میں جاتا ہے یا نہیں۔
جاتا ہے اور ہمیشہ مایوس اور ناکام لوٹتا ہے۔
وجہ ـــ
ایک تو کلام بے حد ثقیل۔ عوام الناس کے آگے شاٹ سرکٹ ہو جاتا ہے دوسرے اس کے اندر ایک بڑا عیب ہے۔
وہ کیا۔
مشاعرے میں یہ جب بھی غزل پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو کبھی اپنے کوٹ کی جیب میں دونوں ہاتھ ہوتے ہیں یا پھر پتلون کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈالے رہتا ہے۔
یہ کیا بات ہوئی۔
بس یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے یہ اپنی مکمل غزل پڑھ ہی نہیں پاتا۔ بھول جاتا ہے۔
شاید CONFUSE ہو جاتا ہوگا۔
لیکن اس میں CONFUSION کی کیا بات ہے۔
بھئی اصل میں جیب میں ہاتھ ڈال کر یہ اپنی انگلیوں پر گنتی گننے لگتا ہے اور اچانک CONFUSION شروع ہو جاتا ہے۔
کیسا CONFUSION۔
بھئی پتلون کی گنتی کوٹ کی گنتی سے ہمیشہ ایک حد زیادہ ہو جاتی ہے۔

بیچارہ جھنجلا کر اشعار بھول جاتا ہے۔

پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو تباچ۔

تم نہیں سمجھ سکو گی رعنا۔ یہ بڑا المیہ ہے۔

شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تباچ۔ وہ دیکھو۔ وہ اب بھی اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں چھپائے ہوئے ہے۔

بیچارہ ابھی بھی CONFUSION میں مبتلا ہے۔

رعنا نیم گنجے شاعر، ریٹائرڈ پروفیسر اور خلاق جتیں کی طرف دیکھ کر انگشت بہ دنداں تھی۔ نیم گنجا شاعر اچانک بوکھلا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ رعنا انھیں جاتا دیکھ کر انکار میں سر ہلاتی کہنے لگی ....

تباچ ؟

ہوں ـــ

لگتا ہے میری ریسرچ اکارت جائے گی۔

کیوں ؟

اِس طرح کے نامعقول لوگوں سے مل کر میرا وقت اور میری محنت دونوں ضائع ہوجائے گی۔

ایسی بات نہیں ہے رعنا ـــ اس شہر میں ہندوستان کے اعلیٰ و عظیم شعراء و ادبا موجود ہیں۔ جنہیں خود نمائی سے بے حد احتراز کرتے ہیں۔ اُن کا ایک ہی نصب العین ہے کہ بس ہر طرح سے اُردو کی خدمت میں لگے رہنا تو ایسے لوگوں سے تم مجھے کیوں نہیں ملاتے ـــ

کیا ہے کہ مجھے اُن کا اتا پتا ٹھیک سے نہیں معلوم ہے پھر بھی کوشش کرکے ملواؤں گا فی الحال تم تھکی ہوئی ہو۔ تھوڑا آرام کرلو۔ کل ہم لوگ جلدی

چلتے ہیں۔

وہاں کون ہے۔

انڈو پاک کے ایک بہت جانے پہچانے شاعر

نام کیا ہے

اوں ہوں۔ تم تو ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر بیٹھتی ہو۔

بھئی اچھے شاعر سے ملنے کی بڑی عجلت رہتی ہے مجھے۔

کہا نا ۔ فی الحال آرام کرتے ہیں۔ کل صبح میں تمہیں اس کا نام بتا کر ایسا سرپرائز دوں گا کہ تم وہاں پر پلکیں بچھاتی ہوئی چلی جاؤ گی۔

ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔

تم آرام کرو ۔ میں بازار جا کر کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آتا ہوں۔

قباچہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ رعنا اسے جاتا دیکھ کر مسکراتی رہی۔ شاید وہ قباچہ کے حسن سلوک سے کافی متاثر ہو چکی تھی۔ ●● (باقی آئندہ)

(سلسلہ صفحہ ۳۳)

پلاتے ہیں۔ ایسے پانی میں پکے ہوئے جیسے غذا استعمال کرنے سے جراثیم انسان میں داخل ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے دست اور پیشاب میں خون آنے لگتا ہے۔ ریٹھے کی گٹھلی کا مغز اعصاب اور دماغ کو تقویت دیتا ہے اس لئے ہم اس کو استعمال کرتے ہیں۔ ہچکی کی شکایت میں اس کو گھس کر گلے پر لیپ کرنے سے ہچکی فوراً بند ہو جاتی ہے۔ بے ہوشی اور غشی کے مریضوں میں ایک رتی باریک سفوف ناک میں پھونکنے سے مرض دور ہو جاتا ہے۔ مالیخولیا اور اختناق الرحم کے مریضوں کے لئے بھی اس کی بھاپ لینا فائدہ مند ہوتا ہے۔ دمہ کے دورے کی صورت میں اس کا سفوف کھلانے سے پھیپھڑوں سے بلغم خارج ہو کر مریض سکون سے سو جاتا ہے۔ جن لڑکوں اور لڑکیوں کے پیٹ میں کیڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کا سفوف دو رتی استعمال کرنے سے پیٹ کے کیڑے مردہ حالت میں جسم سے خارج ہو جاتے ہیں

حکیم سید مجاہد محمود برکاتی

ریٹھا سستا اور مفید پھل

ریٹھا ہمارے ملک کا عام سستا اور نہایت آسانی سے دستیاب ہو جانے والا پھل ہے جو جھاڑی کے برابر یا اس سے کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کا چھلکا شکن دار، پیلا، سیاہی مائل ہوتا ہے۔ توڑنے پر اندر سے کنول گٹے کے مانند کالی گٹھلی نکلتی ہے۔ یہ پھل درخت پر گچھے کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کے درخت خودرو ہوتے ہیں البتہ سری لنکا، بنگال اور شمالی ہند میں اس کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔

یہ بات ایک عجیب و غریب شے ہے اور اگر کوئی شخص صرف ریٹھے کی تاثیر اور اس کے استعمال سے پوری طرح واقف ہو جائے تو جسم انسانی کی بہت ساری بیماریوں کا علاج کر سکتا ہے اور اس کے بعض فوائد ایسے ہیں کہ کوئی دوا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور ہم اسے روزمرہ کی بیماریوں میں استعمال کر سکتے ہیں۔

عام طور پر اسے ہماری خواتین بالوں کو دھونے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ یہ بالوں کو نرم اور صاف کرنے کے لئے برسوں سے مستعمل ہے۔ یہ ایک نہایت مفید اور بے ضرر قدرتی شیمپو ہے۔ ریٹھے کے ساتھ سیکاکائی، آملہ، میتھی دانہ ہم وزن لے کر پانی میں باریک پیس کر سر دھونے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے چھلکے کو پانی میں پیس کر لیپ کرنے سے چہرے کے داغ، دھبے، چھائیاں اور جھائیاں دور ہو کر چہرہ نکھر جاتا ہے۔ اس کے جھاگ سے چہرہ کو دھونے سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ اس کے جھاگ سے چہرہ کو دھونے سے چہرہ کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ جن لوگوں کو

آدھے سر کا درد (جسے طبی اصطلاح میں درد شقیقہ کہا جاتا ہے) شکایت ہو وہ اس کے چھلکا پانی میں گھس کر چند قطرے ناک میں ٹپکالیں۔ اس سے اس کی تکلیف دور ہو جائے گی۔ ایک خاص مرض بواسیر جو کہ ہمارے معاشرے میں عام طور پر پایا جاتا ہے ریٹھہ اس مرض میں بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ بواسیر میں ریٹھے کو استعمال کرنے کا طریقہ بہت آسان ہے۔ ریٹھے کے چھلکے اور [illegible] (یہ بھی عام دوا ہے جو دواخانوں میں آسانی سے مل جاتی ہے) دونوں کو مساوی وزن میں لے کر پانی میں پیس لیں اور چھ چھ رتی کی گولیاں بنا روزانہ ایک گولی صبح نہار منہ پانی کے ساتھ استعمال کریں۔ گرم اشیاء کا استعمال بند کردیں اور مونگ کی دال کی کھچڑی خوب گھی ڈال کر استعمال کریں۔

خناق (ڈپتھیریا) کے مریض کو اس کا سفوف پانی میں گھول کر غرارے کرائے تکلیف بہت جلد دور ہو جاتی ہے۔ ورم اور درد دور ہو کر گلا کھل جاتا ہے۔ ریٹھے کے چھلکے کا سفوف ایک سے دو رتی کیپسول میں بھر کر کھلانے سے قولنج اور آنتوں میں بلغم جمع ہونے کی تکلیف بھی دور ہو جاتی ہے۔ ریٹھا سانپ کا زہر بھی دور کرتا ہے طریقہ بہت آسان ہے۔ ریٹھے کا چھلکا خوب باریک پیس کر ململ کے باریک کپڑے میں چھان لیں اور صاف خشک شیشی میں محفوظ کرلیں۔ جب کسی کو سانپ کاٹ لے تو یہ سفوف گرم پانی میں گھول کر دو دو گھنٹے پر پلائیں۔ اس کے علاوہ بچھو کا زہر بھی یہ سفوف پلانے اور متاثرہ جگہ پر لگانے سے دور ہو جاتا ہے۔ کسی جگہ مکڑی مل جانے سے سوزش اور درد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس کے لگانے سے دور ہو جاتا ہے۔
ہمارے اطباء نے اس کی ایک اور خصوصیت یہ بھی بتائی ہے اس کے پانی کے چھڑکاؤ سے سانپ اور بچھو اس جگہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ حال ہی میں یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ ریٹھے کا پانی مرض بلہارزیا سے بھی نجات دلاتا ہے۔ اس مرض کے جراثیم افریقہ اور بعض ایشیائی ملکوں کے دریاؤں اور جھیلوں کے پانی میں موجود گھونگوں میں پرورش

(باقی بر صفحہ ۲۱)

محمد افتخار احمد بشیر
ریٹائرڈ سشن جج۔ حال مقیم امریکہ

نقش امریکہ

حیرت و عبرت کے لائق ہے یہاں کی داستان
داستانِ بے مثالِ دہر کا ہو کیا بیاں
فخرِ انساں ہو نہ ہو قایل تو ہے سارا جہاں
دیکھئے تو ہر طرح سے مہرباں ہے آسماں

ساحلوں کی ریت پر بکھری جوانی دیکھئے
دھوپ کے اسٹیج پر رنگین کہانی دیکھئے
پیسے ہی کے نام سے چڑھتی جوانی دیکھئے
نقش کی بے باکیوں پر شادمانی دیکھئے

رات میں "سیرس ٹاور"* سے جو دیکھا چار سُو
رقص میں تھے آسماں کے سارے تارے کو بہ کو
جگمگاتی سینکڑوں دیوالیاں تھیں روبرو
لکھ نہیں سکتا قلم انوارِ افشاں ہو بہو

---

* ۱۴۵۴ فٹ اونچی، ۱۱۰ منزلہ۔ دنیا کی بلند ترین عمارت

دیدنی ہوتا ہے منظر گلشنوں میں "فال" کا
پیڑ پودوں کا سراپا زرد، اُودا لال سا
جیسے ہولی کھیلنا معمول ہو ہر سال کا
شوخ موسم بے تکان بُنتا ہے رنگیں جال سا

ہائے رنگ و نور کا وہ قاتل و دلکش سماں
ڈس گئی ہوں جیسے اس کو دھوپ کی سرگرمیاں
دیر تک کوئی حسیں ویسے بھی رہتا ہے کہاں
وسطِ اکتوبر تلک ملتا نہیں اس کا نشاں

برفباری کی ہوا کرتی ہیں پھر اٹکھیلیاں
نور کی بارش کا منظر، برف باری کا سماں
کھل گئی ہوں جیسے روئی کی ہزاروں منڈیاں
یا کہ پھر بن بن کے نازل ہو رہی ہے کہکشاں

ہر طرف فیاض قدرت کے دئیے سوغات ہیں
ان گنت معدن ہیں، جھیلیں ہیں، چمن جنگلات ہیں
علم و دولت کے سبھی عقدے یہاں پر حل ہیں
عقل و دانش پر تصدق، نوبل انعامات ہیں

ہر کس و ناکس کے مذہب کی یہاں توقیر ہے
مندر و مسجد کی جاری بے کھٹک تعمیر ہے
زندگی جوشِ عمل کی بولتی تصویر ہے
اس لئے گویا کہ راضی کاتبِ تقدیر ہے

بڑا پتجھڑ

وسعتِ قلب و نظر ایسی کہ عرش عرش کیجئے
بے تعصب طرز پر جو داد چاہے دیجئے
امتیازِ رنگ و مذہب کا گماں کم کیجئے
کیسے انساں ہیں، یہ دشمن سے گواہی لیجئے

ہوش والوں کا مقدر، دوستو سوتا نہیں
خواب کے عالم میں کوئی سرخرو ہوتا نہیں
وقت سے آنکھیں ملائیں جس نے وہ روتا نہیں
ملتوں کا بول بالا بے جتن ہوتا نہیں

درد و غم کی راگنی ہو، یا ربابِ زندگی
چھیڑ دے جو حل اس پر عتابِ زندگی
سامنے رکھ دی ہے قدرت نے کتابِ زندگی
اے بشر سمجھو کہ کیا ہے آب و تابِ زندگی



(بقیہ ص ۱۶ سے)

یہ ہے کہ غیر اردو داں حلقے بالخصوص ہندی داں اردو زبان، اردو رسم خط میں سیکھنی چاہتے ہیں۔ لہٰذا اول تو اردو کے اپنے اداروں کو اردو رسم خط سکھانے کا انتظام بڑے پیمانے پر کرنا چاہئے۔ دوسرے سہ لسانی فارمولے پر اس طرح عمل درآمد کرانے کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہندی بولنے والے دوسری اور جدید ہندوستانی زبانوں کے طور پر اپنی خوشی سے اردو، اردو رسم خط میں پڑھیں جبکہ اردو بولنے والے ہندی اور مادری زبان کے طور پر اردو ہی کی تعلیم لازماً اردو رسم خط میں حاصل کریں ●●

رحمٰن جامی
الحرا۔ ہل کالونی۔ جہدی پٹنم
حیدرآباد ۔ ۲۸

تری کی پھٹکی

(شاگردوں کے نام)

ابتدا بھی ہے میری ہی بخشی ہوئی
انتہا بھی ہے میری ہی بخشی ہوئی

جس پہ اترا رہے ہو بڑے شوق سے
وہ جگہ بھی ہے میری ہی بخشی ہوئی

مبتلا آج جس کرب میں تم ہوئے
وہ سزا بھی ہے میری ہی بخشی ہوئی

یہ جو تم "میں میں" کیے جا رہے ہو یہاں
یہ "انا" بھی ہے میری ہی بخشی ہوئی

ساتھ رہ کر تمہیں شاعری آگئی
یہ ادا بھی ہے میری ہی بخشی ہوئی

نیک توفیق دے تم کو اللہ میاں
یہ دعا بھی ہے میری ہی بخشی ہوئی

جامیؔ اس زمانہ کو پاتی یہاں
ابتلا بھی ہے میری ہی بخشی ہوئی

منظر نبلی
۱/۸۱-۱۵ کاشانۂ رحمت
شاد نگر۔ عادل آباد۔ ۱

غزل

خودی کے بدلے عطا کر نہ تاج و تخت مجھے
میں تیرا بندہ ہوں کر دے انا پرست مجھے

ہوئی نزاکتِ احساس اس قدر افزوں
کہ فرشِ مخمل بھی ہے اب مثلِ راہ سخت مجھے

سکونِ دل کو میسّر نہ چین راتوں کو
کہاں کہاں لئے پھرتا ہے میرا بخت مجھے

یہ سوچتا ہوں کہ جب تو ہی ہے مرا قاتل
تو دل بھی لگتا ہے سینے میں لخت لخت مجھے

تمام شہر میں چھایا ہوا ہے سنّاٹا
اب اپنی آہ بھی لگتی ہے باز گشت مجھے

میں جان بوجھ کے دل سے کہاں اُلجھتا ہوں
ہجومِ غم نے بنایا ہے دل بدست مجھے

مثالِ قیس ہوں منظرؔ یہ فیضِ عشق و جنوں
بجائے شہر کے راس آگیا ہے دشت مجھے

●●

ماہنامہ **شاداب** حیدرآباد

جلد (۱۲) شمارہ (۹) قیمت ۶ روپے

ایڈیٹر محمد نصیر الدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر قدیر انصاری

:-(مجلس مشاورت):-

محترمہ عائشہ بیگم ڈاکٹر منشا الرحمن خان منشا محترمہ سیدہ مہر

ڈاکٹر یوسف الدین محمد منظور احمد منظور منیر احمد صدیقی

پروفیسر زاہد علی

زرِ تعاون

	سالانہ	۲ سال	تاحیات
ہندوستان	۶۵ روپے	۱۲۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۲۰۰ "	۳۶۰ "	۲۷۰۰ "
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۷ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیلِ زر کا پتہ :- ماہنامہ "شاداب" ۱۲۷-۵-۱۱ ریڈہلز۔ حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد نصیر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر "شاداب" ۱۲۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

سوفی ڈین ڈیکر فان بیسٹر ولڈ
کیتھولک یونیورسٹی ٹلبرگ، ہالینڈ

ترجمہ
محمد شمیم الزماں

انسانی حقوق کا اسلامی نظریہ

بنیادی تصور اور اظہارات

قسط اول

تعارف:

انسانی حقوق کا معاملہ محض قومی اہمیت کا حامل بن کے رہ گیا ہے۔ عالمی سطح پر اقوام عالم نے انسانی حقوق کے کلیے کو اپنا کر ان کا احترام کرنے کا اعلانِ عام کیا ہے۔ اس کے باوجود تصورِ انسانی حقوق کے تئیں مختلف نظام قانون کے درمیان فرق پایا جاتا ہے اور بدقسمتی سے ہر نظام جس نظریے کے تحت انسانی حقوق کو دیکھتا ہے اسی نظریے کے تحت وہ دوسرے نظام قانون کے ذریعہ اخذ کئے گئے تصورِ انسانی حقوق کو نہیں دیکھتا۔

اس مضمون میں انسانی تصور کے تئیں اسلام کے رویّے کو بہتر انداز میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پہلو سے غور کرنے کے لئے کہ انسانی حقوق کے تئیں اسلام کا رویّہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل مشمولات کے تحت گفتگو کی گئی ہے:

(الف)۔ انسانی حقوق کی شناخت کے طور پر حرمتِ انسانی کے اسلامی نظریہ کا مرکزی خیال۔

... اسلام میں آزادی کا تصور، معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اور انفرادی طور پر انسان کے درمیان توازن۔

(III) اسلامی قانون کی اسلام میں ایک داخلی جز کی حیثیت۔
(IV) اسلامی قانون کے مطابق انسانی حقوق ' اور
(V) چند اہم انسانی حقوق۔

(I)۔ حرمتِ انسانی کے اسلامی نقطہ کا مرکزی خیال

جس نوع انسان پر اسلامی نظریے کا مرکزی نکتہ ہونے کے ناطے حرمتِ انسانی کا تصور اسلام میں بہت گہرا ہے۔ اسلام میں انسانوں کے لئے وعظ' پند حتیٰ کہ نہمائشی خطاب میں بھی جو رویہ برتا گیا ہے وہ حرمتِ انسانی کی بنیاد پر ہی قائم ہے۔ قرآن پاک حرمتِ انسانی کے تصور کو قرآن پاک میں جابجا سمویا بھی گیا ہے اور حرمتِ انسانی کے موضوع پر قرآن پاک میں بارہا ارشادات بھی رقم ہیں۔

قرآن پاک حرمتِ انسانی کے موضوع پر بہت واضح نظریے کا حامل ہے۔ حرمتِ انسانی کا معاملہ الوہی نوعیت کا ہے۔ یہ انسان کو خدا کی دین ہے اور چونکہ یہ انسان کو خدا کی دین ہے۔ اسلئے حرمتِ انسانی کو بھی ایک حقیقت کا درجہ حاصل ہے جو حرمت اللہ نے انسان کو بخشی ہے وہ خدا سے انسان کے مخصوص تعلق کی عکاسی کرتی ہے اور اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ انسان بیک وقت آزادی الٰہیہ اور لزوم الٰہیہ میں شریک بھی ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیئے کہ ایسا صرف خدا کے وصف وحدانیت کے سبب ہے۔

قرآن پاک نے انسان اور خدا کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے اور زمین پر انسان کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے انسان کو خدا کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور تمام تر تخلیقات اس کے ہی واسطے عمل میں آئی ہیں۔ دنیا میں ہر چیز انسانوں کی تلاش وجستجو کے لئے کاشت کے لئے اور اس سے آرام حاصل کرنے کے لئے ہے اور جب تمام تر تخلیقات اس کی حرمت کے واسطے اور بشی

نتائج اس کی بہتری کے لئے ہیں تو خود بہ خود ان تمام چیزوں کی وراثت اس کے ذمے آجاتی ہے۔

اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے انسان نیکوکاری کا اہل ہے کیونکہ کام کو عقل سلیم کی بنیاد پر جائز طور پر کرنے کے پس منظر میں انسان کو دنیا میں اشرف ہونے کا جو شرف حاصل ہے وہ اس کا پورا پورا اہل ہے۔ انسانی حرمت ان تمام مقاصد کے حصول کے لئے مواقع اور امکانات کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ جو انسانی عزت کے مدنظر کسی بھی طرح ناقابل حصول ٹھہر سکتے ہیں۔ اس طرح اسلام میں حرمت انسانی کا تصور بنی نوع آدم کے لئے مثبت انسلاکات کا حامل ہے۔

اور یہ اُصول تمام بنی نوع انسان پر کھرا اُترتا ہے اسے محض بنی نوع انسان کے کسی خاص صیغے تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا اطلاق پوری انسانیت پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ ہر فرد کے لئے اس کے مضمرات یکساں ہیں۔

اسلام کے مطابق انسانی وجود ابتدائی غلطیوں کا تختہ مشق نہیں ہے۔ کوئی بھی آبائی کمزوریوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ تمام تر خدشات سے مبرّا ہو کر ہر شخص اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کرتا ہے چونکہ انسانی کردار بنیادی طور پر نیکوکاری کی طلب اور اس کے حصول کی کوشش سے عنوان ہے۔ اسلئے ابتدائی گناہوں یا غلطیوں کی بنیاد پر کسی بھی شخص کو مردود قرار دینے کے رویے کی سختی کے ساتھ مذمت کرتا ہے۔

لامحالہ ابتدائی غلطیوں کی پاداش میں کسی کو مردود قرار دینے کے رویے کی مذمت میں کسی بھی شخص کو ان تمام غلطیوں کا ذمہ دار ٹھہرائے جانے کے اُصول کا رد بھی شامل ہے جو اس کی ذات سے وابستہ نہ ہوں۔ اسلئے انفرادی ذمہ داری کا تصور اسلام کے پس منظر میں نہایت دلچسپ ہے اور اس کے دو اہم مضمرات پر اسلام نے روشنی ڈالی ہے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کا تعلق انسان کے واقعی کارناموں سے جڑا ہے۔ اس طرح انفرادی ذمہ داری ایک شخص کے اپنے انفرادی عمل اور اس کی کمزوریوں سے وابستہ

ہے۔ نہ تو اس سے کم، نہ اس سے زیادہ۔

لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے۔ کسی بھی شخص کو اس کے عمل یا اس کی کمزوریوں کے لئے تبھی ذمہ دار ٹھیرایا جاسکتا ہے جب اس کو انتخاب کا حق حاصل ہو۔ جب ایک شخص کو کسی چیز کو قبول یا رد کرنے کا حق حاصل ہوگا یا راہ عمل متعین کرنے کا حق حاصل ہوگا تبھی ذمہ داری کی بات کرنا یا کسی شخص کو ذمہ دار ٹھیرائے جانے کی بات کرنا بامعنی ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اسلام اس پہلو کو نہ صرف عام سطح پر اختیار کرتا ہے بلکہ خود اسلام میں انفرادی ذمہ داری کی شکل میں بروئے کار لاتا ہے۔

• چونکہ اسلام قوی ایمان اور انتخاب کی آزادی کی بنیاد پر ہی استوار ہے اسلئے یہ کسی بھی شخص پر جبراً تھوپا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ خود اللہ اس جبری عقیدے کو پسند نہیں کرے گا۔ نہ ہی وہ اسے ایمان صحیح کا رتبہ عطا کرے گا۔ اگر یہ فرد انسان کے داخلی جذبے اور ایمان قوی کا نائیدہ نہ ہو۔ اسلام مذہب کے معاملے میں جبر سے منع فرماتا ہے۔ یہ وہ روشنی ہے جس کا انسان کے داخل سے منعکس ہونا ضروری ہے کیونکہ آزادی انتخاب انفرادی ذمہ داری کے پس منظر میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔" (حامد عباسی)

انسانی حقوق کا جائزہ لینے کی ضرورت براہ راست حرمت انسانی کی شناخت ہے۔ اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا نمائندہ قرار دے کر انسان کو ایک اعزاز سے نوازا ہے۔ انسانی حرمت کا اسلامی تصور بنی نوع آدم کے تعلق سے ایک مثبت نظریہ قائم کرتا ہے۔ صرف حرمتِ انسانی کے مسلسل اور مکمل احترام کے ذریعے ہی انسانی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

(II). اسلام میں آزادی کا تصور

انسانوں کے بنیادی حقوق کے عوامل انسانی حرمت کے تصور میں پوشیدہ ہیں

اور وسیع پیمانے پر انسانی حرمت کی شناخت جس نہج پر ہوتی ہے، وہی بنیادی حقوق کے مضمرات کا تعین کرتی ہے اور یہی چیز آزادی کے تصور پر بھی غالب آتی ہے۔ آزادی کا اسلامی تصور، انسانی حقوق پر براہ راست اپنا اثر رکھتا ہے۔

اسلام میں آزادی کے تصور کا خاکہ تیار کرتے وقت انسان کی انفرادی حیثیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ مانا گیا ہے کہ انفرادی طور پر انسان انتخاب کی آزادی رکھتا ہے اور اپنے عمل کے لئے وہ انفرادی طور پر ہی ذمے دار ہے۔ آزادی کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان ایک شخص ہونے کے ناطے ایک معیار فراہم کرتا ہے۔ آزادی کی بات کرنا بے معنی ہے اگر اسے انسان کی انفرادی حیثیت کے پس منظر میں نہ لیا جائے۔

اسلام صرف شخص اور اس آزادی سے تعلق رکھتا ہے جس کا وہ محتاج ہے۔ انفرادی آزادی پر لگائی گئی حقیقی یا لگائی جانے والی ممکنہ قدغن کو ختم کرنے کے پہلو سے اسلامی تصور آزادی پر غور کرنا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ اسلام میں آزادی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایک شخص اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے دوسروں کے مفادات کو خاطر میں لائے بغیر کسی بھی حد تک چلا جائے کیونکہ انسان کی انفرادی حیثیت کے باوجود اسلام فرد کی انفرادی شناخت پر بہت زیادہ زور نہیں دیتا۔ کیونکہ انسان انفرادی ہونے کے باوجود معاشرے کا ایک رکن محض ہے۔

انسان کی انفرادی حیثیت کے علاوہ معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے اس کی شناخت محض ایک واقعہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت کی جانب اشارہ ہے اس کا ایک معیاری پہلو بھی ہے۔ انسان کو معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے اور اس کے تئیں پورے طور پر ذمے دار ہونے کے ناطے عمل کرنا چاہئے۔ انفرادی آزادی کو ہمیشہ معاشرے کے پس منظر میں لیا جانا چاہئے۔ اس طرح آزادی کا ایک ذمہ دارانہ انداز میں استعمال یقینی ہے۔

واضح طور پر معاشرے میں انسان کا مقام اسلام کے تصور آزادی پر اثر انداز ہوتا ہے اور چونکہ یہ چیز آزادی کے تصور کی حدود اور اس کے رویے کا تعین کرتی ہے۔ اسلئے اس پس منظر میں "معاشرے" کے پہلو کو سمجھنا بھی از حد ضروری ہو جاتا ہے۔ افراد اور معاشرے کے درمیان توازن کا معیار اس بات پر مبنی ہے کہ معاشرے کا انداز کیا ہے۔

معاشرہ کوئی افراد سے خالی ادارہ یا تنظیم نہیں ہے۔ یہ ایک ہی نسل کے افراد کی جمعیت سے بنا ہوا سماج ہے اور اسی سماج میں افراد اپنی ذاتی و انفرادی آزادی کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی سماج کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے ایک شخص دوسرے شخص کے تئیں ذمے دار ہوتا ہے۔ دوسروں کی آزادی کا احترام اور کسی بھی ممکنہ دخل اندازی سے تحفظ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے اور یہی ذمہ داری ہر پہلے شخص کے تئیں دوسرے شخص پر عائد ہوتی ہے اسلام کے تحت "اللہ" فطرت اور دوسرے ہم نسلوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی ایک شخص اپنی آزادی کا استعمال کر سکتا ہے۔

اسلامی معاشرے کے جائز عادات کو نظر انداز کرتے ہوئے انفرادیت پسندی کو ہوا نہیں دیتا۔ معاشرہ اپنے طور پر اپنے اختیارات کا استعمال کرنے والی کوئی تنظیم نہیں ہے بلکہ یہ افراد کی جمعیت کا نام ہے۔ آزادی کے تصور کو معاشرے سے جوڑنے کا مطلب معدودے چند کو نہیں بلکہ افراد کو آزادی فراہم کرنا ہے۔ ہر شخص کی انفرادی حمیت کا تحفظ ہونا چاہئے۔ چونکہ آزادی کے تعلق سے اسلام کا نظریہ مذکورہ بالا جملوں سے واضح ہے۔ اس لئے وہ ہر اس عمل کو رد کرتا ہے جو دوسروں کو نقصان پہنچائے۔ دوسری جانب اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ معاشرہ افراد پر غالب نہیں ہے۔ اس لئے آزادی کے تصور کی تشکیل کے وقت اسلام نے افراد (معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے) اور معاشرے کے درمیان ایک مثالی توازن قائم کیا ہے۔ بنیادی طور پر آزادی کا مطلب "عمل کی آزادی" نہیں ہے بلکہ یہ "وجود کی آزادی" کا نام ہے۔

انسانی حرمت اور دوسروں کی آزادی میں ممکنہ مداخلت کے خطرے کو ختم کرنے
لئے اخلاقی کردار سازی نہایت ضروری ہے۔ اسلام اس کردار سازی کے اصول فراہم
کرتا ہے اور یہی اصول انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے نسخہ ہائے وفا تجویز کرتے
ہے اسلام کے اخلاقی قوانین کا جز قرار پاتے ہیں۔ یہ قوانین بذات خود کسی اہمیت کے
نہیں ہیں بلکہ انھیں سمجھنے کے لئے اُن کے ماخذ کو بھی سمجھنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ
ضابطوں پر اس نقطہ نظر سے غور کرنا ہوگا جس کے تحت دوسروں کی آزادی اور جمیت
مقاصد کے حصول کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔ اس کے لئے محض دوسروں کے تئیں ایک
شخص کے فرائض کا نقطہ نظر کافی نہیں ہے۔

اسلام کے نزدیک انسانی زندگی ایک کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسلام اس
تمام جزئیات پر اپنا اثر رکھتا ہے۔ یہ خود کو زندگی کے محض چند پہلوؤں تک محدود
نہیں رکھتا بلکہ تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسلامی فکر کے مطابق یہی منطق
اخلاقیات کے تعلق سے بھی اختیار کی جاتی ہے۔ اسلام کے مطابق:

"جو کچھ افراد معاشرے کی بہتری کے لئے ہے وہ اخلاقی سطح پر درست ہے۔
.... اور جو کچھ نقصان دہ ہے وہ اخلاقی سطح پر غلط ہے۔

(اسلام کا اخلاقی نظام: دامی سیریز)

اسلام نیکوکاری اور حق کی تلاش کی ترغیب اور اسی کے مطابق عمل کرنے
کا علم دیتا ہے اور اس کی مکمل جامع بندی نظام عدل کے ذریعے ہوتی ہے۔ حد درجہ کا
تعصب یا تصنع ہر سطح پر رد کیا جانا چاہیئے۔

انسانوں کے بنیادی حقوق اسلام کے اخلاقی نظام سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔
بنیادی حقوق کے تحفظ کا معاملہ اخلاقی پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ آزادی کا اسلامی تصور
جس کے تحت براہ راست انسان اپنے دوسرے ہم نسلوں سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اس طریقے

کو رعی نشاندہی کرتا ہے۔ جس کے تحت انسانی حقوق کو شمار کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ دوسرے کے عمل پر قدغن لگا کر کسی ایک شخص کو فراہم ہونے والی آزادی اور مادی و سماجی بہبود کی شکل میں کسی دوسرے کے عمل سے حاصل ہونے والی آزادی کے درمیان اسلام بہت سختی کے ساتھ تفریق نہیں کرتا۔

(III) اسلام اور اسلامی قانون

قانون اسلام کا ایک داخلی جز ہے۔ زندگی کے تمام شعبہ جات میں قانونی پہلو سے رہنمائی الہٰی قوانین کے تحت ہوتی ہے۔ اس پہلو سے بھی اسلامی قوانین عیسائی عقیدے کے مذہبی قوانین سے بالکل الگ ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مذہبی تنازعے عیسائی عقیدے کا داخلی حصہ ہیں، عقیدے سے باہر ان کی کوئی انفرادی شناخت نہیں۔

اسلامی قانون چونکہ انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ الہامی قوانین ہیں اور اس لئے ان کی حیثیت انسانوں کے ذریعے بنائے گئے قوانین پر غالب ہے۔ اسلامی قوانین کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ ہے۔ نیک و بد اور خیر و شر کے حوالے سے اگر غور کیا جائے تو اسلامی قوانین اسلام کی اخلاقی قدروں کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں۔

اسلامی قوانین کے روحانی ہونے کا ثبوت ان ذرائع سے ہوتا ہے جن میں ان قوانین کی جڑیں پیوست ہیں۔ اسلامی قوانین کے ذرائع قرآن پاک، سنت، اجماع (یعنی فقہا کے درمیان) اتفاق رائے، قیاس (قیاسی توجیہہ) اور اجتہاد پر مبنی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر اسلامی قوانین کا بیشتر حصہ قرآن پاک پر مبنی ہے۔ قرآن اللہ کی جانب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۶۳۲ - ۵۷۰ء) کے ذریعہ انسان کو بخشی ہوئی کتاب الٰہی ہے۔ قرآن پاک میں انسان کے خدا اور دوسری مخلوقات، فطرت اور خود اپنی ذات کے ساتھ رشتے کے تمام تر ضوابط مفصل اور جامع انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن پاک کی ۶۲۳۶ آیات میں ۵۰۰ آیات براہ راست عدلیاتی نوعیت کی حامل ہیں۔ ان آیات کا آئینی

قوانین اور تجارتی و عائلی قانون کے تعزیری پہلوؤں سمیت قانون کے مختلف صیغوں سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

قرآن پاک کی طرح قانون کے بنیادی ذرائع میں دوسرا ذریعہ سنتِ محمدیؐ ہے۔ سنت کا تعلق رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور حیات اطہر کے مختلف النوع ضابطوں سے ہے۔ سنت میں آپؐ کے اقوال و اعمال سبھی کچھ شامل ہیں۔ حال ہی میں اسلامی قانون سازی میں محمدؐ کے رول پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے گو کہ ان قوانین کی تشکیل نو کے اثرات ابتدائی کچھ صدیوں کے فوراً بعد ہی نمایاں ہونے لگے تھے۔ مذکورہ تمام باتوں سے اسلامی قانون پر قرآن پاک اور سیرتِ اقدسؐ کے اثرات پوری طرح واضح ہیں۔

" اجماع " اسلامی فقہاء و علماء کے ذریعہ اتفاق رائے سے اخذ کیا گیا قانون ہے قانون کا یہ ذریعہ بھی قرآن پاک اور سیرت و سنتؐ اقدس پر ہی انحصار کرتا ہے۔ خود حضورؐ کا قول ہے کہ : " میری امت کسی غلطی پر صاد نہیں کرے گی "

اسلام کے فاضل فقہاء و علماء کے ذریعے قانون کے کسی خاص مسئلے پر اتفاق رائے سے استصواب رائے کے ذریعے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ اجماع کی مختلف قسموں کے درمیان فرق کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً واضح طور پر بیان کیا گیا یا خفیہ طور پر اخذ کیا گیا اجماع۔

اسلامی قانون کا ایک اضافی ذریعہ " قیاس " ہے۔ قانون کے اس ذریعے کا اطلاق مذکورہ بالا تینوں ذرائع کے تعلق سے قیاسی توجیہہ کی بنیاد پر ہونا چاہیئے یعنی دوسرے لفظوں میں " قیاس " کا اطلاق آزادانہ یا انفرادی طور پر نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی تمام تر معنویت قرآن پاک، سنت مقدس اور اجماع کے تعلق سے ہی ہے۔ قانون کا ایک ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اس کا استعمال ہمیشہ قرآن و سنت و اجماع کے ذیل میں ہی آتا ہے اور اس کے بعد " اجتہاد " کا پہلو سامنے آتا ہے۔

"اجتہاد یعنی کسی بھی قانونی مسئلے کو حل کرنے کے آزادانہ رویئے کا اطلاق کسی دوسرے ممکنہ عمل کی عدم موجودگی میں ہو سکتا ہے۔"

اجماع، قیاس اور اجتہاد اسلامی قوانین کی تشکیل و تدوین میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

اسلام میں علم قانون کو "فقہ" کہتے ہیں۔ "اُصولِ فقہ" قانون کے ذرائعوں کے مطالعے پر زور دیتا ہے اور "فروع" قانون کے بنیادی درجوں اور قانونی سندوں کی مرتب درجہ بندی ہے۔ اسلامی علم قانون کی ابتداء سے مختلف مکاتیب فکر نشوونما پاتے رہے سُنی اُصول قانون کے چار اہم مکاتیب ہیں جو انفرادی طور پر جداگانہ انداز میں اسلامی قانون کے ذرائعوں اور قانونی سندوں کی تصریح پر زور دیتے آئے ہیں۔

اسلامی قانون "حق اللہ" یعنی انسانوں کے اعمال پر اللہ کا اختیار یا حق اور "حق الناس" یعنی انسانوں پر ایک دوسرے کے تئیں حقوق و فرائض کے درمیان امتیاز قائم کرتا ہے۔ اس درجہ بندی کے تحت اسلامی قوانین انسانی عملیات کی مختلف صیغوں کے تحت توثیق کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں پانچ مختلف زمروں کی تقسیم کی جاسکتی ہے۔ انسانی عمل قانونی طور پر لازمی، اضافی، غیر نزاعی، قابلِ ملامت یا ممنوعہ ہو سکتا ہے اور اسی نظام کے تحت بنیادی انسانی حقوق کا تعین ہوتا ہے۔ مثلاً ذاتی عزتِ نفس (مادی و روحانی) یا حق ملکیت وغیرہ۔

چونکہ اللہ سب سے بڑا اور واحد قانون ساز ہے۔ اسلئے قوانین کی تشکیل صرف اسی کا حق ہے۔ قانون کا احترام ہر شخص پر فرض ہے۔ خواہ وہ ملت کا کوئی قائد ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے باوجود اسلام قانون ساز تنظیموں اور نظامِ حکومت کو قانونی حکمت عملی اختیار کرنے سے منع نہیں کرتا۔ نظامِ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسلامی قوانین کا مزید وضاحت یا صراحت کے لئے اور خاص حالات میں مسائل کے حل کے لئے ضابطے بنا سکتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات اور بدلتے ہوئے زمانے کے پیشِ نظر قانونی اختراع کو

(باقی ۲۸ پر)

مولانا محمد رضوان القاسمی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

مملکت علم و تحقیق کے عظیم سفیر و نقیب
مسجد الدعوۃ پیرس میں دعوتی سرگرمیاں
حیات و کارناموں پر کتاب کی ضرورت

یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب اِس وقت عالم اسلام ہی کے نہیں بلکہ دنیائے انسانیت کے بلند پایہ مصنف، عظیم محقق، باخبر مورخ، نامور قانون داں اور ممتاز دستور ساز ہیں۔ ایک زمانہ میں پاکستان دستور بنانے کے سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ نیز جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے پاکستان کو ایسا سیاسی ڈھانچہ دینے کے لئے جو زیادہ سے زیادہ اسلامی تصورات کے قریب ہو، ڈاکٹر صاحب سے خصوصی تعاون حاصل کیا تھا۔ ان کے وجود پر علم و تحقیق کو بجا طور سے ناز ہے۔ آج دنیا میں اہل علم کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کمی ہے تو ایسے اہل علم کی جو اپنی فکر اور اپنی نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار ایسے ہی کمیاب اہل فکر و نظر میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی دینی بصیرت، علمی پختگی اور تحقیقی جہدت کا ایسا چراغ جلایا ہے جس کی روشنی سے علمی میخانے کے در و دیوار روشن ہیں۔ دنیا کے جس حصہ جس گوشہ اور جس یونیورسٹی میں ان کے توسیعی خطبات اور لیکچرس کا اہتمام کیا گیا۔ اپنے وقت کے اہل فضل و کمال اس طرح جمع ہوتے رہے ہیں جیسے شمع کے گرد پروانے۔ سچ ہے یہ مقبولیت

اور رتبہ کی بلندی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ بقول شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا

میری زندگی کا وہ ناقابل فراموش دن ہے جس دن ڈاکٹر حمید اللہ صا سے پیرس کے ایک قدیم محلہ میں ان کی قیام گاہ کی چوتھی منزل پر ایک الجزائری نوجو ناشل کے ہمراہ ملاقات ہوئی۔ اپنے سفر امریکہ سے واپسی میں برمنگھم (برطانیہ) پیرس میں زیادہ تر اسی غرض سے گیا تھا۔ تاریخ جولائی کی ۱۸ تھی اور سنہ ۱۹۹۲ء ظہر کے بعد کا، دیوبند کی طالب علمانہ زندگی ہی سے میں ان سے متاثر تھا۔ عربی اور میں ان کی تحقیقی تحریروں کے مسلسل مطالعہ نے ان کا گرویدہ بنادیا تھا، دل میں دید خواہش شدید تھی۔ ذہن نے اپنے نہاں خانہ میں ان کی ایک تصویر بھی بنالی تھی۔ ملاقات ہوئی تو ان کی شکل و صورت، ذہنی تصور سے بہت کچھ آہنگ تھی۔ علیک سلیک ابتدائی گفتگو کے بعد اندر اُن کے کمرہ میں بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ ایک نو مسلم کو د کی عملی مشق کرا رہے تھے۔ عظیم محقق اور مصنف کا کمرہ عصر حاضر کی ظاہری "عظمت کے نقشوں سے خالی تھی۔ ہر چیز سے سادگی اور مسکینیت ٹپک رہی تھی۔ وہ خود بھی تواضع اور عجز و انکسار کے پیکر بنے ہوئے تھے۔ مشہور مقولہ " پھل دار ٹہنی جھکی رہتی ہے" عین مصداق ہر طرح کے کروفر سے زندگی عاری و خالی، لیکن ہر ادا اور ہر عمل سے عالمانہ وقار و تمکنت کا کامل اظہار، کتابیں بھی سجی سجائی الماریوں کی زینت بنی ہو نہیں بلکہ مختلف کارٹون کے اندر اور حسب ضرورت وہاں سے نکال کر استفادہ، پیرس کے مختلف کتب خانے ان کا تحقیقی مسکن اور روح کی غذا۔ جسمانی اعتبار سے لاغر او ... کم خوراک اور خوراک بھی بغیر مرغن اور سادہ، عمر اسّی سے متجاوز مگر بہت ا طاقت ور۔ بغیر نفث کے اپنی قیام گاہ کی بلڈنگ کی چوتھی منزل پر بلاتکلف سیڑھ

چڑھنا اور اُترنا شاید ایسے ہی موقع کے لئے غالب نے کہا ہے۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

لیکن یہ آسانی ڈاکٹر صاحب کے اُترنے چڑھنے کی مشق کی برکت نہیں، بلکہ اُن کی بزرگی کی کرامت ہے، چنانچہ ہر ذی شعور اس باکرامت بزرگ یا مردِ حقانی کی پیشانی کا نور محسوس کر سکتا ہے۔ جب یہ بات کرتے ہیں تو علانیہ طور پر اُن کے دل کا سرور عشق چھلکا پڑتا ہے، اندر کے اس سرورِ عشق کے ساتھ چہرہ پر یقین کی تابانی بھی صاف نظر آرہی تھی۔ میری ان سے یہ پہلی ملاقات اس زمانہ میں ہوئی تھی جب وہ پاکستان کے دورے سے واپس آئے تھے اور پاکستان میں عورت کی سربراہی کا مسئلہ شد و مد کے ساتھ اٹھا ہوا تھا اُنھیں دورہ پاکستان میں مختلف خطابات کے بعد سوال و جواب کے وقفہ میں اس مسئلہ کے جواز و عدم جواز کے بارے میں پوچھا جارہا تھا۔ اُنہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں جو جواب (جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) دیا تھا اسے وہاں کے بعض اخبارات نے توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا۔ اس سے وہ نالاں نظر آرہے تھے چونکہ اس سلسلہ کے بعض رسائل و جرائد میری نظر سے گذرے تھے، میں نے جب ان کی نشاندہی کی تو فرمانے لگے کہ پیشہ صحافت کے لئے اہم چیز دیانت ہے۔ یہ دیانت آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ لوگ اپنے مزاج اور منشاء کے مطابق دوسروں کی باتوں کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے قائل کی بات کا رخ الگ ہی ہوجاتا ہے اور اس کی صحیح ترجمانی نہیں ہونے پاتی۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میں نے عورتوں کی سربراہی کے مسئلہ میں اپنی وضاحتی تحریر پاکستان کے بعض اخبارات کو ارسال کردی ہے۔ اس سے غلط فہمی کا ازالہ ہوجانا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کے دوران اپنے بعض نئے علمی کام سے بھی واقف فرمایا اس میں خصوصیت کے ساتھ امام بخاری کے مشہور ... یث "الجامع الصحیح"

کے مکمل اشاریہ کی ترتیب کا ذکر فرمایا جو بلاشبہ ایک اہم اور مشکل کام ہے۔ تاہم اس بارے وہ اپنے عدم اطمینان کا اظہار کر رہے تھے کہ ہندوستان میں ان کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت صحیح ڈھنگ اور نہج سے نہیں ہو رہی ہے جسے میں نے بھی شدت سے محسوس کیا۔ ایک زمانہ میں خود حیدرآباد میں ان کے بعض قریبی اعزہ ان کی کتابوں کی اشاعت میں بہت ہی مستعد اور سرگرم نظر آتے تھے مگر اِن دنوں ان کی یہ مستعدی اور سرگرمی دیکھنے میں نہیں آرہی ہے۔ شاید کوئی مصروفیت اور معذوری مانع آرہی ہو لیکن جو برکت موقوف ہوگئی ہے اس کو پھر سے ایک تسلسل کے ساتھ جاری کرنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے ۱۸ر جولائی کی یہ مختصر ملاقات اسی قدر گفتگو اور احساسات پر ختم ہوئی البتہ ۱۹ر جولائی اتوار کو مسجد الدعوہ پیرس میں آنے کی دعوت دی۔ میں اسی الجزائری نوجوان کی رہنمائی میں مسجد الدعوہ پہونچا۔ مسجد عالیشان تھی، بارونق اور آباد بھی۔ اس سے ملحق ایک عمارت بھی تھی جو دعوتی کام اور دینی تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص تھی میں نے ظہر کی نماز یہیں ادا کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ملا۔ اسی اثناء میں مسجد کے اندرونی حصہ میں حلقہ بننا شروع ہوگیا۔ اس حلقہ میں علماء اور تعلیم یافتہ حضرات کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ڈاکٹر صاحب فرانسیسی زبان میں بیان فرمانے لگے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ڈاکٹر صاحب کے بیان کی ترجمانی ایک عرب عربی زبان میں کرتا جارہا تھا جس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بعض پہلوؤں پر عالمانہ اور محققانہ گفتگو کی جارہی ہے۔ میں نے اپنے الجزائری رہبر سے اِس پروگرام کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ ہر اتوار کو اِسی طرح بعد نماز ظہر ڈاکٹر صاحب کا درس اور [illegible] ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ ملحقہ عمارت میں تشریف لے جاتے ہیں جہاں پہلے [illegible] نئے ہوئے افراد (مرد اور عورت دونوں) جو حلقہ بگوش اسلام ہونا چاہتے ہیں انھیں [illegible] پڑھاتے ہیں اور ضروری باتوں کی تلقین فرماتے ہیں جو مرد اور عورت

ف یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات بھی ہوتی ہیں) اسلامی انداز سے رشتہ ازدواج
منسلک ہونا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کا خطبہ نکاح دے کر ایجاب و قبول
لیتے ہیں۔ مسجد کے خطاب کے بعد اس اجتماع اور تقریب میں بھی شرکت کی سعادت
ی ہوئی تھی جس کے لئے خود ڈاکٹر صاحب نے بھی اشارہ فرمایا تھا۔ اس موقع پر میں نے
ڈاکٹر صاحب کے بعض شاگرد سرگرم ہیں اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہونے اور نکاح
دھن میں بندھنے والوں کے نام بھی ایک مخصوص رجسٹر میں درج کر رہے ہیں۔

مجلس جب ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب سے اجازت طلب کرتے ہوئے اپنی قیام گاہ
آیا۔ میں پیرس جیسے فیشن ایبل شہر کی شاہراہ سے گزرتا ہوا اس کے ایک زمین دوز ریلوے
ن پہ آیا اور ریل سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوا لیکن دل میں ڈاکٹر صاحب
ے ہوئے تھے۔ اور ذہن و دماغ ان کی بے پناہ علمیت کے باوجود پیرس جیسے شہر میں سادگی
اضع و ملنساری کی "اپنی نظیر آپ" کے حسین و جمیل نقش و نگار میں گم تھا۔ تصنع، بناوٹ
ع سازی نے ان سے دور سے بھی اپنا سایہ نہیں ڈالا تھا۔ آپ یقین جانیے میں اپنی
ذہنی کیفیت میں تھا کہ عالم تصور میں اقبال آئے اور نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے
ند اشعار سنا گئے۔ ان کا لب و لہجہ درد و سوز میں ڈوبا ہوا تھا۔

ں کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
ں کی ادا دل فریب، اس کی نگاہ دل نواز
دم گفتگو، گرم دم جستجو
م ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

ہاتھ ہے اللہ کا، بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز

یہ پیام دے گئی ہے، مجھے باد صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا، ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی
مرے حلقۂ سخن میں، ابھی زیر تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں، رہ و رسم کج کلاہی
تو ہما کا ہے شکاری، ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی، یہ جہان مرغ و ماہی
تو عرب ہو یا عجم ہو، ترا لا الٰہ الا
لغت غریب جب تک، ترا دل نہ دے گواہی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے متعلق یہ سفری تاثرات تھے جس میں اس کا بھی اضافہ کرلیا جائے کہ جب میں پیرس سے لندن واپس آرہا تھا تو ان کا فرانسیسی زبان میں کیا ہوا قرآن کے ترجمہ کا ایک نسخہ بطور تبرک رکھ لیا اور اب یہ نسخہ بطور یادگار دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے کتب خانہ میں موجود اور محفوظ ہے جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے سوانحی خاکہ کا تعلق ہے تو وہ ۱۶ محرم ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹ فبروری ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل یہیں طے کئے۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اپنی علمی میں کچھ دنوں استاذ بھی رہے، اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لئے یوروپ پہونچے۔ جرمنی کے شہر بون کی یونیورسٹی سے ڈی فل،

اور پیرس سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری کے لئے "اسلام کے بین الاقوامی قانون" اور "عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری" پر تحقیقی مقالے لکھے۔ جرمنی اور فرانسیسی یونیورسٹیوں میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔ یوروپ اور ایشیاء کی متعدد یونیورسٹیوں میں توسیع خطبات کا سلسلہ جاری ہے۔ ان دنوں پیرس میں اپنے چاہنے والوں اور شاگردوں کے ساتھ اسلامی دعوت کے کام میں زیادہ منہمک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی قرآن، حدیث، سیرت رسولؐ، فقہ اسلامی اور قانون کے موضوع پر مختلف زبانوں میں جو درجنوں کتابیں ہیں وہ تمام علم و تحقیق کی اعلیٰ معیار تک پہونچنے والی اور اس کی اونچی سطح کو چھونے والی ہیں جس کا اعتراف مستشرقین یوروپ کو بھی ہے۔ ان کے علمی کارناموں میں ایک "خطبات بہاولپور" بھی ہے۔ بارہ خطبات پر مشتمل (۴۶۴) صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب علم و معرفت کا بیش بہا اور انمول خزانہ ہے جس کے پیش لفظ میں ڈاکٹر صاحب کی درج ذیل عبارت نہایت متاثر کن ہے اور ان کی فکر رسا اور ذہنی جودت کی بین دلیل وہ لکھتے ہیں۔

"اللہ کی عنایتیں بے پایاں ہیں۔ ان کا شکر کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ بہاولپور کی جامعہ اسلامیہ نے مجھے نوازا اور مجھ گمنام بلکہ بدنام کو ربیع الاول ۱۴۰۰ھ میں بارہ خطبات اہل علم و فضل کے سامنے دینے کی دعوت دی۔ یہ میرے لئے "فانفجرت منہ اثنتا عشرہ عینا" (پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ البقرہ۔ ۶۰) ہے۔ وللہ الحمد خدا ارباب متعلقہ کو جزائے خیر دے۔ "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" (اور تم کو جو کچھ علم دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ بنی اسرائیل۔ ۸۵) کا مصداق ہوں اور رب زدنی علما (پروردگار مجھے اور زیادہ علم عطا فرما۔ طہ۔ ۱۱۴) کا دعا گو"

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا جب بھی نام آتا ہے تو ایک خواہش سینہ میں

ضرورت مجلتی ہے وہ یہ کہ کاش کوئی حوصلہ مند آدمی اُٹھتا اور اُن کی بلند پایہ تصنیفات کو از سر نو عصری معیار کے مطابق شائع کر کے تشنگان علم و تحقیق کی تشنگی کو دور کرتا ' اس کی بھی ضرورت ہے کہ مختلف موضوعات پر ان کے جو قیمتی مقالات مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں ان کو کوئی ہوشمند اور باخبر آدمی یکجا کرتا ' اُنھوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں جو توسیعی خطبات دیئے ہیں اور اہل علم کی مجلسوں میں جو تقریریں کی ہیں اگر وہ محفوظ ہیں تو ان کی بھی ترتیب و تہذیب ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مختلف حیثیتوں کے حامل جو مکاتیب اور خطوط لکھے ہیں اور جن استفسارات کے جواب دیئے ہیں ان میں بھی علم و تحقیق کے موتی بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو اکٹھا کر کے شائع کرنا بھی ایک اہم کام ہے۔ بہر حال ایک آدمی نے جو اکیڈیمی کا کام کیا ہے اس کے کام کی مختلف انداز سے پذیرائی ہونی چاہیئے۔ وہ اس وقت آخر شب کی متاع عزیز ہیں۔ اس متاع عزیز کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ اب موجودہ صورت حال میں ان کی زندگی خود اُن کے لئے نہیں بلکہ عالم اسلام اور بنی نوع انسان کے لئے ایک ضرورت ہے۔ اسلئے صحت و عافیت کے ساتھ درازی عمر کی دعا ان کیلئے کرتے رہنا چاہیئے اور ہاں مجھے نہیں معلوم کہ ان کی مادر علمی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (جہاں وہ استاذ بھی رہے ہیں) میں ان پر ریسرچ کا کام ہوا ہے یا نہیں ' اگر نہیں ہوا ہے تو اس طرف فوری توجہ درکار ہے اور اگر ہوا ہے تو نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں اس تحقیقی کام کو منظر عام پر آنا چاہیئے۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور کارناموں سے متعلق ایسی دقیق کتاب کی ضرورت ہے جو " حیات جاوید " (تذکرہ سرسید احمد خاں از مولانا الطاف حسین حالی) " حیات شبلی " (تذکرہ مولانا شبلی نعمانی از مولانا سید سلیمان ندوی) اور " حیات سلیمان " (تذکرہ مولانا سید سلیمان ندوی از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی) کے ہم پلہ ہو " مردان کار کی اب بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ کیا عجب کوئی حوصلہ مند آدمی سامنے آئے اور ایسی کتاب لکھ کر مسافران علم و تحقیق کو اپنے ایک عظیم اور مثالی رفیق و ہم سفر بلکہ مخلص پروش

اور باشعور رہبرو رہنما کے نقش پا کا پتہ دیدے اور یہ بتا دے کہ اللہ سے اُنھوں نے کیا لیا اور دنیا کو اُنھوں نے کیا دیا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ماضی قریب کے نامور ہندوستانی علماء و فضلا کا علمی، تحقیقی اور دعوتی خدمت کا دائرہ زیادہ تر برصغیر اور اگر آگے بڑھیں تو عرب ممالک تک رہا ہے۔ مگر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ السنہ شرقیہ یعنی اُردو، فارسی، عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور اطالوی وغیرہ مغربی زبانوں پر عبور کی وجہ سے اُن کا میدان عمل مشرق سے آگے بڑھ کر مغرب تک وسعت اختیار کر گیا اور مغربی دنیا کو براہ راست اس کی زبان میں مخاطب کیا۔ خوبی کی خوبی یہ رہی کہ مغرب کے رہنے والوں کے مزاج، نفسیات اور ماحول و معاشرت کا پورا لحاظ رکھا گیا۔ مناظرانہ اور جارحانہ انداز سے گریز کیا گیا اور قرآن حکیم کے حکیمانہ اسلوب دعوت کا پورا اہتمام رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس طرز سے سائنٹفک استدلال و استنباط کے خوگر انسانوں اور جدید دور کے سنجیدہ علمی اثرات مرتب ہوئے اور "از دل خیزد بر دل ریزد" (دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے) کا نمونہ سامنے آیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب مغربی ممالک کے لئے ہندوستان کا عظیم "علمی تحفہ" ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان ممالک نے اس تحفہ کی قدر جانی اور پہچانی ہے۔ شاید انھیں اپنے دیس میں بھی وہ مقام و احترام نہیں ملا جو بدیس میں بدیسیوں نے دیا ہے۔ اللہ رب العزت کے لئے جو کام کرتا ہے، اُسے ایسی عزت ملنی ہی چاہیئے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے تذکرے کا مطلب "باغ علمی" کی سیر ہے۔ اس سیر سے جی سیر تو نہیں ہوا لیکن باغ علمی کی مناسبت سے قدیم اور بافیض دینی درسگاہ مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم مولانا اسعد اللہ اسعد (جن کی مصاحبت اور مکاتبت سے جگر مرادآبادی نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے) یاد آرہے ہیں۔ اس باغ علمی سے

مجتبیٰ حسین

اردو غزل کے اہم موڑ

شمس الرحمٰن فاروقی کا یادگار غالب خطبہ

ہمدرد کے بانی اور دہلی کی نہایت برگزیدہ ہستی جناب حکیم عبدالحمید ہمارے کرم فرما تو ہیں ہی طبیب حاذق ایسے ہیں کہ نبض پر ہاتھ ہی رکھ دیں تو وہ چلنے لگ جاتی ہے (اپنی ذاتی نبض کے بارے میں تو کم از کم ہم نے یہی پایا)۔ ماشاء اللہ نوے برس کے نوجوان ہیں جنھیں دیکھ کر ہم جیسے ساٹھ برس کے بوڑھوں کو جینے کا نیا حوصلہ ملتا ہے۔ پچھلے دنوں ہم حج پر جانے لگے تو ہمارے ایک کرم فرما خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا کہ میاں جانے سے پہلے حکیم صاحب سے ملتے جاؤ اور دعاؤں کے کے علاوہ کچھ دوائیں وغیرہ بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی کے ہمراہ جب ان کے مطب پر پہونچے تو دیکھا کہ مریضوں کا ایک جم غفیر ہے اور اس جم غفیر میں چندرا سوامی بھی اپنے باڈی گارڈس کے ساتھ موجود ہیں۔ حکیم صاحب نے ہماری نبض پر ہاتھ رکھتے ہی کچھ گننا شروع کر دیا۔ "ایک، دو، تین، چار" ہم نے سوچا غالباً نبض کی رفتار کو گن رہے ہیں۔ مگر چار کی گنتی کے بعد اچانک رک گئے۔ بولے "تمہاری چار اولادیں ہیں نا؟" ہم نے کہا "جی ہاں"۔

ہمیں اچانک احساس ہوا کہ حکیم صاحب نے ہماری نبض پر ہاتھ رکھ کر ہمارے خاندان کے سارے افراد کی نبضوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے اور ہمارے مرض کی

اصل جڑ کو پہچان گئے ہیں۔

ہمارا تو یہ خیال ہے کہ حکیم صاحب کسی فرد کی نبض کو دیکھ کر ساری قوم کے مرض کو بھی پہچان لیتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ قوم کے لئے ہر دم کچھ نہ کچھ کرتے اور سوچتے رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے کچھ عرصہ پہلے وہ اپنے گھر میں گر پڑے تھے جس کی وجہ سے ان کے کولھے کی ہڈی میں فریکچر آ گیا ہے۔ چنانچہ اب تک صاحب فراش ہیں لیکن بستر پر پڑے پڑے بھی وہ ان فلاحی اور سماجی کاموں کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں جو انہوں نے شروع کر رکھے ہیں۔

غالب اکیڈمی جس کے وہ بانی ہیں ہر سال ایک غالب یادگار خطبہ کا اہتمام کرتی ہے جس میں ملک کے کسی ممتاز دانشور اور اہل قلم کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس سال حکیم صاحب نے اس یادگار خطبہ کے لئے مشہور نقاد اور دانشور شمس الرحمن فاروقی کو مدعو کیا تھا۔ شمس الرحمن فاروقی اردو دنیا کے سب سے ممتاز اردو کے مستند نقاد، عالم بے بدل اور بلند پایہ دانشور وغیرہ تو ہیں ہی ہمارے ان دوستوں میں سے ہیں جن سے بہت عرصہ تک ملاقات نہ ہو تو ہمیں ہر شئے میں کسی شئے کی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے بہت زیادہ ملاقاتیں ہوں تو ہر شئے کی زیادتی کا بھی احساس ہونے لگتا ہے۔ فاروقی ریٹائرمنٹ کے بعد مستقلاً الہ آباد میں رہنے لگے ہیں۔ جب تک وہ دہلی میں رہے، ہم ان کے "ارشادات عالیہ" اور "ارشادات کالیہ" دونوں سے مستفید ہوتے رہے۔ فاروقی اپنے بے تکلف دوستوں سے بات چیت کے دوران بعض بے ستر گالیوں کا استعمال کچھ ایسی خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں وہ اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ سننے والوں کے دل میں اتر جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فاروقی سے جو بھی پہلے پہل ملتا ہے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن جب ملاقاتیں بڑھنے لگتی ہیں تو رفتہ رفتہ غلط فہمیاں تو دور ہونے لگتی ہیں لیکن ان کی جگہ "خوش فہمیاں" پیدا ہونے

گئی ہیں جو آخر تک قائم رہتی ہیں۔ فاروقی سے ملے ہوئے یوں بھی ایک برس بیت گیا تھا۔ حکیم صاحب نے انھیں غالب یادگار خطبہ دینے کے لئے بلایا تو ماننا پڑا کہ حکیم صاحب نے ہماری نبض کو دیکھنے کے بعد ہی فاروقی کو اِس خطبہ کے لئے مدعو کیا ہے۔

خطبہ کا موضوع بھی بڑا دلچسپ تھا "اردو غزل کے اہم موڑ" اور جہاں اُردو غزل اور شاعری کا تعلق ہے۔ ہماری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اُردو کے جتنے شاعر اب تک پیدا ہوئے ہیں۔ ان سب نے اُردو غزل کو کہیں نہ کہیں سے موڑنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ بھلے ہی اردو غزل ان سے نہ مڑی ہو لیکن اُنھوں نے اُسے موڑنے کا دعویٰ ضرور کیا ہے۔ ہم نے تو بعض شاعر ایسے بھی دیکھے ہیں جو نہ صرف اپنی پہلی غزل کو بلکہ پہلی غزل کے مطلع کو ہی اُردو غزل کا ایک اہم موڑ تصور کرتے ہیں۔ بعض شاعر تو ایسے بھی ہیں جو موڑنے اور مروڑنے کے فرق کو بھی سمجھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُردو شاعری اتنی مڑی تڑی نظر آتی ہے۔ ہم تو یہ دیکھنے کے لئے گئے تھے کہ شمس الرحمٰن فاروقی بعض دیگر اہم شاعروں کے ساتھ ساتھ خود اپنی شاعری کو بھی ایک اہم موڑ قرار دیتے ہیں یا نہیں لیکن ہمیں یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ انہوں نے اُردو شاعری کے صرف ایک موڑ کا ذکر کیا جس کا عرصہ انھوں ۱۶۷۰ سے ۱۷۵۰ تک بتایا۔

خطبہ آغاز سے پہلے ڈاکٹر شارب ردولوی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں کہا کہ فاروقی اپنی زندگی میں ہی ہمارے ادب کی ایک نہایت اہم روایت اور سنگ میل بن گئے ہیں۔ اس بات سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے کہ فاروقی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز روایت کو توڑنے سے کیا تھا اور اب خود ایک روایت بن بیٹھے ہیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ فاروقی نے آج سے تیس بتیس برس پہلے مغربی شعریات اور مغربی ادب کے زیر اثر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا اور اردو ادب میں "جدیدیت" کی ایک رو چلا دی تھی۔ لیکن اب وہ مشرقی شعریات کے سبب سے اہم پارکھ اور ناقد سمجھے جاتے ہیں۔ میر تقی میر کا

شاعری پر ان کی تصنیف "شعر شور انگیز" ایک اہم تنقیدی کتاب ہے۔ مغربی شعریات سے مشرقی شعریات کی طرف فاروقی کا سفر خود ایک اہم ادبی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

فاروقی نے اپنے خطبہ کے آغاز میں کہا کہ اردو شاعری کے اہم موڑ کے موضوع پر اُنھوں نے جب مقالہ لکھنا شروع کیا تو لکھتے ہی چلے گئے۔ جب رکے تو پتہ چلا کہ یہ مقالہ اب ایک کتاب کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ مقالہ کی جگہ اپنی پوری کتاب جلسہ میں پڑھ دیتے لہذا انھوں نے زبانی طور پر تقریر کرنے کو ضروری سمجھا۔

فاروقی نے اپنے خطبہ میں اردو غزل کے جس اہم موڑ کی طرف اشارہ کیا وہ ابہام گوئی کے بارے میں تھا اور اس موڑ کے لئے اُنھوں نے ۱۷۰۰ سے ۱۷۵۰ تک کا عرصہ متعین کیا۔ اُنہوں نے ابہام گوئی جیسے دقیق، ثقیل اور خالص فنی موضوع پر نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ ان کا کہنا تھا کہ ابہام گوئی میں شعر میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنے کے علاوہ تازہ گوئی کو بھی بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ انھوں نے اس عہد کے کئی شاعروں کے اشعار سناتے ہوئے کسی کسی شعر میں استعمال ہونے والے ایک ہی لفظ کے کئی کئی معنوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اُنھوں نے اپنے خطبہ میں ولی، بکنی، ناجی، بیدل اور آبرو وغیرہ کے کلام کے کئی نمونے پیش کئے اور بیسویں صدی کے شاعروں پر بھی ان کے اثرات کی طرف نشاندہی کی۔ سچ پوچھئے تو ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ فاروقی اردو کی کلاسیکل زبان اور شعریات پر اتنی گہری نظر رکھتے ہیں۔ موجودہ دور کا کوئی اور ناقد اس طرح کا کام کرنے کا اہل نہیں ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ ابہام گوئی کے بارے میں ہم بس یونہی سرسری معلومات رکھتے تھے لیکن فاروقی نے جس گہرائی کے ساتھ موضوع پر روشنی ڈالی اس کے باعث ہم جیسے آدمی کی جھولی میں بھی ابہام گوئی کے بارے میں خاصی معلومات جمع ہوگئی ہیں۔

یہ دہلی کی ایک یادگار محفل تھی جس میں موسم کی خرابی کے باوجود سامعین نے

کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ایک خوشں آئند بات یہ بھی تھی کہ اس میں دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں کے کئی طلبہ نے بھی شرکت کی۔ بزرگ افسانہ نگار جوگندر پال نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے اکثر ناقد کتابیں پڑھ کر کتابیں لکھتے ہیں۔ فاروقی ان معدودے چند ناقدین میں سے ہیں جو اپنے علم کو پہلے اپنی واردات کا حصہ بناتے ہیں جب کہیں جا کر کوئی کتاب لکھتے ہیں۔

سابق گورنر گجرات ڈاکٹر سروپ سنگھ نے محفل کی صدارت کی اور فاروقی کے خطبہ کے دوران ہمہ تن گوش بنے رہے۔ انھوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ اتنی گہری بصیرت اور علمیت رکھنے کے باوجود شمس الرحمٰن فاروقی سرکاری ملازمت میں کیسے رہے۔ انھیں تو کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہونا چاہیئے تھا (ڈاکٹر سروپ سنگھ کو اب ہم کیا بتلائیں اگر وہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتے تو ایسی سمجھداری کی باتیں کیونکر کرتے) انھوں نے کہا کہ ان کے خطبہ کا موضوع میرے لئے اگرچہ مشکل تھا لیکن ان میں جو گہرا سوچ ہے اور عربی سنسکرت اور فارسی پر انھیں جو گہرا عبور حاصل ہے۔ اس کے باعث ان کا خطبہ فکر انگیز رہا۔ شمس الرحمٰن فاروقی سے بہت عرصہ بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ ماشاء اللہ جب سے وہ الہ آباد میں رہنے لگے ہیں ان کی صحت بہتر رہنے لگی ہے۔ چھوٹے شہروں میں رہنے کے بھی تو فائدے ہیں۔ ●● ("سیاست" میرا کالم سے ماخوذ)

تخلیقات کا طبع زاد ہونا ضروری نہیں، صاف اور خوش خط ہونا ضروری ہے

* جواب امور کے لئے پوسٹ کارڈ کا آنا ضروری ہے

مینیجر "شاداب"

منظور الامین
ڈائرکٹر جنرل دوردرشن انڈیا
3B فیروز کیو بنجارہ ہلز روڈ 4
حیدرآباد 34

حسنِ خیال

ریاست علی تاج کے مجموعۂ نقوشِ حیات پر ایک نظر

آج جب میں ریاست علی تاج کے "نقوشِ حیات" تلاش کرنے نکل پڑا تو یہ معلوم ہوا کہ اُن کے نقوش، آج کے محاورے میں کسی سیٹلائٹ (Satellite Foot Prints) سے کم نہیں، جس کا نظامِ نشریات دور، دور تک پھیلا ہوتا ہے سیٹلائٹ ہی کی طرح تاج کے موضوعات کا احاطہ دور دور تک نمایاں ہے جن امورِ حیات کو انھوں نے شعر کا موضوع بنایا ہے اُن میں بڑا تنوع ہے۔ اِن موضوعات میں فضا آلودگی بھی ہے خراب و خستہ جھگی جھونپڑیوں کی زندگی بھی ملتی ہے، رنجشیں، چشمکیں تنافر اور تلخیاں بھی ہیں، عید اور تہوار بھی ـــ اور اِن تیوہاروں سے جڑے ہوئے نسلی اور مذہبی فسادات بھی ـــ چاند کا سفر بھی ہے، اور اسکائی لیب بھی۔ اِس طرح ان کے اشعار ع "طرحِ نو افگن کہ ماجدّت پسند افتادہ ایم" کی تفسیر دکھائی دیتے ہیں۔

تاج نے شاعری کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ ہاں ذریعۂ اظہار ضرور بنایا۔ اِن کی نظموں اور غزلوں کو پڑھ کر اِس بات کا احساس ہوتا ہے کہ زبان پر انھیں مکمل دسترس حاصل ہے اِن کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے اس لئے اِن کی سوچ کا کینوس بہت وسیع ہے۔ انھوں نے لفظوں سے جو حسیاتی پیکر تراشے ہیں انھیں آپ تصوّر کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔

ریشم کا گستاخ دوپٹہ ٭ راز بدن کے کھول رہا ہے
یا پھر یہ شعر گھنا جنگل حسیں برگِ درختاں ٭ شفق گول شام کتنی دل کشا
تاج کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے ان کے دل نے جو بھی محسوس کیا ہے وہ ان احساسات اور تاثرات کو آسانی سے لفظوں کا پیرہن دے دیتے ہیں، لیکن یہ پیرہن چوڑی دار پائجامہ نہیں کہ جس کے اندر جاؤ تو آسانی سے باہر نہ نکل سکو۔ ان کے یہاں نہ تو "تعقیدِ لفظی" ملتی ہے نہ "تعقیدِ معنوی"۔ ان کے یہاں نام نہاد "ترسیل کا المیہ" بھی نہیں ملتا بلکہ "ازدل خیزد، بر دل ریزد" والی کیفیت ہے ان کے الفاظ میں تاثیر ہے۔ الفاظ جو دو روحوں کے درمیان مادّے Matter کا پل ہیں۔
ریاست علی تاج۔ ایک اچھے شاعر، ایک اچھے فن کار، ایک اچھے تخلیق کار ہیں برسوں تک وہ تعلیم وتدریس کے پیشے سے منسلک رہے ہیں اور اسی سیاق وسباق میں بحیثیتِ معلم وہ موٹر کے Spark Plug کی طرح ہیں جو Ignition کو دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ طالبانِ علم کے دلوں میں علم کی سچی لگن پیدا کرتے رہے ہیں۔ علم کے ساتھ ساتھ آئے دن کے مشاہدات اور تجرباتِ زندگی نے ان میں وہ نظر پیدا کی ہے جو دوربین بھی ہے اور گہری بھی چنانچہ تاج حقیقت کی دہلیز تک آکر ٹھہر نہیں جاتے بلکہ بات کی تہہ کو پہنچ جاتے ہیں اور پھر اپنے شعر کے ذریعے، تنگ نظری، کم عصری، اوہام اور تعصبات کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔

ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں "عید، تہوار، جب بھی آتے ہیں لوگ شہر [illegible] سے بھاگ جاتے ہیں کیوں؟ کہ "شہر میں زندگی، جیبر ن ہے۔" آدمی کا دشمن ہے [illegible] اس سے واں تک اجنبی رقصاں ہے۔" زیست جھنگی ہے"

ارزاں ہے ۔۔۔ اس لیئے بقول شاعر " لوگ شہروں سے بھاگ جاتے ہیں "
کیوں کہ ایسے میں "عزت و آبرو کی خیر کہاں "

تاج " ایک بے باک قلم " کے مالک ہیں۔ وہ شاعری میں " اداکاری " اور " گلوکاری " کی بےساکھیوں کے قائل نہیں۔ کیوں کہ بنیادی طور پر وہ ایک انسان ہیں وہ مکر و ریا کے مکھوٹوں کے پیچھے چھپے ہوئے آج کے انسان کے چہرے کو پہچان لیتے ہیں ۔۔ وہ انسان جو بظاہر تو مسکراہٹوں اور شادمانیوں کی کرنیں بکھیرتا ہے ، لیکن جو باطن میں " ضمیروں کے اندھیرے " چھپائے ہوتا ہے۔ ایسے انسان کے باطن میں اگر ہم جھانک کر دیکھیں تو " خیانتِ ضمیر و دل " کی شرابِ سیاہ Wine-dark کے سمندر میں ، ایسے جذبے بہتے ملتے ہیں ، جن میں شامل ہیں ۔۔ مکر و ریا ، وعدہ خلافی عہد شکنی ، جھوٹ ، حسد ، نفرت ، رقابت ، منافقت (سامنے کرتے ہیں توقیر تو پیچھے تحقیر) جن کے اندھیرے ہمیں چکاچوند کر دیتے ہیں۔ تاج ایسے انسان کی Duplicity کا پردہ فاش کر دیتے ہیں ۔

عرصہ ہوا مرزا غالب نے کہا تھا ۔ " حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے "۔ تاج بھی یہی کچھ محسوس کرتے ہیں۔ شاعری کے بارے میں ان کا بھی خیال ہے کہ ۔ " آگ سی دل میں دبی ہو تو غزل ہوتی ہے " یا پھر " کچھ نہ کچھ دردِ سری ہو تو غزل ہوتی ہے " بقول اُن کے یہ " نزدیکِ رگِ جاں ہو خلش سی ہے ، ۔۔ یہ ستارے جو سرِ مژگاں لرزتے ہیں ، یہ جو درد میں ڈوبی ہوئی اک چیخ ہے یہ سب شعر گوئی کے محرکات ہیں ۔

تاج کے یہاں " لطفِ زباں " بھی ہے ، " طرزِ ادا کا بانکپن " بھی۔ ان کے

یہاں اسلوب کی نئی نئی جہتیں اور ابعاد Dimensions ملتے ہیں وہ بات بظاہر بڑی سادگی سے کرتے ہیں " ہم لوگوں کو / حاجت کیا ہے / تکیے کی ہاتھ کو سر کے / نیچے دھر کے / سوتے ہیں " مگر اُن کی گفتگو میں گہرے معانی ہوتے ہیں، ساتھ ہی اک زمزمہ یا " Lilt " بھی ـــ اس شعر کو شعر کی طرح پڑھ کر دیکھیے تو بات واضح ہوجائے گی۔ ان کی سادگی میں جو پُرکاریاں ہیں انھیں ہر اہلِ علم محسوس کرے گا۔

وہ اُس بات کے قائل ہیں کہ ـــ " کوئی فن ہو، مشقت چاہتا ہے ۔ ہنر میں "سہل انگاری نہ کرنا"۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خود بھی علم و فن کے لیے محنت کی ہے اور بڑی مشقتیں اُٹھائی ہیں۔

مرزا غالب نے " مشاہدۂ حق " کے سلسلے میں شعر میں " بادہ و ساغر" کے استعمال کی اور " ناز و غمزہ " کو مقصد بیان کر گفتگو میں " دشنہ و خنجر" کے استعمال کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ تاج نے اس عظیم استادِ فن کے اس نظریے کی تائید اپنے الفاظ میں اس طرح کی ہے۔ ـــ

مطلب ہی اور ہوتا ہے ان لفظیات کا ؛ کہتے ہیں جب بھی شعر میں ہم " ساغر و سبو "

تاج کے اشعار میں شستگی اور رچاؤ ہے۔ ان کے جذبوں میں روحِ عصر کی صحیح عکاسی کو اجاگر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں غلط الفاظ کی بندش نہیں ملتی۔ کیونکہ انھیں زبان و بیان اور فنِ شعر پر دسترس حاصل ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق شاعر ہیں بلکہ مبادیات و متعلقاتِ شعر پر ان کی گہری نظر ہے۔ فکر و فن کے تقاضے وہ خوب سمجھتے ہیں۔ عروض، بحر و قوافی، استعارے، مجاز مرسل، تشبیہیں، کنایے

تلمیحات، نظم معریٰ، غزل، رباعی، قطعہ، پر انھیں عبور ہے" شعریات" یا اُردو شعر کے گرامر اور محاسنِ کلام (Figures of Speech) کو بڑی روانی اور اہتمام سے تننے پر قادر ہیں۔ بہتر ان کے اشعار میں وہ بے ربطی، بے ضابطگی اور آورد و تکلف کی سی کیفیت آپ کو نہیں ملے گی، جسے میں نے شعر کی انارکی کا نام دیا ہے۔ آدمی میں کمال و ہنر یونہی نہیں آجاتا۔

میرا خیال ہے کہ دور افتادگی، کم آمیزی اور ضرورت سے زیادہ عجز وانکسار نے، انھیں نقصان پہنچایا ہے لیکن واقعتہً تاج کی اہلِ نظر کو ایسی پذیرائی کرنی چاہیئے کہ ان کا مقام واقعی ان کے نام کے مطابق ہی ہو۔

حسینی جاوید

قوی سیف

اچھا دوست، قلندر انسان اور منفرد شاعر

قوی سیف، ہمارے شہر کا ایک ایسا نوجوان شاعر تھا، مستقبل
جس سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ ۴ر اگسٹ کو روز کی طرح گھر سے روانہ
درگاہ یوسفین رح کے قریب ایک ہوٹل میں چکرا کر گر پڑا، اور دواخانہ جاتے ہوئے ا
کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی.... پتہ چلا ہے کہ اس ہوٹل میں جہاں اس
ایک شاعر دوست بھی موجود تھے، دوست سے نعت شریف سنی تھی، اور اپنی نع
سنانے کی وہ تیاری کر رہا تھا۔

قوی سیف دراصل ایک قلندر صفت سخنور تھا۔ نہ اپنی صحت ہی کی
پرواہ تھی، اور نہ ہی غذا کی طرف دھیان دیا کرتا تھا۔ شہر میں اس کے احباب کا حل
کافی وسیع تھا، وہ احباب کے درمیان ہو کر یہ محسوس کرتا تھا کہ اب اسے بہت بڑی دول
ہاتھ آگئی ہے۔ وہ ایک ایسا شاعر تھا، جس کا فن اور تخیل کی پرواز بے مثال تھی۔ کسی ک
کے حصہ ہی میں یہ دولت آیا کرتی ہے اور قدرت نے سخت آزمائش میں مبتلا کر کے اُ
یہ انعام عطا کیا تھا....

قوی سیف کا مطالعہ حیران کن تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر بے تکان
کرتا تھا، ادب، شاعری، موسیقی، یہاں تک کہ علوم فلکیات پر اس کی گہری نظ

سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری پر بہت محنت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ وہ کسی بھی تحریک سے متاثر نہ تھا۔ لیکن ہر تحریک کے بارے میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ خود مجھے اکثر اوقات حیرت ہوتی تھی کہ یہ لا ابالی نوجوان آخر مطالعہ کیلئے کس طرح وقت نکال لیا کرتا ہے۔ تصوف پر گفتگو کرنے بیٹھتا تو اچھے اچھوں کو پچھاڑ دیتا قدیم سے قدیم کتب کے حوالے اس طرح دیتا کہ گویا ابھی ابھی پڑھ کر آیا ہے۔ صبح سویرے گھر سے نکل کر احباب کے ساتھ وقت گزاری کرنے والے اس نوجوان کے پاس کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ کس طرح ہوا ہوگا۔ بہر حال فن شاعری پر اُسے کافی دسترس حاصل تھی۔ باریک سے باریک نکات کو واضح کرتا ، غالب ، میر ، ذوق ، سراج ، ولی اور اقبال کے کلام کا بڑا حصہ اسے اَز بر تھا۔ ساختیات جیسے خشک اور بہت سوں کے لئے ناقابل فہم موضوع پر گفتگو کرتا ، دلائل کے ساتھ مطمئن کرتا۔ ایک ذہین اور حساس فن کار کی حیثیت سے شعری میدان میں وہ اچانک نمودار ہوا تھا۔ جس تیزی کے ساتھ وہ آیا تھا ، اتنی ہی تیزی کے ساتھ سفر آخرت پر روانہ بھی ہو گیا۔ سفر کا اُسے بہت شوق تھا نا !

اس سے میری ملاقات ۱۹۸۸ء میں اس وقت ہوئی ، جب میں اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد چلا آیا تھا۔ قدیم شہر کے تاریخی چار مینار کے قریب مینار ہوٹل ہے ، قدیم شہر کے علاوہ جدید شہر کے بھی بعض شعرا اور ادیب وہاں بیٹھا کرتے ہیں۔ ادبی شخصیتوں سے ملاقات کی غرض سے جب گھر سے نکلا تو ایک دوست نے مجھے اس ہوٹل پر پہنچا دیا تھا ، وہاں کئی اصحاب سے ملاقات رہی ، ان میں قوی سیف بھی تھا۔

ظاہری طور پر وہ شاعر بالکل نظر نہ آتا تھا۔ اس کے بیٹھنے اور بات کرنے کا انداز بھی مناسب نہ تھا ، شروع شروع میں ، میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ یہ نوجوان زبردستی خود کو شاعر کہلواتا ہے اور اپنے تکلمانہ انداز سے یہاں کے شاعروں پر دھونس جماتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اس سے گفتگو کا موقع ملتا رہا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا

کہ قوی سیف کا نہ صرف مطالعہ بہت وسیع ہے بلکہ وہ بہت اچھی شاعری بھی کر
گفتگو کے دوران یہ راز بھی کھلتا گیا کہ کئی موضوعات پر اس کی دسترس ہے اور بہ
معلومات رکھتا ہے۔ ابتداءً ... اردو' فارسی کا کوئی ایک لفظ لے کر چلا آتا' اور مجھ
سے معنے دریافت کرتا۔ ایک مرتبہ "منفرد" کے بارے میں پوچھنے لگا.... یہ ا
موجودہ شکل اور آواز میں اچھا نہیں لگتا' ضرور اس کا تلفظ کچھ اور ہی رہا ہوگا۔"
اور جستجو گویا اس کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ فلکیات کے بارے میں پوچھنے لگا کہ
میں آپ کی قطعی رائے کیا ہے ؟ نجوم جفر' علم الاعداد اور علم الحروف پر جب میں نے
اور جب اس کے مکان کے ایک حصہ کے بارے میں بتلایا تو وہ بے چین ہو گیا۔ بالآ
علوم کے بارے میں اس کا ذوق بڑھتا گیا ' روزانہ کچھ نہ کچھ پوچھتا۔ مجھے یہ دیکھ کر
ہوئی تھی کہ اس بارے میں بھی وہ بہت آگے نکل رہا ہے۔ وہ مجھے "صاحب" کہہ ک
تھا' بہت سے تو میرے دوست مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ گھر اور خاندان ک
میں' میں اسی نام سے جانا جاتا ہوں۔

قوی سیف' ایک سمجھدار انسان' عقلمند دوست اور سچا ساتھی تھ
بولا نہیں کرتا تھا۔ مسکراہٹ اس کی علامت تھی۔ مزاج میں سادگی اور بچپن تھا۔ لیک
دور اندیش اور ذہین انسان بھی تھا۔ قوی سیف کی طرح کے لوگ بہت کم پیدا ہو۔
وہ اپنا دکھ درد ظاہر نہیں کرتا تھا۔ مرنے سے چند روز قبل ملاقات ہوئی تو میں۔
کہا تھا کہ اپنی صحت کا خیال رکھو ! جواب میں اس نے مسکرا دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ
چاہتا تھا' خودداری اور غیرت مانع تھی۔ وہ بے لاگ شخص تھا۔ ۱۴ر اگسٹ کی رات
محترم جہاندار افسر نے مجھے بتایا کہ قوی سیف اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ بعری:
اس کے جانے کا میں یقین نہیں کر سکا۔ تاہم جو دکھ اور صدمہ پہونچا' وہ بیان سے
افسر بھائی کو لے کر سید سے سلطان نواز جنگ مسجد گیا' جس کے روبرو سروب کے ق

اس پر ڈھیر ساری مٹی ڈالی جا رہی تھی۔ تدفین کے فوری بعد والی دعاء فاتحہ میں شریک ہو کر مجھے یک گونا اطمینان ہوا۔ بقول افسر بھائی ہم نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

قوی سیف، قرض مٹی کا چکانے کے لئے زندہ تھا، جب یہ قرض ادا ہو گیا تو ایک لمحہ کے توقف کے بغیر وہ اپنی کینچلی اتار پھینکا، اور مسکراتے ہوئے قبر میں داخل ہو گیا۔ ہم انسان بھی کتنے کٹھور ہوتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے احباب کو مٹی دیتے ہیں، اور مٹی دینے میں اتنی عجلت دکھاتے ہیں کہ گویا ایسا نہ کریں تو وہ اپنا دوست باہر آ جائے گا، اور پھر سب کو غزلیں سنا سنا کر تنگ کیا کرے گا۔ ایک دوست کا دوست پر یہ حق نہیں رہتا کہ وہ غزل سنائے تو دوست چپ چاپ اس کی غزل سنتا رہے۔ سر دھنتا رہے یا مبہوت سا ہو جائے اور جب سناٹا ٹوٹے تو اُسے لگے کہ قوی سیف ابھی یہاں تھا، ابھی تو گیا ہے، اس کی آواز آ رہی ہے، اِدھر اُدھر کہیں ہو گا وہ ..... مسکراہٹیں بکھیر رہا ہو گا، فرشتوں کو تنگ کر رہا ہو گا، ان سے پوچھ رہا ہو گا کہ یہ فاعلاتن فاعلات کیا بلا ہے؟ غزل کو نیا لباس، نیا آہنگ دینے کیلئے کن چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ "میں نے دنیا میں ہزاروں تجربے کئے ہیں، کیا تم لوگوں نے بھی کچھ کیا ہے؟" فرشتوں کا نفی میں جواب سن کر وہ جھلا اٹھتا ہے، اُن سے اصرار کرتا ہے کہ اُسے دنیا میں پھینک آئیں۔ جہاں لاکھ خرابیوں کے باوجود انسانیت زندہ ہے، ادب اور شاعری زندہ ہیں، بے ادب زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ کیا تم لوگوں نے کبھی قوی سیف کا نام بھی سنا ہے؟.... پھر قوی سیف ایک سرد آہ کھینچ کر کہتا ہے، افسوس کہ وہ اب نہ وہاں رہا ہے، اور نہ یہاں رہے گا۔ ادب کے بغیر وہ کہیں نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کا یہاں رہنا لازم ہے تو یہاں بھی مشاعروں کی محفلیں سجاؤ، رعنا وصفی کو لے کر ادبی انجمنیں بناؤ کہ کسی طرح اس کا دل لگ جائے۔ آخر اپنی تخلیقات کے بغیر وہ یہاں کیسے رہ سکتا ہے؟

ہمارے نقش قدم ہیں، چراغِ راہِ حیات
کہ یہ طویل سفر ہم نے پاپیادہ کیا (راغب مرادآبادی)

●●●

ایک خط

سلام خوشنویس
۱۶-۲-۸۴۰/۱/۱ امین کالونی
سعید آباد حیدرآباد ۵۹

مدیرانِ گرامی قدر ماہنامہ "شاداب" حیدرآباد
السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اپریل ۱۹۹۶ء کا شمارہ پڑھنے میں آیا۔ خوشی یوں ہوئی کہ (ہمارا شہر حیدرآباد جو کبھی فرخندہ بنیاد فخر سے لکھا اور پڑھا بھی جاتا تھا' اب بھی کچھ پاسدارانِ روایات ایسا لکھنے اور پڑھنے کے قائل ہیں) حیدرآباد کے ان دنوں جو حالات ہیں۔ ان حالات میں بھی کچھ باہمت صاحبانِ فکر و نظر اور اردو زبان سے محبت رکھنے والے "شاداب" کی اشاعت کی ہمت کر رہے ہیں' حالانکہ ایسا کرنے میں ان کی اپنی "شادابی" کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے ـــــ اوراقِ شاداب پلٹتے پلٹتے صفحہ (۳۶) پر نظر پڑی تو جم گئی۔ پڑھا تو صاحبِ تنقید و تبصرہ جناب غنی نعیم صاحب کے خیالات سے متفق ہو گیا' مگر اس اختلاف کے ساتھ کہ تنقید و تبصرہ کا اختیار ہر زندہ دل کو ہے اور نا اس کرا لیسے شخص کو تنقید و تبصرہ کا حق پہنچتا ہے جو یہ محسوس کرے کہ اپنی مادری زبان میں شعر یا تخلیق کے نام پر غت ربود مچائے اور تخلیق کار بھی کہلائے۔ جو شخص اردو زبان و ادب سے محبت کرتا ہو ایسے کج رو' بے بہرہ اور سطحی قسم کے تخلیق کاروں کا تعاقب کر سکتا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے صحیح مشورہ بھی دے سکتا ہے۔ اگر کوئی تنقید و تبصرہ نگار اپنے مقام کو نظر میں نہ رکھے' تنقید و تبصرہ کا حق

ادا نہ کر سکے اور اُس کے تنقید و تبصرہ کا معیار وقتی مصلحت یا مفاد پر مبنی ہو تو خود بخود تنقید و تبصرہ نگار کا مقام باقی نہیں رہے گا۔ اگر تنقید و تبصرہ نگار ایسی تخلیقات کا مطالعہ کرتا ہے جو اُس کے خون کھولانے کا سبب بنتی ہیں تو بہتر ہے کہ وہ شیخ عابد کریم نہ غنی نعیم صاحب، اب یوں کریں کہ مطالعہ تو وہ جاری رکھیں گے ہی، تنقید و تبصرہ کا عمل بھی جاری رکھیں مگر اِس بیباکی کے ساتھ کہ بس تخلیق کار کو وہ پڑھ رہے ہوں باقاعدہ اُس کا نام لیں اور اُس کی تخلیق پر بے لاگ قلم اُٹھائیں۔ یہ حق ہر اُس شریف آدمی کو پہنچتا ہے جو اپنی زندگی کی تلخیوں سے کچھ وقت نکال کر تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی مادری زبان کی تخلیقات، جی بہلانے اور ذہنی آسودگی کے لیئے مطالعہ کرتا ہے اور اُس کا جی اور بھی اُکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی تخلیق کار (واقعی تخلیق کار ہو تو) کسی تنقید و تبصرہ کی زد سے جھلا اُٹھتا ہے یا تلملا جاتا ہے تو پھر جان لیجئے کہ وہ تخلیق کار کے زمرہ ہی میں نہیں آسکتا۔ اور ایسے تخلیق کار کو عموماً اپنی تخلیقات، اپنے دیوان خانے میں، قریبی دوستوں یا بیوی بچوں کو سُنا کر جی بہلا لینا چاہیئے۔ کوئی تخلیق جب تخلیق کار کے ذہن و قلم سے نکل کر عوام تک پہنچتی ہے تو وہ تخلیق، تخلیق کار کی نہیں رہ جاتی، اُس پر معاشرہ کا حق ہو جاتا ہے اس کی یعنی تخلیق کی اچھائیاں بھی بتائی جا سکتی ہیں اور برائیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

"شاداب" کے مطالعہ کے بعد معاً خیال آیا کہ کچھ ایسے احباب سے بھی ملوں جو شاداب پڑھتے ہوں، میرے لیئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا ـــــ اور پھر یوں ہوا کہ ایک صاحب نے یہ بھی معلومات فراہم کر دیں کہ شاداب میں اُس تنقید و تبصرہ کی اشاعت کے بعد ادب نوازوں کے ایک حلقے میں غوغا مچی ہوئی ہے۔ کسی گوشہ

ہ تعفّن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ادب نواز نہ تو کہرام مچاتے ہیں اور نہ جامہ سے
ہر ہوتے ہیں، مگر ایسا کچھ ہو گیا ہے اور تحریر کے نمونے بے ردھم شعروں کی
صورت میں میرے پاس محفوظ بھی ہیں ۔۔ اور یہ سارا عمل ادب کے میدان میں
وئی معرکہ سر نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ " مارنے والا یوں خوش ہو جائے کہ
یں نے فلاں کو مارا۔ اور مار کھانے والا یوں جھومتا رہے کہ میں نے مار کھا کر کم از
م گالی تو دی "۔ یہ کوئی صحت مند علامت نہیں ہے ۔۔ موجودہ ادبی کساد بازاری
کے عالم میں "گالی دینا نہایت آسان کام ہے، مگر یہ کمزوری کی علامت ہے ۔۔ گالی
سہہ لینا " یہ کار آمد جذبہ ہے، اس میں اگرچہ کہ تھوڑے سے حرارے خرچ ہوتے ہیں
مگر آدمی میں خود اعتمادی بڑھتی ہے !

ہر دور میں دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی ہی کہا جائے گا۔ شاداب میں تنقید و
تبصرہ کا عمل جاری رکھنے سے عین ممکن ہے، کسی کی اصلاح ہو سکے، کسی کی فکر کے دریچے
روشن ہو جائیں اور کوئی خود ستائی کے خول سے باہر بھی نکل سکتا ہے۔ یہ شہر جب تک
ہم زندہ ہیں، ہمارا ہے اور بہر حال اس شہر کے تمام تخلیق کار ہمارے ہی شہر کی پیداوار ہیں
اور ہر پیداوار (فصل) بڑی اہم ہوتی ہے اور ہر فصل سے ہم کچھ نہ کچھ ضرور استفادہ کرتے ہیں
اور فصل کو کار آمد بنانے کے لئے صحت مند طریقۂ کار بھی اپنا سکتے ہیں ۔۔ مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے
اگر مدیران شاداب میرے خیال سے متفق ہوں تو ملال نہیں کروں گا ۔۔ اور اگر متفق ہو جاتے
ہیں تو قلمے سخنے اور قدمے تعاون ضرور کروں گا "دامے درمے"۔ اس لیئے نہیں لکھا کہ ایک دن
سانہ دور خالص اُردو کی روٹی کھاتے کھاتے گزر گیا ۔۔ "دام اور درہم" نہیں ہے قلم میرا ہے سخن
ہے، لکھتا ہوں۔ قدم بھی خاقتور ہیں۔ اللہ بس ۔۔ باقی نہ رکھے ہوس ۔۔ (آمین) ■

پریس انفارمیشن بیورو
گورنمنٹ آف انڈیا

تحریکِ عدم تعاون......

سودیشی کا جذبہ

تحریکِ عدم تعاون' درحقیقت قومی تحریک کے سلسلے میں کئے جانے والے بہت سے اہم آئینی اقدامات کی نقیب تھی۔ یہ تحریک ۱۹۲۰ سے ۱۹۲۲ تک صرف تقریباً دو سال تک چلی تھی۔ اس تحریک نے عوام کو ایک قوم کے طور پر اور سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ عدم تشدد دانہ طریقوں سے' جدوجہدِ آزادی کا فیصلہ کن مرحلہ شروع کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔ پہلی بار کل ہند پیمانے پر "سودیشی" کے جذبے کی تشہیر کی گئی تھی اور کھادی کو عوام میں مقبول بنایا گیا تھا۔ کسانوں اور مزدوروں کو بھی قومی تحریک میں شامل کیا گیا تھا اور اس طرح جدوجہدِ آزادی کو صحیح معنوں میں ایک عوامی تحریک بنایا گیا تھا۔

سودیشی کا جذبہ

کل ہند کانگریس کمیٹی نے ۵ نومبر ۱۹۲۱ کو دہلی میں تحریکِ عدم تعاون چلانے کا اختیار دیا تھا۔ لوگوں پر اپنی سرکاری ملازمت چھوڑنے' برطانوی عدالتوں سے دور رہنے' اسکولوں اور کالجوں سے اپنے بچوں کا داخلہ ختم کرانے نیز انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے لئے زور دیا گیا تھا۔ چرخہ پروگرام کے ایک حصے کے طور پر' عوام پر

رضاکارانہ طور سے کتائی کرنے کا کام شروع کرنے کے لئے زور دیا گیا تھا۔ اس سرگرمی کا مقصد دیہی عوام کو پہچان کی ایک علامت بنانا اور سودیشی کی راہ پر تیزی سے گامزن کرنا تھا۔ سودیشی کے جذبے کا احیاء قابلِ دید تھا۔ اس کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ سی آر داس اور موتی لعل نہرو جیسے وکیلوں نے اپنی وکالت ترک کر دی تھی۔

قومی تعلیمی ادارے

تحریکِ عدم تعاون کے سلسلے میں ایک اہم اقدام کافی تعداد میں قومی اسکولوں اور کالجوں کا قیام تھا، جن میں سے اہم علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ جسے بعد میں دہلی منتقل کیا گیا، بنارس میں کاشی ودیاپیٹھ اور گجرات ودیاپیٹھ ہیں۔ ان اداروں سے سودیشی کو مزید فروغ حاصل ہوا۔

سیاسی اور معاشی امور

معاشی بائیکاٹ کافی کامیاب رہا اور ایک موثر ہتھیار ثابت ہوا۔ یہ بائیکاٹ تحریک عدم تعاون کا ایک اہم حصہ تھا۔ درحقیقت، عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں کاروباری لوگوں کی حمایت سے برطانوی کیمپ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

چنانچہ تحریکِ عدم تعاون کا زور مسائل کو یکجا کرنے اور طبقاتی تقسیم کے خاتمے کی کوشش کرنے پر تھا۔ گاندھی جی نے چھوت چھات کو ختم کرنے کے سلسلے میں پُرخلوص کوشش کی۔ وہ اس معاملہ کو پہلی بار قومی سیاست میں نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئے۔ تحریک عدم تعاون ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھی، جس کا مقصد سودیشی کے ذریعے قومی فخر و امتیاز کو بحال کرنا، اہم سماجی اور معاشی امور کو اٹھانا اور ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرنا تھا۔ درحقیقت یہ پہلا قدم تھا، جو ایک قوم نے اپنی حقیقی پہچان کی تلاش میں اٹھایا تھا۔

(باقی بر صفحہ ۴۸)

ڈاکٹر (مسز) سرلا گوپالن
سکریٹری HRD حکومت ہند

ماں کا دودھ۔ ایک نعمت

جدید سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ماں کے دودھ کے مقابلے میں شیر خوار بچوں کے لئے بہتر خوراک تیار نہیں کرسکی ہے۔ ماں کا دودھ شیرخوار بچوں کی غذائی اور نفسیاتی ضروریات پوری کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

بدقسمتی سے، نہ صرف ترقی یافتہ ممالک میں بلکہ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں بھی ماں کا دودھ پلانے کے رواج میں بہت زیادہ کمی واقع ہوئی ہے۔ ان ممالک میں شیرخوار بچوں کو صحت کے لئے بہت ہی مضر دودھ کی ایسی مصنوعی متبادل خوراک دی جاتی ہیں، جن کا معیار بہت ہی خراب ہوتا ہے۔ اس طرح غذائیت کی کمی اور بیماریوں کے واقعات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے کہ ان دونوں کی وجہ سے بیشتر ترقی پذیر ممالک میں شیرخوار بچوں نیز پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات زیادہ رہتی ہے اور ان بچوں میں بیماریوں کے واقعات بھی بہت زیادہ رہتے ہیں۔

ماں کے دودھ میں غذائیت کا معیار

سائنسی تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ ماں کے دودھ اور گائے کے دودھ کے اجزاء کئی لحاظ سے مختلف ہیں۔ ماں کے دودھ میں غذائیت کے غیر معمولی معیار کو کافی پہلے سے ہی تسلیم کیا جاچکا ہے۔ یہ دودھ آسانی سے ہضم ہوجاتا ہے۔ اس دودھ میں پروٹین زیادہ حل پذیر شکل میں ہوتا ہے، جسے شیرخوار بچے با آسانی ہضم کرلیتے ہیں۔

گائے کے دودھ میں ، ماں کے دودھ کے مقابلے میں زیادہ پروٹین ہوتے ہیں ۔
یہی صورت حال ماں کے دودھ میں چکنائی اور کیلشیم کے معاملے میں بھی ہے ۔
یہ چیزیں بھی با آسانی سے ہضم ہو جاتی ہیں ۔ ماں کے دودھ میں جو مٹھاس (لیکٹوز) ہوتی ہے ' اس سے بھی بچوں کو طاقت ملتی ہے ۔ اس کے علاوہ اس کا ایک حصہ آنتوں میں جاکر ' لیکٹک ایسڈ میں تبدیل ہو جاتا ہے ' جس سے آنتوں میں موجود نقصان دہ جراثیم مر جاتے ہیں نیز کیلشیم اور دیگر معدنیات کے ہضم ہونے میں بھی مدد ملتی ہے ۔ ماں کے دودھ میں وٹامن مثلاً تھیامائن ' وٹامن اے ' وٹامن سی پائے جاتے ہیں ۔ دودھ میں ان وٹامنوں کی مقدار کا انحصار ماں کی خوراک پر ہوتا ہے ۔ عام حالات میں ' اس دودھ سے ان وٹامنوں کی مناسب مقدار فراہم ہو سکتی ہے ۔

ماں کے دودھ میں قدرتی طور سے بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی خاصیت ہوتی ہے ۔ یہ خوبی کسی اور دودھ میں نہیں پائی جاتی ہے ۔ اس دودھ میں بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا یہ عمل خاص طور سے ان ترقی پذیر ممالک کے لئے اہم ہے ' جہاں بیماریوں کے واقعات بہت زیادہ ہوتے ہیں اور شیر خوار بچوں کے لئے صاف ستھرے طریقے سے خوراک تیار کرنے کے سلسلے میں سہولیات کی کمی ہے ۔

ماں کا دودھ پلانے کا رواج

خوش قسمتی سے ہندوستان میں ماں کا دودھ پلانے کا رواج تقریباً عام ہے لیکن خاص طور سے شہری علاقوں میں اس رواج میں کمی واقع ہو رہی ہے جہاں ماں کا دودھ پلانے کی بجائے ' بوتل سے دودھ پلانے کے رواج میں تیزی آ رہی ہے ' اس کے نتیجے میں بچوں میں غذائیت کی کمی واقع ہو رہی ہے اور ان میں بیماریوں کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ماں کا دودھ پلانے کے اس رواج کو برقرار رکھا جائے اور اُسے فروغ دیا جائے ۔

چھوٹے بچوں سے متعلق اعلانیہ

عالمی طور سے حکومتوں نے شیر خوار بچوں، ماؤں اور وسیع پیمانے پر سماج کے لئے ماں کا دودھ پلانے کی اہمیت اور فوائد کی از سر نو توثیق کی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں بچوں کے حقوق کے بارے میں کنونشن میں چھوٹے بچوں سے متعلق اعلانیہ اور عالمی چوٹی کانفرنس کے اعلانیہ میں، جس پر ہندوستان نے بھی دستخط کئے ہیں، ماں کے دودھ کی اہمیت پر توجہ مرکوز کرائی گئی ہے۔ فروری، ۱۹۹۲ء میں ورلڈ الائینس فار ایسٹ فیڈنگ ایکشن (ڈبلیو اے بی اے) قائم کیا گیا تھا، جس کا اہم مقصد ماں کا دودھ پلانے کے رواج کو برقرار رکھنا اور اسے فروغ دینا تھا۔ اس کے علاوہ یکم اگست سے ۷ اگست تک کے ہفتے کو ماں کا دودھ پلانے کا سالانہ عالمی ہفتہ قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۹۲ء میں ہندوستان کی پارلیمنٹ نے شیر خوار بچوں کے لئے دودھ کی متبادل اشیاء، دودھ پلانے کی بوتلوں، شیر خوار بچوں کی خوراک کی تیاری، سپلائی اور تقسیم کے ضابطے سے متعلق قانون ۱۹۹۲ء اختیار کیا تھا۔

غذائیت سے متعلق قومی پالیسی

۱۹۹۳ء میں، حکومت ہند نے غذائیت سے متعلق پالیسی اور ۱۹۹۵ء میں غذائیت کے بارے میں قومی منصوبہ عمل اختیار کیا تھا۔ چھوٹے بچوں کی غذائیت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں جن اہم اقدامات کی سفارش کی گئی ہے، ان میں ایک یہ ہے۔ "ماؤں کو غذائیت اور صحت کے بارے میں تعلیم دینا" نیز "صحت اور غذائیت کے بارے میں تعلیم کے ذریعے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ شرکت حاصل کرنا"

اس پس منظر میں، ماں کا دودھ پلانے سے متعلق عالمی ہفتے ۱۹۹۶ء کا موضوع ہندوستان کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ماں کا دودھ پلانے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، حکومت ہند نے اس رواج کو فروغ دینے اور اسے برقرار رکھنے کے سلسلے میں

TelePhone: 229161
R. No 37/979/84 Postal Regd. No. H/HD593
MONTHLY **SHADAAB** HYD.
11-5-147 RED HILLS, HYD-A. P.
Vol.12 No.12 DEC 1998

شاداب بک کلب

۱۱-۵-۱۴۷، ریڈ ہلز، حیدرآباد-۴۔۰۰۵ (اے پی)

- اُردو کتب و رسائل خرید کر پڑھنے اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ اس مد پر خرچ کرنے کی عادت ڈالنے کیلئے "شاداب بک کلب" قائم کیا گیا ہے۔
- شاداب بک کلب کی رکنیت فیس -/25 روپئے ہے۔
- ہر رکن کو سالانہ 500 روپے کی کتب و رسائل خریدنے ہونگے۔ یہ رقم وہ پیشگی جمع کروائیں گے یا ہر ماہ 50 روپے پیشگی ادا کریں گے۔
- مکتبہ شاداب کی مطبوعہ کتب پر 25 فیصد ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا دیگر کتب پر ۱۰ فیصد ڈسکاونٹ دیا جائے گا۔
- کتب کی فہرست مکتبہ پر موجود رہیگی اور منتخب کتب کی فہرست "شاداب" میں چھپتی رہے گی۔
- ہر رکن کو اپنی پسند سے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔
- مکتبہ شاداب میں غیر موجود کتب کی خواہش پر انھیں حاصل کرکے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- اگر کوئی رکن سال کے ابتدائی دس ماہ تک -/500 روپے کی کتب فراہم کرنے کی خواہش نہ کریں تو ادارہ اپنی پسند کی کتب روانہ کرے گا



یونٹوں کے ذریعے ماں کا دودھ پلانے کے رواج کو فروغ دینے کا کام انجام دے رہا ہے یہ کام وہ غذائیت کے بارے میں تعلیم اور تربیت کے پروگراموں کے ذریعے کر رہا ہے۔

ملازمت پیشہ ماؤں کے لئے امدادی خدمات

اپنا دودھ پلانا ایک عورت کا حق ہے۔ بیشتر عورتیں اپنے بچوں کو دودھ پلانا چاہتی ہیں، بشرطیکہ انھیں ایسا کرنے کے سلسلے میں سہولیات مہیا کی جائیں۔ اپنا دودھ پلانے سے ایک عورت اپنے ساتھ ساتھ اپنے بچے کی بھی اچھی صحت برقرار رکھ سکتی ہے۔

ہر ماں خواہ گھر سے باہر یا گھر کے اندر ایک کام کرنے والی ماں ہوتی ہے۔ بیشتر عورتیں، جو اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلانا چاہتی ہیں، کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ اپنا دودھ پلانے کا خیال چھوڑ دیتی ہیں اور جزوی طور سے یا علامتی طور سے اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سماج کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ ان کی مجبوریوں کو دور کرنے کے لئے آگے آئیں۔ حکومت کو بھی چاہئیے کہ وہ ملازمت پیشہ عورتوں کے لئے امدادی خدمات فراہم کرے۔ زچگی کے سلسلے میں چھٹی، کام کرنے کے اوقات میں اپنے شیرخوار بچوں تک ان کی رسائی اور ان کے بچوں کی ایسی دیکھبھال کی سہولیات ہونے کی وجہ سے، جس کے اخراجات وہ برداشت کر سکیں، عورتیں بہتر کام کر سکتی ہیں۔ بچوں، عورتوں، کنبوں اور ملازمین سبھی کو اس سے فائدہ ہوگا۔

ماں کے دودھ کا مہنگا متبادل

گذشتہ برسوں میں، کاروباری لوگ ماں کے دودھ کی جگہ مہنگے کم غذائیت اور مضر صحت متبادل کو فروغ دینے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اس شیرخوار بچے کی خوراک پر، جسے ماں کا دودھ نہیں پلایا جاتا ہے۔ تقریباً ۵۰۰ روپے ماہانہ خرچ ہوتا ہے۔ اسی میں اس بچے کے علاج معالجے کے اخراجات شامل نہیں ہیں،

(باقی بر صفحہ ۴۸)

غزل

ڈاکٹر محمد منشارالرحمٰن خان منشاؔ
[illegible]

اجلے اجلے تو ہیں کانٹے اور ہیں کالے کالے پھول
دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ڈال رہے ہیں جالے پھول

میرے چمن میں فصلِ بہاراں آنے کو آئی ہے مگر
ہر اک جانب بکھرے پڑے ہیں پژمردہ مٹیالے پھول

تھوڑی دیر میں یہ بھی آخر خاک میں مل ہی جائیں گے
نشۂ رنگ میں جھوم رہے ہیں شاخ پہ جو متوالے پھول

تیز دمکتے سورج کو بھی شام میں ڈھلنا پڑتا ہے
حسن و جوانی پر مت اتنا زیادہ پھولنے والے پھول

دیکھنا کل وہ اچھا خاصہ ہار گلے کا بن جائے گا
ہنستے ہنستے آج گلے میں جس نے لا کر ڈالے پھول

نام کو بھی ہوتا ہی نہیں ہے جن میں سچا رنگِ خلوص
تیر کے جیسے چبھتے ہیں وہ منہ سے جھڑنے والے پھول

قطرہ قطرہ لہو پلا کر ہم نے جنھیں شاداب کیا
ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں اب وہ لہو کے پالے پھول

سیرِ چمن کی آخر منشاؔ ہم کو چاہت ہو تو کیوں
دیکھی بھالی ہیں یہ فضائیں اور ہیں دیکھے بھالے پھول

غزل

محمد منصور خاں منصورؔ
استاد انگریزی۔ چھندواڑہ کالج
چھندواڑہ (ایم پی)

لذتِ غم سوا نہ ہوجائے
میرے دل کی صدا نہ ہوجائے

مجھ سے لغزش کوئی نہ ہوجائے
میری منزل خطا نہ ہوجائے

دل تو رہتا ہے عقل کے تابع
آج یہ بھی رہا نہ ہوجائے

بیخودی اپنی اور خودی اُن کی
رازِ دل اب کھلا نہ ہوجائے

نہیں ملنا تو کوئی بات نہیں
ڈر تو ہے سامنا نہ ہوجائے

اُن کو دیکھے ہوا ہے اک عرصہ
زخم دل ہرا نہ ہوجائے

لذتِ غم کی ہے بُری عادت
اُن سے ملنا گراں نہ ہوجائے

بدلے کیسے ہیں حسن کے انداز
زلفِ سرکش خفا نہ ہوجائے

جستجو میں جفا کی اے منصورؔ
بے وفا، باوفا نہ ہوجائے

(باقی سلسلہ ص۴۲ سے آگے)

تحریک عدم تعاون کو اس کے اس پیغام کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے کہ آزادی صرف عدم تشددانہ طریقوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس تحریک کا پیغام آج کے زمانے میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سودیشی کے جذبے کو آج بھی عوام کے دلوں میں ازسرِنو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ●●

(باقی سلسلہ ص۱۲ سے آگے)

دیکھتے ہوئے مولانا کے یہ تین شعر ان پھول نگاہ سے چھنئے اور اس کی خوشبو کو دماغ تک پہونچایئے۔

علم سے ہے آدمیت کا فروغ ○ علم باغِ زندگی کی ہے بہار
علم سے ہوتا ہے انساں محترم ○ علم سے ہوتا ہے انساں باوقار
علم کے نغموں سے ہو کرمت و خوش ○ جھومتی ہے رحمتِ پروردگار

●●●

(باقی سلسلہ ص۴۵ سے آگے)

کیونکہ یہ بچے بیماریوں کا زیادہ شکار ہوتا ہے۔ بوتل سے دودھ پینے والے بچے کو ڈائریا کی بیماری زیادہ لاحق ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ چونکہ بہت سے کنبے اس طرح کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، اسلئے بیشتر بچوں کو کم غذائیت والا دودھ ملتا ہے، جس کی وجہ سے ان میں غذائیت کی کمی رہتی ہے۔ ●●●

(باقی سلسلہ ص۱۱ سے آگے)

نئی قانون سازی کے طور پر نہیں لیا جانا چاہیئے بلکہ پہلے ہی سے موجود قوانین کی وضاحت و صراحت کے طور پر اس کو قبول کیا جانا چاہیئے۔ ●●

(باقی اگلے شمارہ میں)

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱۲) شمارہ (۱۰)

قیمت ۶ روپے

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال کیلئے ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	" ۲۰۰ "	" ۳۶۰ "	" ۳۷۰۰ "
امریکہ	" ۴۰ ڈالر	" ۷۰ ڈالر	" ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	" ۲۵ پونڈ	" ۴۵ پونڈ	" ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	" ۱۷۵ روپے	" ۳۰۰ روپے	" ۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱ ریڈہلز۔ حیدرآباد

○ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپواکر

دفتر ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد، اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

ر الحفیظ ندوی

استنبول میں جلسے اور سیمینار

حضرت مولانا ندوی کے اعزاز میں

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام استنبول میں منعقد ہونے والے سیمینار میں
رکت کے لئے ہندوستانی وفود کے ممبران دبئی اور کویت ہو کر ترکی پہونچے۔ سب سے
بے میر کارواں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم (صدر رابطہ)
انا سید محمد رابع حسنی ندوی (جنرل سکریٹری رابطہ) کا قافلہ دہلی سے ۱۶ اگست کی صبح
دبئی کے لئے روانہ ہوا۔ جہاں چوبیس گھنٹے اس وفد نے دعوتی مصروفیتوں میں
ارا، دبئی ایرپورٹ پر اہل تعلق اور مخلص احباب کی بڑی تعداد موجود تھی۔ یہاں آمد
مقصد صرف یہ تھا کہ ایک طویل سفر کو دو حصوں میں پورا کیا جائے، لیکن تعلق والوں
نے اسی دن بعد نماز عشاء مسجد العزیز میں ایک پروگرام رکھ دیا جس میں بڑی تعداد
ہند و پاک کے لوگ موجود تھے حضرت مولانا مدظلہ نے اپنی دعوتی تقریر میں فرمایا
یہ وہ سرزمین ہے جہاں سے ہم کو سب سے قیمتی چیز ملی ہے، یعنی ہدایت اور
نا کی لازوال نعمت ملی ہے اور ساری نوع انسانی پر جزیرۃ العرب کا احسان
اس احسان کو آپ ہر وقت یاد رکھیں، اس کے جو تقاضے اور فرائض ہیں انہیں

اپنے تصور میں تازہ کرتے رہیں، اس سرزمین کا ایک ذرہ بھی سونے سے زیادہ قیمتی ہے آپ اس قدر کیجئے۔ جب ایمان کی دولت ہمیں یہیں سے ملی ہے تو پھر ہماری زندگی اس سرزمین پر اور بھی ذمہ دارانہ طریقے سے بسر ہونی چاہیئے، فرائض کا اہتمام تو ہو ہی، ہمیں سنن اور مستحبات کا بھی اہتمام کرنا چاہیئے۔ ذکر و اذکار کی پابندی اور اپنی زندگی کو سیرت نبوی کے سانچے میں ڈھالنی چاہیئے، آپ جب اپنے وطن واپس جائیں تو آپ کی زندگی میں لوگوں کو تبدیلی نظر آئے۔ مولانا مدظلہ نے حاضرین کو ان کے دعوتی فرائض یاد دلائے اور انہیں دنیا کے قائد و امام بننے اور اصل منصب خلافت و قیادت کے مقام کو حاصل کرنے کی دعوت دی، پوری تقریر جوش و اخلاص اور حکمت و دعوت کے جذبے سے ابل رہی تھی، از دل خیزد، بردل ریزد کا مصداق دبئی کے بعد یہ قافلہ مشرق و مغرب کے دونوں براعظم کو اپنے بازوؤں میں سمیٹنے والے منفرد اور بے مثال شہر استنبول میں اترا۔ استنبول کا نام ہی ایک مسلمان کے جذبات میں تلاطم اور اس کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کرکے رکھ دیتا ہے وہ استنبول جو ملت اسلام کا عظیم تاریخی شہر اور جو سینکڑوں برسوں کے کشت و خون کا حاصل اور امت مسلمہ کی سطوت کا نشان پائیدار ہے، جو محمد الفاتح کی ذاتی فتوحات نہیں بلکہ اسلامی فتوحات کے تاریخی مرقعہ میں ایک شاندار، پرجلال، عظیم الشان زندہ تابندہ اور جگمگاتی و مسکراتی ہوئی دلکش تصویر ہے، یہ وہ شہر ہے جو صدیوں سے تک ملت اسلام کی عظمت و سطوت کا رمز بنا رہا، جہاں کے حکمرانوں کے ناموں کی ہیبت اور رعب و دبدبے سے یورپ کے گرجا گھروں کے گھنٹے بجنے بند ہو جاتے تھے ستر سال تک دشمنوں کی سازشوں، مکر و فریب اور طاقت کے بل پر یہ عظیم

ملک اسلام اور مسلمانوں کے لئے شجرِ ممنوعہ بنا رہا۔ ایک مستند روایت کے مطابق صرف پچھتر ہزار علماء کو اسلام کا نام لینے کے جرم میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ لاکھوں انسانوں نے قید و بند کی جو صعوبتیں جھیلیں وہ الگ ہیں، لیکن آخر کار خون صد ہزار انجم سے سحر پیدا ہو کر رہی۔ جب میرِ کارواں اس شہر میں داخل ہو رہے تھے تو قرآنی مکاتب کی چار دیواری میں تیار ہونے والے شاہین بچے ایا صوفیا میں دوبارہ بیانگِ دہل اذان دے رہے تھے وہی اسلام جس کا نام لینے پر رقیب تھانے میں رپٹ لکھواتے اور اس کے نام لیواؤں کو تختۂ دار پر لٹکواتے تھے اب اس اسلام کا نام بڑے فخر اور بڑی خود اعتمادی سے سرکاری اسٹیج پر لیا جا رہا ہے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اس وقت پورا برصغیر ترکان عثمانی کے ناموں اور کارناموں سے گونج رہا تھا "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" کے جانفزا نغمے مولانا بچپن سے سنتے آ رہے تھے، خاندانی ماحول اور تعلیم و تربیت نے ترکی مجاہد ملت اسلامی کا عشق کی آگ رگ و پے میں بھر دی تھی، مولانا شبلی، مولانا ظفر علی خان کی آتشیں نظموں اور علامہ اقبال کے صور اسرافیل نے اس آتش عشق کو تیز تر کر دیا تھا، وہ پہلی بار جب ۱۹۵۶ء میں امیدوں اور تمناؤں کی دنیا لئے ہوئے اس تاریخی سرزمین پر داخل ہوئے تو بے اختیار پکار اٹھے، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ قدم قدم پر ان کے مچلتے آرزوؤں کا خون ہوا۔ ارمانوں کی اس بستی کو لٹے پٹے اور اجڑے ہوئے دیکھ کر وہ خون کے آنسو روئے، لیکن دعوت و عزیمت اور قوموں کے عروج و زوال کے کھنڈرات اور ملبوں اور تاریخ کی سلوٹوں میں پوشیدہ خزانوں اور حقائق کی جستجو کرنے والے اس محقق اور دقیقہ رس مصنف اور اسلام جیسے

لافانی اور ابدی مذہب پر یقین کامل رکھنے والے اس داعی مرد مومن کو امید کی کرنیں نظر آئیں اور اس نے پیشن گوئی کی کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے ؎ شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

۱۹۵۱ء میں جب مولانا مدظلہ، مصر تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے ازہر میں زیر تعلیم ترک نوجوانوں کو ملک واپس جا کر اس کی قیادت سنبھالنے کی دعوت دی تھی، اور ان سے اس کے لئے زبردست ایثار و قربانی اور ہر طرح کی علمی و روحانی تیاری اور مستقبل میں پیش آنے والے چیلنجوں کو نہ صرف قبول کرنے بلکہ ان کا جواب دینے کے لئے تیار رہنے کو کہا تھا، اقبال کے الفاظ میں اُن سے فرمایا تھا۔ ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز ؎ یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

مصر کے اُس سفر میں جن ترک طلبا کا خصوصیت کے ساتھ مولانا نے تذکرہ کیا تھا وہی آج کل اسلام پسند ترک نوجوانوں کی قیادت کر رہے ہیں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ترک حکومت نے بدرجۂ مجبوری حفظ قرآن کے مکاتب اور ائمہ مساجد کی تعلیم کے لئے محدود پیمانے پر مدارس کھولنے کی یہ سمجھ کر اجازت دی تھی کہ طاقتور سکولر حکومت کا جس کو پوری مغربی دنیا اور خود ترک فوج کی طاقتور پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ مدارس کیا بگاڑ لیں گے۔ لیکن یہ حفاظ اور آئمہ مساجد تعلیمی زینے طے کرتے ہوئے یونیورسٹیز کی سطح تک اور پھر وہاں سے حکومت کے دَر و بست تک پہونچ گئے۔ حفظ قرآن اور تعلیم امامت و خطابت کے محدود ماحول کو انہوں نے غنیمت سمجھا ان ہی مکاتب کی چہار دیواری میں انکی اسلامی تربیت بھی ہوئی۔ اس حفظِ قرآن کے نظام میں ایسی برکت ہوئی کہ اس کی بدولت نہ صرف عربی زبان بلکہ اسلام زندہ ہو رہا ہے، اسلامی تہذیب کا چراغ روشن ہو رہا ہے

ایک ترک مسلم نے فرمایا۔ آپ سڑکوں پر بے حیائی کے مناظر کو نہ دیکھئے، ترک بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت کا ہم لوگوں نے جو نظام بنایا ہے انشاء اللہ اس کے آثار دس سال بعد آپ کو نظر آئیں گے، ہم قانون بنا کر نہیں بلکہ ترک معاشرے کی بنیاد اٹھا رہے ہیں، ہم نے شیخ ندوی کی اس نصیحت کو جو انہوں نے ۱۹۵۶ء میں اپنی آمد کے موقع پر کی تھی، ہم نے اپنی گرہ میں باندھ لی ہے کہ ایک بچی کی تعلیم و تربیت کا مطلب تین نسل کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا ہے۔ اس وقت ہم گیارہ سو مدارس صرف لڑکیوں کی تعلیم کے لیئے چلا رہے ہیں۔

ترکی میں اس وقت عالم اسلام کے چار ممتاز داعیوں اور مفکروں کی کتابیں پڑھی جا رہی ہیں۔ حضرت مولانا مدظلہ کی انیتس کتابوں کے ترجمے ترکی میں ہو چکے ہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید قطب اور علامہ یوسف القرضاوی، مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی کتاب حیاۃ الصحابہ، مولانا ذکریا صاحب کی کتاب فضائل اعمال کے ترجمے ہو چکے ہیں ایک باخبر ترک دوست نے بتایا کہ ترک وزارت داخلہ کی خفیہ رپورٹ میں یہ بات خاص طور سے درج ہے کہ ترکی میں اسلامی بیداری کی لہر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت کو خاص دخل ہے، واضح رہے کہ سیرت سید احمد شہید کی دو جلدوں سمیت دعوت و عزیمت کے تمام حصوں کا ترکی میں آٹھ جلدوں میں ترجمہ بڑا مقبول ہو رہا ہے۔

ترکی میں حضرت مولانا مدظلہ کی یہ پانچویں بار آمد تھی۔ یہ مبارک آمد ایسے موقع پر تھی جبکہ بہار بے خزاں (اسلام) کے جاں نواز جھونکے مشام جاں کو معطر بنا رہے تھے، جس انتشار نے ترکی کو مرد بیمار بنایا تھا وہ مریضِ سخت جاں سیکولرازم کی بیماری سے

شفایاب ہو رہا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر اس طبیب حاذق کو بھی قلبی مسر
رہی تھی جس نے زخموں سے چور جسم اور رستے ناسوروں پر مرہم رکھا تھا، کہیں
فاسد مادہ نکالا تو کہیں طاقت کے انجکشن لگائے اس مریض کی کلی شفایابی
اس نے اس طرح تڑپ تڑپ کر دعائیں کیں کہ جیسے "ترکش مارا خدنگ آخر
جن لوگوں نے اس کے دنوں کی تپش اور اس کے شبوں کا گداز اور پیچ و تاب
دیکھی ہے وہ گواہی دیتے ہیں کہ صرف ترکی ہی نہیں سارے جہاں کا درد ہمارے
ہے" عالم اسلام کی حالت زار دیکھ کر اس کے دل کا چین و سکون اور راتوں کی نیند
اور ایسا لگتا ہے جیسے کسی بیوہ خاتون کے آخری سہارے کو اس کی گود میں ذ
گیا ہو۔

استنبول میں چلنے پروگرام ہوتے سب اس مرد مومن کے اعزاز میں ہو
ان سب میں یہی مشاہدہ میں آیا اور محسوس بھی ہوا کہ امیر المجاہدین سید احمد شہ
تحریک جہاد کو نمایاں کرنے والے مصنف کی رگوں میں ایک طاقتور اور زندگ
سے بھرپور مجاہد کا خون گردش کر رہا ہے یہ بیاسی سالہ نوجوان جب بھی خط
تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ایمانی آبشار رواں دواں ہے، صحف سماوی کے اا
طرح طاقت، زندگی اور حقائق سے بھرپور ایجاز و اعجاز کا شاہکار، تاریخ دعوت
کے بے خزاں باغوں کے ہزاروں پھولوں سے کشیدہ عطر آبیدہ کی منزل پر ز
دشواریوں، کام کی نزاکتوں، پیچیدگیوں اور قدم قدم پر خار مغیلاں سے پُر د
موجودگی کی اطلاع، تلوار سے تیز اور بال سے باریک صراط مستقیم پر توا
اعتدال سے چلنے زمانے کے جائز اور فطری تقاضوں اور ضروریات پر نظر،

تلقین، نئی نسلوں کو مطمئن کرنے، حکمراں اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں اسلام کی ابدی تعلیمات، اس کی قیادت اور ہر دور میں دنیا کی رہنمائی کی صلاحیت کو راسخ کرنے، عصر حاضر کی شستہ وشائستہ طاقتور زبان میں آنکھیں ملا کر بغیر کسی احساس کمتری کے خود اعتمادی سے بات کرنے، بچوں اور نوجوانوں کے لیے صالح ذہنی و فکری غذا مہیا کرنے کی ہدایت۔ یہ وہ بنیادی عناصر تھے جو ان کی تقریروں کا محور ہے۔

استنبول میں یادگار اور تاریخی جلسہ وہ تھا جو میر کارواں کے اعزاز میں منعقد کیا گیا۔ ذہن ہندی کو خراج تحسین شکوہ ترکمانی اور نطق اعرابی دونوں ہی پیش کر رہے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا استنبول میں منفرد جلسہ تھا، منفرد اس لیے کہ جس شہر کے رقیب خدا نام لیے جانے پر تھانوں میں رپٹ لکھواتے تھے اس شہر میں خدا کے ایک مخلص بندے اور اسلام کے داعی وسپاہی کو دین کی خدمت پر خراج عقیدت پیش کیا جا رہا تھا۔

والدین کی نیکی اور صلاح کی جزا اولاد کو کب اور کہاں ملتی ہے قرآن مجید نے اس کی تعیین کر دی ہے مولانا مدظلہ کے والدین ہوں یا خود ان کی ذات قدم قدم پر فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون کا ظہور ہوتا رہا اور برابر اس کی تفسیر سامنے آ رہی ہے مولانا سید عبدالحئی کو عالمگیر شہرت کی صورت میں ملی، ان کی علمی تصنیفات سے مشرق ومغرب کے دانشور استفادہ کر رہے ہیں تازہ اطلاع یہ ہے کہ اسلامک سنٹر آکسفورڈ نے "نزھۃ الخواطر" کی آٹھوں جلدوں کو کمپیوٹرائز کر دیا ہے مولانا علی میاں مدظلہ کی پہلی تحریر دلنی عالم عربی نے اس وقت جب دنیا سے عرب کے ممتاز رسالہ المنار نے ان کا مضمون شائع کیا۔ اس وقت مضمون نگار کی عمر چودہ سال کی تھی مولانا کی اولین علمی تصنیف سب سے پہلے قاہرہ جیسے علمی او

مرکز سے شائع ہوئی، ان کے اعزاز میں سب سے پہلا تعارفی جلسہ یہیں منعقد کیا گیا سب سے پہلے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے عالم عربی کے علمی و تہذیبی مرکز دمشق یونیورسٹی میں ان کو مدعو کیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے فیصل ایوارڈ سے نوازا جو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز اس وقت حاصل ہوا اور میری زندگی کا یادگار اور تاریخی دن وہ تھا جب کعبۃ اللہ کے کلید بردار نے دروازہ کھول کر مجھ سے کہا کہ آپ جس کو چاہیں کعبہ کے اندر لے جا سکتے ہیں، تکیہ رائے بریلی میں پیدا ہونے والے یتیم کے لئے وہ لمحہ بھی یادگار تھا جب حرم مکی کے خطیب نے اپنے جمعہ کے خطبہ میں اس کی کتاب سے اقتباسات پیش کئے۔ عالم عربی ہی وہ جگہ ہے جہاں مولانا کی تصنیفات کی اشاعت اور مقبولیت چپہ چپہ میں ہوئی۔ وہ دانش گاہوں سے لے کر عدالتوں اور جیل خانوں تک میں پڑھی گئی، ہوا کے دوش پر بھی قسطوں میں ان کو عوام تک پہونچایا گیا تعلیمی اداروں کے درجات میں سبقاً سبقاً تعلیم دی گئی، عالم عربی میں سب سے پہلے ان کے پیش کردہ اسلامی ادب کے تخیل کو عملی شکل میں سامنے لانے کے لئے اقدام کیا پھر اس کی تنظیم حرم مکی کے زیر سایہ ہوئی۔ اب اس کا سایہ ملیشیا، انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک پھیل گیا ہے۔

اور اب اسلامبول آل عثمان کے مرکزی پایۂ خلافت اسلامبول میں مولانا مدظلہ کی تاج پوشی یا ان کا اعزاز اس طرح کیا جا رہا ہے کہ عرب و عجم کے ادباء و شعراء اور دانشوروں کی ایک جماعت ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے جمع ہے۔

مرکزی اسٹیج پر عالم اسلام کے چوٹی کے عالم اور ممتاز داعی و مفکر علامہ یوسف القرضاوی اور مشہور مفکر و ادیب محمد قطب بیٹھے ہوئے ہیں، رابطہ ادب اسلامی کے ممتاز

رکن، مصر میں علاقائی دفتر کے صدر، ازہر یونیورسٹی کلیۃ اللغۃ العربیہ کے سربراہ ڈاکٹر عبدالمنعم احمد یونس اس اعزازی جلسہ کے انعقاد کی اہمیت اور اس کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں، رابطہ ادب اسلامی کے بنیادی مقاصد میں سے یہ مقصد بھی تھا کہ ہم اسلامی کے بنیادی مقاصد میں سے یہ مقصد بھی تھا کہ ہم اسلامی ادیبوں اور ممتاز دانشوروں کی دینی وادبی خدمات کا اعتراف کریں، انہوں نے اپنے علم اور فکروفن سے انسانیت کو جو فائدہ پہونچایا ہے اور اس راہ میں انہوں نے جو ایثار و قربانی کی ہے ہم ان کی قدر کریں اپنے محسنوں کے احسانات کو یاد رکھنا ان کے حقوق کی ادائیگی اور قدردانی ہمارے دین کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے، من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ ، دوسری بات یہ ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہمارے رابطہ ادب اسلامی کے بانی صدر اور صرف اس کے محسن نہیں پوری انسانیت کے مربی ومحسن اور رہنما ہیں اور عرب وعجم ان کی دعوت و فکر سے نہ صرف آشنا بلکہ ان کا قدرداں ہے، یورپ کے لوگ اپنے محسنوں کی قدرشناسی اور عزت افزائی میں بہت آگے ہیں، وہ اپنے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں، فوجی وسیاسی قائدین اور سائنسی ایجادات کرنے والوں کے بارے میں بڑے بڑے سیمینار کرتے اور دانش گاہوں میں ان کے نام سے شعبے قائم کرتے اور لاکھوں کے صرفے سے ان کے اسٹیچو اور مجسمے نصب کرتے ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنے محسنوں کو جانتے بھی نہیں، چہ جائیکہ ان کی شخصیت ودعوت اور علمی وادبی اور اخلاقی خصوصیات کو کسی کانفرنس کا موضوع بنائیں۔ یہ جلسۂ اعزاز بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا، ہم نے رابطۂ ادب اسلامی کے زیر اہتمام مشہور اسلامی ادیب نجیب کیلانی کے اعزاز میں ایک

جلسہ قاہرہ میں منعقد کیا تھا، جس میں ان کی شخصیت اور فن پر مقالات پڑھے گئے تھے اور ان کو ایک شیلڈ پیش کی گئی تھی، آج ہمیں دلی مسرت ہے بلکہ ہم فخر و اعزاز محسوس کر رہے ہیں کہ استنبول جیسے تاریخی شہر میں ہم یہ جلسہ ایسی شخصیت کے اعزاز میں کر رہے جن کی ذات انجمن ساز ہے اور اس نے اسلامی دنیا ہی نہیں مغربی دنیا کو بھی اپنی شخصیت اور فکر و فن سے متاثر کیا ہے بہت سے علمی و ادبی اور دعوتی مراکز کا سرچشمہ اُن کی ذات ہے۔

اس تمہیدی تقریر کے بعد ڈاکٹر عبدالمنعم نے مولانا مدظلہ کی تصانیف میں موجود دعوتی روح کی طرف اجمالی انداز میں صرف اشارہ کیا اور کہا کہ مقالہ نگار حضرات اپنے مقالوں میں تفصیل سے ان کا تعارف کرائیں گے (باقی آئندہ شمارہ میں)

اٹلانٹا اولمپکس صہ ۱۸ سے آگے

ضروری تربیت کی فراہمی کے ذریعہ ان کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ ہندوستان جیسا بڑا ملک عالمی کھیل کود میں ہمیشہ پیچھے نہیں رہ سکتا۔ اس سال بھی ہندوستانی کھلاڑیوں کا ایک بڑا جتھا اٹلانٹا اولمپکس میں شرکت کے لئے روانہ ہو چکا ہے اور اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا لے کر واپس لوٹتے ہیں۔

اٹلانٹا اولمپکس | بہترین تاریخی پس منظر رکھنے والے اٹلانٹا اولمپکس موجودہ دور کے عصری کی صد سالہ تقاریب کی علامت ہیں جو اپنی نوعیت کے منفرد کھیل ہونگے جہاں مابعد جنگ کے دور میں یہ پہلا موقع ہے کہ تمام ممالک نے اولمپک میں شرکت کے لئے رضامندی ظاہر کی ہے۔ اٹلانٹا اولمپکس میں (۱۹۷) ممالک کے زائد از (۱۶,۵۰۰) اتھلیٹس (۱۸۳۸) میڈلس کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گے ۱۹۹۲ء کے بارسلونا اولمپکس میں مقابلوں کی تعداد صرف (۲۵۷) تھی تاہم اس مرتبہ ان کی تعداد میں (۲۷۱) تک اضافہ کیا گیا ہے۔

ممتاز مفتی

لبیک

[ممتاز مفتی اُردو کے ممتاز فکشن نگار ہیں۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ منٹو، بیدی، عصمت وغیرہ کے ساتھ ایک ہی دور میں لکھتے ہوئے انھوں نے ایک نفسیاتی افسانہ نگار کی حیثیت سے افسانہ نگاری میں اپنی شناخت بنائی۔ ان کا ضخیم سوانحی ناول "علی پور کا ایلی" بہت مشہور ہوا۔ ۱۹۹۱ء میں "الکھ نگری" کے نام سے ان کا دوسرا سوانحی ناول بھی شائع ہوا۔ نومبر ۱۹۹۵ء میں انہوں نے نوّے ۹۰ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ "اَن کہی" "گہما گہمی" "اسمارائیں" "سمے کا بندھن" "گڑیا گھر" "روغنی پتلے" وغیرہ ان کے افسانوی مجموعے ہیں "لبیک" کے نام سے انہوں نے حج کا بہت ہی دلچسپ سفرنامہ تحریر کیا تھا جو اپنے اسلوب کی دلکشی، جذبے کی شدّت اور والہانہ عقیدت کی وجہ سے حج کے عام سفرناموں سے بہت ممتاز اور مختلف ہے۔ اس سفرنامہ کی پہلی قسط ھدیۂ قارئین ہے]

(ادارہ)

میرے دل میں حج کرنے کی خواہش کبھی پیدا نہ ہوئی تھی پر عجیب حالات رونما ہوئے۔

فوارہ چوک کا مست، ایک شام میں فوارہ چوک سے گزر رہا تھا، اس وقت بجلی فیل ہونے کی وجہ سے چوک میں خاصہ اندھیرا تھا۔ حسبِ دستور آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں بچ کر ایک طرف چل رہا تھا کہ دفعتاً ایک سیاہ فام جسم میرے سامنے اُبھرا۔ چہرہ بھیانک تھا۔ بال بکھرے ہوئے آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر خوشی سے چلا کر بولا۔ "تو حج پہ جائے گا۔ تو حج پر جائے گا۔ سنا تو نے۔"

وہ مست تھا۔ میں سمجھا کہ فقیر ہے۔ میں نے جیب سے چونّی نکال کر اُس کے ہاتھ پہ رکھ دی اور چل پڑا۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ہاتھ کھولا۔ چونی میرے ہاتھ پہ رکھ دی۔ پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی۔ وہ ریزگاری سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے ساری ریزگاری مجھے تھما دی۔ "رکھ لے۔ رکھ لے" وہ بولا —— "تجھے حج پر جانا ہے، تجھے پیسے چاہئیں۔ رکھ لے رکھ لے۔"

اس روز گھر پہنچ کر میں سوچتا رہا۔

اگر وہ چونی واپس نہ کرتا اور اتنی ساری ریزگاری میرے ہاتھ میں نہ تھما دیتا تو اس واقعہ کو میں چنداں اہمیت نہ دیتا۔ لیکن ان کوائف نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

چار ایک دن میں سوچتا رہا۔ وہ کون تھا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا اُس نے مجھے پیسے کیوں دیئے۔ حج کی بات کی طرف میری توجہ منعطف نہ ہوئی۔

اس کی حیثیت ضمنی رہی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اتنی بھیڑ میں اس نے مجھے کیوں روکا۔ خیرات کیوں نہ لی۔ مجھے کیوں پیسے دیئے۔

چار ایک دن میں سوچتا رہا۔ پھر بات ذہن سے نکل گئی۔

دو مہینے گزر گئے۔

خواب ہی خواب ہے — ایک رات مجھے حج کا خواب آیا۔ میں اپنے خواب کو لکھ لیا کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ مجھے یہ گمان ہے کہ خواب پیغامات کے حامل ہوتے ہیں یا مستقبل کی خبر دیتے ہیں بلکہ اس لئے کہ میں نفس لاشعور میں دلچسپی رکھتا ہوں۔

خواب میں میں نے دیکھا کہ میرے چچا مرحوم تشریف لائے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں دو سوٹ کیس ہیں۔ بغل میں ایک لمبا لفافہ دبا رکھا ہے۔ بولے۔

"یہ لو رہا تمہارا سامان" اور پھر لفافہ کھول کر اس میں سے ایک سلپ نکالی۔ اور یہ رہی تمہاری ٹکٹ۔"

"کیسی ٹکٹ ؟" میں نے پوچھا"

بولے۔ "بھئی تم حج پر جو جا رہے ہو۔"

یہ خواب اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھا تھا۔

نوجوانی میں مجھے خواب نہیں آتے تھے۔ آتے بھی تو بے ربط اور ڈراؤنے جو صبح کو یاد نہ رہتے۔ ان دنوں صرف ایک باربط خواب آیا تھا جس سے میں اچھی طرح مانوس تھا جسے انگریزی میں Night Mare کہتے ہیں۔ ڈراؤنی بڑھیا میرے پیچھے بھاگتی۔ مجھے پکڑ لیتی۔ پھر وہ میری چھاتی پر چڑھ کر بیٹھ جاتی۔ ڈر کے

مارے میں چیختا ۔ اور میری آنکھ کھل جاتی ۔

ادھیڑ عمر میں بڑھیا سے تو چھٹکارا مل گیا لیکن خوابوں میں بے ربطی افراتفری دوڑ دھوپ، خوف و ہراس قائم ہے اس خواب سے متعلق تین باتیں عجیب تھیں۔

پہلی یہ کہ ایسا باربط اور صاف خواب میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

دوسری یہ کہ حج کی بات کبھی میرے نفس شاعر یا غیر شاعر میں نہ آئی تھی

پھر اس کے متعلق خواب دیکھنا حیران کن بات تھی۔

تیسری یہ کہ حج کی بات اور چچا کی زبانی ۔ دونوں باتیں ہی ناقابل یقین تھیں۔ چوں کہ میری طرح چچا مرحوم بھی اللہ تعالیٰ کو صرف منہ زبانی مانتے تھے

یہ خواب دیکھ کر اب کی بار میری تمام تر توجہ حج پر مرکوز ہو گئی۔ کئی ایک دن میں سوچتا رہا مجھے حج کی خبر کیوں سنائی جا رہی ہے۔ حج اور میں دونوں کا کوئی میل بھی ہو۔ سوچ سوچ کر ہار گیا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔

پھر کچھ دیر کے بعد بات ذہن سے نکل گئی

دو مہینے اور گزر گئے۔

میاں صاحب، پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ میرے دل میں حج کے مفہوم کی آگاہی حاصل کرنے کے لیے تجسس پیدا ہو گیا۔ ان دنوں میں کراچی میں نیا نیا قدرت اللہ شہاب سے واقف ہوا تھا۔

ایک روز قدرت اللہ نے مجھے فون کیا۔ بولے جب آپ دفتر آئیں تو راستے میں ۱۸ گارڈن ایسٹ Garden East سے ہوتے آئیں۔ وہاں ایک صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میاں صاحب۔ ان سے ملیں کہیں میں بھی

ہیں، فرمائیے۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟
بسیار تلاش کے بعد مجھے گارڈن اسٹیٹ کا وہ مکان ملا جس میں میاں صاحب تھے۔
میں نے صاحب خانہ سے میاں صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے رے کی طرف اشارہ کیا۔
وہ ایک چھوٹا سا خالی کمرہ تھا جس میں ایک طرف چارپائی بچھی ہوئی تھی دوسری لو نماز پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی عبادت میں مصروف تھا
میاں صاحب بڑے اخلاق سے ملے۔ میں نے اپنا مقصد بیان کیا۔ میں نے کہا ے قدرت اللہ شہاب نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے" وہ پوچھتے ہیں کہ چاہتے کیا ہیں؟"
کچھ دیر کے لیے میاں صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ اُن کے بشرے سے نورانی اور وقار کا اظہار ہو رہا تھا۔ برتاؤ میں حلم، شفقت اور سنجیدگی تھی لیکن اس بود انداز میں شدت کا اضطراب تھا، جسے وہ دبانے کی شدید کوشش کر رہے تھے
"کچھ نہیں چاہیئے" میاں صاحب نے جواب دیا "کچھ نہیں چاہیئے۔ اللہ کا دیا ہے۔ کون سی نعمت ہے جس سے انہوں نے اپنے غلام کو نہیں نوازا۔ اُن سے بس اتنی گزارش ہے کہ ہمیں حج پر بھجوا دیں۔"
حج کی بات کرتے ہی ان کا پُر وقار چہرہ یوں ٹوٹ گیا جیسے انڈا ضرب لگنے ٹ جاتا ہے۔ چہرہ مسخ ہو گیا۔ بزرگی اور وقار پارہ پارہ ہو کر رہ گئے۔ اُن پہ ہا تمنا، بے بسی اور بے چارگی طاری ہو گئی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

روتے روتے وہ چلائے "وقت بیت نہ جائے۔ ہمارے پاس پیسہ ہے کرایہ ہے، اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف وقت نہیں۔ بس ہمیں حج پر بھجوا دیں۔"
وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ روتے روتے اُن کی گھگی بندھ گئی۔

میاں صاحب سے ملنے کے بعد میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"یہ حج کیا چیز ہے؟" میں نے قدرت اللہ سے پوچھا

انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "حج اسلام کا ایک رکن ہے۔"

"رکن تو ہے پر یہ کیسا رکن ہے جس کے لیے ایک معزز باوقار بزرگ یوں بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا جیسے حج چوسنے والی مٹھائی ہو۔"

رٹیچول:

"حج ایک Ritual ہے۔" قدرت اللہ نے سنجیدگی سے کہا۔ تقسیم کے فوراً بعد مشہور فلم ڈائرکٹر مسعود پرویز نے مجھ سے کہا "مفتی صاحب! اگر آپ ایک ایسی فلمی کہانی لکھ دیں جس میں دورِ جہالت کے قدیم عرب قبیلوں کی زندگی کی تصویر ہو، عربوں کی بت پرستی، شراب نوشی، زناکاری، بے حیائی اور عیاشی دکھانے کے بعد دفعتاً جہالت کے بادل چھٹ جائیں اور سورج نکل آئے اور محمد صلعم کی عظیم شخصیت کے اثرات عربوں کی کایا پلٹ دیں۔

مسعود پرویز کے خیال نے مجھے مسحور کر دیا۔ فلم لکھنے کے لیے میں نے مکہ کی تاریخ کا مطالعہ شروع کر دیا۔

تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ حج کے کوائف بالکل وہی ہیں جو زمانہ جاہلیت میں مکہ

کے بت کدے میں سالانہ اجتماع پر ادا کیئے جاتے تھے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ جب لات ومنات کا طواف ہوتا تھا تو زائرین ننگے ہوتے تھے۔ ہاتھوں میں شراب کے پیالے ہوتے تھے اور بغلوں میں محبوبائیں ہوتی تھیں۔

لیکن اب زائرین کے جسم ملبوس ہوتے ہیں۔ دلوں میں پاکیزہ جذبات کی بھیڑ لگی ہوتی ہے، ہونٹوں پر اللہ کی حمد وثنا کے جام ہوتے ہیں اور اگرچہ مسجدالحرام میں عورتوں اور مردوں کی بھیڑ ہوتی ہے، لیکن وہاں نہ کوئی عورت ہوتی ہے نہ مرد ہوتا ہے۔

"کیا یہ سچ ہے؟" میں نے قدرت اللہ سے

پتہ نہیں، کون سی تنک میں تحریر ہے کہ فتح پور سیکری میں ایک بہت بڑا پتھر ہے جو بظاہر سوکھا نظر آتا ہے، لیکن اس پر کنکر مارو تو پانی کے قطرے اُڑتے ہیں۔"

میں نے بہت سے کنکر اور خالی شیشی جیب میں رکھ لی اور قدرت اللہ کی طرف چل پڑا۔ ان دنوں قدرت اللہ لاہور چھاؤنی میں الگن روڈ پر ایک وسیع و عریض لیکن بوسیدہ اور ویران کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

پہلا حج:

"آپ نے حج کیا ہے؟" میں نے پہلا کنکر مارا۔

"ہاں کیا ہے!"

"طیارے سے گئے تھے؟"

"نہیں"

"جہاز میں گئے تھے؟"

"نہیں"

"پھر کیسے گئے تھے؟"

"بس سے گیا تھا۔"

قدرت اللہ سے سوالات پوچھنا، اچھی خاصی سردردی کا باعث ہوتا ہے۔ سوالات پوچھو تو ان کا رویہ ایسے مجرم کا سا ہوتا ہے جو پولیس کے ہتھے چڑھا ہوا ہو، جسے جھوٹ بولنا گوارا نہ ہو مگر سچ کہہ دینے سے حتی الوسع بچنا چاہتا ہو۔

سوالات کا جواب دیتے وقت ان کا رویہ اس قدر خالصتاً منطقی ہوتا ہے جس قدر ارسطو کا ہوتا تھا۔

ایک دہقان ارسطو کا فین تھا۔ وہ گاؤں سے چل کر بڑے شوق سے ارسطو سے ملنے آیا۔ شہر آکر پوچھتے پوچھتے وہ ارسطو کے گھر پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت ارسطو حکیم کی دکان پر جانے کے لیئے گھر سے باہر نکل رہا تھا۔

دہقان نے پوچھا۔ "یہ ارسطو کا گھر ہے؟"

"جی ہاں۔" ارسطو نے جواب دیا

"ارسطو اندر ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"وہ کہاں ملے گا"؟

"حکیم صاحب کی دکان پر۔"

"حکیم صاحب کی دکان کہاں ہے؟"

ارسطو نے اتا پتا بتایا۔

کچھ دیر کے بعد دہقان حکیم کی دکان پر پہنچا۔ حکیم سے کہا مجھے ارسطو سے ملنا ہے۔ حکیم نے ارسطو کی طرف اشارہ کیا

"یہ رہے ارسطو۔"

"اچھا تو تو ارسطو ہے" دہقان نے حیرت سے پوچھا

"ہاں۔" ارسطو بولا۔ "میں ارسطو ہوں۔"

دہقان کو غصہ آ گیا، بولا۔ "تو نے مجھے وہاں کیوں نہ بتایا کہ تو ارسطو ہے"

ارسطو نے جواب دیا "تو نے وہاں یہ نہیں پوچھا تھا کہ تو ارسطو ہے۔ پوچھتا تو بتا دیتا۔"

جواب دینے میں قدرت اللہ بھی سمجھ لیجئے ارسطو ہیں۔ لیکن اس کا کیا جائے کہ سوال پوچھنے میں میں اس دہقان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ جواب لینے کے لیے مجھے مناسب سوال کرنا نہیں آتا۔

میں نے پوچھا۔ "مکہ شریف میں ٹھہرے کہاں تھے؟"

کہنے لگے: "ایک نالے کے کنارے۔"

میں نے پوچھا: "نالے کے کنارے ہوٹل تھا کیا؟"

بولے "نہیں۔"

"مکان تھا؟"

"نہیں۔"

"کیا تھا؟"

"نالے کے کنارے نالے کا کنارہ تھا۔" قدرت نے جواب دیا۔

"اتنے دن نالے کے کنارے پر پڑے رہے۔ زمین پر؟"

"ہاں"۔ وہ بولے۔ "تقریباً"

اگر حج وہی پرانا Ritual ہے تو پھر میاں صاحب جیسے معزز لوگ اس کے لیے کیوں منہ پھاڑ کر روتے ہیں۔

"پتہ نہیں" قدرت اللہ نے کہا

قدرت اللہ ایک ایسے تنگ منہ کا مرتبان ہیں اور انھوں نے التزاماً اپنے علم اور مشاہدے کے پانی کی سطح اتنی نیچی رکھی ہوئی ہے کہ اس سے استفادے کے لیے مرتبان میں بہت سے پتھر پھینکنے پڑتے ہیں جب کہیں جا کر طالب کی چونچ ہری ہوتی ہے۔ اس قدر ہری نہیں کہ پیاس مٹ جائے بلکہ اس قدر ہری کہ تشنگی اور بڑھ جائے۔

قدرت کا روکھا جواب سن کر مجھ میں مزید پتھر مارنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا۔ اتنی محنت کون کرے اور اگر حج کے کوائف کے متعلق پتہ چل بھی جائے تو کیا فرق پڑے گا

بھس میں آگ : پھر چند ایک ماہ کے بعد گویا بھس میں آگ لگ گئی۔ حج کے خوابوں کا تانتا بندھ گیا۔

میں کہیں جانے کے لیے سامان باندھ رہا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہے۔ کہاں جا رہے ہو۔ پیشتر اس کے کہ میں جواب دوں۔ آواز آتی ہے "حج پر جا رہے ہیں"

میں بس میں بیٹھ جاتا ہوں۔ بس چل پڑتی ہے کنڈیکٹر ٹکٹ دینے آتا ہے "میں ملتان جاؤں گا۔" میں اس سے کہتا ہوں۔ سبھی مسافر حیرانی سے میری

طرف دیکھتے ہیں اور یک زبان ہو کر چلاتے ہیں "یہ بس تونج کو جا رہی ہے۔"

"مگر میں تو ملتان ---- روکو۔ روکو میں چلاتا ہوں۔"

کنڈکٹر نفی میں سر ہلاتا ہے۔ یہ بس رُکے گی نہیں۔

ایک بڑھیا آتی ہے۔ میرے ہاتھ پر اٹھنی رکھ دیتی ہے۔ کہتی ہے۔

"اس کا گیہوں خریدنا اور کبوتروں کو ڈالنا میری طرف سے۔"

"کون سے کبوتر۔" میں پوچھتا ہوں

"اے روضۂ پاک کے اور کون سے۔"

یہ خوابوں کا سلسلہ تین مہینے تک جاری رہا۔ حتیٰ کہ میں بوکھلا گیا۔

آیات ہی آیات پھر ایک روز بک سنٹر سے گزر رہا تھا کہ سامنے ایک کتاب پر نظر پڑی، جس پر جلی قلم سے لکھا تھا، "حج بیت اللہ"۔

میں نے وہ کتاب خریدلی اور گھر جا کر اسے پڑھنے لگا۔ کتاب پڑھ کر میں بے حد مایوس ہوا۔ کتاب کا لبِّ لباب یہ تھا کہ حج کی نیت کرتے وقت فلاں آیت پڑھو احرام باندھتے وقت فلاں آیت پڑھو۔ روانہ ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔ مکہ شریف میں داخل ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔ مسجد الحرام میں داخل ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔ خانۂ خدا پر نگاہ پڑے تو فلاں آیت پڑھو۔

ارے توحج، مسلسل آیتیں پڑھنے کا نام ہے، لیکن اتنی ساری آیات زبانی تو یاد نہیں رہ سکتیں۔ میں نے سوچا۔ زائرین ساتھ چھپی ہوئی آیات کی کتابیں اٹھائے پھرتے ہوں گے۔

پھر جو دیکھتا ہوں تو لاکھوں زائرین کتابیں آنکھوں کے سامنے رکھے فریضۂ حج

ادا کر رہے ہیں۔ انھیں آیتیں پڑھنے سے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ آنکھ اٹھا کر دیکھیں کہ وہ کس کے حضور میں کھڑے ہیں۔ کس کے در پر استادہ ہیں اور کتابوں کی اوٹ میں بیت اللہ تن تنہا کھڑا ہے اداس اکیلا۔ ارے کیا میاں صاحب اس حج کے لیے زار و قطار رو رہے تھے بار بھی الجھ گئی۔ میں نے سوچا کہ چلو قدرت سے ملو۔ چاہے مرتبان میں پتھر ڈالنے پڑیں۔ کتنی ہی محنت کرنی پڑے۔ کر گزرو۔ شاید کچھ پلے پڑے

"نہیں میں نے وہاں ایک دری بچھالی تھی"

"وہاں دری پر پڑے رہتے تھے؟"

"ہاں"

"پاس پیسے نہیں تھے کیا؟"

"نہیں"

"گھر سے پیسے نہیں لے کے گئے تھے۔"

"لے کر گیا تھا۔"

"تھوڑے سے ہوں گے؟"

"نہیں کافی تھے"

"ان دنوں عہدہ کیا تھا؟"

"صدر کا مشیر تھا"

"تو پیسے چوری ہو گئے تھے؟"

"نہیں"

"کسی کو دے دیئے تھے؟"

"ہاں۔"

"پاس کچھ نہ رکھا؟"

"رکھا تھا"

"کتنا رکھا تھا"

"جتنے میں روز دو روٹیاں خریدی جا سکیں۔"

"باقی خیرات کر دیئے"

"ہاں"

"روٹی کے ساتھ کیا کھاتے تھے؟"

"دال"

"دال کہاں سے ملتی تھی؟"

"تندور والا دیتا تھا"

"مفت"

"ہاں مفت"

توبہ ہے قدرت سے کون سر کھپائے۔ ساری کنکریاں ختم ہو گئیں لیکن بوتل میں ایک قطرہ پانی نہ پڑا۔ میں نے سوچا چلو گھر چلو۔ جج سے متعلق معلومات کیئے بغیر کیا میری زندگی ادھوری رہ جائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے

ایلگن روڈ کا مست عین اسی وقت باہر سے شور کی آواز بلند ہوئی۔ بہت سے لوگ چیخ چلا رہے تھے۔ ہم باہر نکلے۔ کوٹھی کے صحن میں بہت سے لوگ کھڑے تھے

ان کے درمیان ایک نوعمر شخص تھا وہ دیوانوں کی سی باتیں کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ چلایا۔ " وہ آ گئے۔ وہ آ گئے " اور پھر ہماری طرف بھاگا

کمرے میں لے جا کر قدرت نے اسے کرسی پر بٹھا دیا

کرسی پر بیٹھ کر وہ غصے میں قدرت سے کہنے لگا۔ " تو اسے بتاتا کیوں نہیں؟ "

" کیا؟ قدرت نے پوچھا

" جو یہ پوچھ رہا ہے " اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور قدرت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

" اس نے پانچ حج کرنے ہیں۔ ابھی چار باقی ہیں۔ "

" تو بھی جائے گا۔ تو بھی جائے گا " وہ بولا۔ تیری فائل بنی ہوئی ہے۔ ابھی دستخط نہیں ہوتے۔ "

جب وہ چلا گیا تو میں نے قدرت سے کہا " اللہ میاں کے بھی فائلیں چلتی ہیں؟ "

" ہاں ۔۔۔ کہتے ہیں "

" اسی طرح جس طرح ہمارے سکریٹریٹ میں چلتی ہیں؟ "

" ہاں "

" کیا وہاں کے دفتروں میں بھی ایسی ہی دھاندلی ہے؟ "

قدرت ہنس پڑے۔ " پتہ نہیں۔ "

" قرائن سے تو ایسے ہی لگتا ہے "

" ہاں ۔۔۔ وہ بولے " لگتا تو ایسا ہی ہے "

" اچھا ۔۔۔ مجھ سے ایک وعدہ کیجئے

"کیا؟" وہ بولے

"جب بھی آپ حج پر جائیں مجھے ساتھ لے جائیے"

"اچھا" وہ بولے "لے جاؤں گا۔ اگر گیا تو"

میں نے کہا "اگر مجھے جانا ہے تو اکیلے جانا بے کار ہوگا۔"

"کیوں؟" انھوں نے پوچھا

"وہاں مجھے کون جانتا ہے وہاں میری کیا حیثیت ہوگی"

"وہاں کسی کی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہاں سب ایک ہوتے ہیں۔ سب برابر ہوتے ہیں۔ وہاں صرف ایک رشتہ ہوتا ہے۔"

"کون سا؟" میں نے پوچھا

"اللہ اور عبد"

"مکہ شریف میں اللہ اور عبد ہوتے ہیں۔ مدینے شریف میں رسول اللہ اور اُمتی ہوتے ہیں"

"وہاں بزرگ نہیں جاتے کیا؟"

"جاتے ہیں"

"تو پھر؟"

"مسجد میں داخل ہونے سے پہلے سب کو جوتوں کے ساتھ مرتبہ اور بزرگی کے عمامے بھی اُتار دینے پڑتے ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ واپسی پر اس کا عمامہ اسے مل جائے گا۔"

"پھر تو مرتبے والے بزرگ فکرمند رہتے ہوں گے۔ عام بندے مزے میں ہوں

گئے۔ اس فکر سے آزاد"۔

"ہاں۔" وہ بولے

"آپ کو کیسے پتہ ہے"

"اقبال نے جو بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔"

"اقبال کو پتہ تھا؟"

"ہاں۔"

"کیسے پتہ تھا؟"

"وہ صاحب نظر تھے۔"

"کیا وہ اللہ اور عبد کے تعلق سے واقف تھے؟"

"ہاں۔"

دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے اللہ اور اس کے رسول کا مجھ سے گہرا تعلق ہو۔ میرے دل سے منہ زبانی مسلمان ہونے کا کانٹا نکل گیا۔ میرے بند بند میں ایک نیا نشہ ابھرا۔ میں عبد ہوں۔ عبد ہوں۔ میرا خالق مجھے بلا رہا ہے۔ میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ حج کرنے نہیں، اپنے اللہ کو سلام کرنے کے لیئے۔ اپنے خالق کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کہ اس نے مجھے بنایا کہ جیسا میں ہوں۔ میں جاؤں گا اپنے اللہ کو منانے کے لیئے جاؤں گا۔ یہی عبدیت کی غایت ہے کہ بنانے والے کو منایا جائے۔

کمرے پر خاموشی طاری تھی۔ اس سنسان کوٹھی کے درختوں کی شاخیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ دور کوئی جھکی چلا رہی تھی۔

"عبدہٗ ہو۔ رسولہٗ ہو۔ عبدہٗ ہو۔ رسولہٗ ہو ▲▲

سید قطبؒ

ترجمہ: ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری

کیا ادب مر گیا ہے؟

[سید قطب شہید (۱۹۰٦ء — ۱۹٦٦ء) کا شمار اُن بیباک مصری شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کی تحریریں اپنے اندر انسانی زندگی کی اعلیٰ اقدار کا پیغام رکھتی ہیں اور جو سلاست، روانی اور اثر انگیزی کے ساتھ ساتھ مقصدیت، استحکام، اعتماد اور فکری ربط کی بھی بہترین مثال ہیں۔ حریتِ فکر اور ادبی اخلاص کے سہارے انھوں نے تقلید سے ہٹ کر اپنی راہ الگ بنائی۔ قلم کی پختگی، فکر کی وسعت اور حق گوئی ان کی تحریروں کی وہ صفات ہیں جن کی بنیاد پر انھوں نے ادب کو ثقافت سے مربوط کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اولاً وہ ایک ادیب کی حیثیت سے ابھرے لیکن فکری ارتقا نے ان کی شخصیت کو ہمہ جہتی منہج کی راہ دکھائی تو ان کے موضوعات میں بھی تنوع آتا گیا چنانچہ وہ ایک انقلابی مفکر، ایک وسیع النظر سیاسی و اجتماعی ناقد، ایک بے باک صحافی، ایک ممتاز مفسرِ قرآن۔ الغرض مختلف و متعدد حیثیتوں سے قارئین کو متاثر کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے اسلوب کی رعنائیاں، رافعی کی روح اور عقاد کی گہرائی سب

سب کچھ نظر آتا ہے۔

ہم یہاں اُن کے ایک مضمون کی قسط اول کا اُردو ترجمہ نذر قارئین کر رہے ہیں یہ مضمون احمد حسن زیات کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "الرسالہ" کے تین شماروں میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ "هل الادب مات" (کیا ادب مر گیا ہے؟) کے عنوان سے انہوں نے پہلی قسط میں ادب کے تئیں ادباء و شعراء کی حقیقی ذمہ داریوں اور ادب کے ثقافتی و سماجی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسری قسط میں مصری وزارت تعلیم کی ذمہ داریوں اور نصاب تعلیم کے حوالے سے اس میں موجود مختلف خامیوں کو ادب کی بربادی کا سبب قرار دیا گیا ہے اور تیسری قسط میں مصری حکومت کے عام رویے سے ادب کو پہنچنے والے نقصانات پر گفتگو کی گئی ہے اگرچہ مجموعی طور پر اس تحریر میں مقامی اور وقتی مسائل کی بنیاد پر گفتگو کی گئی ہے لیکن اثنائے کلام میں ادب اور ادباء، ادب اور ثقافت ادب اور تعلیم، نیز ادب اور سماج جیسے موضوعات اور تہذیبی تبدیلیوں کے نتیجے میں ادب پر لگے ہوئے سوالیہ نشان کے سلسلے میں جو اشارے دیئے گئے ہیں ان سے یقیناً ہمارے اردو ادب کے طلبا بھی مستفید ہوں گے، کیوں کہ یہ مسائل محض کسی مخصوص زبان کے ادب کے نہیں بلکہ مطلق "ادب" کے ہیں۔

(مدیر: محمد صلاح الدین عمری)

اکثر حضرات اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ادب کی موت پر حسرت و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے پُر زور آہیں بھی بھرتے ہیں۔ موت کے شواہد گناتے ہیں۔ وفات کے مواقع کی نشان دہی کرتے ہیں اور ان دنوں کو کلماتِ خیر سے یاد کرتے ہیں جب ادب کو شہرت و مقبولیت حاصل تھی جب وہ حیات بھی تھا اور باعثِ حیات بھی۔

میں ادب سے موت کا الزام دھونے نہیں جا رہا، ممکن ہے یہ سچ ہی ہو، البتہ قاتلین جنھوں نے یہ مذموم فعل انجام دیا ہے اور جو ابھی بھی اپنی اسی روش پر قائم ہیں) کہ اس کے ڈھکے ہوئے مردہ جسم سے آتی جاتی آخری سانسوں کے رشتہ پلمو کو بھی منقطع کر دیں۔

میری نظر میں یہ تین قسم کے لوگ ہیں:

۱۔ خود ادبا، اپنی شخصی حیثیت اور اپنے مناصب و ذمّہ داریوں کے ساتھ ادب کی موت کے ذمّہ دار ہیں۔

۲۔ وزارتِ تعلیم کے تحت چلنے والے مصری اسکول بھی اس مذموم فعل میں برابر کے شریک ہیں۔

۳۔ وزارتِ مالیہ اور وزارت رسل و رسائل کے حوالے سے پوری مصری حکومت ادب کو فنا کرنے کے درپے ہے؟

۱۔ جہاں تک پہلی قسم یعنی ادبا کا سوال ہے ان سب کے سب یا ان میں سے بیشتر نے ادب اور ادبی عمل کے تئیں اخلاص سے اپنا دامن جھاڑ لیا ہے کیوں کہ اخلاص ان سے جہد و مشقت کا تقاضہ کرتا ہے۔ جبھی شہرت اور ادبی فوائد سے اجتناب

کی بات کرتا ہے اور ادب میں ندرت اور حسنِ عمل کے لیے عرق ریزی جانفشانی اور صبر و ثبات کا مطالبہ کرتا ہے۔ جب کہ حال یہ ہے کہ اکثر ادبا بالخصوص صفِ اول کے ادبا۔ کو جنگ اور زمانۂ جنگ میں ہونے والے نشر و اشاعت کے عمل نے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے اور اب وہ بازار میں تیز رفتاری سے تیار کی گئی ایسی پھسپھسی ادبی تخلیقات کے ساتھ ابل پڑے ہیں جو ان کو فوری مالی فوائد سے بھی فیض یاب کرتی ہیں، ان کو ادبی امانت اور تحقیق کی مشقت سے بھی چھٹکارا دلاتی ہیں اور ساتھ ہی عوام کی نظروں میں ان کی فہرستِ تخلیقات کی ضخامت بھی بڑھاتی ہیں۔

شروع میں تو ان ادبی تخلیقات کی کثرت پر عوام متوجہ ہوئے لیکن آہستہ آہستہ جب ادب میں تکرار و سطحیت کے اثرات بڑھنا شروع ہوئے ادبا معیار سے نیچے آنے لگے اور بغیر ہضم کیے ہی ادب کی جگالی کرنے لگے جس میں کوئی جدت تھی نہ ندرت، نہ ادب کی زندگی میں کوئی اضافہ تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی پیغام تو ان صفِ اول کے ادبا کی قلعی کھلنی شروع ہو گئی۔

دوسری صف کے بیشتر ادبا بھی صفِ اول کے مشہور ادبا کو ملنے والی شہرت کو دیکھ کر اس دوڑ میں شامل ہو گئے جس کے نتیجے میں راتوں رات پریس کی یہ حالت ہو گئی کہ صبح ہوتے ہوتے قارئین کے سروں پر کتابوں کی بارش ہونے لگی۔ ان راتوں رات تیار ہونے والی کتابوں میں چند ہی کام کی تھیں باقی سب لغو اور فضول۔

ابتدا میں چند قارئین اپنے مخصوص عربی مزاج کی وجہ سے اس صورتِ حال

پرچے نکلے اور ان کی ادبی پرکھ کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ پھر۔ سب نے دیکھا کہ ان کھوکھلے ادیبوں کی تکرار سے بھری اور اگلی ہوئی ادبی تخلیقات سے اعراض و بے توجہی اندھیر پورے ادب سے اعراض و اہمال اکثر قارئین کا وطیرہ بن گیا۔

اس میں ادبی تنقید کی سرگرمی ٹھہراؤ اور انجماد کو بھی شامل کر لیجئے۔ ایسی تنقید جو کھرے اور کھوٹے کو چھانٹتی ہے۔ صحیح وغلط کی پہچان قائم کرتی ہے اور ادبی ماحول میں بالیدگی اور توانائی، حرکت و نشاط، امنگ و حوصلہ، انتخاب و افکار اور پیش قدمی کی فضا پیدا کرتی ہے۔

اب تنقید کے نام پر محض کھلواڑ اور مضحکہ خیز ناکام کوششیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ چند ٹولیاں اور انجمنیں وجود میں آگئی ہیں۔ ہر ٹولی یا انجمن نے کسی نہ کسی کمپنی مصنوعات کے جھوٹے پروپگنڈا کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ان کمپنیوں سے اس کا تعلق انتہائی شرم ناک اور ایسے رسوا کن مرحلہ میں پہنچا ہوا ہے۔ قاری کا ذوق واضح طور پر اس کو محسوس کرتا ہے اور ادب ونقد کے نام پر ہر تحریر ہر گفتگو پر سے اس کا اعتماد یکسر ختم ہو چکا ہے۔

ان انجمنوں کا دائرہ مجلات و جرائد تک وسیع ہوا تو ہر ایک نے کسی نہ کسی جریدے یا مجلّہ پر قبضہ جما لیا اور پھر۔ ایسی کسی کتاب کے لیے ان مجلات و جرائد کے صفحات میں کوئی جگہ نہ رہی جس کا مصنف اس مخصوص گروپ سے وابستہ نہ ہو۔ اس طرح اس گروپ بندی کی بلا نے تنقید و ادب دونوں کو یکساں طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

طرفہ تماشا یہ کہ۔ جیسا کہ ابھی حال ہی میں سننے میں آیا ہے۔ ان مجلات و

جرائد میں حصہ دار مؤلفین و ناشرین اس بات کو قطعی جائز نہیں سمجھتے کہ یہ مجلات جرائد ان کی تالیفات کی حمد و ثنا کے علاوہ بھی کچھ چھاپیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی صاحب ۔۔ جو کسی مجلہ میں مالی حصہ دار تھے، نے مجلّہ کے خلاف اپنے سخت غصّہ اور احتجاج کا مظاہرہ کیا کیوں کہ اس میں ان کی کسی غیر معیاری تالیف پر تنقید چھپ گئی تھی۔

یوں یہ ادبی مجلات و جرائد۔ اس حیثیت سے اپنے حصہ داروں اور مالک کے لیئے اشتہار و پروپیگنڈا دفتروں میں بدل گئے ہیں۔ اب قارئین کے پاس اس کے علاوہ کیا چارہ رہ جاتا ہے کہ اس کا احساس کرنے کے بعد وہ ان ادبی مجلات و جرائد، ادب اور ادبا سے اپنی نفرت کا مظاہرہ کریں۔

مزید براں اکثر ادبا امت کی زندگی کی بقا اور جدّ و جہد سے بھی دستبردار ہو گئے ہیں، بلکہ وہ امت سے کھلی ہوئی اور واضح خیانت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

میں ادب و ادبا کو کسی محدود عرصے کی سماجی کش مکش اور فوری اغراض و مقاصد سے لیس کرنے پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس پر ضرور یقین رکھتا ہوں کہ وہ ادیب جو اپنی قوم کے قریبی آلام و مصائب اور دور کے مسائل و مشکلات کو محسوس نہیں کرتا، وہ مردہ ادیب ہے اور زندوں سے اس کی کوئی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ اگر ادب موجودہ کش مکش میں حصہ لینے کے قابل نہیں، یا نہیں لینا تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس پر لازم ہے کہ وہ انسانیت کے ان اعلیٰ اغراض و مقاصد اور دور رس اشواق کی پرجوش دعوت دے جو موجودہ نسل کو وقتی کش مکش سے پرے آفاقی مقاصد کی راہ دکھائے۔

میں اپنے مخصوص تجربات کی وجہ سے سمجھتا ہوں کہ عوام دو قسم کی تخلیقات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

پہلی قسم وہ عوام کی جد وجہد میں ان کی ہمنوا ہوتی ہے، عوام سے مدد کی طلب گار بھی ہوتی ہے اوران کی مددرساں بھی ہوتی ہے اور اس کشمکش میں عوام کی فوری ضرورتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔

دوسری قسم وہ جو عوام کے روبرو مستقبل کی امیدوں اور توقعات کے نغمے چھیڑتی ہے، اعلیٰ انسانیت کے مدارج و مراتب کی دعوت دیتی ہے اور تاریکی میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ دلچسپی اُمت کی فطری وشعوری صحت مندی کی علامت ہے اگرچہ اس اُمت کے قارئین کی تعداد خاصی کم ہے اور وہ اس گھٹیا، تکرار زدہ اور بے جان ادب کے اس ڈھیر سے بے توجہی اور اعراض میں حق بجانب ہے جو اد با و مؤلفین، بالخصوص جو کبھی عظیم ادبا و مؤلفین میں شمار ہوتے تھے کی جانب سے ان کے سامنے آتا ہے۔

میں عوام میں مخرب اخلاق ناولوں، حیاسوز افسانوں، فحش فلموں اور ردی صحافت کی مقبولیت و مانگ سے بھی غافل نہیں ہوں۔ یہ رنگ انسانی نفس کے پست پہلو کو غذا فراہم کرتا ہے۔ بشریت کے دو رُخ ہوتے ہیں اور اس کو بلندی کے دھاگے سے اُوپر کھینچنا بھی اسی طرح ممکن ہے جس طرح پستی کے دھاگے سے نیچے کھینچنا۔

جب مخلص اور سنجیدہ ادبا اقوام کو روحانی غذا کی فراہمی اور عصری ضرورت کو

تکمیل نہیں کریں گے تو لازماً وہ ان محند افکار کے نشے میں غرق ہو جائیں گی ناولیں، افسانے اور قلمیں پیش کرتی ہیں۔

بے چاری شاعری کو تو بھول ہی گیا۔ اشاعتی اداروں نے اِدھر چند برس میں شاعری کا کوئی معمولی انبار نہیں لگایا ہے۔ اس انبار کی ضخامت اور رد شعراء کو بڑا فخر بھی ہے جس کے ذریعے یہ شعراء بڑی بے حیائی اور ڈھٹائی سے اپنے وسائل و ذرائع اور وفاداریوں کا استعمال کر کے عوام سے بغاوت پر آمادہ آتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست نے ایسے ہی شعری دواوین میں سے ایک دیوان کو جو جسیم تو تھا لیکن معنویت کے لحاظ سے لغو اور بے جان تھا ہاتھوں الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا:

"پرانے زمانے میں "کام کا گدھا" بولتے تھے، اب ہم اس دور میں "شاعری کا گدھا" دیکھنے کے لیے زندہ ہیں۔"

یہ ایسے شعری دواوین ہیں جن میں ایسی ہی گھٹن کا احساس ہو جیسی کہ غمزدہ ماحول میں سانسوں میں ہوتی ہے اب اگر عوام ایسی شاعری ایسے شعراء کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کے دواوین کو پڑھنا تو درکنار دیکھنا نہیں چاہتے تو ان کا کیا قصور ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عرصے میں منظرِ عام پر آنے والے مقالوں، ناولوں، افسانوں اور دواوین و قصائد میں ایسی کاوشیں کم ہیں جو بقاء پذیرائی اور توجہ کے لائق ہوں۔

ان چند لائق پذیرائی ادبی نگارشات میں اکثر کو بجا طور پر عوامی مقبولیت اور خراج تحسین حاصل ہوا ہے لیکن بقیہ جن کے نصیب ایسے نہیں جاگے اور وہ عوام کی توجہ سے محروم رہیں، ان پر تنقید کی غفلت، ادبی ٹولیوں اور انجمنوں کی سازشوں اور قاری کا آج کی تنقید، صحافت اور اشاعتی اداروں سے سوء ظن کی دھند چھائی ہوئی ہے۔

اگر سنجیدہ ناقدین کمربستہ ہو جائیں اور ادبی صحافت کی جانب سے اس مکدر فضا کی منفی جرثوموں سے تطہیر کی ہمت افزائی بھی ہو تو ادبی تنقید کے تئیں قارئین کے اعتماد کو بحال کیا جا سکتا ہے۔ وہ اعتماد جس پر مختلف ٹولیوں اور انجمنوں نے شب خون مارا ہے

مجھے توقع ہے کہ "سالرسالہ" مخلص و جرأت مند ناقدین کی جانب سے آنے والی مخلصانہ اور غیر جانبدارانہ تنقید کے لیئے اپنے صفحات کو تنگ نہیں کرے گا یہ ہے قتلِ ادب کے جرم میں ادبار کا حصہ۔ جہاں تک اسکول اور وزارتِ تعلیم پھر وزارتِ مالیہ اور وزارتِ رسل و رسائل کے حوالے سے پورے ملک کے اس جرم میں ملوث ہونے کا سوال ہے۔ ان شاء اللہ عنقریب ان موضوعات پر بھی گفتگو کروں گا[1]

---

[1] "الرسالہ" (ہفتہ وار) شمارہ/ ۹۳۹، ۲ جولائی ۱۹۵۱ء

سید مجیب الرحمٰن
نہرو گنج کالونی۔ گلبرگہ

کچھ نئے دانشوروں سے

"عہدِ رفتہ کی سسکتی ہوئی تاریک شبو اک درخشندہ نئی صبح کے سواگت کیلئے نئے فانوس جلاؤ، نئے نغمے گاؤ۔ عہدِ ماضی کی ہر اک مردہ روایت کے عوض نئی قدروں کے اُجالے سے سرافشاں کرلو نئے سورج کی مسرت میں نئے جام پیو"

(مجیب)

نیا سال جہاں یہ پیغام دے رہا ہے کہ ہم نئے منصوبے بنائیں وہیں اس بات کی بھی دعوت دیتا ہے کہ ہم ماضی کے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کو بھی دیکھیں ہم کب تک نئے سال کی مسرت میں ماضی کی ناکامیوں کو فراموش کرسکیں گے کیا یہ ہماری دانشوری کے لیے چیلنج نہیں ہے۔

دانشور وہی کہلاتا ہے جو اپنی دانش کی مدد سے فطرت میں تسلسل، باقاعدہ ہم آہنگی اور ارتقاء کے اصول کو تلاش کرکے اپنی زندگی کی ابدی جمالیاتی پیاس کو بجھانے کے لئے نئے تجزیے کرے اور نئے وسائل حاصل کرے۔ تعجب ہے کہ جیسے جیسے

ہم ناکامیوں کی گھٹن سہہ رہے ہیں ویسے ویسے ہم اپنے از کار رفتہ ہتھیاروں سے خود کو آراستہ کر رہے ہیں۔ وسیع النظری کی بجائے تنگ نظری اور رجعت کو ہم گلے لگا رہے ہیں۔

آج جمہوری آزادیوں کی دہائی دے کر ہم زبان، کلچر، علاقہ، مذہب، فرقہ اور قوم کے نام پر انسانیت کو جزیروں میں بانٹ رہے ہیں اور اپنے ہی مفعولوں کی حاصل کردہ ناکامیوں کو دوسرے کے سر باندھنے میں ہم اپنی اعلیٰ یا شعوری کا ثبوت تلاش کرتے ہیں جب ہی تو آج کے دانشور اپنی سطح سے بہت نیچے آگئے ہیں اور ان کی باتوں میں مستقبل کی کامرانیوں کا کوسوں پتہ نہیں ہے یہ حالت نہ صرف ہمارے ملک کی ہے بلکہ ہر اس ملک کی ہے جہاں کے دانشور ماضی کے نظریاتی خانوں میں خود کو بند کر کے للکارتی ہوئی منزل کو نہیں دیکھ پاتے ہیں۔

سوویت یونین کے ماضی کے پس منظر کی داخلی ابتری اور خارجی سرمایہ کاری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی انقلابی پرولتار کے ہراول اور بین الاقوامی سماجی حصہ داری کو نظرانداز کر کے ہم اس ملک کی طرح درمیان کی ساری منزلیں طے کئے بغیر لسانی ریاستوں کے نسخہ کو قبول کرنے میں ترقی پسندی سمجھتے ہیں تو زبان واری تعصبات کے سوا ہمیں کیا حاصل ہو سکتا ہے جیسے جیسے ہم اپنی اپنی زبانوں کے خطرے میں ہونے کا ماتم کر رہے ہیں ویسے ویسے ہم ان زبانوں کے بولنے والوں کی حالت کو قابلِ زار بنا رہے ہیں۔ مہاراشٹرا میں مرہٹی ذریعہ تعلیم کا تجربہ کر کے ہم وہاں کے صنعتی کارخانوں اور ٹکنیکل اداروں میں ٹاملناڈو کے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھرتی کر کے دوسری زبان والے نو واردوں کے خلاف شیوسینا کھڑا کر رہے

ہیں اس کے جواب میں اب ٹاملناڈو بھی آگے آرہا ہے وہ بھی ٹامل کو نہ ص
ذریعہ تعلیم بنانے کا خواہاں ہے بلکہ دوسروں کو ٹامل سیکھنے پر مجبور کرنا اپنا جمہو
سمجھتا ہے ظاہر ہے اس سے وہ دن دور نہیں ہوگا جبکہ دلی سکریٹریٹ میں
ناڈو کے سرکاری افسروں کی جگہ لاہوریت جھانکے گی۔

اس دور میں اُردو کے سورما بھی کسی سے کم نہیں نظر آتے وہ بھی جگہ
کانفرنسیں کر رہے ہیں وہ اسرائیل کی طرح اُردو کے لئے علاقہ، زمین اور
مانگ رہے ہیں اِس پس منظر میں مجھے سابق وزیر تعلیم حکومت میسور جو
انالاؤ گن مکھی کی ایک جگہ اُردو کانفرنس کی مخالفت یاد آرہی ہے جس میں
نے کہا تھا "ہم نے پاکستان کو زمین دی ہے زبان نہیں دی ہے۔ اُر
خالص ہندوستانی زبان ہے۔"

یہ کیسا طنز ہے کہ آج ہم چاند کو پہونچنے کے دور میں بھی زبان
زمین کی طرح تنگ سمجھ رہے ہیں دوگز زمین کی بھیک مانگ رہے ہیں ہمار
سامنے اُردو کی طرح بین الاقوامیت کا مزاج رکھنے والی ایک اور زبان ان
ہے انگریزوں نے آج تک نہیں کہا کہ انگریزی کا وطن انگلستان ہے کیو
وہ جانتے ہیں کہ زبان انسانی تہذیب کا عطیہ ہے وہ عوام کی مِلک ہے
کے سارے عوام کی جب ہی تو انگریزی نہ صرف انگلستان کی زبان ہے
امریکہ، آسٹریلیا اور دنیا کے کئی ممالک میں لوگوں کی اعلیٰ افکار کے اظ
کا ذریعہ ہے۔

بعض دانشور یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ اُردو مسلمانوں ہی کی تہذ

یسی، ہندو، سکھ اور عیسائیوں کی بھی زبان ہے یہ ایسی ہی بات
جیسے کوئی غالب کی اندھی محبت میں دوسروں کے عقائد کا لحاظ کیے
یہ دل آزار بات کہہ دے کہ "غالب کا دیوان مقدس وید کی طرح
نہ ہے۔" اس طرح ہم مقدس وید و برگزیدہ کو ہی خطرے میں نہیں
رہے ہیں بلکہ دنیا کی ساری مقدس کتابوں کی تضحیک کا سامان مہیا
ہے ہیں۔

اردو یقیناً شمالی وسطی اور دکنی ہندوستان کے مسلمانوں کی مادری
ہے اس میں شرم کی کیا بات ہے بلکہ قابل فخر بات تو یہ ہے کہ ان
زبان ہندوستان کی بہت سی قومیتوں کے علیحدہ علیحدہ مادری
رکھنے کے باوجود ان کے بیچ میں ایک رابطہ کی زبان کی حیثیت رکھتی
ی طرح جس طرح انگریزی الگ الگ زبان والوں کے بیچ میں بین
جی واسطہ کا درجہ رکھتی ہے۔
پھر کسی چیز کی کسی فرد سے ملکیت کی بنیاد پر وابستگی بھی کتنی کھوکھلی
ہے کسی نے خوب کہا ہے کہ بیوقوف لوگ خود کو تکلیف میں رکھ کر مکان
تے ہیں اور اس کی ملکیت کے دستاویزات سنبھالنے گندہ طبینوں میں جا
نے ہیں اور ان کے عالیشان کرایہ کے مکانوں میں عقل مند لوگ رہتے ہیں
رہے کہ دنیا کے سارے عالیشان مکان ساری عالیشان تہذیبی قدریں زبانیں
ان سب کا ہے۔ جو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پسماندہ لوگوں کا ان
ئی علاقہ نہیں اس طرح جس طرح کشمیر کی حسین وادیاں کشمیر کی صدیوں کی

غربت کا مذاق اڑاتی ہیں اور باہر سے آنے والے لطف اندوز ہونے والے زائرین کا سواگت کرتی ہیں۔

زندگی کی اُمنگ حسن ہے اور حسن کی انتہا مطلق حقیقت بنتا ہے اور جو چیز اضافت سے مطلق کا رشتہ ڈھونڈے وہ طاقت چاہتی ہے اور یہ ساری طاقتیں عورت کے نازک ہاتھوں سے گوندھے جانے والے آٹے کی روٹی میں پنہاں ہیں اس لئے زندگی یا حسن اور طاقت کے حصول کی ساری جدوجہد سماج کو خوشحال بنانے کی جدوجہد میں مضمر ہے جو دا تصور نہیں بلکہ اس کا کارٹون ہے۔

آرٹسٹ کا کام بنیادی طور پر جمالیاتی تسکین حاصل کرنے کا کام ہے اور اس وقت تک جمالیاتی تسکین حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ ہمیں پیٹ بھر کھانا نہ ملے تو گویا آج کی دنیا کے سامنے دو طرح کی گھٹیں ہیں روٹی کے حصول کی بھوک اور محبت کے حسن کی لگن جو ممالک صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں مگر سماجی اونچ نیچ کے شکار ہیں ان کا غم یہ ہے کہ ان کے محبوب کو سماج میں اونچا درجہ رکھنے والے ہڑپ کر جاتے ہیں اور ہمارے جیسے غریب ملکوں کے سامنے دونوں کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں ایک خوشحال اونچ نیچ نہ رکھنے والے سماج کی تعمیر کرنی ہوگی اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ملک میں بڑے پیمانے پر صنعتیں قائم نہ ہوں زرعی صنعت اور سٹہ بازی کی تجارت ایک پچھڑی ہوئی حیثیت کی علامت ہے اس لئے اس اعلیٰ مقصد کے لئے اس معاشرے کالے روپیہ کو سرمایہ کاری میں مشغول ہونے کی اجازت دی جانی

اہیئے جو ہندوستانی عوام کو لوٹ کھسوٹ کر کمایا گیا ہے۔ دانشوروں کی
راست اور دانائی اسی میں ہو گی کہ ملک کی خوشحالی کی جدوجہد میں سارے
بقوں کو آزادانہ طور پر حصہ لینے دیا جائے تاکہ بے خطر طور پر زمین اور دولت
ے کارخانوں کے قیام میں لگ جائے انھیں قومیا نے کا سوال تو اُس
ت پیدا ہوگا جب کہ سرمایہ دار سماج کی خدمت کرنے میں سستی اور رجعت
سند بن جائیں ایسی سرمایہ کاری سے پہلے قومیانے کا نعرہ گھوڑے کے سامنے
ڑی رکھنے کے مماثل اور نقصان رساں ہوگا۔ ہم بلاوجہ حکومت کے خلاف
دپگنڈہ کرتے ہیں کہ جیسے ہم خود کوئی علیحدہ سیاسی حل رکھتے ہوں دراصل
اری حکومتیں وہی کچھ کر رہی ہیں جو ہم چاہتے ہیں ہم مختلف سیاسی پارٹیوں
رماننے والے عام لوگوں نے بھی نعرہ لگایا تھا کہ بینکوں کو قومیایا جائے۔
لک سیکٹر کو بڑھایا جائے اور خانگی شعبہ کو گھٹایا جائے (گلبرگہ کی ٹکسٹائیل
لو) حکومت کے تحت لیا جائے اب پھر شکایت کیسی؟ گھوڑے کے آگے
ڑی لگانے کا پھل تو ہمیں ہی بھوگنا ہوگا ہماری ساری سیاسی سوجھ بوجھ قابل
بر اس نہیں ہے ہم پانچ سال تک جن کے خلاف بولتے پھرتے ہیں الکشن آتے ہی
نکی تائید میں کام کرنے لگتے ہیں پھر رنگ میں بھنگ ملانے کے لئے ہم اُردو
بان کے بولنے والوں کے مسائل کو اُردو زبان کے مسائل کی طرح پیش کرتے ہیں
الانکہ یہ صحیح نہیں ہے بات سچ تو یہ ہے کہ یہ بڑی صنعتوں کے قیام کے مطالبہ
بجائے اپنے روزگار کے لئے کالج کھلوانا چاہتے ہیں تاکہ ہم سب لکچرار بن
ائیں یا یہ نہیں تو اخبار نویس بن جائیں ہمارے اُردو اخبار اور ہمارے اُردو کالج

چلانے کے لئے ہم اُردو کے خطرے میں گھرنے کی آواز بلند کرتے
حالانکہ روز بروز اُردو کی مقبولیت بڑھتی جارہی ہے اور اب
کی زبان ہے۔ لتا منگیشکر کی آواز ہے اُردو بولنے والوں کی
کا تعلق اُردو کے مسائل سے بالکل نہیں ہے بے روزگاری تو
مسئلہ ہے جس زبان میں علمی اثاثہ ہے اور زندگی کی صلاحیت ہے عبرا
سنسکرت زبان کی طرح صدیوں تک ترو تازہ رہ سکتی ہے آج کے
سے ٹکنیکل سطح پر یہ شکایت ہے کہ وہ یا تو محبوب کی زلفوں میں ہی پھنسے
ہیں یا خود علامتی کے شکار ہو گئے ہیں یا فلموں میں بوسہ بازی کے خلاف
جنسی گندگیوں کے ڈھونڈے اظہار میں شاہکار ڈھونڈتے ہیں
ہی انتہا پسندیاں ہیں درمیانی بات تو یہ ہے کہ وہ ساری باتیں
اظہار کو سماج مطعون ٹھہراتا ہے اور جوان کے لئے بھدی اور ناقابل قبو
انھیں کو جب سماجی بنایا جاتا ہے تو وہ قبول ترین شاہکار بن جاتی ہیں
شاہکار وہ شئے ہے جو سماجی طور پر ناگوار حقائق کو سب کے لئے دلکش
اور قابل فہم حقیقت میں تبدیل کیا جائے۔

اس لئے نئی نسل کے دانشوروں کو تعصبات کی ان ساری حدود
کر ایک ایسا پاک آرٹ دینا ہوگا جو فلموں میں بوسے کی بات
اور نہ بلاوجہ جامہ سے باہر ہونے کو انقلاب سمجھے اور جو جمالیاتی تسکین
صحت مند عریاں وہی چیز ہو سکتی ہے جو سب کے لئے دلکش ہو اور
آسودگی فراہم کرے۔ بے غرضی۔ بے خوفی اور انکساری دنیا کے سارے

طرح تخلیقی کاموں کے لئے بھی زرین اصول ہیں جو ادیب اور فن کار زمانہ کو بدلنے کی ہمت نہیں رکھتے وہ اس سے ڈر کر اپنی ایک ادا سے خود کو ہی سماج کی بدلی ہوئی تصویر کی علامت بنا لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک جری فن کار سماج کی ایک ایک نا انصافی اور برائی کو شعور میں محفوظ رکھ کر اپنے آرٹ اور فن کو ان کے خلاف ہتھیار کی طرح استعمال کرتا ہے اس طرح خود علامتی مایوسی اور حرمان نصیبی کی مثال بنتی ہے جبکہ علامت پسندی صحت اور جراءت کی۔

کروشئے کے مطابق فن کاری ایک وجدانی عمل ہے اس لئے ایک ادیب اور فن کار جتنا تنہا ہوگا اتنا ہی وہ زیادہ تخلیقی کام کر سکے گا۔ مگر یہ کہ وجدان بھی مشاہدہ اور سماجی عمل کا بھوکا ہے۔ اس لئے ایک دانشور آدمی کی طرح اجتماعی سماجی کاموں سے فیضان حاصل کر کے پھر تنہا ہو جاتا ہے تخلیقی کام کر سکتا ہے اس لئے فن کاروں کی تنظیم کا عمل ایک محدود کام ہی کر سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر فن کاروں کی تنظیم فن کاروں کو سماجی فیضان مہیا کرنے کی بجائے محتسب اور منتظم کا رول ادا کرنے لگے تو فن کار اور جمہوریت میں آپس میں ٹکراؤ پیدا ہوگا۔

آخر میں فن کار اور جمہوریت کے بارے میں مجھے زیادہ عرض کرنا نہیں ہے کیونکہ فرانسیسی انقلاب کے رہنما والیٹر کا نعرہ ہر با ہمت دانشور کے لئے ہمیشہ مینارۂ نور ہوگا۔

"تم جو کہتے ہو میں اس کا مخالف ہوں مگر تمہارے اس حق کی کہ تم میرے

خیالات کی مخالفت کرو، میں آخری قطرۂ خون تک حفاظت کر
تو گویا فن کار کی راحت اسی جدوجہد میں پنہاں ہے کہ نہ صرف وہ
کے اظہار کی آزادی کے لئے لڑے بلکہ وہ دوسروں کو بھی اس پر
کرنے کی آزادی دے۔

فن کار کی اولین وفاداری اس کی ذات سے ہوتی ہے۔ ذ
ایک مقناطیس ہے تو اس کے ایک سرے پر صفات ہوتی
دوسرے سرے پر اس کی ماورائیت۔ جب تک صفات اپنی
سے وابستہ رہیں گی فن کار کسی اسٹیٹ، کسی پروپگنڈہ یا کسی
شکار نہیں ہوگا۔ مگر عملاً ایسا بھی ہوتا ہے کہ صفات کی ماور
ذات کی منزل کو پانے کی دھن میں فن کار منزل کے راستے کو ہی م
لگتا ہے۔ اس موڑ پر اس کا مذہب، اس کا عقیدہ اور اس کی پا
کے لئے افیون کا کام کرتی ہے۔

فن کار آزادی اور انقلاب کا رکھوالا ہے۔ اور جو فن کار مذہ
اور پارٹی کے افیون کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کو بھول جات
مرحوم فن کار کہلاتا ہے۔

شاداب آپ کا اپنا پرچہ ہے

خود پڑھیئے اور اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کرو

پریس انفارمیشن بیورو
گورنمنٹ آف انڈیا۔ (حیدرآباد)

اٹلانٹا اولمپکس

اتھینس سے اٹلانٹا تک۔ پینسلوانیہ پادری کے پُرجوش سنہری الفاظ کہ "اہم چیز کامیابی نہیں بلکہ شرکت کرنا ہے"۔ ٹھیک اسی طرح زندگی میں فتح پانا ضروری نہیں ہے بلکہ پورے جوش و جذبہ کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حوصلہ کھیل کود میں حصہ لینے والی اور حصہ لینے والی دو نسلوں میں اس جذبہ کی شمع کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوسکتا۔ اس طرح کھیل کود کی عصری روایات کے ساتھ اولمپک کی صدسالہ تقاریب اس جذبہ کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے جو ان کھیلوں کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔

اولمپکس کی ابتداء | اولمپکس کی ابتداء ماقبل تاریخ کے دور میں ہوئی اور سب سے پہلے یہ گیمس اولمپیا میں دیوتاؤں خاص طور پر "ZEHS" کے اعزاز میں منعقد ہوئے جنھیں دیوتاؤں کا سردار سمجھا جاتا تھا اور جس کی شناخت سیارہ مشتری سے ہوتی تھی۔ ان تقاریب کو صرف کھیل کی حد تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ ان فیسٹول میں ادب، فنون لطیفہ، ڈرامہ، موسیقی اور جمناسٹک کو بھی شامل کیا گیا۔ سب سے پہلے اولمپکس گیمس جن کا دستاویزی ریکارڈ موجود ہے وہ ۷۷۶ قبل مسیح میں سلطنت ایلیس کے میدانوں میں منعقد ہوئے جو دریائے الفیس اور ماؤنٹ کرونین کے درمیان دریائے جونسن کے قریب واقع ہیں۔

موجودہ اولمپکس اولمپکس گیمس تقریباً (۱۵۰۰) سال تک منعقد نہیں ہوئے اور اس طویل عرصہ تک میدانوں سے غائب رہنے کے بعد یونان نے ایوان چیلیز راپر نے ۱۸۵۰ء میں ان کے دوبارہ احیاء کے لئے خود کو وقف کر دیا تاہم اس کی تمام کوششیں رائیگاں ہوگئیں۔ لیکن فرانس کے پیری ڈی کیوبرٹس نے عمری کی سرپرستی کی اور ۱۸۹۶ء میں ایتھنس میں ان کا انعقاد عمل میں لایا۔

اولمپک پرچم اولمپک کا پرچم پانچ دائرہ پر مشتمل ہے۔ جو ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں جس سے پانچ براعظموں اور عالمی سطح پر کھیل کود کی خیرسگالی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہ پرچم اگرچہ کہ (۱۹۱۳) میں تیار کیا گیا۔ تاہم پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء میں انٹورپ اولمپکس میں اس پرچم کو لہرایا گیا چونکہ ۱۹۱۶ء میں اولمپکس منعقد نہیں کئے گئے تھے۔ اولمپک مشعل جو کہ قدیم اور موجودہ کھیل کود کے درمیان سلسلہ کی علامت ہے۔ ۱۹۲۸ء میں امیسٹرڈیم گیمس تقاریب میں روشن کی گئی تھی۔ جبکہ برلن اولمپکس ۱۹۳۶ء میں مشعل روشن کرنے کا عصری طریقہ اپنایا گیا۔

اولمپکس اور ہندوستان ۱۹۲۷ء میں سر دراب ٹاٹا اور ڈاکٹر اے جی نوہار کی جانب سے انڈین اولمپک ایسوسی ایشن کی تشکیل کا مقصد کھیل کود کے رجحان کو فروغ تھا۔ اس کی تشکیل کے وقت نہ تو یہ خیال تھا کہ ہندوستان کا عالمی کھیل کود میں داخلہ ہو اور نہ یہ کہ میڈلس حاصل کرنا اس کا مقصد تھا۔ خاص طور پر اولمپک گیمس اور عام طور پر کھیل کود میں ہندوستان کا ریکارڈ ویسا نہیں تھا جیسا کہ ہونا چاہئے تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے سخت محنت کرنی ہے۔ ہمیں ان وسیع انسانی وسائل کو کام میں لانا ہے، جو خوابیدہ ہیں خاص طور پر ہمارے دیہاتوں میں بسنے والوں کو بہتر سہولتیں اور

(سلسلہ صفحہ ۵۴ پر)

ماہنامہ

شاداب

جلد ۱۲
شمارہ ۱۱
قیمت ۶ روپے

نومبر ۱۹۹۶ء

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	۶۵ روپے	۲ سال	۱۲۰ روپے	تاحیات	۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	〃	۲۰۰ 〃	〃	۳۶۰ 〃	〃	۳۷۰۰ 〃
امریکہ	〃	۴۰ ڈالر	〃	۷۰ ڈالر	〃	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	〃	۲۵ پونڈ	〃	۴۵ پونڈ	〃	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	〃	۱۷۵ پاکستانی روپے	〃	۳۰۰ روپے	〃	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد اے پی سے جاری کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

قرآنِ کریم میں عورتوں کا ذکر

ذیل کا مضمون حضرت مولانا مدظلہ العالی کی وہ اہم تقریر ہے جو ۱۴ ستمبر ۹۶ء کو مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ کے جلسہ میں جس میں طالبات کے علاوہ خواتین کی بہت بڑ تھی فرمائی۔ حضرت مولانا نے قرآن کریم میں عورتوں کو جو درجہ دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ساتھ عورتوں کو جو مرتبہ عطا کیا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو فرماتے ہوئے خواتین اسلام کے علمی کارناموں اور دینی خدمات پہ روشنی ڈالی اور فرمایا کہ خواتین خدمتِ اسلام اور اصلاحِ معاشرہ میں کیا اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔ (ادارہ)

حمد و ثنا کے بعد ذیل کی آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۃ نحل ۹۷)

حضرات! قاری صاحب نے جو آیت تلاوت کی ہے وہ ذہن کو بہت متوجہ کرنے والی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے عمل صالح کے تذکرہ میں مرد اور عورت کا الگ الگ تذکرہ کرتے ہوئے توجہ دلائی ہے اس طرح عورت کو بھی اسی توجہ کا مستحق دکھایا ہے جس کا مرد کو، اور عملِ صالح کا جو فائدہ بتایا وہ عظیم ہے عملِ صالح کا فائدہ ہونا تو سب کو معلوم ہے اور اس کا ذکر بھی سب کرتے ہیں لیکن اس آیت میں یہ فائدہ بتایا گیا وہ اپنی خاص نوعیت اور اہمیت رکھتا ہے جو بہت اہم ہے لیکن اس کی طرف

اس آیت کے پڑھنے والوں کا ذہن عموماً کم گیا ہے گذشتہ زمانے سے لے کر اس وقت تک کتنے حفاظ گزرے ہیں اور حافظوں کو قرآن حفظ یاد ہے اور ہوگا اور عالموں نے اس کی تفسیر کی ہے لیکن بہت کم اس پر غور کرنے کی نوبت آئی کہ اس میں کتنی بڑی بشارت سنائی گئی ہے یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بھی نیک کام کرے گا (من یعمل من الصالحات) مرد ہو یا عورت (من ذکر أو انثی فلنحیینہ حیوۃً طیبۃ) ہم اس کو ضرور اچھی زندگی گزروائیں گے۔

یہ سب ساری دوڑ دھوپ دنیا میں جو ہو رہی ہے امریکہ سے لے کر انڈونیشیا تک ہماری اسلامی دنیا میں مراکش سے لے کر شمال افریقہ پھر یمن، انڈونیشیا اور ملیشیا تک سب کا یہ ہے کہ اچھی زندگی کیسے حاصل ہو، اس کے لئے کیا کوشش کی جائے اور اس کے کیا اسباب اور کیا ہیں اور کس طرح یہ دولت حاصل کی جائے، آپ دیکھیں گے کہ پرائمری اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک، یونیورسٹیوں کے بعد خاص مضمون کی بڑی بڑی جو یونیورسٹیاں، جامعات اور اکیڈمیاں یا جو غور و فکر کرنے کے لئے ہی بنائی اور قائم کی گئی ہیں اور بڑے بڑے مصنفین ہیں ان سب کا مشترک ہے وہ یہ کہ ایسی زندگی کیسے حاصل ہو یہاں تک کہ سیاست اور انتخابات اور جمہوریت یہ ساری چیزیں بھی اس کی معاون ہیں کم سے کم یہ کہ وہ اس کا اعلان کرتی ہیں کہ ہم اس کا راستہ دکھائیں رہنمائی کریں گے۔

اچھی زندگی کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک بہت بڑی بشارت سنائی ہے من یعمل من الصالحات جو اچھے کام کرے گا اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کے مطابق ہوں کام اللہ کی منشاء کے مطابق ہوں اس کے رسول کی منشاء و فرمان کے مطابق ہوں احکام کے مطابق ہوں پھر آخری آسمانی صحیفہ قرآن مجید کے مطابق ہوں تو ہم اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے اس میں دنیا کی زندگی بھی آجاتی ہے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس میں صرف آخرت کی بشارت دی گئی ہے حیوۃً طیبۃ جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں نکرہ لفظ ہے الحیوۃ الطیبۃ نہیں کہا گیا ہے فلنحیینہ حیوۃً طیبۃ ہم ہر طرح

اچھی زندگی اس کی گزر جائیں گے یہ ساری کوشش اس کی بات ہو رہی ہے یہ دوڑ دھوپ یہ محنتیں اور یہ راتوں کا جاگنا اور یہ کتابوں پر محنت کرنا، پرائمری سے لے کر یونیورسٹیوں تک پڑھنا اور پھر اس کے بعد ڈگریاں حاصل کرنا، کوئی انجینئرنگ کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کوئی ادب اور [illegible] کا راستہ اختیار کرتا ہے سب کا مشترک مقصد اور ہدف و نشانہ یہ ہے کہ اچھی زندگی حاصل ہو۔

اور کیا آدمی چاہتا ہے کہ بڑی تنخواہ ہو، رہنے کے لئے اچھی بڑی کوٹھی اور سواری کے لئے اعلیٰ درجہ کی موٹر اور ہوائی جہازوں پر سفر کرنا اور اس کے بعد سیاست میں آئے تو وزیر اعظم بن جانا اور پھر پارلیمنٹ کا ممبر بن جانا، سب اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہم آرام اور سکھ کی زندگی گذار سکیں اس کو سکھ کہتے ہیں یہ ایک عام لفظ ہے اور بہت وسیع کہ ہم سکھی ہوں دکھی نہ ہوں، ہم سکھ کی زندگی گذار سکیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی ضمانت لے لی ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ نیک عمل کرے ہمارے احکام کے مطابق اگر عمل ہوگا فلنحیینہ لام کے ساتھ کہا، جب کہنا ہوتا ہے عربی میں الیسا ضرور ہوگا الیسا ضرور کریں گے تو اس کو لنفعلن، لنذھبن، لنعلمن کے وزن استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حالانکہ اللہ کا قول، فرمانِ خداوندی ہے اس میں شک کیا ہو سکتا تھا لیکن ہمیں اطمینان دلانے کے لئے مردوں اور عورتوں کو اطمینان دلانے کے لئے کہا کہ ہم ضرور اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے اور کیا چاہیئے، دنیا میں یہ کس لئے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے کس لئے اپنی جانیں خطرے میں ڈالی جا رہی ہیں کس لئے مقابلے ہیں کس لئے یہ دوڑ دھوپ ہے سب اسی غرض سے کہ اچھی زندگی گزرے۔

اب اچھی زندگی کسی نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اچھی تنخواہ ہو حالانکہ اچھی تنخواہ میں اچھی زندگی [illegible] ہرگز نہیں۔ لاکھوں مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ اچھی بڑی تنخواہ ہے لیکن زندگی اچھی نہیں۔ [illegible] خراب ہے یا آپس میں نا اتفاقی ہے یا اطمینان قلبی نہیں ہے کوئی ڈر لگا ہوا ہے [illegible] ہے یا کوئی ایسا مرض ہو گیا ہے کوئی عارضہ ہو گیا ہے کچھ ہو گیا ہے، وہم ہونے لگا ہے یا [illegible] کی خرابی آ گئی ہے کہ بڑی تنخواہ بڑی کوٹھی، شاندار موٹر سب ہے اولاد ہے لیکن مزہ نہیں آ رہا ہے

زندگی میں۔

نعمت جس کو زندگی کی نعمت کہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہو رہی ہے تو یہ بات بہت سوچنے کی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو ہمارے احکام پر عمل کرے گا، ہماری شریعت پر عمل کرے گا، ہمارے رسول کے فرمانوں پر عمل کرے گا، نہ وہ یہ دیکھے گا کہ رسموں میں کیا ہوتا ہے نہ یہ دیکھے گا کہ کون سی چیز بڑے فخر کی سمجھی جاتی ہے، کس بات پر تعریفیں ہوتی ہیں، کس بات میں عزت ملتی ہے، کس بات میں دولت ملتی ہے کوئی اس کا خیال نہیں کرے گا کوئی اس کی فکر نہیں کرے گا صرف یہ کہے گا کہ اللہ اور اس کے رسول کا کیا حکم ہے شادی بیاہ کس طرح ہونا چاہیے، بچوں کی پرورش کیسے کرنی چاہیے گھر میں کس طرح کی زندگی رائج کرنی چاہیے، نمازوں کی پابندی ہو، پردہ ہو، حیا و شرم ہو ایک دوسرے کا احترام ہو، بڑے کو بڑا سمجھا جائے، چھوٹے پر شفقت کی جائے، غرور نہ ہو، تعلی نہ ہو، اسراف و فضول خرچی نہ ہو، ناجائز رسمیں نہ ہوں اور یہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے اللہ کو ناراض کرنا بالکل آسان سمجھا جائے یہ نہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ باتیں نہ ہوں گی تو ہم اس کو ضرور اچھی زندگی گزروائیں گے یعنی دنیا میں بھی اور اس کی ہزاروں نہیں لاکھوں مثالیں ہیں اگر آپ حدیث پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جن گھروں میں اور جن خاندانوں میں شریعت کی پابندی کی گئی، احکام اللہ اور احکام رسول پر عمل کیا گیا اور اسلامی زندگی کا جو نمونہ اور سانچہ ہے، اسلامی زندگی کا جو ماڈل ہے وہ اختیار کیا گیا، رسموں کو نہیں دیکھا گیا، رواج کو نہیں دیکھا گیا بلکہ یہ دیکھا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کیا ہیں، جن لوگوں، خاندانوں، برادریوں اور جن ملکوں اور جن معاشروں نے اور جس سوسائٹی نے اس پر عمل کیا اس کو اللہ نے دنیا میں جنت کی زندگی کا مزا چکھا دیا۔ اس میں شبہ نہیں ہم مبالغہ سے نہیں کہہ رہے ہیں، دنیا ہی میں ان کو جنت کی زندگی کا مزہ آ گیا کہ بس معلوم ہوتا تھا کہ ہم جنت میں ہیں۔ محبت کا دور دورہ ہے ایک دوسرے کا حق ادا کیا جاتا ہے، یہاں کسی کا حق مارا نہیں جاتا، کسی کو حقارت و ذلت

شاہ ولیب
یہ نظر نہیں دیکھا، کوئی فضولیات نہیں کی جاتی، کوئی ناجائز آمدنی باہر سے نہیں، بس اللہ پہ توکل اور اللہ کا نام لینا، پابندی کے ساتھ نماز پڑھنا، حلال روزی کمانا، حرام کا پیسہ کیا حرام کا لقمہ بھی گھر میں نہ آنے پائے، جن گھروں میں اس کی پابندی کی گئی ان کے گھر جنت کا نقشہ ہیں ان گھروں پر بادشاہوں کے محلات اور شاہوں کی کوٹھیاں قربان، ان کے سامنے ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی جیل خانہ ہے دیکھنے میں باہر سے کتنی شاندار کوٹھی ہے، بڑی بڑی دیواریں ہیں یہ سب ہے لیکن اندر جہنم کی زندگی ہے، بیوی اور شوہر میں محبت نہیں ہے، ماں بیٹے میں محبت نہیں ہے، نہ ماں میں وہ شفقت ہے نہ بیٹے میں وہ احترام ہے نہ کسی کمزور پر ترس آتا ہے نہ کسی غریب کی مدد کی جاتی ہے اور سوٹ کیس میں پیسے اور سوائے فخر و غرور کے اور دکھاوے کے نئے مظاہرہ کرنے کے کوئی اور یہاں کام ہی نہیں ہے۔

تو بھائیو اور بہنو! آپ اس بات کا خیال رکھیں اور یہ اللہ نے موقع دیا ہے کہ مرد عورت دونوں کوشش کر کے اور شریعت کے مطابق زندگی گزار کر اور اللہ کی فرمانبرداری کر کے اور اس کے رسول کی شریعت پر عمل کر کے وہ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں اور ترقیاں بھی کیا روحانی ترقی، یہ ہم خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہیں کہ ہم کتابیں لکھنے والے آدمی ہیں، ہم جو لکھتے ہیں اس کی تحقیق ہوتی ہے، اس کو پکڑا جاتا ہے اس پر سوال کیا جاتا ہے کہ یہ کیسے لکھ دیا؟ لہٰذا ہم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔

علمی دنیا میں عورتوں کی خدمات : ہم آپ کو خدا کی قسم کھا کر بتاتے ہیں کہ دین کے احکام پر عمل کرنے سے اور دین کا ضروری علم حاصل کرنے سے اسی پر عمل کرنے سے مستورات نے اسلامی تاریخ میں، اسلامی دنیا میں وہ وہ ترقیاں حاصل کی ہیں، روحانیت کے اس درجہ تک پہونچی ہیں جس درجہ تک اس زمانے میں ہزاروں نہیں لاکھوں مرد نہیں پہونچنے پائے۔ آج ہم آپ سے پوچھتے ہیں کیا حضرت رابعہ بصریہ کا نام آپ نے نہیں سنا کہ حضرت رابعہ بصریہ کون تھیں، ان کا نام آج لکھنؤ میں یہاں اس محلے میں لیا جا رہا ہے کہ ان کے زمانے کے ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی بھی

ان کے درجے کو نہیں پہونچے ہوں گے اور اس کے علاوہ تاریخ پڑھیں اور خود مستورات کی اور مسلمان فاضلات کی اور مسلمان ادیبات کی تاریخیں الگ الگ لکھی گئی ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حیثیت سے بھی ہماری بہنیں پرانے زمانے میں ایسے درجہ تک پہونچی ہیں کہ تاریخ میں نام آگئے بڑے بڑے اس زمانے کے علماء ان سے رجوع کرتے تھے اس وقت ہم ان کے نام نہیں گنا سکتے وہ بہت ہیں اور مجھے سب یاد بھی نہیں۔

اندلسی بغداد اور قاہرہ میں اور حرمین شریفین میں ایسی عورتیں تھیں کہ ان سے لوگ مسئلے پوچھنے جاتے تھے اور عربی لغت کی تحقیق کرنے جاتے تھے ان سے علمی استفادہ کے لئے جاتے تھے ان کے نام ہیں تاریخ کے اندر، ان کے شاگردوں کے نام ہیں کہ کیسے بڑے بڑے شاگرد ہوئے تو یہ دولت علم کی دولت مردوں کے ساتھ مخصوص نہیں، مرد و عورت دونوں کے لئے ہے۔

قرآن کریم میں مردوں کے ساتھ عورتوں کے ذکر کا اہتمام

ہم آپ سے ایک طالب علم اور عربی جاننے کی حیثیت سے کہتے ہیں کہ یہ صرف کہہ دینا ہوتا ہے کہ مرد و عورت سب کے سب درجے حاصل کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جب ذکر کرتا ہے ایسے مراتب کا تو مردوں کے لئے صیغہ الگ اور عورتوں کے لئے الگ ذکر کرتا ہے وانَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ اور ہر لفظ کے ساتھ ایک مرد کے لئے صیغہ ہے، ایک عورت کے لئے، کہنا چاہئے کہ یہی اتنا کہہ دیا کہ ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثیٰ وھو مومن نہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ عبادت کی یہ قسم صرف مردوں کے ساتھ مخصوص ہے عورت اس میں کوئی درجہ نہیں حاصل کر سکتی روزہ رکھنے میں ان کا ذکر ہے عبادت کرنے میں ان کا ذکر ہے اور اللہ کی یاد کرنے میں ان کا ذکر ہے والذاکرین اللّٰہ کثیراً والذاکرات اللہ کا ذکر کرنے میں الذاکرین مذکر صیغہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور مونث کا بھی۔ اس لئے کہ دوسرے مذاہب کی تاریخ ان کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہاں بہت سے کمالات اور بہت سی صفات صرف مردوں کے لئے مخصوص کر دی گئی

یہ بات دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی اور ایک بالکل بدیہی بات سمجھی جاتی تھی کہ یہ صرف مردوں
ہے عورت اس میں ہاتھ نہ لگائے، وہ ترقی نہیں کر سکتی ہے اس کو اس سے کوئی بڑا امتیاز
حاصل ہو سکتا ہے لیکن قرآن میں ایک ایک عبادت کے ساتھ، عبادت کی ایک ایک قسم کے
مردوں کے لئے الگ لفظ اور الگ صیغہ ہے اور عورتوں کے لئے الگ صیغہ ہے۔

ن مجید میں عورتوں کے ے مستقل ایک سورۃ

اور پھر دیکھئے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید کی بڑی سورتوں میں سے ایک سورۃ کا نام ہی عورتوں کے نام پر رکھا گیا ہے "سورۃ النساء" کیا ہندو مذہب
جاننے والا بتائے گا کہ اس کے مذہب میں اور اس کی کسی مقدس کتاب میں عورت کے نام سے
لکھا ہوا اس کے عنوان سے ذکر ہو۔ لیکن جہاں پر ایک سورۃ سورۃ بقرہ ہے، سورۃ آل عمران
پھر ساری سورتیں قرآن مجید کی ہیں وہیں ایک سورۃ النساء بھی ہے اور پہلے دن سے اس وقت
اس کا یہ نام چلا آرہا ہے اور یہ عورتوں کے لئے ہے، ترقی اور علم دین حاصل کرنے اور دین میں
اس میں امتیاز پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی
کرنے اور اس کے یہاں اونچا مقام حاصل کرنے اور اللہ کا مقبول بندی بننے کی پوری پوری
یت اور پورے امکانات اور پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک موجود ہیں اور آج
یسا ہو سکتا ہے۔

وستان میں عورتوں کی دینی خدمات

اور آپ حضرات ہندوستان ہی کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں کتنی بیویوں نے قرآن مجید کی تعلیم اور
ت کی ترویج اور بدعات کی تردید اور سنتوں کی اشاعت کا کام کیا ہے ایک شاہ ولی اللہ صاحبؒ
ان دیکھ لیجئے کہ وہاں ایسی بیبیاں گزری ہیں کہ جنھوں نے دہلی میں اور بعض مرتبہ دہلی کے باہر
ن کا فیض پہونچا اور کم سے کم یہ کیا کم بات تھی کہ ان کی آغوش تربیت میں ان کی گود میں شاہ
اور شہید پیدا ہوتے ہے۔ شاہ رفیع الدین پیدا ہوئے، شاہ عبدالعزیز پیدا ہوتے یہ کن کی گودوں میں

پیدا ہوئے تھے اور پھر ہمارے یہاں اودھ میں دیکھیے یہاں کیسی کیسی بیبیاں پیدا ہوئیں۔
میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلی میں پیدا ہوئے جن کے
متعلقات میں ہی نہیں بلکہ ان کا فیض سارے ہندوستان میں پہونچا ان کے ہاتھ پر ۳۰، ۴۰ ہزار
آدمی مسلمان ہوئے اور ۳۰ لاکھ کے قریب لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت اور توبہ کی۔ ان کے
حالات میں لکھا ہوا ہے دیکھنے اور سننے میں تو بہت ادنیٰ بات ہے کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان
کی والدہ صاحبہ نماز پڑھ رہی تھیں اور ان کی دائی بیٹھی ہوئی تھیں کہ ایک گھبرایا ہوا آدمی گھر
میں آیا گھر میں اس آدمی نے کہا کہ دو فریقوں میں فساد ہو گیا اور لڑائی ہو رہی ہے اور آپ کو
جہاد کے لئے دعوت دی، آپ تیار ہو گئے۔ ماشاء اللہ آپ جوان تھے اور بہت ورزشیں
کئے ہوئے اور تندرست بھی تھے پھر تھے دائی نے کہا نہیں نہیں، یہ نہیں جا سکتے۔ عمر ان کی اس
وقت شاید ۲۲، ۲۴ برس کی رہی ہوگی والدہ خوب سمجھتی اور جانتی تھیں کہ وہاں جا کر شہادت کی
خبر آسکتی ہے ہم ہیں بیٹھے ہیں کہ معلوم ہوا کہ شہید ہو گئے یا زخمی ہو کر وہاں سے واپس لائے جا رہے
ہیں تو دائی نے روک دیا اور والدہ صاحبہ نے جب سلام پھیرا۔ حیرت کی بات ہے انھوں نے کہا
کہ دائی تم نے کیوں روکا؟ تم نے اس سعادت سے کیوں محروم رکھا؟ ہمارے بیٹے کو جانے دینا چاہیئے
تھا یہ جہاد کا معاملہ تھا۔ اب آپ بتلائیے کہ کس درجہ کا یقین و ایمان ہوگا اس خاتون کے
اندر اور وہ علم دین سے کتنی واقف ہوں گی اور پھر کتنا اس کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ ہوگا کہ
اپنے بیٹے کو اس خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار اور دائی جس کا ایک عارضی خادمانہ رشتہ ہوتا ہے
وہ روکے مگر وہ دودھ پلانے والی اور اس کو وجود میں لانے والی شفیق ماں ہے کہے کہ نہیں ان کو
جانا چاہیئے تھا۔ ایسی سینکڑوں ہزاروں مثالیں آپ کو ملیں گی یہ سب کے بیان کرنے کا موقع
نہیں۔ آپ کو بہت سے ایسے ملیں گے انشاء اللہ، علماء، فضلاء اور دین کے داعی و خدمت
کرنے والے کہ ان سے آپ اگر پوچھیں کہ آپ کی یہ حالت کیسے ہوئی، آپ اس درجہ تک کیسے
پہونچے، آپ کی یہ سیرت کیسے بنی تو ان میں سے بہت سے یہ کہیں گے کہ ہماری ماں نے ایسی

بت کی تھی الغرض امید ہے کہ اس مجمع میں بھی ایسے لوگ بیٹھے ہوں گے جو اپنی ماں کے ممنون احسان ہوں گے اور ہم شہادت دے سکتے ہیں کہ ہمیں ہماری ماں نے جھوٹ بولنے سے روکا، ہماری نے ہم کو حق تلف کرنے سے، کسی پر زیادتی کرنے سے، کسی پر ہاتھ بڑھانے سے روکا، ہم ماں کو دیکھتے تھے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور ہمیں یاد ہم نے اپنی والدہ صاحبہ کو تہجد پڑھتے ہوئے دیکھا ہے معلوم ہوا کہ نماز تہجد نہیں چھوٹتی ہے ہم فخریہ نہیں کہتے لیکن عرض کرتے ہیں کہ ہمارے بچپن میں ہمارے چھوٹے سے خاندان میں چار پیسے ہوں گے تکیہ پر، یہ سوال کیا گیا کہ کیا عورتیں تراویح پڑھ سکتی ہیں، اور کیا عورتوں تراویح با جماعت ہو سکتی ہے تو علمائے فرنگی محل نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر عورت امام ہو اور عورتیں اس کی مقتدی ہوں تو جماعت کرنے میں کوئی حرج نہیں، چنانچہ ہماری والدہ صاحبہ مرحومہ ہماری خالہ اور بہن اور ہماری پھوپھی یہ سب قرآن مجید پڑھتی تھیں اور تراویح میں ایک ن مجید ہمارے گھر میں ختم ہو جاتا۔

اس کے علاوہ عورتوں میں مصنفات گزری ہیں اور ایسی بڑی بڑی بعض مصنفات کہ ان کی کتابیں علمی کتب خانے کی زینت ہیں اور بعض تو اس میں مردوں سے بھی بازی لے گئی ان سب کا ذکر کرنا اور پھر ایسے مجمع میں مشکل ہے۔

س ملک میں مسلمان بن کر رہنے کی آدھی ذمہ داری عورتوں پر ہے

ہم صاف کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس ملک میں مسلمان بن کر رہنا قرآن شریف پڑھنے کے قابل ہونا اردو کتابوں سے فائدہ اٹھانا، اسلامی شعائر و احکام سے واقف ہونا، اسلامی تہذیب اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا اور توحید کے عقیدے پر مضبوطی سے جمنا، اس میں آدھی سے زیادہ ذمہ داری ہماری بیٹیوں اور عورتوں پر ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہماری دینی تعلیمی کونسل اور قاضی جلیل عباسی صاحب مرحوم کو اور ہمارے ڈاکٹر اشتیاق صاحب کو، ان کی عمر میں صحت میں ترقی ہے کہ انھوں نے یہ بات گھر

سر پھوڑنے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت کچھ کوشش کرلی جائے کہ ہمارے بچے قرآن مجید پڑھنے کے قابل بن جائیں، قرآن مجید تو عربی میں لکھا ہے اسے پڑھ سکیں اور اُردو پڑھ سکیں، دینیات کی کتابوں سے فائدہ اٹھائیں اور شرک و توحید کا فرق سمجھیں، سنت و بدعت کا فرق سمجھیں اور گناہوں کو سمجھیں کہ کون کون سی چیزیں گناہ ہیں۔

ہماری پڑھی لکھی بہنوں کی ذمہ داری

اگر یہ نہ ہوا اور اس میں ہماری خواتین اور ہمارے گھر کی پڑھی لکھی دیندار بیبیوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور نہ ہی دلچسپی لی تو میں آپ سے صاف کہتا ہوں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ اس ملک میں مسلمان کا مسلمان رہنا مشکل ہوگا بلکہ یہ ملک اسپین بن جائے گا اور آج بتاتا ہوں آپ کو کہ یہ نقشہ اور منصوبہ تیار ہے کہ اس ملک کو اسپین بنا دیا جائے اور اسپین کیا ہے بہت سی بڑی بڑی بیبیاں نہیں جانتی ہوں گی کہ اسپین یورپ کا ایک ایسا ٹکڑا تھا جو کہ خالصۃً مسلمان ملک ہو گیا تھا، وہاں بڑی اسلامی شان و شوکت کی سلطنتیں قائم تھیں اور وہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ پیدا ہوئے، شیخ اکبر کہ جن کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے وہیں کے رہنے والے تھے، مالکی مذہب کا ایک مسئلہ ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مدینہ میں ایسا ہوا کرتا تھا تو اب کسی دلیل کی ضرورت نہیں، ان کا عمل حجت اور دلیل ہے۔

تاریخ میں لکھا ہے ایک زمانہ ایسا تھا کہ مالکیوں میں یہ ایک اصول بھی تھا کہ اہل قرطبہ عمل حجت ہے، اہل قرطبہ ایسا کرتے ہیں، اس کی اہمیت ایسی ہے کہ قرطبہ کے متعلق یہ کہہ دینا کافی تھا کہ وہاں ایسا ہوتا ہے۔ وہ اسپین کہ جہاں اولیاء اللہ پیدا ہوئے، چوٹی کے علماء، مؤطا کے شارحین پیدا ہوئے اور بڑے بڑے مجاہدین پیدا ہوئے اور پورے اسپین میں اسلامی حکومت تھی اور جامع قرطبہ اور جامع اشبیلیہ اور جامع غرناطہ کیسی کیسی مسجدیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس ملک کو وہاں کے غیر مسلم باشندوں نے منصوبہ بنا کر اور اس میں کچھ ہمارے مسلمانوں

کو سمجھ کو تایہ ماننی کر انھوں نے ان کو مانوس نہیں کیا تھا اس طرح وہاں سے غیر مسلموں نے اسلام کو خارج کر دیا، جو بچے کھچے مسلمان تھے وہ غرناطہ سے مراکش پہونچ گئے اور آج پورا اسپین خالی ہے نہ کہیں سے اذان کی آواز آتی ہے اور نہ کہیں کوئی مدرسہ ہے۔

ویسے لوگوں نے کہا ہے کہ ہم نے فضا سے آوازیں سنی ہیں اذان کی قرآن کی یہ نہیں پتہ چلتا ہے کہ کہاں سے آوازیں آرہی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ روحانی فضا سے آوازیں آرہی ہیں کہ کچھ اللہ کے مقبول بندوں نے قرآن پڑھا تھا۔ اللہ کے بندے جب ریکارڈ کر سکتے ہیں تو اللہ کیوں نہیں کر سکتا ہے تو اللہ نے اس کو ریکارڈ رکھا ہے اور ان کی آوازیں سب سن رہے ہیں اور ہم آپ سے کہتے ہیں کہ آج ساری کوشش جو ہو رہی ہے ندوۃ العلماء ہو یا جو بھی ہمارا خاص مدرسہ اور ادارہ ہو یا دارالعلوم دیوبند ہو، یا جامعہ ملیہ ہو یا مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہو اور بھی کوئی بڑا مدرسہ کالج ہو، یونیورسٹی ہو وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ہماری مستورات نے توجہ نہ کی تو ملک خطرہ میں ہے

مسلمان آئندہ مسلمان نسل کو مسلمان رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک ہمارے گھر کی مستورات بیگمات ہماری مائیں اور بہنیں اس کا ارادہ نہ کرلیں اور یہ طے نہ کرلیں کہ ہم اپنے بچوں کو دین سے واقف کرائیں گے، پرائمری اسکول میں جانا ضروری ہے جائیں لیکن ہم مغرب بعد انتظام کریں گے کسی کو بلائیں گے یا صبح جانے سے پہلے کوئی انتظام کریں گے۔ ان کو اردو پڑھائیے، ان کو اردو لکھنے کی مشق کرائیے ان کا کلمہ سن لیجئے یہ معلوم کر لیجئے کہ اتنی سورتیں ان کو یاد ہیں کہ نماز میں پڑھ سکیں؟ اگر اس کی طرف ہماری مستورات نے توجہ نہ کی تو ملک خطرہ میں ہے بس اس جلسہ کا ہم بھی بڑا فائدہ سمجھتے ہیں۔ اصل بات جو یہاں کہنے کی ہے اور میں اسے امانت کے طور پر چھوڑ کر جاتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے بچوں کی خود فکر کیجئے اپنے ہی گھروں کے نہیں اپنے محلے اور بہنوں، سہیلیوں اور رشتہ دار بیویوں کو بھی توجہ دلائیے کہ دیکھو بی بی، دیکھو بہن اپنے بچے کو جہاں چاہو بھیجو لیکن اس کو اللہ کا نام

سکھاؤ کہ اللہ ایک ہے وحدہٗ لاشریک ہے اور اللہ کے پیغمبر حضور آخری پیغمبرؐ ہیں۔ آج تو ایسی ترکیبیں کی جاتی ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ کہا جاتا ہے اگر تمہاری کوئی چیز گم جائے یا کوئی کام ہو یا تکلیف ہو تو راستہ میں مندر آئے گا اس سے گزرتے ہوئے اس سے مانگ لینا اور یہاں تک سازشیں ہوتی ہیں کہ کوئی چیز چھپا دی جاتی ہے۔ ایک طالب نے ایک طالب علم کی کتاب یا کاپی کہاں ہے۔ میری کاپی کہاں ہے اس نے کہا رام کا نام رام کا نام لو تو مل جائے گی۔ اس نے جو رام کا نام لیا تو اس نے جیب سے نکال کر سامنے کر دیا اس طرح اس کے دل میں یہ عقیدہ ڈال دیا کہ رام کا نام لینے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے کام ہو جاتا ہے کھوئی ہوئی چیز مل جاتی ہے یہ بڑی گہری اور بڑی وسیع سازش چل رہی ہے ہندوستان کے اندر جو اولیاء اللہ کی سرزمین ہے، یہ مجاہدین کی سرزمین ہے.
مجددین کی سرزمین ہے جہاں پر مجدد الف ثانیؒ پیدا ہوئے یا خواجہ معین الدین چشتیؒ آ یا شاہ ولی اللہ صاحبؒ جیسا امام وقت پیدا ہوا اور یہاں مولانا قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد علی صاحب مونگیری اور کیسے کیسے عالم، کیسے کیسے... فاضل ہوئے اس ملک کے بارے میں یہ نقشہ بنایا جا رہا ہے نقشہ بنا ہوا موجود ہے۔ نام محض رہ مسلمان رہے باقی کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیئے، آئندہ نسل جو ہو وہ بالکل اسلام سے ناواقف کر دیا جائے چاہے منکر نہ بنیں لیکن اسلام سے ناواقف کر دیا جائے بس یہ پیغام کر جائیے کہ اپنے گھروں میں پہلے اور پھر محلے میں اور پھر برادری میں کہیں اگر شادی بیاہ میں جانا ہو تو وہاں کہیں تقریب ہو تو وہاں جا کر کہیئے، وہاں بھی توجہ دلائیے کہ

بہنو! سن لو۔ بہنو! بیویوں سن لو اپنے بچوں کو مسلمان بناؤ۔ مسلمان رکھو! اردو پڑھنا سکھاؤ قرآنِ مجید پڑھنے کے قابل بناؤ، توحید ان کے دل میں بٹھاؤ، شرک و بدعت و بت پرستی سے ان سب چیزوں سے روکو، اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو توفیق دے اگر یہ کام ہو گیا تو اس میں بہت کچھ ضمانت ہے اسلام کے بقا اور تحفظ کی ورنہ محض خارجی اور تنظیمی کوششیں محض اخبارات و رسائل مفید ضرور ہیں بے شک مفید ہوں لیکن کافی نہیں ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

امام بخاری

محمد سلیم الثقفی

آپ کو بچپن ہی سے حدیث سے شغف تھا

اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کے مصنف حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکت سے کون واقف نہیں آپ کا شماران اہم نادر روزگار شخصیات میں ہوتا ہے جن کے احسان کے بارگراں سے امت اسلامیہ قیامت تک سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ بلاشبہ آپ کا مقام ومرتبہ دیگر تمام محدثین کے بارے میں بلند وبالا اور بلحاظ حافظہ ضبط واتقان، اجتہاد واستنباط، تحقیق وتدقیق میں آپ عدیم المثال ہیں آپ کی فوقیت وبرتری کا تسلیم شدہ ہے فی الحقیقت یہ خداوند قدوس کی کارفرمائی تھی جس نے اوائل عمر ہی سے آپ کا انتخاب حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمات جلیلہ کے لئے کرلیا تھا اور کم سنی ہی سے ایسی تربیت ونشوونما فرمائی کہ آپ اپنی خداداد صلاحیت ولیاقت سے فضل وکمال کے ان بلند مراتب سے فائز المرام ہوئے جس کے انکار کی جراُت ایک معاند وسرکش اور کج فہم ہی کرسکتا ہے۔

آپ کی پیدائش 13 شوال المکرم ۱۹۴ھ کو بعد نماز جمعہ شہر بخارا میں ہوئی۔ کم سنی ہی میں والد محترم کے سایہ سے محروم ہوگئے، لہٰذا والدہ محترمہ نے جو کہ بڑی عابدہ زاہدہ اور صالحہ سیدہ خاتون تھیں بڑی توجہ اور انہماک سے آپ کی تربیت وپرداخت کا فریضہ انجام دیا اور ابتدائی تعلیم وتربیت کا انتظام فرمایا جس سے آپ نے دس سال کی عمر ہی میں فراغت حاصل کرلی۔

امام بخاری کو صغر سنی ہی سے حدیث پاک سے کافی شغف اور لگاؤ تھا یہاں تک کہ آپ کی یہ عادت بن گئی تھی کہ آپ کو جہاں کہیں بھی حدیث کا کوئی ٹکڑا مل جاتا فوراً اس کو یاد کرلیتے تھے اسی کثرت اور تعلق کا نتیجہ تھا کہ صرف گیارہ سال کی عمر تک آپ نے بہت سارا احادیث کا مجموعہ اپنے سینہ ذہن میں محفوظ کرلیا تھا۔

آپ نے بخارا کے ممتاز شیوخ اور اکثر محدثین و احادیث سے استفادہ کیا جن میں عبداللہ بن محمد مسندی، ابراہیم بن الاشعث اور محمد بن سلام بیکندی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں یہ سلسلہ سولہ سال تک جاری رہا اس کے بعد پھر آپ نے اپنا پہلا سفر اپنی والدہ اور بھائی کی معیت میں حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ کے لئے کیا۔ مناسک حج کی ادائیگی کے بعد آپ کی والدہ اور بھائی تو وطن لوٹ آئے لیکن آپ کو مکہ کی فضا حصولِ علم کے لئے خوشگوار معلوم ہوئی لہٰذا حصولِ علم کے لئے آپ وہیں رہ گئے وہاں آپ نے ابو عبداللہ بن الزبیر، عبیداللہ بن یزید ابوالولید احمد بن الازرق اسماعیل بن مسلم وغیرہ ہم ارباب علم سے تحصیل علم کی پھر اس کے بعد ۲۱۲ ہجری میں بلدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے لئے عازم سفر ہوئے اور وہاں بھی آپ نے خود کو علم حدیث کے لئے وقف کر دیا گویا کہ آپ کی پوری زندگی تھی اور علم حدیث تھا۔ مدینہ منورہ میں آپ عبدالعزیز بن عبداللہ الاویسی، ابراہیم بن المنذر، مطرف بن عبداللہ، ابوثابت محمد بن عبیداللہ اور ابراہیم حمزہ وغیرہ ہم سے فیض یاب ہوئے۔ حجاز مقدس میں آپ کے قیام کی مکمل مدت تقریباً چھ سال مدینہ طیبہ کے بعد آپ نے بصرہ، کوفہ، بغداد نیز مصر کا بھی سفر کیا۔ جہاں آپ نے اپنے کمالات کے جوہر دکھائے آپ جہاں تشریف لے جاتے علم و فضل کی روشنی میں وہاں کی فضائیں منور اور درخشاں ہو جاتیں اور تشنگان علم کے پروانوں کا ایک ہجوم ہو جاتا تھا چنانچہ بڑے بڑے علماء و فضلاء آپ کی کم سنی اور طفلانہ صورت کے ساتھ علم و فضل کی فراوانی اور کمال پختگی کو دیکھ کر متحیر ہو جاتے اور انگشت بدنداں رہ جاتے۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی شہرۂ آفاق کتاب "صحیح البخاری" ہے جس میں کل ۹۰۸۲ احادیث درج ہیں جو کہ آپ کی چھ لاکھ یاد کردہ حدیثوں کا انتخاب ہے اس عظیم تصنیف کی تکمیل میں آپ نے سولہ برس کی مدت صرف کی۔

بخاری شریف کے علاوہ بھی آپ کی کئی مشہور تصانیف ہیں جن میں چند یہ (۱) الصحابہ والتابعین

نومبر ۶ ۱۹۹۶ء

نا داب

ن الادب المعنی (۳) التفسیر الکبیر (۴) الجامع الکبیر (۵) الکتاب الفوائد

اخیر ایام میں ایک بار حاکم وقت نے آپ کو تنہائی میں اپنے گھر آکر اپنے لڑکے کو حدیث پڑھانے کا طالبہ کیا لیکن آپ نے انکار کر دیا اور درخواست رد فرمادی' تو حاکم وقت نے دولت وشہرت کے نشہ میں بد ہو کر ایک منظم سازش رچا کر آپ کو نہایت پریشان کیا حتی کہ آپ کو شہر بدر کر دیا۔ تو آپ بخارا چھوڑ کر نیشاپور چلے آئے لیکن آپ کی خودداری اور استغناء نے حاکم نیشاپور کو بھی ناراض کر دیا اور بالآخر آپ نے نیشاپور کو سلام الوداع کیا اور سمرقند سے چھ کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں خرتنگ میں اقامت اختیار کی اور وہیں آپ کا پیمانۂ حیات بھی لبریز ہوگیا اور رمضان کی آخری تاریخ عید الفطر کی رات ۲۵۶ھ میں ۶۲ سال کی عمر میں بالآخر علم وفضل اور حکمت و دانش کا یہ درخشاں و تابندہ ستارہ جس کی ضیا رپاش کرنوں نے بلا واسطہ نوے ہزار قلوب کو روشنی اور جلا بخشی تھی اور جن کے دلوں میں حدیث کی شمع روشن کی تھی ہمیشہ ہمیش کے لئے غروب ہوگیا۔ (دعوت [illegible] کے شکریہ کے ساتھ)

(بقیہ سلسلہ ص۲۸ سے آگے)

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ وہ تناور درخت جو اردو شاعری کی زمین پر اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا یکساں ہی جھونکے سے ڈھے گیا۔ پروین خود لکھتی ہیں۔

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں ؛ جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا

شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مرنے والے کو قبل از وقت ہی اپنی موت کا اندازہ ہو جاتا ہے اس کی جیتی جاگتی مثال پروین کی آخری غزل کا آخری شعر ہے۔

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی ؛ اور تری بزم سے اب کوئی اٹھا چاہتا ہے

اس طرح اردو ادب کا یہ درخشاں ستارہ مزید اپنی چمک دکھانے سے پہلے ہی معدوم ہوگیا اور خوشبو جو بادل کا ہاتھ تھام کے چلی تھی اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی راہ سے بھٹک گئی۔ جیسے معلوم شاید یہ شعر پروین شاکر کے لئے ہی لکھا ہے۔

نکل کے لالہ و گل سے بکھر گئی خوشبو ؛ ہٹی جو اصل سے اپنی تو مر گئی خوشبو

ڈاکٹر محسن جلیل شمسی (مترجم)

اسلامی نظام معیشت اور سود

جناب ڈاکٹر منظور عالم اسلامی بنک کی تبلیغ و تفہیم میں سرگرم عمل انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے چیئرمین ہیں ان کی مایا کے ساتھ ہوئی گفتگو کا خلاصہ پیش ہے۔

مایا: کیا موجودہ دور میں بھی اسلامی بینکوں کا نظام عمل میں لایا جا سکتا ہے؟

عالم: امریکہ سے شائع ہونے والے "فارن افیئرس" رسالے میں گذشتہ دو شماروں میں ا[illegible] سرخیوں میں سر فہرست اولیت دی جا رہی ہے کہ جب سے معاشی بدحالی کو دور کرنے کی صورتحال پیدا کی جانے کی کوشش لگی ہے تب سے بجائے کم ہونے کے یورپ اور امریکہ روز بروز معاشی بدحالی بڑھتی ہی جا رہی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ سودی کاروبار۔ چونکہ اسلامی بینکنگ نظام سود سے خالی ہے اس لئے معاشی بدحالی اور بے روزگاری فقط اسلامی معاشی نظام ہی دور کر سکتا ہے۔

مایا: کیا مغربی ممالک بھی اسلامی بینکنگ نظام کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟

عالم: ہاں! امریکہ اور جرمن میں تمام بینک اسلامی نظام کے مطابق چلائے جا رہے جیسے سٹی بنک اور اے این جیڈ گریڈ لیز بنک نے مغربی ممالک کے یورپ اور امریکہ کی شاخوں میں اسلامک ونڈوز کھولی ہیں جن میں فقط اسلامی طرز عمل پر پورا کام ہو گیا ہے پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی اس طرح کی کوششیں شروع ہوئی ہیں۔

طرح سے اسلامی بینکنگ نظام پر دنیا کا سب سے بڑا بینک ملیشیا میں ۱۹۹۴ء میں کھلا ہے جس کا کاروبار اربوں ڈالروں میں ہوتا ہے۔

ملیا: سود کو موجودہ زمانے میں معاشی بدحالی کو ختم کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن اسلامی بینکنگ نظام سود کا مخالف ہے کیا سود کے بغیر سود کے معاشی بدحالی کو دور کرنے میں کامیاب سمجھا جا سکتا ہے ؟

عالم: دونوں میں معاشیات کو بڑھاوا دینے میں تقریباً شکل ایک ہی جیسی ہے جیسے موجودہ نظام میں پونجی پیدا کرنے کے لئے میچول فنڈز کا استعمال ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح اسلامی نظام میں یہ طریقہ اپنایا جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں بھی ہر ایک کو اس کی پونجی کے مطابق اسے فائدہ پہونچتا ہے۔

ملیا: پھر دونوں میں کیا فرق ہے ؟

عالم: دونوں نظام میں صرف اتنا فرق ہے کہ موجودہ بینکنگ نظام میں سود کی وجہ سے پیداوار یا صنعت کی قیمت کافی بڑھ جاتی ہے جس کا اثر اس کی خرید و فروخت کی رقم پر پڑتا ہے اس کے برخلاف اسلامی نظام میں سود کے نہ ہونے کی وجہ سے صنعت کی لاگت کم رہتی ہے اس سے اس کی فروخت "بکری" بہت زیادہ ہو جاتی ہے اس وجہ سے اس میں کیپٹل جنریشن زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔

- دنیا میں امیری اور غریبی کے درمیان خلیج بڑھتی ہی جا رہی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ سود ہے (عالمی بینک کی رپورٹ ۹۶-۱۹۹۵ء)
- یورپ اور امریکا میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو جب ہی کم کیا جا سکتا ہے جب سود کی شرح کم سے کم سطح پر لائی جائے۔ (فارن افیرس۔ نیویارک ۱۹۹۶ء کا پہلا شمارہ)
- مکمل روزگار کے حصول کے لئے سود کی شرح کو صفر کرنا ہوگا۔ جے ایم کینس (عالمی شہرت کے ماہر معاشیات)

یہ تینوں اہم سرخیاں ہیں جو تین سو سال سے چلے آرہے مغربی بلکہ عالمی معاشی نظام کے خلاف
سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اس معاشی نظام کا کوئی دوسرا نعم البدل ہے دنیا بھر کے معاشیات کے
اس کا جواب نفی میں دیں گے مگر ایک مذہبی کتاب اور اس کے ماننے والے اس کا جواب
دیں گے یہ مذہبی کتاب ہے قرآن اور اس کے ماننے والے دنیا کی آبادی کے لحاظ سے نمبر ۲ پر آنے
مسلمان۔ اسلام کا ۱۵سو سال پرانا معاشی نظام سودی لین دین سے پاک ہے اس کو اگر دنیا
سے نافذ کیا جائے تو قرض میں ڈوبتی دنیا کو پھر سے ابھارا جا سکتا ہے۔ دنیا کے سارے معا
ادارے اس بات پر متفق ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد امیری اور غریبی کے درمیان جو خلا
ہے اس کا سبب صرف سود ہے۔

آج تیسری دنیا کے ممالک پر ۵۶ کھرب ڈالر کا قرض ہے دنیا کی ۷۶ فیصد آمدنی صرف
۱۵ فیصد لوگوں تک ہی محدود ہے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ یورپ اور امریکہ جیسے ممالک میں بھی
کی تقسیم کا تناسب ۱ : ۶۰ کا ہے یعنی ان ممالک کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کی آمدنی ملک ا
سے ۶۰ گنا زیادہ ہے افریقہ میں پسماندہ ملکوں کی آمدنی ۱۹۶۰ء سے منجمد ہے جب کہ جرمنی، جنوبی کوریا
جاپان کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کی آمدنی اس درمیان ۶۰۰ فیصد بڑھی ہے۔ امیری غریبی کی یہ کھائی
سودی نظام معیشت کا نتیجہ ہے دنیا کے واحد سود سے پاک اسلام نظام معاشیات کا دعویٰ
اگر دنیا اس کو اپنالے تو دنیا قرض سے چھٹکارہ پا سکتی ہے بے روزگاری ختم ہو سکتی ہے اور خوش
آسکتی ہے۔

آخر یہ نظام ہے کیا؟ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو سمجھا جائے کیونکہ اسلامک
نظام اسی کا ایک جز ہے اسلامی نظام زندگی کا بنیادی اصول ہے کہ دنیا کے سارے انسان برابر
ہر انسان کو زندگی گذارنے کے لئے روزی روٹی اور کپڑے کی ضرورت پڑتی ہے اسی نظریہ کے
اسلام نے دولت کو ایک جگہ اکٹھا کرنے پر روک لگائی ہے کیونکہ جب بھی دولت ایک جگہ اکٹھا ہوا
غریبی پیدا ہوتی ہے اس کے تدارک کیلئے اسلام نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے زکوٰۃ کی ادائیگی کسی کی مرضی پر

بلکہ ایک فرض ہے جس کا ادا کرنا لازمی ہے اور وہ غریبوں کا حق ہے اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم حکومت کا کام ہے اگر حکومت اسلامی نہ ہو تو یہ تقسیم چند اصولوں کے تحت کی جاتی ہے اور یہیں سے اسلامک بنکنگ یا اسلامی نظام معاشیات کی شکل سامنے آتی ہے۔

اگر کسی شخص کے پاس ٹیلینٹ ہے لیکن اس کے پاس ذریعہ معاش کے لئے پونجی نہیں ہے تو موجودہ بنکنگ نظام کے تحت اس شخص کو روزگار دینے کے لئے ایک رقم بطور قرض دے کر معینہ مدت کے مطابق مع سود کے واپس لیتی ہے، اسلامی نظام کے تحت بھی ایسے بدحال لوگوں کو قرض دیا جاتا ہے لیکن اگر قرض لینے والے شخص کو فائدہ کے بجائے کسی وجہ سے نقصان ہو گیا۔ تو اسلامی غیر سودی بنک خود بھی اس کے نقصان میں شریک ہوتا ہے موجودہ نظام کی طرح صاحب قرض پر جبراً قرض کی ادائیگی کا بوجھ نہیں ڈالتا بلکہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ صرف اس کی پونجی کا ہی نقصان نہیں ہوا بلکہ صاحب قرض کی طاقت و قوت اور اس کی توانائی کا بھی نقصان ہوا ہے لیکن فرصت اور سہولت کا غلط استعمال نہ ہو اس کے لئے ایک خفیہ نگرانی کمیٹی ہوتی ہے یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی موجودہ نظام سے کیسے بہتر ہے اسلامی نظام معیشت؟ یہ دو طرح سے بہتر ہے خوش حال لانے کا سب سے ٹھوس ذریعہ ہے زیادہ سے زیادہ پیداوار اور اس کی اس رفتار سے کھپت۔

کسی پیداوار کی کھپت تبھی زیادہ سے زیادہ ہو پاتی ہے جب اس کی فروخت کی قیمت کم ہو اور فروخت کی قیمت تبھی کم ہو سکتی ہے جب اس کی لاگت کم آئے اور صنعت کار کو پونجی پر سود نہ دینا پڑے۔

اسلامی نظام معیشت کے ذریعہ حاصل شدہ پونجی سے صنعت کی قیمتیں ۴۰ سے ۵۰٪ تک کم ہوتی ہیں کیونکہ صانع کو اس میں کوئی سود نہیں دینا پڑتا اور نہ ہی اشیاء کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کرنا پڑتا ہے اس طرح صنعت کی قیمتوں میں کافی کمی ہو جاتی ہے اور مال کے سستا ہونے کی وجہ سے اس کی اشیاء بہت جلد فروخت ہو جاتی ہیں اس لئے اصل رقم کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوتا ہے اب چونکہ صانع اس پونجی کو اپنے پاس اکٹھا نہیں کر سکتا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے اس پر ۲۵٪

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

مسلمانوں کیلئے تعلیم و تربیت کی اہمیت

کسی بھی صحت مندانہ اور صالح سماج کی تشکیل کے لئے اس کے افراد کی تعلیم و تربیت اس کی بنیادی ضرورت ہے اس کا نظام اس سماج کے صحیح اقدار اور خصوصیات کی روشنی پر مرتب کرنا اور چلانا ضروری ہوتا ہے اور یہ کام اس اختیار کردہ نظام کے نفاذ کے لئے اور مخلصانہ کوششوں سے انجام پاتا ہے پھر جن اقدار و مقاصد کو سامنے رکھ کر یہ کوشش کی جاتی ہیں انہی کے مطابق معاشرہ بنتا ہے۔ لیکن اگر یہ کوششیں نہ کی جائیں تو معاشرہ اخلاق و کردار کی شکل خودرو گھاس کی طرح ہو جاتی ہے ان میں کوئی تناسب اور توازن نہیں ہوتا اور اگر مخالف عناصر کو موقع مل جائے تو وہ اصل اقدار و مقاصد کے بالکل متضاد مقاصد کا معاشرہ بنا دیتے ہیں جس کی اصلاح کیلئے غیر معمولی دانشوروں اور مخلص رہبر کو طویل محنت اور بے انتہا توجہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

اچھے معاشرہ کی تشکیل کیلئے معاشرہ کے تمام افراد کو حصہ لینا ضروری ہوتا ہے جس میں مختلف سطح کے لوگ اپنی اپنی سطح کے مطابق طریقہ اختیار کر سکتے ہیں حدیث شریف میں آتا ہے کہ تم میں سے ہر ایک اپنے زیر اثر ..... کی فکر و اصلاح ذمہ دار ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے زیر اثر کی فکر کے متعلق سوال ہے لہٰذا صحیح اور اچھا حال بنانے کی ذمہ داری ہر ایک شخص پر آتی ہے باپ ماں اپنی اولاد

بڑا چھوٹے کے، حاکم اپنے محکوم کے، غرض ہر ایک کسی دوسرے کے بنانے کی فکر کا ذمہ دار
ملت کے افراد کو سکھاتا اور بنانا وہ ذمہ داری ہے جس کو سب کو مل کر اٹھانا پڑتا ہے اور اسی
وہ صحیح طریقہ پر انجام پاتی ہے مسلمان معاشرہ دنیا میں جہاں بھی ہے اس کے بنیادی اقدار و
مد ایک طرح کے ہیں۔ اس سلسلہ میں ملکوں ملکوں اور قوموں قوموں کا فرق نہیں۔ یہ سب
ئے ضروری ہیں یہ سب کے لئے ضروری ہیں اور سب ان کے معاملہ میں یکساں ہیں ان بنیادی
ار میں مذہبی عقائد اور اسلام کی طرف سے طے کردہ اخلاقیات اور اسلامی زندگی کے بنیادی
ب اور مقاصد ہیں۔ لیکن بنیادی اقدار کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی زندگی کے متعدد دوسرے
ؤوں یہ گنجائش ہے کہ وہ ملکوں کے فرق سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان پہلوؤں میں ملکی حالات
رق اور پڑوسیوں کے پڑوس کا لحاظ رکھنے کی اجازت ہے۔ معاشرہ کی تشکیل میں دونوں
ملک کے پہلوؤں کے فرق کو سامنے رکھنے سے زندگی کو بہتر بنانے کا پورا حق ملتا ہے۔

مسلمان معاشرہ کی اولین بنیاد توحید یعنی خدائے واحد کی عبادت کا عقیدہ ہے وہ شرک کو
ی قیمت پر اختیار نہیں کر سکتا وہ اپنے رسول کی لائی ہوئی شریعت کا پابند ہے وہ اس میں دی
ی ہدایات کے خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اس کے نبی آخری نبی ہیں لہذا ان کے احکام کی پیروی
ی اب کوئی اضافہ یا ترمیم نہیں کر سکتا۔ مسلمان کا عقیدہ اس دنیاوی زندگی کے بعد ایک ابدالآباد
دگی کے ہونے کا یقین ہے جہاں اس کو اچھے کام کرنے کا اجر و ثواب ملے گا اور غلط کاموں پر
ا ہوگی اس بنیادی عقیدہ پر یقین کرنا اس کیلئے ضروری ہے اور اس کو ان تمام کاموں سے علیحدگی
نیار کرنا ہوگی جو اس کی شریعت اور اس کے نبی کی ہدایت سے ٹکراتی ہوں۔

لیکن زندگی کے دوسرے مختلف پہلو ایسے بھی ہیں جن کے معاملہ کو اس کے صوابدید پر چھوڑا گیا
ان میں اپنے حالات کے مطابق عمل کی اجازت ہے اگرچہ شریعت اسلامی کی طرف سے ضروری قرار
یئے گئے معاملات بھی ایسے ہیں کہ ان سے نہ تو عمل کرنے والے کو دشواری ہوتی ہے اور نہ ان سے
وسروں کو کوئی ضرر پہنچتا ہے اور وہ معاملات جن میں مسلمان کو اپنی صوابدید کا اختیار حاصل ہے ان
ں مسلمان اپنے ملک کے حالات اور تقاضوں کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ اس طرح مسلمان دنیا کے تمام معاشروں

کے ساتھ گزارا کر سکتے ہیں ان کو کہیں بھی سب سے علیحدہ رہ کر زندگی گزارنے کی ضرورت نہیں
لیکن اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ مسلمان کو ان معاملات کی معلومات حاصل ہوں اس کو یہ معلوم
ہو کہ کہاں وہ کس بات کا پابند ہے اور کس بات میں اس کو اپنے نئے تجربوں اور اصولوں کے
مطابق عمل کرنا ہے اس کیلئے اس کو ایک طرف ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جس سے اس کو یہ
علم حاصل کرائے اور دوسری طرف ایسی سوسائٹی کی بھی ضرورت ہے جو اس کو ان خصوصیات
کا حامل بنانے میں کارگر ہو کیونکہ ماحول انسان کی تربیت و تشکیل کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اکثریت غیر مسلموں کی ہے اور حکومت لادینی ہے مسلمان
ملی تشکیل خود مسلمانوں ہی کو کرنا ہے اور وہ کوئی بڑا پیچیدہ یا ناقابلِ عمل کام نہیں ہے یہ تشکیل بچوں
کی سطح پر ان کے گھروں کے بڑوں کے ذریعہ پھر بچوں اور ان سے بڑوں کی درسگاہوں کے ذریعہ پھر عام
سوسائٹی کے دائرہ میں لٹریچر اور عوامی رابطہ کے ذریعہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ بچوں کی سطح پر یہ کام
آزادی سے قبل مسلم شرفاء کے گھرانوں کے اندر انجام دیا جاتا رہا ہے اولاً بچوں کی مائیں، خالائیں، نانیاں
اور دادیاں اسلام کے بنیادی عقائد سے اپنے بچوں کو ان کے ذہن کے مطابق اندازِ بیان میں آشنا
کر دیتی تھیں اور انبیاء علیہم السلام کی باتیں، اسلام کی مثالی شخصیتوں کے خاص واقعات تاریخ کے
نصیحت آموز قصے اپنے بچوں کو لوریوں اور کہانیوں کے ذریعہ واقف کرا دیا کرتی تھیں پھر خاندان
کے کسی بزرگ یا محلہ کے کسی مخلص صاحبِ علم سے بچوں کو حرف شناسی، قرآن مجید ناظرہ، اردو
زبان کی تعلیم کا آغاز کر دیا جاتا تھا اور اس طرح ان کی ابتدائی تعلیم شروع ہو جاتی تھی جس میں
باتوں کا سہل و آسان حصہ بچوں کے ذہنوں میں بیٹھ جاتا تھا جو زندگی کے ساتھ ان کے دلوں میں
بلکہ ان کی سیرتوں میں اثر انداز رہتا تھا اس گھریلو تعلیم کے ساتھ اور اس کے بعد بچہ مدرسہ یا
اسکول کی تعلیم کی طرف بڑھتا تھا اور اس کی منظم تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا تعلیم کا باقاعدہ
نظام کسی بھی قوم کی باعزت زندگی کی تشکیل میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے
لیئے یہ بات لازمی ہے کہ وہ ملت کی ضرورت اور اس کی خصوصیات کا خیال رکھتے ہوئے اس کے
دائرہ میں جو بہتر سے بہتر ذرائع و انکشافات سامنے آئیں ان سے ملت کی ضرورت اور مقصد حیات

اور عزت و امتیاز کے تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے فائدہ اٹھایا جائے۔ ان باتوں کا لحاظ کرنے سے تعلیمی عمل قوم کو دیگر معاصر قوموں کے درمیان ہنر مند اور باعزت قوم کے مقام پر کھڑا کر دیتا ہے۔
مسلمانوں کا معاشرہ ساتویں صدی عیسوی تک تعلیم و تعلّم کے میدان میں دنیا کے تمام معاشروں پر فائق رہا اور اس نے وہ ترقیات حاصل کیں جن کو بنیاد بنا کر بعد میں یورپ نے تعلیمی اور تجرباتی میدان میں ترقی شروع کی۔ افسوس ہے کہ یورپ کی ترقیات کے ساتھ مسلمانوں کے معاشرہ میں علم کے میدان میں جمود و تعطل کا آغاز ہو گیا جس کا سلسلہ تا ہنوز جاری ہے البتہ اب کسی حد تک بیداری کا آغاز ہو گیا ہے اب تعلیمی و تجرباتی کوشش ہی سے مسلمانوں کو اپنے سابقہ امتیازی مقام پر واپس لایا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے فکر و جد و جہد تنظیم و حکمت کی ضرورت ہے اور خاص طور پر ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کو اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے تعلیمی میدان کو خود اپنی کوششوں سے سر کرنا ہے زیادہ فکر و توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ تعلیم کوئی سطحی قسم کا عمل نہیں ہے وہ دراصل انسان سازی اور انسانی صلاحیتوں کو ابھارنے اور فعال و مفید بنانے کا عمل ہے ذہنی تربیت سے اس کا گہرا تعلق ہے تعلیم وہ عمل ہے جو انسان کو ایک بے خبر مخلوق سے بدل کر ہنر مند اور بلند مقام کی مخلوق بنا تا ہے۔
تعلیم کا اصل میدان اٹھتی ہوئی عمر کی نوجوان نسل ہوتی ہے اور اس کام کی ذمہ داری اصحاب علم اور ماہرین تعلیم پر ہوتی ہے کہ وہ ایسا نصاب اور نظام تعلیم تجویز کریں پھر اس کو نافذ کریں جو ان کی تعمیر ایسے خطوط پر کر سکے جن کی اس کو ضرورت ہے اور جس سے وہ اپنا اعلیٰ مقصد حاصل کر سکتی ہو اور اس سے اس کو اس کا باعزت و بلند مقام ملتا ہو۔ یہ وہ امر ہے جس کی طرف تمام زندہ قومیں توجہ کرتی ہیں اور اس کے ذریعہ وہ اپنے سرمایہ افتخار کے ساتھ عقل و تجربہ کی رہنمائی میں زندگی کی خوب سے خوب تر تعمیر کرتی ہیں اور قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتی ہوئی قدرت کے ودیعت کردہ ذخائر مادی سے بہتر سے بہتر طریقہ سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے آخری عہد سے تعلیم کی طرف صحیح توجہ میں کمی شروع ہو گئی تھی پھر انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد کے تحت مسلمانوں کو تعلیم میں مزید پیچھے ڈھکیل دیا جس سے ان کے لئے مواقع اور حوصلے بہت کم ہو گئے

(باقی ۴۸ پر)

شاداب
نومبر ۱۹۹۹ء

اُمِ ھانی فتح پور (یوپی)

لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا ۔۔ مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

اس نازک شعر کی تخلیق کر کے دنیا کے ہر خاص و عام کے دل کی دھڑکن بن جانے والی خوشبودار شاعرہ پروین شاکر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء میں کراچی پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید شاکر علی پٹنہ (بہار) کے باشندے تھے لیکن ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے بعد پاکستان میں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں پروین پیدا ہوئیں۔ ان کا بچپن کراچی میں گذرا وہیں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ پروین انگریزی سے ایم اے کرنے کے بعد کراچی ہی کے عبداللہ کالج میں پڑھانے لگیں۔ انہوں نے سول سروس کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور عمر کے آخری دور میں ہارورڈ یونیورسٹی سے بنک ایڈمنسٹریشن کی ڈگری بھی حاصل کر لی تھی۔

پروین شاکر نے اپنی خوشبودار رومانی اور سادگی سے بھرپور شاعری کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں وہ مقام بنا لیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ان کے گرد چاہنے والوں کا بہت بڑا حلقہ تھا۔

۱۹۷۶ء میں پروین شاکر کا پہلا مجموعہ "خوشبو" منظر عام پر آیا اور اس کے ساتھ ہی پروین ہر دل کی دھڑکن بن گئیں۔

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو ۔ ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

پروین نے اُردو غزل کا رخ بدل کر اسے عورت کی زبان بنا دیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ملکوں کی عورتوں کے جذبات کی سچی عکاسی پروین کی شاعری میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں پروین کی بیشتر نظمیں اس کی اپنی ذات اس کے محبوب اور اس کی پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ

مذکرہ اور صحیفہ ہیں۔ ان نظموں میں بجید پھیلاؤ ہے اور بے حد ارتکاز ہے یہ یکجائی آپ کو آسانی سے کسی اور جدید فنکار کے یہاں نہیں ملے گی۔ پروین کی غزل میں غزل کے پیکر کا احساس ہے اس کی ایک وجہ پروین کی نسوانی بصیرت ہے جس نے غزل کو ایک کومل لڑکی کے روپ میں دیکھ لیا ہے۔"

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کر تنہائی میں ؛ میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

پروین کی شاعری کی سب سے بڑی خاصیت ان کی خالص ہندوستانی اردو زبان ہے۔ ان کی شاعری میں فارسی اور عربی زبان کا استعمال کہیں نہیں ملتا۔

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی ؛ میں اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن سجاؤں گی

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں ۔

"اردو کے گلستاں میں پروین کے نام کی جو کلی چٹکی ہے اس نے فضاء کو نئی مہکاروں سے معمور کر دیا ہے پروین جذبے کی شدت اور شائستگی کی شاعرہ ہے جذبے کا سچا اظہار اور خوبصورت اظہار اس کی شاعری کا کرشمہ ہے نہ وہ اپنے آپ کو فریب دیتی ہے اور نہ اپنے قاری سے کچھ چھپاتی ہے اس نے جذبے کی حیرت انگیز تہذیب کی ہے۔

اپنی تنہائی مرے نام پہ آباد کرے
کون ہوگا جو مجھے اس کی طرح یاد کرے

"خوشبو" پروین نے اپنے عمو احمد ندیم قاسمی کے نام ہی انتساب کی ہے وہ لکھتی ہیں

وہ سایہ دار شجر
جو مجھ سے دور بہت دور ہے مگر اس کی
لطیف چھاؤں
سجل نرم چاندنی کی طرح
مرے وجود مری شخصیت پہ چھائی ہے ۔

"وہ ماں کی باہوں کی طرح مہرباں شاخیں
جو ہر عذاب میں مجھ کو سمیٹ لیتی ہیں
وہ ایک مشفق دیرینہ کی دعا کی طرح
شریر جھونکوں سے پتوں کی نرم سرگوشی
کلام کرنے کا لہجہ مجھے سکھاتی ہے"

۱۹۸۰ء میں پروین شاکر کا دوسرا مجموعہ "صد برگ" شائع ہوا جو انہوں نے اپنی امی کے نام انتساب کیا۔ صد برگ کی اشاعت پر سجاد میر لکھتے ہیں:

"لیجئے اب پہیلا "خوشبو" جب اپنے بدن میں ڈھلتی ہے تو "صد برگ" بنتی ہے۔ پروین نے اپنے سفر کے ان دو مرحلوں کے درمیان خود مسافت طے کی ہے دنیائے شعر میں اس سے پہلے اس کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ وہ راہیں ہیں جنہیں پروین کو خود تراشنا پڑا۔"

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے ؛ لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

"صد برگ" کے بعد ان کے دو مجموعہ کلام بعنوان "خود کلامی" اور "انکار" یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے اور پروین اپنے فن کے عروج پر پہنچ گئی۔ ان مجموعوں میں ذاتی اور ملکی حوالوں سے جا بجا تلخی سمٹ آئی ہے جہاں وہ سماج کے رشتے تلاش کرتی نظر آتی ہیں

مجھ کو کسی کا ساتھ گوارا نہ تھا مگر
ان چوڑیوں کا ہاتھ میں ہونا عجیب ہے

کشور ناہید لکھتی ہیں "اردو شاعری کے گذشتہ اور آنے والے دس سال بھی شاعرات اور خصوصاً پروین کے عطا کردہ اسلوب کے آئینہ دار ہوں گے۔"

عکس خوشبو ہوں، بکھرنے سے نہ روکے کوئی ؛ اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

اور آخر میں یہ خوشبو ۴۲ سال کی ہی عمر میں ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء میں ایک سڑک حادثہ میں بکھر گئی اور

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

حضرت اوج یعقوبی
کچھ یادیں کچھ باتیں

دکنی کہاوت ہے کہ "اللہ شکر خورے کو شکر کھلاتا ہے" یہ کہاوت اوج یعقوبی صاحب پر پوری طرح منطبق ہوئی اور ملک الشعراء بنادیئے گئے تھے اوج صاحب کو ملک الشعراء بنائے جانے پر کچھ شاعروں نے اس دکھ میں اور پہنا شروع کردیا کہ "تعلیم" قابلیت اور شہرت میں اوج پر ہونے کے باوجود وہ ملک الشعراء نہ بن سکے۔ کچھ شعرائے کرام اس غم میں ماتم کناں تھے کہ شاعری ان کو وراثت میں ملی ہے اور ملک الشعراء ہونا ان کا پیدائشی حق تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔

اوج یعقوبی صاحب کا کوئی مستقل ذریعہ روزگار نہیں تھا البتہ وہ ہر ہفتہ شاعر سیاست کے نام سے ایک طنزیہ نظم حالاتِ حاضرہ پر لکھا کرتے تھے جن کا انہیں معاوضہ مل جایا کرتا تھا۔ وہ صاحبِ زوجین وکثیر العیال بھی تھے۔ مگر بڑی نگاہ اور بڑے دل کے مالک تھے بڑی نگاہ بڑا آدمی بناتی ہے۔

انہوں نے قلندری میں بھی خسروانہ اندازِ زندگی اپنائی تھی ملک الشعراء ہوکر گورنمنٹ سے متعدد مشاہرہ پانے لگے تھے گھر پر ٹیلیفون اور کار آگئی تھی ماشاء اللہ ٹھاٹ ہی ٹھاٹ تھے سب والوں سے دیکھا نہیں جارہا تھا ناچار دیکھنا پڑرہا تھا۔ دیکھا یہ جاتا ہے کبھی مشاعرے میں بھی

ایک شاعر کا کلام جب چل جاتا ہے تو دوسرے شاعروں سے برداشت نہیں ہوتا۔ یہ تو حاشہ آسائیشیں تعصب اور صرف شاعری کی بنیاد پر حاصل ہوئی تھیں۔ یہ بھلا کیا دیکھی جاتیں؟

غریبوں کے ہمدرد جناب ٹی انجیا (آنجہانی) غریبوں کی محبتوں اور اپنی محنتوں سے جب آندھرا پردیش جیسی بڑی ریاست کے چیف منسٹر بن گئے تو اوج صاحب کے کلام سے ہو کر برسر مشاعرہ ان کو ملک الشعراء بنا کر سماجی سیاسی اور ادبی دنیا کو حیرت میں ڈال اور اصل اللہ تعالیٰ تو کسی بہانے نوازنا چاہتا ہے۔ اوج صاحب کا ستارہ اوج پر آگیا۔ غم میں کئی شہاب ثاقب ٹوٹ گئے۔ اللہ اپنے بندے کی کسی ادا سے خوش ہو جاتا ہے تو پر رحمتوں کے در کھول دیتا ہے کبھی کبھی آزمائش کے لئے بھی دیتا ہے جس کو دیتا ہے کی آزمائش اور جن کو ملا ان کی آزمائش بھی مقصود ہوتی ہے۔

بقول ڈاکٹر حبیبی شاہد، دکن کے یہ ممتاز شاعر اوج یعقوبی صاحب شعر کا کارخانہ چلاتے تھے جنھیں اس کارخانے کا مال چاہیئے تھا وہ تو اس سے استفادہ کیا کرتے ہی تھے، البتہ جنھیں بعد میں یہ معلوم ہوا کہ یہاں مال ٹھوک کے بھاؤ بنتا اور بکتا ہے وہ اپنی ذاتی گھریلو صنعت اکتفا کر کے اپنی عزت رکھ لینا چاہتے تھے۔

اوج صاحب سے ہمارا ملنا بچھڑنا کچھ اسی نوعیت کا تھا ہمیں اپنی خودگوئی کی لاج رکھنی اس لیئے ہمارا اور اوج صاحب کا ساتھ بہت تھوڑے سے دنوں کا تھا۔ وہ ایرانی گلی میں رہا کرتے ہم جاتے تو کبھی نیاز حاصل ہو جاتا اور اگر نہ ہوتے تو ہم اپنی غزل کا کاغذ گھر میں دے آتے۔ دوسرے دن وہ ہمیں اصلاح شدہ مل جاتا۔ دکن میں علامتِ فاعل (نے) کا استعمال عام گفتگو بہت کم ہوتا ہے، چناں چہ ایسی غلطی ہم سے شعر میں بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اوج صاحب ہمارے غزل کے حاشیے پر لکھ دیا کرتے تھے کہ "فعل متعدی و فعل لازم پر سوچو"۔ ہمارے بار بار پوچھنے پر بھی کہ یہ فعل متعدی و فعل لازم ہے کیا؟

اوج صاحب ٹال جایا کرتے تھے (یہ غالباً ۶۵-۱۹۶۴ء کی بات ہے جب ہم میٹرک پاس کر کے شعر و ادب کے میدان میں تازہ وارد ہوئے تھے) تنگ آ کر ہم نے جناب نسیم الحسن موہانی سے جو حسرت موہانی کے غالباً بھتیجے تھے، رجوع کیا۔ نسیم الحسن صاحب ہمیں ہائی اسکول میں اردو پڑھ اتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں بٹھا کر سمجھایا کہ فعل متعدی و فعل لازم کیا ہے اور علامت فا

(نے) کا استعمال کہاں ضروری ہے۔

میٹرک کے بعد چھٹیاں ہم آصفیہ کتب خانے میں گزارا کرتے تھے وہاں شعر و ادب کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور اصلاحِ فن سے متعلق کئی کتابیں مطالعے میں آ گئیں۔ خاص طور پر ظفر اقبال سراج الدین ظفر، جوش، فیض، احمد ندیم قاسمی، ہانی، شکیب جلالی، قتیل شفائی وغیرہ کے ساتھ ساتھ نیاز فتح پوری کی انتقادیات، مالہ و ماعلیہ نگار کی فائلیں، مرقع سخن اور سیماب کی اصلاحیں وغیرہ وغیرہ بھی نظر سے گزریں۔ کچھ کچھ زبان و بیان کا شعور آیا۔ اسی کے سہارے چل نکلے۔

اوج صاحب سے ملاقاتیں تقریباً ختم ہو گئیں۔ ایرانی گلی والے مکان سے وہ مختلف مکانات بدلتے رہے، البتہ وہ جب ہفتہ وار "رابطہ" نکالنے لگے تو اپنے پرچے کے لیے وہ ہم سے مختلف کتابوں پر تبصرے کرواتے تھے اور تبصرہ کرنے کے بعد کتابیں مبصر کا حق ہوتی تھیں، یوں ہمیں تبصرہ کرنے کا چسکا لگ گیا۔

اوج صاحب کے ملک الشعراء ہونے کے ٹھاٹ دیکھنے کا اتفاق ہمیں نہیں ہوا کہ ہماری مصروفیات اور اوج صاحب کی مصروفیات میں کوئی تال میل نہیں تھا ہم اس زمانے میں عدالت میں اسٹینو تھے۔

اوج صاحب شہزادوں اور بے نواؤں دونوں کی خدمت کیا کرتے تھے کسی زمانے میں وہ "دربار در بار" میں فانی وصدق جائسی وغیرہ کی طرح رات کو جاگتے اور دن کو سویا کرتے تھے۔ اوج صاحب سلام و مرثیہ بھی کہہ لیا کرتے تھے (وہ اکثر کہا کرتے کہ میاں پیٹ کی خاطر سب کچھ کہنا پڑتا ہے)۔

اوج صاحب کے مصرعوں پر چلنے والے جب اوج صاحب کا نام بڑی بے تکلفی سے لیتے ہوئے اوج آتا تھا۔ اوج جاتا تھا۔ اوج ہمارے ساتھ مشاعرے پڑھا کرتا تھا، کہتے ہیں تو ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے بلکہ ایک صاحب کو تو ہم نے اوج صاحب کے مقابلے میں ان کی حیثیت و اوقات کا احساس بھی کروا دیا۔

اوج صاحب کا پہلا مجموعہ گرفت نظر ان کا شناس نامہ ہے اوج صاحب نے کہا تھا

فکر ہوتی رہی تقسیم نظر بٹتی رہی ⁂ آج وہ وقت ہے کچھ بھی نہ رہا میرے لیئے

دیوان کے بروقت نہ چھپنے کا سبب ان کی وہی "کارخانہ داری" تھی چنانچہ انھوں نے خود کیا تھا۔

مجھے قسمت سے دورِ قحطِ خود گوئی ملا ورنہ :: مرا دیوان بھی اے اوج کب کا چھپ گیا

حیدرآباد میں دو شاعر ایسے گزرے ہیں جو شعر کہنے کے ساتھ ساتھ شعر سنانے کا منفرد اور متاثر کن انداز رکھتے تھے۔ دونوں تحت اللفظ سناتے تھے اور مشاعرے لوٹ لیا کرتے تھے، ایک تھے جناب اوج یعقوبی اور دوسرے جناب شاذ تمکنت۔

اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو، ان زمینوں میں بھی اوج صاحب نے خوب شعر کہے تھے جیسے

مردِ خدا کو اوج ہم آب و دانہ کیا :: جینا ہی ہے تو پھر قفس و آشیانہ کیا

آپ زلفوں کو سنواریں کہ پریشاں رکھیں :: ہونے والے تو بہر حال پریشاں ہوں گے

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین جب حیدرآباد تشریف لائے تھے تو اوج صاحب نے ان کے لیے ایک تہنیتی غزل کہی تھی، بڑی مشکل زمین میں بڑے خوبصورت شعر تھے اس کے دو شعر پیش ہیں۔

جس بزم میں صہبا ہو نہ ساغر ہو نہ خم ہو :: رندوں کو وہاں پھر بھی تسلی ہے کہ تم ہو

کچھ قافلے والوں کے بھی ہوتے ہیں فرائض :: جب راہنما مصلحت وقت میں گم ہو

طرحی ہو کہ غیر طرحی اشعار، اوج صاحب اپنی انفرادیت اور اپنی پہچان برقرار رکھتے تھے

ہمیں احساس تھا بس ہم بڑے ہیں :: نہ جانے کب سے وہ بازو کھڑے ہیں

آپ کیا جلوہ گر ہو گئے :: گل پسینے میں تر ہو گئے

حسرتِ قرب بھی خواہشِ دیدار بھی ہے :: ایسا لگتا ہے مرا پیار زلیخا ہے ابھی

کھلے دشمن کا استقبال بھی منظور ہے لیکن :: خدا محفوظ رکھے دوست کے ذہنی تعصب سے

اوج صاحب زندگی کی اعلیٰ قدروں کے ترجمان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے۔

"مجھے یہ ... انک جھک کر روٹی اٹھانا نہیں آتا۔"

انھوں نے قلم سے روٹی پیدا ضرور کی، مگر قلم کو کبھی ذریعۂ تجارت نہیں بننے دیا۔

کتنا ہی پست کیوں نہ ہو معیارِ زندگی :: کردار کے لحاظ سے انسان نہ پست ہو

(باقی صفحہ ... پر)

سرور تاج معانی
بمبئی

پاگل تنہا

گزشتہ سے پیوستہ
دوسرا ایپی سوڈ

ناشتے سے فارغ ہو کر قباچہ نے ایک پرانا صندوق کھولا۔ اور کچھ ریزگاری نکال کر اُسے بند کر دیا۔ راعنا کھٹیا پر بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی کہ اچانک انھیں باہر سے ایک آواز سنائی دی۔

کیا میں اندر آ سکتا ہوں ـــــ ؟ راعنا نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ دہلیز پر ایک لمبا لیکن دبلا پتلا شخص کھڑا ہے حُلیئے سے یوں لگ رہا تھا جیسے بنگلہ دیش کا کوئی رفیوجی ہو۔ قباچہ اُس شخص کو دیکھتے ہی بے ساختہ کہنے لگا

ارے۔۔ ؟ فقیر الزماں ـــ تم ؟ یہاں کہاں بھئی۔

تمھیں ہی ڈھونڈ رہا تھا

کیوں ؟ ... خیر تو ہے ۔ فقیر الزماں قباچہ کے قریب آ کر سرگوشیانہ انداز میں کہنے لگا۔

پہلے یہ بتاؤ۔ یہ نرگسِ مستانہ کون ہے ؟

یہ ـــــ ؟ یہ راعنا ہیں ـ گلِ رعنا ـــــ چاند کی رہنے والی ہیں اور یہاں کا ادبی سروے کرنے آئی ہیں ـــ قباچہ راعنا کی طرف دیکھتا ہوا کہنے لگا ـــ راعنا ـــ؟ یہ ہیں بہت خوبصورت فقیر الزماں فقیر ـــــ

فقیر الزماں فقیر نہایت ہی عاجزی سے راعنا سے گویا ہوا۔

شاداب   نومبر ۱۹۹۶ء

محترمہ ـــــ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ شہر حیدرآباد کا ادبی سروے کرنے نکلی اور اس پر طرہ یہ کہ آپ کی ملاقات ایک بہت بڑے شاعر یعنی کہ مجھ سے ہو گئی ہے لہٰذا آپ اپنا ادبی سروے کا آغاز مجھ سے ہی کر لیں۔

آپ کی کوالی فیکیشن ۔ ؟

محترمہ ـ میں نے تذکیر و تانیث پر پی ایچ ڈی کی ہے

وہ کیسے ـ ؟

وہ یوں کہ مجھے پہلے ہی سے شاعری کا شوق تھا جس استاد کے پاس زانوے ادب طے کرنے پہنچا تو انہوں نے مجھے نااہل قرار دیا۔ میں وہاں سے مایوس ہو کر استاد کے پاس پہنچا ـــ وہاں بات بن گئی ـــ انہوں نے فوراً میری شاگردی کی رسید بنا کر غزل کی بل پھاڑ دی ـ

راعنا فیقر الزماں کے اس جملے پر انگشت بہ دنداں تھی ـ اس نے قباچہ کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہوئے کہا ـ

ہاں راعنا ـــــ

یہاں پر شاگردی کی رسید بنا کر غزلوں کی بل کیسے پھاڑی جاتی ہے ؟

قباچہ مسکراتے ہوئے کہا ـــــ بھئی یہ ادب کے ہول سیلر اور ریٹیلرز کی پالیسی ہے۔ فیقر الزماں کے استادِ ثانی ریٹیلر ہیں ـ فی غزل سو روپیہ جائے پانی کے علاوہ ہیں پچ پگری، خطوط رسانی اور جوتیاں سیدھی کرنے کی ڈیوٹی بھی نبھانی پڑتی راعنا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی ـ اپنی زلفوں کو پیشانی پر سے ہٹا ہوا ہے وہ فیقر الزماں سے کہنے لگی ـ

آپ کے استادِ ثانی کا نام کیا ہے ؟

فصاد الدین احمد رحمتہ اللہ علیہ

راعنا یہ نام سنتے ہی چونک پڑی اور کہنے لگی۔
یہ وہی دغا دالدین مجیر ہیں نا؟ جو کویتا کے ساتھ حرکت نارواکرتے تھے؟
جی ہاں وہی ــــ آج کل یہ میرے ساتھ فعل ممتنع کر رہے ہیں
کیا مطلب؟
مجھے اپنی شاگردی سے ہٹا دینا چاہتے ہیں
وہ کیوں؟
کیونکہ ایک بار میں ان کی کویتا کے چھندوں اور بحروں کو رُوپک میں لے کر اُس کی ستھائی کو مدھم لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔
ایسا کیوں کیا آپ نے کویتا کے ساتھ؟
کیونکہ غزل میرے بس کی بات نہیں تھی۔ کب تک ان سے ریڈی میڈ لے کر کام چلاتا ــــ؟ درمیان میں طرحی مشاعروں کی دعوت آجاتی تو بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ــــ اِسی لئے غزل سے مجھے الرجی سی ہو گئی اور کویتا پسند آگئی۔
آپ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟
اپنے استادِ ثانی دغا والدین مجیر لعنت اللہ علیہ کے ہی حسب نسب کا ہوں۔
دغا دالدین مجیر کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں
ارے بھئی وہ تو نجیب الطرفین منافق ہیں
سُنا ہے یہاں پر منافقینِ ادب کی اکثریت ہے
جی ہاں یہ ٹھیک ہے!
لیکن آپ نے تو اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔!
کونسی؟
وہی تذکیر و تانیث پہلی ایج ڈیسی والی ــــ!

ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں کہ جب تذکیر سے بات نہیں بنی اور اُستاد سے !
توڑ لیا تو تانیث پر طبع آزمائی کر بیٹھے ـــــ رابعہ حیران ہو کر قبا چہ کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔

بھئی قباچہ ـــــ ؟ یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ؟

یہ کہہ رہے ہیں کہ ان سے ادب میں سُقم ہو گیا۔

یہ کیا جملہ ہے ؟

اسی جملے سے تو ان کی پی ایچ ڈی کا ارتباط ہے !

کیا مطلب ـــــ ؟

بھئی ادبی سقم کا مطلب ہے کہ انہوں نے ایکدن طیش میں آکر اپنی بیوی کو طلاق دے دیا۔ یہ تو ان کے تخم کا سُقم ہوا ـــــ

ہاں تو ادبی سُقم اس کے بعد ہوا نا ؟

وہ کیسے ـــــ ؟

طلاق کے دوسرے مہینے پھر یہ اپنی بیوی کو گھر لے آئے اور گھر کی آبادی بڑھانے میں منہمک ہو گئے۔

لیکن یہ تو ناجائز فعل ہے ـــــ طلاق کے بعد یہ سب حرام کہلاتا ہے

ارے بھئی جب دغاؤ الدین فجر کی غزل پر فقیر الزماں فقیر کا نام جائز قرار دیا جا سکتا ہے تو شرع کے تین جملوں کے بعد تخلیق کی صحت سلامت کیوں نہیں رہ سکتی۔

مجھے تو یہ بات ہی سمجھ میں نہیں آرہی ہے !

نانا بن جانے کے بعد بھی فقیر الزماں فقیر کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تو تمہیں کیا سمجھ میں آئے گی۔

ارے کسی سے حلالہ کروا لیتے !

نومبر ۱۹۹۶ء

اداب

استادِ ثانی نے اِس فعل پر عمل پیرا ہونے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔

پھر ؟

منافق سے اس کارِ خیر کی توقع بیکار تھی۔!

تو پھر ؟

ایک سر پھرے مولوی سے بغیر حلالہ کے بیوی جائز ہونے کا فتویٰ لے آئے۔

لیکن اِن معاملوں سے اِن کی پی ایچ ڈی کا کیا علاقہ ؟

اِسی عمل پیر تو پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل ہوگئی انھیں !

اوہ ـــــ راعنا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا ـــــ

قباحت اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا ـــــ راعنا فقیر الزماں فقیر کی رف دیکھتے ہوئے مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔

آپ اپنا کوئی اچھا سا شعر سنائیں ؟

فلسفہ چلے گا۔

ہاں کچھ بھی سنائیے!

فقیر الزماں فقیر نہایت ہی فقیرانہ انداز میں گویا ہوئے

دغا دے کے مچھر نے کاذب سے پوچھا
کوتیا کی بحروں میں کھیلے گا کب تک

یہ شعر ہے یا ادبی معمّہ

جی نہیں ـــــ اِسے نسوانی شعبدہ کہتے ہیں

ٹھیک ہے ـــــ راعنا مسکراتی ہوئی کہنے لگی ـــــ میں نے آپ کا سر دے کر لیا ہے۔ اب آپ ارادہ فرمائیں۔

جی بہت اچھا ـــــ فقیر الزماں بڑے ہی نسوانی انداز میں شرماتا ہوا واپس چلا گیا

ماھتاب قباچہ کو استفسارانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ اس شہر میں اور کتنے ناخلف اور نااہل شعراء ہیں۔ قباچہ شاید راعنا کے دل کی بات جان چکا تھا۔ صرف مسکرا تا رہ گیا کہ پھر اچانک قباچہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکل پڑا

ارے۔؟ دغا دالدین تھی تم۔؟ یہاں کیسے بھئی۔

ارے بھئی تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی

کہو۔ کیا بات ہے

پہلے یہ بتاؤ کہ یہ کس برق بردار حسینہ کو لئے بیٹھے ہو۔ تمہارے سیریل کی کوئی ہیروئن تو نہیں ہے یہ ؟

ارے نہیں یار۔ یہ تو گل راعنا ہے۔ چاند کی رہنے والی ہے اور یہاں کا ادبی سروے کرنے آئی ہے۔

ارے واہ۔ پھر تو ہم بڑے اچھے وقت پر پہنچے بھئی۔ لیجئے محترمہ۔ آپ ہمارا ہر قسم کا سروے کر سکتی ہیں۔

آپ کا نام کیا مبارک ہے بھی اور۔ شہر میں کافی چرچے ہیں آپ کے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ نو مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آنے کے بعد بھی آپ کا ایک شعر بھی کسی کو یاد نہیں۔ اس کے باوجود بھی آپ کافی مشہور ہورہے ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے۔

دیکھئے محترمہ۔ ہماری اپنی ایک پالیسی ہے !

کیسی پالیسی ؟

جب ہمیں اس بات کا عرفان ہو گیا کہ ایڑیاں اُچکا کر ادب کا آسمان نہیں چھوا جا سکتا۔ !

کیا مطلب ہوا ؟

شاداب — نومبر ۱۹۹۶ء

مطلب یہ کہ سوائے تُک بندی کے ہم ایک بھی اچھا شعر نہیں کہہ سکتا۔ اچھی تخلیق سے ہم بے بہرہ ہیں؟

تو پھر اپنے آپ کو کیسے منوایا جاتا ہے! تو معلوم یہ ہوا کہ اپنے آپ کو نیوز میں رکھو۔ جلسوں کی صدارت میں رکھو۔ خواتین کی انجمن میں رکھو۔ یہ وہ پبلسٹی ہے جو اپنے آپ کو بڑا شاعر بنا دیتی ہے۔!

بڑا شاعر بن کر آپ نے کیا کر لیا ؟

چار پانچ چمچے پال لیئے۔ جو ہمیشہ ہماری جوتیاں سیدھی کرتے رہتے ہیں اور ہماری ادبی خدمات کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔

کیا یہ اعتراف آپ کو بھی ہے ؟

ان حالات میں انکار کرنے کو جی نہیں چاہتا شہرت کا ہوکا کیسے نہیں رہتا۔

آپ کے ان نو مجموعوں میں آپ سب سے اچھا مجموعہ کسے سمجھتے ہیں ؟

"بدبو کا سفر" کو!

وہ کیوں ؟

کیونکہ اس میں میری تمام ادبی غلاظتوں کو قارئین نے قبول کر لیا۔

اور وہ ایک آپ کا مجموعہ تھا نا؟ "شرم در شرم"

وہ دراصل محبت نامہ ہے۔ جسے شگی اخبار کی بیوی نے کتابی شکل دینے میں کافی کوآپریٹ کیا تھا۔

شگی اخبار کی شاعری کے بارے میں کچھ بتایئے ؟

وہ ہماری مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے!

یہ آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں؟

آپ کو یقین نہ ہو تو شگی اخبار کی بیوی سے پوچھ لیجئے!

شاداب   نومبر ۱۹۹۶ء

اچھا ۔۔۔ وہ آپ کا ایک مجموعہ تھا نا؟ اب کیا کیا جائے ۔۔۔ وہ کیا تھا؟

وہ ادب کی سفلس اور گنوریا کی شکل میں منظرِ عام پر آیا تھا

اب کونسی منظرِ عام پر آنے والی ہے ؟

کیا مطلب ؟

مطلب دسویں مجموعے کا ارادہ نہیں ہے؟

آج کل اپنے ارادے کو تنیا کی طرف زیادہ ہیں

اُس طرف ارادے اور خطرناک کو جنم دے سکتے ہیں!

ہمیں اِس کا PROTECTION بھی آتا ہے

دیسے میں سمجھتی ہوں ۔۔۔ کویتا ۔ غزل سے زیادہ کامیاب صنفِ سخن ہے

اِسی لئے تو اُس پر طبع آزمائی کا رجحان ہوا!

آپ کے چمچوں کو اپنی چمچہ گیری کی کیا اُجرت دیتے ہیں آپ ؟

بھئی کنسیشنس تو دینا ہی پڑتا ہے ۔۔۔ بے چارے دینی کلمہ چھوڑ کر دن رات

میرا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں ۔ اس کا کچھ تو صلہ ملنا چاہیئے انھیں!

بونس کے طور پر کیا ہے آپ کے چمچوں کو۔

بھئی حیدرآباد کے باہر کے تمام مشاعروں میں انھیں لے جاتا ہوں اور زادِ راہ

دلواتا ہوں۔

ارے بھئی سُنا ہے یہاں پر آپ ہی کے ڈپارٹمنٹ والوں نے ایک سیریئل بنائی

ہے جو AIR پر ٹیلی کاسٹ بھی ہو رہی ہے۔

ہاں ۔۔۔ وہ یونٹ ہمارے ہی ڈپارٹمنٹ سے ملحق ہے!

تو پھر اُنھوں نے آپ کی خدمات نہیں لیں۔

کیا کریں محترمہ سب کے سب لٹریٹ اور سخن فہم تھے مجھے خواہ مخواہ REJECT کر دیا۔

شاداب

حالانکہ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ چمچہ گیری کرنے میں حیدرآباد میں میرا کوئی ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ ارے ہمارے ڈپارٹمنٹ کے بڑے سیٹھ مرحوم کی کتنی جوتیاں سیدھی کیں میں نے۔ گالیاں کھائیں۔ مار کھایا۔ لیکن دامنِ حماقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مگر اس مرتبہ میری کوئی سنتا ہی نہیں تھا ــــ مجھے نا اہل کہہ کر یونٹ سے نکال دیا اور گیت کسی اور سے لکھوا لیا۔

خیر آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ ایک نہ ایک دن آپ کی چمچہ گیری ضرور رنگ لائے گی۔

راعنا اپنی ریسٹ واچ کو دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔ اگر برا نہ مانیں تو ہم لوگوں کو اجازت دیجئے۔ ہمیں ایک ضروری کام سے مہدی پٹنم جانا ہے۔

کونسا ضروری کام ــــ؟

جھوٹے اور مکار شعراء سے تو بہت مل چکے۔ اب ایک عظیم شاعر ــــ یک بلند پایہ انسان اور ایک مافوق الفطرت ادیب سے ملنے ہم مہدی پٹنم جائیں گے۔ ہندوستان اور پاکستان کے تمام اعلیٰ جریدوں میں شائع ہوتا ہے۔

مہدی پٹنم ــــ؟

تجبر کو یہ نام سن کر یوں لگا جیسے اس کے پیروں تلے زمین نکلی جا رہی ہو۔ اسے اپنے اطراف کا ماحول بڑی تیزی سے گردش کرتا محسوس ہونے لگا۔ اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا ــــ شاید وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

(سلسلہ صفحہ ۳۲ سے آگے)

غنچہ، لب بستہ اور اوجِ عرش ان کے کمزور مجموعے ہیں۔ غنچۂ لب بستہ تو "آج وہ وقت ہے کچھ بھی نہ بچا میرے لیے" کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ نعت، منقبت، سلام و مرثیہ پر مشتمل "اوجِ عرش" میں نورِ عقیدت سے زیادہ شکم کی آگ کارفرما ہے یہی شکم کی آگ انہیں اورنگ آباد تک لے گئی جب لوٹے تو آگ مٹی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

لوگ کیا یاد کریں گے ہمیں کیا تھے ہم لوگ ؛ پڑھ لیا کرتے تھے احباب کے ماتھے ہم لوگ ■

اخبارات کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح ممکن

صحافت اور معاشرے کے زیر عنوان مذاکرہ مقررین کا اظہار خیال

صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے باقی تین ستون میں قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ شامل ہیں ان تینوں ستونوں کو صحیح ثابت رکھتا ہے وہ ہے صحافت۔ جب ہم معاشرے کا ذکر کرتے ہیں تو سارے مسائل اس میں آجاتے ہیں ایک مفکر نے صحافت کو معاشرے کا معمار بھی کہا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صحافت اگر صحیح طریقے سے کام کرے اور جس معاشرے میں کام کرے اس کی ترقی ضرور ہوگی۔ معاشرہ میں جو خرابیاں ہیں صحافت کے ذریعہ دور کی جا سکتی ہیں اور جو خوبیاں ہیں اس کا اظہار ہونا ضروری ہے انتظامیہ کا مسئلہ یہ ہے کبھی اپنے طور پر کارکرد ہوتا اور کبھی عدلیہ کے کارکرد ہوتا ہے جب کوئی معاملہ عدلیہ اور انتظامیہ کے اعتبار سے صحیح نہیں اس کی نشاندہی صحافت کرتی ہے۔ صحافت حکومت اور عوام کے درمیان ایک پل کا کام کرتی۔ کیونکہ صحافت کا راست تعلق عوام سے ہے اس لیے عوام کے مسائل حکومت تک پہنچانے میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے صحافت کی آزادی بہت ضروری ہے اور روزانہ اخبارات میں نیوز اور درد بھی ہوتی ہے جو واقعات اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اس سے معاشرے پر کیا اثر ہوتا ہے کو نظر میں رکھ کر خبریں شائع کرنی چاہیئے۔ اگر ایسی خبر جس کی وجہ سے معاشرے کو نقصان پہنچا۔ اس طرح کی خبروں سے اجتناب کرنی چاہیئے۔ معاشرے کے فائدے کے لیئے اور معاشرے اصلاح کے لیے خبریں اخبارات میں شائع ہونی چاہیئے۔ حقائق پر مبنی خبریں شائع ہونی چا۔ یہ تاثرات ان دانشوروں کے ہیں جنھوں نے مکتبہ شاداب و مرکز ادب کے زیر اہتمام منعقد

شاداب — نومبر ۱۹۹۶ء

صحافت اور ہمارا معاشرہ" کے زیر عنوان مذاکرے میں حصہ لیا۔ ۱۲ر اکتوبر کی شام ۷ بجے مکتبہ شاداب، ریڈ ہلز میں ایک ادبی اجلاس و مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب منظور احمد منظور نے کی۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی مہمان خصوصی تھے جناب قمر صابری نے ادبی اجلاس کی کارروائی چلائی۔ جناب رحمت یوسف زئی نے کہا کہ صحافت کا راست تعلق عوام سے ہوتا ہے اس لیے عوام کے مسائل حکومت تک پہنچانے میں صحافت نے اہم رول ادا کیا ہے جمہوریت میں عوام کی باخبری ضروری ہے سیاسی سطح پر یا معاشرتی سطح پر مسائل کو عوام کے سامنے لانے کا کام صرف صحافت کرتی ہے آج ہمارا ملک اسکنڈلس کا ملک بن گیا پچھلے ۳ برسوں میں صحافت خاموش تھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ چھوٹی چوریاں ہو رہی ہے لیکن بڑے واقعات بھی اب سامنے آ رہے ہیں اگر ملک میں صحافت زندہ نہ ہوتی تو یہ سارے اسکنڈلس کی خبریں آج ہمارے سامنے نہیں آتی۔ صرف صحافت کی وجہ سے عوام کے سامنے یہ ساری باتیں آ گئیں ہیں۔ حکومت کے مسائل اہم کے مسائل ایک دوسرے تک پہنچانے میں صحافت نے اہم رول ادا کیا۔ صحافت میں رپورٹنگ اور اداریہ اہم ہیں کسی بھی اخبار کا اداریہ بہت ہی غور سے پڑھا جاتا ہے یہ اداریہ کس نے لکھا ہے فکر و نظر صحیح ہے یا نہیں۔ اداریہ کا مقصد کیا ہے ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر پڑھا جاتا ہے صحافت کو چاہیئے کہ رائے عامہ کو منظم کیا جائے رائے عامہ پر اعداد و شمار جمع کرنی چاہیئے۔ عوام کی رائے معلوم کر کے ایک گلدستہ کی شکل میں رکھا جاتا ہے۔ اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے بعض اخبارات سرکاری طور پر چلائے جاتے ہیں لیکن بیشتر اخبارات نے طے کیا ہے کہ ہم کو اپنے فرائض کو مکمل کرتا ہے جو عوامی مسائل کو حکومت کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ یہ اخبار عوام کا نمائندہ ہیں۔ حکومت کے معمار ہیں۔ حقائق کی نشاندہی کرنا اور اسے صحیح کرنا صحافت کی ذمہ داری ہے انہوں نے کہا کہ مختلف اخبارات میں افواہیں آ جاتی ہے جس سے عوامی رائے متاثر ہوتی ہے جو اخبار یہ سوچتے ہیں کہ کسی خبر سے منافرت پھیلنے کا اندیشہ ہو تو اسے شائع کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ معاشرہ کی بہتری اور فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا صحت مند صحافت

ہے جناب قمر صابری نے کہا کہ اگر صحافت معاشرے پر اثر انداز ہونا چاہتی ہے تو اسے صداقت اختیار کرنا پڑے گا نہیں تو وہ اپنے مقصد کی انجام میں ناکام ہوتی ہے۔ نیوز کے ساتھ ویوز بھی ہوتے ہیں جس میں تبصرے ہوتے ہیں ویوز، صداقت سے لکھے گئے ہوں تو فائدہ مند ہے ہندوستان کی صحافت میں حق اور صداقت اختیار کیا جاتا ہے لیکن بعض اخبارات کے مالکین کی کچھ پالیسیاں ہوتی ہے اس کے تحت اخبار چلایا جاتا ہے بعض پالیسیاں معاشرے کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے پڑھنے والے کسی اخبار کی پالیسی کو نقطہ نظر میں رکھتے ہوئے اخبار پڑھنا چاہتے ہیں۔ اسٹیٹسمین اخبار کی پالیسی کا ذکر کیا اور کہا کہ آزادی سے پہلے مسلمانوں کے مسائل کو یہ اخبار شائع کرتا تھا۔ حق اور صداقت کا اس اخبار میں خیال کیا جاتا تھا آزادی کے بعد اس اخبار کے مالکین بدل گئے اور اس اخبار کی پالیسی بدل گئی۔ پولیس ایکشن کے وقت جنرل چودھری جو ٹلڑ کا کرسپانڈنٹ تھے کے مضامین شائع ہوتے تھے جس میں فوجی کارروائی کی صحیح تفصیل اس اخبار میں شائع ہوئی۔ جنرل چودھری ایسے شخص تھے جو ان واقعات سے واقف تھے۔ پریم بھاٹیہ بہت بڑے اور اچھے جرنلسٹ ہیں انہوں نے کہا کہ بوفورس کے واقعات ہمارے ملک میں پیش آئے۔ اسکامس کے واقعات صحافت ہی کے ذریعہ ہمارے سامنے آئے۔ صحافت عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کام کرتی ہے۔ تعلیمی سماجی اور دوسری انجمنوں کو ترقی دینے میں صحافت نے بھرپور تعاون کیا ہے صحافت کسی کو ابھار سکتی ہے تو کسی کو گرا بھی سکتی ہے۔ جناب عزیز معارفی نے کہا کہ پرنسس ڈیانا اور اظہر الدین ان دونوں واقعات کے بارے میں جو خبریں شائع ہوئی ہے وہ بالکل ٹھیک نہیں ہے اس سے ان دو شخصیتوں کی شہرت متاثر ہوئی ہے۔ کسی کے نجی معاملات کو اخبارات میں شائع کرنا اچھی بات نہیں ہے محترمہ سلطانہ شرف الدین نے بھی مخاطب کیا۔ اس کے بعد ادبی مشاعرہ جناب منظور احمد منظور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب عزیز حسن عزیز، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی اور جناب

شاداب نومبر ۱۹۹۶ء

محبوب علی اخگر مہمانانِ خصوصی تھے۔ صدر اور مہمانانِ خصوصی کے علاوہ ڈاکٹر سید حسن مسرور، عزیز بھارتی، قمر صابری، قدیر انصاری، خلش جگری، یوسف الدین یوسف، رحمت کوثر، دلشاد رضوی، الف شرفی، رؤف رحیم، ابراہیم ایاز، رشید صاحب اور محترمہ سلطانہ شرف الدین احمد نے کلام سنا کر خوب داد و تحسین حاصل کیں۔ صدر جلسہ و مشاعرہ جناب منظور احمد منظور نے اپنی صدارتی تقریر میں صحافت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ تعلیم کو عام ہونا ضروری ہے ذہنی شعور کے لئے بھی اور سیاسی شعور کے لئے بھی۔ تعلیم ایک موثر ذریعہ ہے جس سے معاشرے کو ذہنی سکون ملتا ہے ہم اُردو کے قلمکار ہیں اُردو اخبار کی تعداد بہت کم ہے انہوں نے عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کو عام کرنے کے لئے عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ نے نمایاں رول ادا کیا ہے جس کی وجہ سے اردو پڑھنے والوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے نئی نسل کو اُردو سے واقف کروایا جارہا ہے۔ ہمارا ہر گھر اُردو کی درس گاہ بن جائے اور تمام والدین اُردو اساتذہ بن جائے۔ تعلیم عام ہوجائے تو ہم معاشرے اور صحافت کی خدمت صحیح ڈھنگ سے کرسکیں گے جو اپنی مادری زبان سے والہانہ محبت رکھتے ہیں ایسے ہی لوگوں کی آج معاشرے کو ضرورت ہے اخبارات چلانے والے اپنے ذہنوں میں یہ بات رکھیں کہ وہ لوگوں کے دلوں کو جوڑنے کے لئے کام کریں اور نئی نسل کو بھی یہ پیغام دیں۔ انسانیت کے جذبہ کو عام کریں اور نئی نسل سے اس کام کی شروعات کریں۔ ہمارے اُردو اخبارات سنجیدگی اور شائستگی سے کام کر رہے ہیں اور سنجیدہ صحافت فروغ پارہی ہے جناب قمر صابری نے ادبی اجلاس کی کارروائی چلائی اور مشاعرہ کی کارروائی جناب قدیر انصاری نے چلائی۔ جناب عزیز بھارتی کے شکریہ پر یہ اجلاس رات دیر گئے اختتام کو پہونچا۔

٭٭٭

لطف الرحیم

غزل مزاحیہ

اس آخری [illegible] ہو گا وہ کرم رہے
اپنے عشق کے سبب [illegible] ہم ستم رہے

پچھو کری کہیں تخلص [illegible] بوسیاں کہو
شاعر کہ اس طرح کی گراوٹ میں ضم رہے

بیساکھیاں ہیں حسب ترنم کی اپنے ساتھ
محفل میں ہم زیادہ رہے گو کہیں کم رہے

پیچھے ہمارے فن ہے فقط اور کچھ نہیں
آگے ہمارے سامنے جس میں بھی دم رہے

ہر ہر قدم پہ دیتے رہے ہم نئے فریب
بچنے کو میرے دوست سے ہم ہم قدم رہے

ہیں شعر گر درست تلفظ بھی ہو صحیح
اتنا تو پڑھنے والے کا قائم بھرم رہے

زلفوں میں اس کی خم ہے تو پیدا نہیں کوئی
یارب کبھی ہماری کمر میں نہ خم رہے

جن کی کمی زمانے نے محسوس کی رحیم
شاعر ہمیشہ ایسے بہت کم سے کم رہے

اسلم چشتی ڈبائیوی

آرزو

چاہے خالی گلاس رکھ دینا
اپنے لب کی مٹھاس رکھ دینا

میری تنہائیوں کے آنگن میں
چاہتوں کا لباس رکھ دینا

غم کے مارے ہوئے پرندوں کو
دل کے گملوں کے پاس رکھ دینا

میری آنکھوں کے جزیروں پر
سارے منظر اداس رکھ دینا

اک مویشی کے واسطے اسلم
خشک دھرتی پہ گھاس دینا

خلیل پرتاب گڑھی

★

بلبلا پانی کا ہے یہ زندگی
ٹوٹ سکتا ہے کسی لمحہ کبھی
جب کبھی ماحول سے غفلت ہوئی
[illegible] میں جھلک سی آ گئی
خود ستائی خود پرستی خود سری
ہو گئیں سب باعثِ شرمندگی
مل نہ پائے گی وہ نصرت پھر کبھی
لوگ کہتے ہیں جسے سچی خوشی
کس طرح سے بات کا ہوتا اثر
اس میں جب اخلاص کی خوشبو نہ تھی
دور ہوتا جا رہا ہے ہم سے وہ
جس کی ہم تلقین کرتے تھے کبھی
غلطیوں پر جب بھی پچھتاوا ہوا
دل کو اک گونہ خوشی حاصل ہوئی
بے حسی، بے اعتنائی کے سوا
کیا ملا کرکے صنم سے دوستی
بس خدائے پاک کو معلوم ہے
اصل میں ہے کون کتنا متقی
ہم جسے اپنا سمجھتے تھے خلیل
دوستی کے نام پر کی دشمنی

([illegible])

(باقی ص ۲۵ سے آگے)

آزادی کے بعد جمہوری اور سیکولر نظام نے ملت کی تعمیر کا بوجھ خود ملت کے اہل سمجھ طبقے پر ڈال جس کو اٹھانا ہے مسلمان تعلیم میں اب بھی پیچھے چل رہے ہیں ان کو آگے لانے کے لئے مخا جدوجہد کی ضرورت ہے تعلیم کو عام کرنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ کارگر بنانے کی طرف توجہ وقت کا اہم تقاضہ ہے لہٰذا ہندستانی مسلمانوں کے دانشور طبقے کی بڑی ذمہ داری ہے وہ اپنی نسلوں کی زندگیوں کی صحیح تعمیر کی طرف خاطر خواہ توجہ کریں۔ اور تعلیم و اصلاح و تر کا بھرپور اہتمام کریں کیونکہ یہ کام انہی کو کرنا ہے ... ۔

(باقی سلسلہ ص ۲۱ سے آگے)

زکوٰۃ دینا پڑے گا۔ اس طرح یہ پونجی ہر سال کم ہوتی جائے گی اس لئے پیدا کرنے والے کو اپنی پو اپنے سے الگ کرنا ہی پڑتا ہے جس سے روزگاروں کے مواقع بڑھیں گے اور خوشحالی آئے

شاداب
حیدرآباد

جلد (۱۲)
شمارہ (۱۲)
دسمبر ۱۹۹۶ء
قیمت ۶ روپے

ایڈیٹر محمد قمرالدین صابری

جوائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین ، مینیجنگ ایڈیٹر : قدیر انصاری

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	″ ۲۰۰ ″	۳۶۰ ″	″ ۳۷۰۰ روپے
امریکہ	″ ۱۴ ڈالر	۲۳ ڈالر	″ ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	″ ۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	″ ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	″ ۱۷۵ روپے	۳۰۰ روپے	″ ۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ :- ماہنامہ ''شاداب'' ۱۲۸/۱-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر شاداب ۱۲۸/۱-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

شاداب
دسمبر ۱۹۹۶ء

اخوان المسلمون کی فکر کی روشنی میں

اسلام میں حقوقِ انسانی اور عورت کی حیثیت

مسلمان عورت یا حقوق انسانی یہ وہ موضوعات ہیں جنھیں بنیاد بناکر مختلف مواقع پر اسلام اور مسلمانوں کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا رہا ہے اسی کے پیش نظر جب جون ۱۹۹۳ء میں ویانا میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق سے متعلق کانفرنس ہو رہی تھی اخوان المسلمون نے ایک بیان جاری کیا تھا جو کہ انسانی حقوق کے تعلق سے مغربی اور اسلامی نقطہ ہائے نظر کی تعین کرتا ہے اسی طرح مارچ ۱۹۹۴ء میں اخوان المسلمون نے ایک اور بیان "اسلامی معاشرے میں مسلمان عورت کا کردار" کے موضوع پر جاری کیا تھا ان بیانات کی افادیت کو دیکھتے ہوئے یہاں اُن کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش ہے۔

حقوق انسانی سے متعلق اپنے بیان میں اخوان المسلمون نے پہلے موجودہ حقوق انسانی کے منشور کا تعارف کرایا ہے جسے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو جاری کیا۔ حقوقِ انسانی کا یہ بین الاقوامی منشور مغرب کے صدیوں کے نتیجۂ فکر کا نچوڑ کہا جاسکتا ہے اس سے پہلے ۱۷۷۶ء میں امریکہ میں برطانیہ کی غلامی کے خلاف آزادی کا منشور جاری ہوا تھا اور ۱۷۸۹ء میں فرانس میں انسانی حقوق اور شہریت کا منشور جاری ہوا جس میں یہ نعرہ دیا گیا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے سارے انسان یکساں حقوق رکھتے ہیں لیکن ۱۹۴۸ء کا انسانی حقوق کا منشور ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کے اثرات دنیا کے بیشتر ممالک میں دستور سازی اور قانون سازی پر پڑے۔ بعد کے ادوار میں انسانی حقوق کے منشور کو مزید موثر بنانے کی کوششیں کی گئیں جن کی ابتدا ر ۱۹۶۶ء میں ہوئی لیکن اقوام متحدہ میں اسے جنرل اسمبلی کی منظوری ۱۹۷۶ء میں حاصل

ہو سکی جبکہ معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو جنرل اسمبلی کی منظوری حاصل ہوئی اور
میں شہری اور سیاسی حقوق کو بھی جنرل اسمبلی کی منظوری حاصل ہو گئی۔

شہری اور سیاسی حقوق کے تحت ہر انسان کو زندگی، تحفظ، اخفا PRIVACY آزادا
غلامی اور قید کی ممانعت، بولنے، غور و فکر کرنے، عبادت، حرکت اور اجتماع کے حقوق،
گئے اور معاشی اور معاشرتی حقوق کے تحت ہر شخص کو بہتر زندگی گزارنے، کام کرنے، مناسب تنخوا
طبی دیکھ بھال، تعلیم اور تنظیم بنانے کے حقوق دیئے گئے۔

اس کے بعد بیان میں مساوات کا اسلامی اصول مذکور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ
جو انسان کو موجودہ دور میں جاکر حاصل ہوئے ہیں اسلام نے چودہ سو سال پہلے وہ سارے
حقوق انسانوں کو دیئے تھے۔ بین الاقوامی حقوق انسانی کے منشور کی پہلی دفعہ میں یہ کہا گیا
کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور مرتبے اور حقوق میں برابر ہیں یہ دفعہ ۶۴۰ میں حضر
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کی یاد دلاتی ہے جس میں انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا
" انہیں ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا تم نے کب سے (کیوں) انہیں غلام بنا لیا ہے۔ حضرت
کا یہ قول اس وقت اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب اسے اس پس منظر میں دیکھا جائے
ایک طاقتور حکمراں (کوئی مفکر یا مصنف نہیں) اپنے اقتدار کے انتہائی عروج کے زمانے میں اپنی
میں رہنے والے غیر مسلموں کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اللہ
مساوات کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے "اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک
عورت سے پیدا کیا" (الحجرات ۱۳)

قابل توجہ یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مسلمانو نہیں بلکہ اے لوگو سے خطاب کیا ہے جس کا ا
تمام انسانوں کی طرف ہے اسی طرح اللہ کے رسول کا ارشاد ہے " تم سب کے سب آدم کی اولا
اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زور دے کر فرمایا " کسی عربی کو
عجمی (غیر عرب) پر فضیلت نہیں مگر تقوی کے ذریعہ) اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں مساوات کی

بڑی گہری ہیں اور یہاں رنگ و نسل کی بنیاد پر کوئی فضیلت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ اس کے اخلاق اور برتاؤ اسے اچھا یا برا بناتے ہیں۔

آج کی دنیا انسانی حقوق بڑی اہمیت اختیار کر گئے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض عرب اور مسلم ممالک بھی ان ممالک کی فہرست میں شامل ہیں جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی جاتی ہے یہاں تک کہ بعض بنیادی حقوق کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب ان انسانی حقوق کو بنیاد بنا کر اپنے سیاسی مفادات کے حصول کے لئے اسے دوسری قوموں پر نافذ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور انہیں ان پر نیو ورلڈ آرڈر کے نام پر تھوپنا چاہتا ہے۔

مغرب میں انسانی حقوق کے تاریخی ارتقاء کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ حقوق انسانی کی تشکیل مغربی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے خصوصاً مغربی ثقافت کو فروغ دینے، ان کی بادشاہتوں کو تحفظ فراہم کرنے اور اصلاحات کے عمل کو روکنے کے لئے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی حقوق کے سلسلے میں خود مغربی تاریخ ابہام کا شکار ہے اور اس کی جڑیں قدیم یونان، عیسائی روایات اور قوانین فطرت میں تلاش کی جاتی ہیں حالانکہ اس کا تاریخی ارتقاء بالکل واضح ہے جو کہ ایک خاص جغرافیائی علاقے میں ہوا اور رنگ و نسل اور مذہبی تعصبات سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکا ہے دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے ان انسانی حقوق کو انسان کے بجائے شہریوں کے حقوق کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ان حقوق کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو کہ کسی خاص ملک کے شہریوں کو صرف اسی ملک میں حاصل ہوتے ہیں اور دوسرے ممالک کے شہری وہاں ان حقوق کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اس طرح ان کی آفاقیت ختم ہو کر محدود ہو جاتی ہے اس طرح اگر غور سے دیکھا جائے تو انسانی حقوق کا یہ مغربی ایڈیشن ایک نظریئے اور مذہب کی حیثیت حاصل کرتا جا رہا ہے جسے کہ مادیت کے فلسفے نے جنم دیا ہے کیونکہ ان انسانی حقوق کو مغرب کے نزدیک تمام مذاہب اور روایات پر برتری حاصل ہے اور اس سے ان کا مقصد ہے کہ مختلف قومیں، گروہ اور علاقے اپنے قومی اور مذہبی امتیازات کھو کر مغرب کی اس تہذیبی

شاداب ڈسمبر ۹۹۶

یلغار میں ختم ہو جائیں۔

یہاں انسانی حقوق سے متعلق مغرب کے نقطۂ نظر کی وضاحت اس لیئے کی گئی ہے کہ اسلام کے حقوق کے تصور کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اسلام انسان کو بنیادی طور پر خواہش نفس اور ا جیسے دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات دلاتا ہے اور اسے ایک خدا کا بندہ بناتا ہے اس کو اشرف المخلوقات اور زمین پر خدا کا خلیفہ بتاتا ہے اور اس کے مطابق کائنات کی تمام چ انسانوں کی خدمات کے لئے پیدا کی گئی ہیں تمام اسلامی اقدار، اصول اور روایات ان کو تحفظ اور عزت عطا کرتی ہیں اس طرح سے اسلام میں جو انسانی حقوق دیئے گئے ہیں وہ کو بحیثیت انسان کے حاصل ہیں کسی خاص مملکت کا شہری ہونے کی حیثیت سے نہیں۔ انسانی کو اسلام میں واجبات کا درجہ حاصل ہے اور ان کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی ہے یہ واجب کھانے پینے، رہنے، تحفظ، خیالات، عقیدے، عبادت اور تعلیم کی آزادی، معاشرے بیداری وغیرہ سب کو شامل ہیں اور ہر مسلمان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ انہیں ادا کرے گا۔ چونکہ یہ حقوق اللہ کے عطا کردہ ہیں کسی انسان کے دیئے ہوئے نہیں۔ اس لیئے جگہ اور ز تبدیلی کے ساتھ ان میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ یہ ہر جگہ اور ہر زمانے کے لوگوں کے لیئے اہمیت کے حامل ہیں اور اسلامی شریعت کے مطابق ان حقوق کو بطور عبادت ادا کیا جاتا ہے ا انسانی حقوق کو نافذ کرنے والی شریعت ہوتی ہے اس لیئے یہ اقتدار کی دست برد سے بھی م رہتے ہیں اور بڑی حد تک اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان توازن کو یہ حقوق قائم ہیں اور ان کی ادائیگی ایک دوسرے کے لئے بھلائی کی طرف بڑھنے میں مہمیز کا کام دیتی ہے اجتماعی مفادات کو اسلام میں انفرادی مفادات پر ترجیح دیتا ہے اسی طرح اسلام میں شخص کو خودکشی کی اجازت نہیں اور نہ ہی کسی شدید طبی ضرورت کے بغیر کسی عضو کے کی اجازت ہے دوسری طرف ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ زمین کے ذرائع سے فائدہ ا کیونکہ اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان کو اس سے استفادہ کرنے کا پورا پورا

حاصل ہے۔

اسلام میں انسانی حقوق کو انسانی ضروریات کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے مثلاً یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے عقیدے کا تحفظ کرے اور اس پر زور ہے کہ وہ دوسروں کے عقائد کا خیال رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "تمہارے لیئے تمہارا دین اور میرے لیئے میرا"۔ اسلام ہر شخص کی زندگی کے لئے تحفظ فراہم کرتا ہے اور ہر شخص کو زندہ رہنے کا حق دیا ہے قرآن کا ارشاد ہے۔ "جس نے بغیر کسی حق کے کسی کی جان لی اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کیا (مائدہ ۳۲) اسی طرح ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کی آزادی ہے بلکہ اسے ایک فریضہ قرار دیا گیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔" یعنی بنیادی تعلیم ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اسی طرح اسلام نے ہر شخص کو اپنی جائیداد رکھنے کا حق دیا ہے یعنی ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس کھانا، کپڑا اور مکان ہو اسی طرح بیماری کی صورت میں اسے طبی سہولیات بھی ملیں اور کوئی شخص اپنی جائیداد سے اُس وقت تک محروم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ عوامی مفادات کو اس سے نقصان نہ پہنچ رہا ہو۔ اسی طرح ہر شخص کو ناموس کا تحفظ حاصل ہے ہر شخص کو حق ہے کہ وہ شادی کرے اور اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ جب کسی شخص کو شادی کی ضرورت ہو تو اس کے لئے اس کے مواقع فراہم کیئے جائیں اور انسان کی خاندانی ذمہ داریاں اسلام میں نہ صرف والدین اور اولاد تک محدود ہیں بلکہ اس کے آگے دوسرے رشتہ داروں تک وسیع ہیں اور انسان کو اسلام میں یہ سارے حقوق اس بنیاد پر حاصل ہیں: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "تم تمام آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔ لہذا اسلامی شریعت میں تمام لوگ برابر ہیں اور ان کے درمیان رنگ، نسل، زبان اور مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق اسلامی اصولوں کی مخالفت قرار پائے گی۔ مختصراً ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ عوامی دلچسپیوں میں حصہ لے، معروفات کے فروغ اور منکرات کے خاتمے میں حصہ لے کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں رکھتا وہ ان میں سے نہیں ہے۔

اس طرح حقوق اور ذمہ داریاں دونوں آپس میں مل کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جہاں ناانصافی اور خدا کے راستے سے ہٹا دینے والی چیزوں کا گزر نہیں ہوتا۔

اسلامی معاشرے میں مسلمان عورت کے کردار کے موضوع پر اخوان المسلمون نے اپنے بیان میں مسلمان عورت کے کردار کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ بیان کے مطابق اسلام میں عقیدے کی بنیاد پر مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے عقیدے کے معاملے میں عورت بھی مرد ہی کی طرح ماخوذ ہے اور اسی طرح حدود بھی ان پر یکساں طور پر نافذ ہوتی ہیں اور معاشی طور پر مسلمان عورت خود اپنی جائیداد کی مالک ہوتی ہے اخوان نے بیان میں واضح کیا ہے کہ عورتوں کے دین میں کمی کا مطلب ایمان میں کمی نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں وہ بہت سے فرائض ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں اسی کو ان کے دین کی کمی کہا گیا ہے اسی طرح مرد کی قوامیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت ہر حال اور ہر چیز میں مرد کے تابع ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت کی حفاظت اور کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے بیان میں عورت کی شوہر اور اس کے بچوں کی تئیں ذمہ داریوں کو بتلاتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ شوہر کی اجازت سے عورت کو کام کرنے کا حق حاصل ہے اور اس طرح کے معاملات میں انتظامیہ مداخلت کا حق نہیں رکھتی۔

بیان میں واضح کیا گیا ہے کہ عورت کو ووٹ دینے، منتخب ہونے اور سرکاری منصب حاصل کرنے کا حق حاصل ہے ووٹ دینے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ شریعت میں کہیں بھی کسی عورت کو ووٹ دینے کے حق سے روکا نہیں گیا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے "اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں (توبہ) ایک جگہ اور فرمایا گیا۔ "اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئیے جو بھلائی کی طرف بلاتا ہے اور برائیوں سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں (آل عمران ۱۰۴)

یہ آیتیں ایک عورت کو یہ حق دیتی ہیں کہ وہ معروفات کا حکم دے اور منکرات سے روکے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک جز مجالس قانون کے لئے نمائندوں کا انتخاب بھی ہے۔

اسی طرح شریعت میں کہیں بھی عورت کو منتخب ہونے سے روکا نہیں گیا ہے جن دلائل کی روشنی میں انہیں ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے وہی انہیں منتخب ہونے کا بھی حق دیتے ہیں اور اس کی مخالفت میں دیئے جانے والے دلائل کمزور ہیں۔

صرف سرکاری مناصب کے حصول کے سلسلے میں علماء اسلام کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں ان میں صدر مملکت یا حکومت کا عہدہ ایسا ہے جس کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ اس پر کوئی عورت فائز نہیں ہو سکتی۔ امام طبری اور ابن حزم ایک عورت کو بلا کسی شرط کے بقیہ سارے مناصب کے دیئے جانے کو جائز کہتے ہیں امام ابو حنیفہ بعض شرائط کے ساتھ اور حالات کو دیکھتے ہوئے اس کی اجازت دیتے ہیں جبکہ فقہا کی اکثریت اس سلسلے میں عدم جواز کی قائل ہے بیان میں اس طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ اس سلسلے میں حالات اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیئے ایسا ہو سکتا ہے کہ حالات کل تک جن چیزوں کی اجازت نہیں دیتے تھے آج کے بدلے ہوئے حالات میں وہ ناگزیر ضرورتیں بن گئی ہوں یہی چیز اس کے بالکل ہی برعکس بھی ہو سکتی ہے۔

بیان میں اخوان المسلمون نے اس سے متعلق مغرب کے طریقہ کار کو بالکل مسترد کیا ہے کیونکہ یہ معاشرہ عورت کو اخلاقیات اور پاک دامنی سے بالکل محروم کر دیتا ہے جبکہ اسلام کی اخلاقیات اور اقدار خدا کی عطا کردہ ہیں اور یہ عورت کو مکمل تحفظ فراہم کرتی ہیں۔

ڈاکٹر مجیو باحی

نیشنل ایوارڈ یافتہ قاضی حسن رضا سے ایک مذاکرہ

امرتسر داد را ایکسپریس جیسے ہی کھنڈوہ اسٹیشن پر رکی۔ پلیٹ فارم پر ہاتھوں میں رنگا رنگ پھولوں کے ہار گجرے، گلدستے، چہروں پر مسرت کی تمتماہٹ اور آنکھوں میں امڈتا ہوا خلوص لیے ڈیڑھ دو سو لوگوں کا ہجوم کوچ نمبر ایس۔ نمبر ۱ کے دروازے پر لپکا۔ یہ لوگ کھنڈوہ کی برگزیدہ شخصیت، مقبول و معروف شاعر اور اپنے آپ کو فنافی القدریس کر دینے والے جواہر ہائی اسکول کے پرنسپل قاضی حسن رضا کے اعزا، اقربا، رفقا، شاگرد اور عقیدتمند تھے جو موصوف کے دلی سے راشٹرپتی ایوارڈ لیکر لوٹنے پر ان کا استقبال کرنے کے لئے یکجا ہوئے تھے رضا صاحب کو مثالی مدرس کا یہ نیشنل ایوارڈ ۵ ستمبر ۹۶ء کو پرشکوہ وگیان بھون کی ایک باوقار تقریب میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ہاتھوں، ایک قابل قدر رقم کے چیک، ایک سند اعزاز اور تمغہ امتیاز کی شکل میں دیا گیا۔ رضا صاحب کے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی ان کے شیدائیوں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ بڑھ کر انھیں محبت اور عقیدت کے مہکتے ہوئے پھولوں سے لاد دیا۔ اسٹیشن سے اچھے خاصے جلوس کی شکل میں لوگ رضا صاحب کو لیے ان کے دولت کدے کی طرف بڑھے۔ راستے میں قدم بہ قدم گھرانے تہنیت پیش کر کے ان کا استقبال کیا گیا۔ گھر پہنچنے پر بھی رات دیر گئے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بیشتر احباب اور اعزا نے ہاروں اور گلدستوں کے ساتھ ساتھ مٹھائیوں کے پیکٹ، شالوں دوشالوں اور کپڑوں لتوں کے تحفے پیش کر کے اپنی چاہت کا مظاہرہ کیا۔ میں بھی خلوص و یگانگت کے اس منظر کا ایک حصہ ہوں۔ دیکھ رہا ہوں اور تصور میں آج سے ٹھیک دس برس پہلے کا وہ منظر گھوم رہا ہے جب ۱۹۸۶ء میں یہی نیشنل ایوارڈ لے کر میں اپنے وطن بارسی ٹاکلی پہنچا تھا

شاداب — ڈسمبر ۱۹۹۶ء

ریلوے اسٹیشن پر میرے بچوں اور ایک دو عزیزوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا، گھر آنے پر دوچار احباب نے آکر مبارکباد دے دی اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔ موازنہ کرتا ہوں تو عوامی مقبولیت اپنوں کی اپنائیت، احباب کی چاہت اور شاگردوں کی عقیدت ہر پہلو سے حسن رضا صاحب کو اپنے سے کئی گنا فائق اور عالی مرتبت پاتا ہوں۔ "ایں سعادت بزور بازو نیست" اپنی قسمت پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایسے مرد کامل کی دوستی کی سعادت سے مجھے نوازا۔ رات کافی بیت چکی ہے اس معاملے میں کل تفصیلی گفتگو کروں گا سوچ کر سو رہتا ہوں۔

دوسرے روز علی الصبح قاضی حسن رضا صاحب کے دولت کدے پر جا دھمکتا ہوں، طے شدہ پروگرام کے تحت رضا صاحب کے دست راست، جواہر بائی اسکول کے وائس پرنسپل حبیب عالم صاحب اور ان کے مخلص دیرینہ الحاج منشی خاں آزاد صاحب بھی موجود ہیں۔ رسمی علیک سلیک کے بعد چائے اور ناشتے کے دوران ذہن میں ترتیب کردہ سوالات کی لڑی سے پہلا سوال نکال کر رضا صاحب کے روبرو پیش کرتا ہوں۔

داھی : رضا صاحب تعلیم وتدریس کے سلسلے کا ملک کا یہ سب سے بڑا مایہ ناز اور قابل صد افتخار نیشنل ایوارڈ پاکر آپ کیا محسوس کر رہے ہیں ؟

رضا : (ایک طمانیت بخش مسکراہٹ کے ساتھ جو ہمیشہ اُن کے چہرے پر کھیلتی رہتی ہے) خدا کا شکر ادا کرتا ہوں بالخصوص اس لئے کہ اب بھی ہندوستان میں بالخصوص محکمۂ تعلیم میں حق بحقدار کے اصولوں پر عمل کیا جارہا ہے۔

داھی : لیکن پچھلے کچھ دنوں سے تو محکمۂ تعلیم کے بھی آئے دن بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کی داستانیں پڑھنے اور سننے میں آرہی ہیں، بوالہوسوں نے اس مقدس محکمے کو بھی دنیا بھر کی غلاظتوں سے آلودہ کر رکھا ہے ؟

رضا : بدعنوانیوں سے آپ کی مراد ؟

داھی : یہی ڈونیشن کے نام پر رشوت کی موٹی موٹی رقموں کے عوض نوکریاں، ٹیوشن کے بہانے

غبی، لیکن سرمایہ دار بچوں کے نمبرات بڑھانا اور استطاعت لیکن ذہین بچوں کا استحصال،
یہ سب بالخصوص خانگی تعلیمی اداروں میں دھڑلے سے ہو رہا ہے

حبیب عالم ، اس میں خانگی اداروں کی کوئی تخصیص نہیں ہے یہی سب مختلف صورتوں میں
سرکاری اداروں میں بھی چل رہا ہے خانگی تعلیمی اداروں کے لیے تو خیر ایک جواز بھی ہے کہ
کا قیام ہی رشوت کی بنیادوں پر رہا ہے جو بے چارا بابے چارے محکمۂ تعلیمات کے چپراسی سے
لے کر چیف سکریٹری اور ایجوکیشن منسٹر پر لاکھوں روپے خرچ کر کے کوئی چھوٹا یا بڑا تعلیمی ادارہ
کھولتے ہیں وہ اپنی لاگت کہاں سے نکالیں گے ؟

منشی آزاد : گویا اب تعلیمی ادارے بھی تجارت کی منڈیاں بن چکے ہیں جن میں منافع ہی منافع
ہے نقصان کا تو سرے سے کوئی خدشہ ہی نہیں۔

راہی : رضا صاحب ! آپ کا جواہر مڈل اسکول جو اب ایک ہائی اسکول کی شکل میں نمودار
ہو چکا ہے اور جسے جونیئر کالج کا روپ دینے کی آپ اور حبیب عالم ہمہ وقت کوشش کر رہے
ہیں یہ بھی ایک خانگی ادارہ ہے گستاخی تو کیا یہاں بھی یہ سب . . . .

رضا : (بات کاٹتے ہوئے نہایت سنجیدہ اور پُرسکون لہجے میں) جی نہیں۔ ہم نے رشوت
یا ڈونیشن کی آلائش سے اپنے ادارے کا دامن پاک رکھا ہے۔ چند برسوں میں ایک چھوٹے
سے قطعۂ اراضی پر جو آپ یہ کئی کمروں پر مشتمل دو منزلہ عمارت دیکھ رہے ہیں نا ؟ اس میں ہم نے
اپنے تاجر اور خوشحال دوستوں، بہی خواہوں، علم کے شیدائیوں اور اپنے فارغ شدہ طلبات
عطیات کی شکل میں نقد رقمیں، سمنٹ، چونا، اینٹ، پتھر اور لوہے کی شکل میں تعمیری اشیاء
حاصل کیا ہے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی ہے اپنی تنخواہیں تک اس کی تعمیر میں جھونک
دی ہیں (حقیقت بیانی کے ساتھ رضا صاحب کے چہرے پر تمتماہٹ اور لہجے میں ہلکی سی نرمی
بھی آگئی ہے فرما رہے ہیں) راہی صاحب کویلو کی جس بوسیدہ چھت کے نیچے آپ بیٹھے ہیں یہ
میرے والد مرحوم قاضی سید اکرام اللہ سے وراثت میں ملی ہے گزشتہ تین دہائیوں میں

شاداب — دسمبر ۱۹۹۶ء

اپنی کھیتی کی فصل کے علاوہ اپنی اور اپنی مرحومہ بیوی نیلوفر قاضی (جو معلّمہ تھیں) کی مشترکہ آمدنی سے اس شکستہ چھت اور ان مٹی کی کچی دیواروں کو تک بدلوا نہیں سکا۔ آپ جانتے ہیں۔

راہی: جی ہاں! جی ہاں! ایک میں ہی کیا زمانہ جانتا ہے کہ لوگوں نے تعلیمی اداروں کو سکّے ڈھالنے والی مشینوں کی طرح استعمال کیا اور اپنے شکستہ کھنڈروں کو پُرشکوہ محلات میں تبدیل کر دیا ہے۔

حبیب عالم: ہمارے شہر کھنڈوہ میں ایسی بہتیری مثالیں ہیں۔ کہیئے تو..

راہی: جی نہیں۔ کھنڈوہ کوئی ہندوستان سے باہر تھوڑے ہی ہے پورا ملک ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ رضا صاحب مجھے اس چھیڑ خانی کے لئے درگذر فرمائیں مجھے بخوبی علم ہے کہ جہاں تک آپ کا تعلیمی ادارے جاری کرنے اور انہیں چلانے کا معاملہ ہے آپ کا دامن نہ صرف یہ کہ مروجہ آلائشوں سے قطعی پاک ہے بلکہ آپ کی ذات تو اس میدانِ ظلمات میں ہم جیسوں کے لئے مینارۂ نور، باعثِ تقلید اور درسگاہوں کے تاجروں کے لئے درسِ عبرت ہے۔

رضا: دراصل آپ کا سوال ماضی کی کچھ ناخوشگوار اور تلخ یادوں کے زخم تازہ کر گیا۔

راہی: ان تلخ یادوں کا تعلق اس اسکول سے تو نہیں جسے نوجوانی میں اپنے احباب کے اشتراک سے آپ نے قائم کیا تھا اور بعد میں کسی وجہ سے آپ ہی کو اسکول سے بے دخل کر دیا گیا۔ کیا آپ زخموں کی ٹیسیں برداشت کرتے ہوئے متعلقہ حالات پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

رضا: خاصی طویل، دردناک اور عبرت انگیز کہانی ہے راہی صاحب۔ دیکھیئے جتنا کچھ یاد ہے بیان کیئے دیتا ہوں۔ میری ایک پرانی غزل کا مقطع ہے ؂

شورشِ محشر بپا کرنا ہی میرا کام ہے — میں پہاڑوں سے گرتی گنگا آبشاروں کی طرح

(میں داد دینا چاہ رہا تھا لیکن رضا صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا)

شورش برپا کرنے کا سودا زمانۂ طالبعلمی ہی سے سر میں تھا مجھ جیسے ہی کچھ اور دیوانے بھی اس شغل دیوانگی میں میرے ساتھ ہو گئے۔ دیوانوں کے اس قافلے کے قافلہ سالار تھے آج کی اردو دنیا کی ایک

شاداب   دسمبر ۱۹۹۶ء

تابندہ شخصیت مظفر حنفی' جو ان دنوں کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پروفیسر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں ان کے علاوہ مرحوم حسن بشیر' مرحوم علی احمد قریشی' قاضی انصار' سید مقصود علی' ایس ایم جلیس اور ایڈوکیٹ عبدالشکور کے علاوہ بھی بیشتر احباب اس دشت کی سیاحی میں ہمارے ہمسفر تھے جس اسکول کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ آج کا اردو بوائز سیکنڈری اسکول ہے ہم نے اس کے قیام کے لیئے ۱۹۵۸ء میں مظفر حنفی کے مشورے سے کھنڈوہ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی اسی سال نیشنل اردو لائبریری اور ۵۹ء میں اردو بوائز اسکول کا قیام اسی انجمن کے تحت عمل میں آیا۔ علاوہ ازیں کھنڈوہ کے نواحی قصبوں کھرالہ' سیرسود۔ بلڈی اور منڈواڑہ میں اردو اسکول جاری کیئے جو آج بھی نہایت کامیابی سے چل رہے ہیں۔

داھی ، اردو بوائز اسکول سے آپ کی بے دخلی کی وجہ ؟ جبکہ آپ کا نام اس کے بانیوں میں سرِ فہرست آتا ہے۔

رضا ، دراصل اسی زمانے میں مظفر حنفی کو بسلسلۂ ملازمت ترک وطن کر کے بھوپال جانا پڑا اور انتظام کچھ ایسے مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جنھیں ہم جیسے حق گو یوں کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ لہٰذا پہلے مرحوم حسن بشیر کو اور بعد میں بی ایڈ کر کے لوٹنے پر مجھے ان لوگوں نے برطرف کر دیا۔ میں چاہتا تو مقدمہ آرائی کر کے ان لوگوں کو ٹھکانے لگا سکتا تھا لیکن ایسا کرنے میں اسکول کو نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا جو میرے لیئے ناقابل قبول تھا۔

داھی ؛ اور یہ موجودہ جواہر ہائی اسکول جس کے آپ پرنسپل ہیں ؟

رضا ، اردو بوائز اسکول سے بیدخلی کے فوراً بعد مجھے شہر کے چند مخلص اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھنے والے لوگ مل گئے جن کی معاونت اور مشوروں سے ۱۹۷۱ء میں جواہر مڈل اسکول کی بنیاد ڈالی گئی جو آج بحمد للہ نیک نامی کے ساتھ ایک بہترین ہائی اسکول کی شکل میں آپ کے سامنے ہے

داھی : بہترین اور مثالی مدرس کے نیشنل ایوارڈ کے لئے آپ کا انتخاب کن خطوط پہ کیا گیا ؟

رضا : بھئی ہم نے تو ہر کام ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیئے بغیر صرف اپنا فرض جان کر کیا ہے اس

تعلق سے تفصیلات میرے دوست راست حبیب عالم ہی بہتر طور پر بتا سکیں گے۔

حبیب عالم: جہاں تک حسن رضا صاحب کی تعلیمی خدمات کا تعلق ہے از اول تا حال ان تمام کا شمار کرنا میرے بس سے باہر ہے البتہ جب سے جواہر ہائی اسکول میں اُن کی ماتحتی میں آیا ہوں بتا سکتا ہوں کہ جب گاہے گاہے معائینے کے لئے آنے والے محکمۂ تعلیم کے افسران کے علاوہ تعلیم و تدریس سے دلچسپی رکھنے والی سیاسی، سماجی اور علمی شخصیتوں نیز طلبار کے باشعور سرپرستوں نے اسکول اور طلبار کی ہمہ جہت ترقی کے لئے رضا صاحب کی شبانہ روز بے لوث اور انتھک جد و جہد کے مثبت اثرات کے زیر اثر طلبار کی صلاحیتوں کو ابھرتے دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس مسلسل بیمار رہنے والے مرد مجاہد نے اپنے دن رات ایک کر کے آئے دن جلسوں، مشاعروں اور سمیناروں جیسی تقریبات کے بہانے مخیر حضرات کو مدعو کر کے انھیں ترغیبات دلائیں اور ان سے مختلف صورتوں میں چھوٹے بڑے عطیات حاصل کر کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم الشان عمارت ایستادہ کر دی۔ دیکھا کہ یہ بال بچے دار شخص اپنی گھریلو ذمہ داریوں اور ذاتی ضرورتوں سے بے نیاز اسکول کے اوقات کے علاوہ بھی گھنٹوں بچوں کی تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیئے ان پر وقت صرف کرتا ہے نادار بچوں کے لیئے تعلیمی وسائل خود اپنی جیب سے خرچ کر کے مہیا کراتا ہے افسرانِ تعلیم نے مجھے حکم دیا کہ میں حسن رضا صاحب کے تعلق سے ان کی مختلف الجہات کارگزاریوں پر مشتمل دستیاب کاغذات اور اسناد یکجا کر کے محکمے کو بھیج دوں تو میں نے تعمیل حکم کے تحت جو کچھ مل پایا یکجا کر کے افسران تعلیم کی خدمت میں بھیج دیا اور سب کچھ بھول بھال کر اپنی روزمرہ تعلیمی و تدریسی مصروفیات میں لگ گیا کہ ایک روز اچانک ریڈیو اور ٹی وی نے اپنی خبروں میں یہ نوید سنائی کہ رضا صاحب نیشنل ایوارڈ کے لئے منتخب کر لیے گئے ہیں بعد کی تفصیلات کا آپ کو علم ہے۔

دراہی: شکریہ عالم صاحب۔ رضا صاحب۔ یہ تمام باتیں تو آپ کی تعلیمی اور تدریسی خدمات کے بارے میں ہوئیں۔ اب کچھ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے تعلق سے بھی روشنی ڈالتے چلیئے۔ اول تو یہ کہ آپ کے اندر تخلیقی شعر و ادب کا ذوق پیدا ہونے کے محرکات و عوامل کیا تھے اور اس کی آبیاری کے لیئے کون کون سے

اسباب و وسائل آپ کو حاصل ہوئے ؟

رضا: آباؤ اجداد عہد شاہجہانی سے قاضی شہر تھے گھر میں مذہبی کتب کے ساتھ ساتھ فارسی، اردو ادب کی مشہور زمانہ کتب مثنوی مولانا روم، گلستان و بوستان سعدی۔ دیوان حافظ، میر، غالب حالی اور اقبال کے دواوین اور شبلی، سرسید، مولانا آزاد وغیرہ کی تصانیف پر مشتمل کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود تھا۔ اس زمانے کے مشہور زمانہ اخبارات ورسائل مثلاً الہلال، اخبار ریاست، ایمان، خیام، مولوی، نگار، معارف، سنگ میل اور ماہ نو پابندی سے آتے تھے لہٰذا دوران طالب علمی ہی سے لکھانے کی دھن پیدا ہو گئی تھی اس کے بعد تعلیمی سفر میں جب پروفیسر مظفر حنفی میرے ہمسفر ہوئے اور ہمسفری دوستی میں تبدیل ہو گئی تو میرے تخلیقی ذوق کو اور جلا ملی اور میں مظفر حنفی کے ساتھ تخلیق ادب میں سرگرم حصہ لینے لگا۔

واقفی: بقول آپ کے، آپ کے اور مظفر حنفی صاحب کے تخلیقی سفر کی شروعات ایک ساتھ ہوئی۔ مظفر حنفی کا نام تخلیق کار، نقاد، محقق، مترجم، افسانہ نگار وغیرہ کی حیثیت سے تقریباً ایک سو کتابوں کے ساتھ وابستہ ہے جبکہ آپ تا حنوز اپنے صرف دو شعری مجموعوں "میثاق" اور "غبار احساس" پر اکتفا کیے ہوئے ہیں دیگر یہ کہ آپ کی شعری تخلیقات ہند و پاک کے معیاری جرائد میں شائع ضرور ہوتی ہیں لیکن مظفر حنفی کے مقابلے میں بہت کم ایسا کیوں ہے ؟

رضا: بھئی دیکھئے۔ پہلے تو میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا چلوں کہ مظفر حنفی بچپن ہی سے ہر میدان میں مجھ سے کچھ زیادہ ہی تیز و طرار رہے ہیں دوسرے یہ کہ انھیں وہ ماحول، مواقع، وسائل اور اسباب و عوامل بھی نسبتاً بہتر حاصل رہے ہیں جو تخلیقی ذوق کی آبیاری کے لیئے از حد ضروری ہوتے ہیں علاوہ ازیں ایک وجہ میرے بچھڑ جانے کی مظفر حنفی کا آغاز سفر ہی میں نقل وطن کر جانا ہے دیر تک اور دور تک ان کا ساتھ رہتا تو صورت حال یقیناً کچھ اور ہوتی اور تیسری ایک خاص وجہ میسر آئے دن ہمہ وقت مختلف تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں لگے رہنا بھی ہے جن کی وجہ سے مجھے تخلیقِ ادب کے لیئے کم مہلت مل پاتی ہے۔

شاداب — دسمبر ۱۹۹۶ء

راہی: تاہم آپ نے جتنا بھی ادب تخلیق کیا ہے وہ سنجیدہ، فصیح، جاندار اور معیار و وقار کی عظمتوں سے ہمکنار ہے آپ کے دونوں شعری مجموعوں کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہو چکی ہے۔ ہند و پاک کے تقریباً سبھی معیاری رسائل میں آپ کی تخلیقات نمایاں طور پر شائع کی جاتی ہیں آپ نے اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے درس گاہوں، انجمنوں، جلسوں، سیمیناروں اور مشاعروں کے سلسلوں سے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اپنے دیرپا مثبت اور پائیدار نتائج کے پیش نظر آپ کو دوسروں سے منفرد کرتی ہیں۔

راہی: اب اس سلسلے کا آخری اور نہایت اہم سوال جو ماہنامہ "نئے چراغ" سے متعلق ہے جس کا ذکر مظفر حنفی نے اپنے مختلف مضامین میں کیا ہے۔ رضا صاحب میں جاننا چاہوں گا کہ کھنڈوہ سے نئے چراغ کا اجراء کن مقاصد کے تحت عمل میں آیا۔ نیز اس کے وسائل، زندگی اور موت (طبعی یا غیر طبعی) کے تعلق سے کچھ ارشاد فرمائیں؟

رضا: دراصل کھنڈوہ اور اس کے نواح میں ہم لوگوں نے جو تعلیمی اور علمی و ادبی تحریکات کا ایک جال سا بچھا رکھا تھا۔ اپنی آواز کو مؤثر بنا کر اسے دُور تک پہنچانے کی غرض سے ہم نے مظفر حنفی کی رہنمائی میں ۱۹۵۶ء میں کھنڈوہ سے ایک خالص ادبی ماہنامے "نئے چراغ" کا اجراء کیا۔ مدیر اعلیٰ مظفر حنفی جبکہ نائب مدیران میں اس خاکسار کے علاوہ مرحوم حسن بشیر اور قاضی انصار کے نام شامل تھے۔ کتابی سائز میں بڑی ضخامت کے ساتھ باقاعدگی سے نکلنے والے اس نوزائیدہ پرچے نے دو تین شماروں ہی میں ہند و پاک کے اعلیٰ ادبی حلقوں میں اپنے لیے جگہ بنالی۔ لوگ جدیدیت کا سہرا صرف "شب خون" کے سر باندھ کر رہ جاتے ہیں اگر وہ "نئے چراغ" کی مکمل فائل بنظر غائر دیکھیں تو انھیں اندازہ ہوگا شعر و ادب میں جدید رجحانات کے لئے فضا اولاً "نئے چراغ" ہی نے بنائی۔ نیاز فتح پوری، قاضی عبدالودود وغیرہ احتشام الدین، فراق، شاد عارفی، جگر، نوح، جذبی، عدم، احمد ندیم قاسمی، اور نئے لوگوں میں قاضی سلیم، بشیر بدر، راہی معصوم رضا، شہریار، ندا فاضلی، عمیق حنفی، خلیق انجم، نثار احمد فاروقی اور اثر نواز جیسے قلمکار نئے چراغ کے مستقل لکھنے والوں میں تھے ان میں سے بیشتر

نے تو اپنی پہچان ہی نئے چراغ کی روشنی میں بنائی۔ نئے چراغ کے کل اٹھارہ شماروں میں پندرہ
مدیر اعلیٰ کی جگہ مظفر حنفی باقیہ میں مرحوم حسن بشیر اور اس کے بعد ان کے نام شامل ہیں مظفر
کے کھنڈوہ کو خیر باد کہہ دینے کے بعد طوعاً و کرہاً ہمیں وہ رسالہ بند کر دینا پڑا ۔
راہی، خدا کا شکر ہے کہ آپ کی تمام تر زندگی قوم و ملت کی تعمیر و تشکیل میں گزر گئی۔ اب آپ کے مشاغل
ایسی حالت میں کہ آپ اکثر بیمار رہنے لگے ہیں اور نسبتاً کمزور بھی ؟
رضا : بھئی راہی صاحب میں سخت احتجاج کرتا ہوں آپ کے اس سوال پر۔ میں کس پہلو سے
کو بیمار اور کمزور دکھائی دینے لگا ہوں۔ اپنے چشمے کا نمبر بدلوا دیجیے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر
علی الصبح اُس کی یاد میں سجدہ گزار ہوتا ہوں۔ اور صبح سے رات گئے تک کیا گھر کیا سڑک اور
اور کیا اسکول ہمہ وقت تعلیمی، تہذیبی اور ملی مسائل بردرپیش قوم و ملت کی گتھیاں سلجھاتا ر
یہ میرے روزمرہ معمولات ہیں اسی درمیان بخار و غار آتا بھی ہے تو میری بے نیازانہ روش
جلد بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔
راہی : (میں اس مرد خدا کے کوہ شکن حوصلوں کی دل ہی دل میں داد دیتے ہوئے آخری سو
اُن کی خانگی زندگی سے متعلق ہے پیش کرتا ہوں۔ جواب میں حسن رضا صاحب کبھی جذباتی او
غیر جذباتی لہجے میں فرماتے ہیں خاندان تو خاصا لمبا چوڑا ہے لیکن گھر میں اب صرف میری چھوٹی
اور دو بیٹے عمران اور سفیان ہیں رفیقہ حیات نیلوفر ۱۹۸۶ء میں داغ مفارقت دے کر
میں جا بسیں ۔ بڑی بیٹی زیبا برہان پور میں بیاہی گئی ہے اور اپنے خاوند، بچوں اور سسر
والوں کے ساتھ خوش و خرم ہے لیکن میری ذمہ داریاں صرف اپنے گھر اور خاندان تک محد
میرے طلباء، اساتذہ، معاونین اور دوست احباب پر مشتمل میرا اپنا ایک بہت بڑا کنبہ
میں ان کے درمیان خوش رہتا ہوں اور وہ سب مجھ سے خوش رہتے ہیں آپ بھی خوش ر
راہی صاحب۔ خدا حافظ۔ ابھی چائے بھیجتا ہوں کہہ کر اندر چلے جاتے ہیں ۔
اور میں محسوس کیے بنا نہیں رہتا کہ اس خوشی کے اظہار کے پیچھے اس شخص کے دو

ڈسمبر ۱۹۹۶ء

شاداب

نذرِ غموں کا کتنا بڑا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ دکھوں کے کتنے رستے ہوئے گھاؤ چھپا کر یہ شخص فضاؤں میں قہقہے بکھیرتا ہے زخموں سے چھلنی جگر رکھتے ہوئے ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا ہے خود یاسیت کی تاریکیوں میں گھرا ہمہ وقت مسرتوں کے اجالے بکھیرتا رہتا ہے بڑے دل گردے کا معاملہ ہے اعلیٰ ظرفی کی ایسی مثالیں اب شاذ ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ چائے کے کش لیتے ہوئے ایک عجیب خوشگوار اور سبق آموز تاثر لیے میں اجازت طلب کرتا ہوں ۔

(بقیہ سلسلہ صہ ۱۲ سے آگے)

اور سرمایۂ شاعری کی عزت و آبرو برقرار رہ سکے۔

ایک قاری کے احساسات آپ تک پہنچ رہے ہیں اس بات کی اُمید رکھنا خوش فہمی ہوگی کہ آپ سنجیدہ اور شریفانہ طرزِ تحریر اختیار کرتے ہوئے ان اعتراضات کو رفع کریں کیونکہ آپ کے دوست، محسن اور سرپرست جناب نیسؔر کے نقشِ قدم کو آپ اپنا رہبر بناتے ہیں۔ اُن کے پانچویں مجموعۂ کلام "خوشبو کے سفر" پر اعتراضات کا جواب اب تک وہ نہ لکھ سکے اور نہ لکھا سکے۔ آپ دونوں "حرمتِ قلم کے ساتھ جواب دیں یا دلوائیں تو پھر یہ سلسلہ کچھ رنگ لائے اور بھٹکے ہوئے راہ پر آئیں۔ رئیس اختر کی نام نہاد شاعری پر بہ حیثیت قاری مختصر مضمون سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

شاعری کے عنوان پر آپ کی مہملات و خرافات کی تفصیل آئندہ شمارے میں ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

✡ مضامین کا طلبیدہ ہونا ضروری نہیں

✡ جواب طلب امور کے لئے مناسب ڈاک ٹکٹ کا آنا ضروری ہے

شاداب
ڈسمبر ۱۹۹۶ء

پروفیسر لطیف احمد سبحانی

ایک تحریک

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد میں شعبہ اردو کا قیام

عزت مآب صدر جمہوریہ ہند شری شنکر دیال شرما جس وقت مہاراشٹرا کے گورنر تھے آپ نے اردو کے تعلق سے ممبئی میں کہا تھا۔ " اس سے بڑی کوئی اور حماقت کی بات نہیں ہو سکتی کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی زبان کہنے کا حق حاصل ہے کیونکہ یہ ہندوستانی عوام کی زبان ہے اور عوام کی زبان ہمیشہ زندہ رہتی ہے اردو بھی زندہ رہے گی اس لئے نہیں کہ اس کی پشت پناہی کوئی چیف منسٹر کر رہا ہے بلکہ اس لئے کہ یہ خود ایک جاندار زبان ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ ہندوستانی فلموں کی زبان ہے اور فلم والے بے وقوف نہیں ہوتے یہ لوگ وہی کام کرتے ہیں جس میں اُن کا فائدہ ہو۔ اردو اگر گھاٹے کا سودا ہوتی تو آج فلم کا وسیلہ اظہار نہ ہوتی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان فلموں کا سنسر سرٹیفکیٹ اردو کا ملتا ہے یا ہندی کا" اُن کی زبان بہرحال اردو ہی ہوتی ہے اور اُن کو ہندوستان کے کروڑوں عوام دیکھتے اور سمجھتے ہیں "

ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے اس بیان سے اردو کی مقبولیت، ہمہ گیری اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ مرہٹواڑہ جو علم و ادب کا گہوارہ ہے جس کا تابناک ماضی سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ولی دکھنی، سراج اورنگ آبادی۔ شفیق، مولوی عبدالحق اور شیخ چاند کا شہر اورنگ آباد دراویڈی، آرین اور مسلم تہذیب کا ملا جلا ایک حسین گلدستہ

یہ اُردو کا شہر ہے جہاں غیر مسلم حضرات بھی بے ساختہ اُردو بولتے ہیں آزادی کے پچاس برس کے بعد بھی ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی "شعبۂ اُردو" کے قیام کے سلسلے میں پس و پیش کر رہا ہے۔ ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے

یوں تو یونیورسٹی میں "شعبۂ اُردو" کے قیام سے متعلق عرصے دراز سے ہل چل جاری ہے۔ نیز اُردو نواز، اُردو پرست اور اُردو دوست حضرات انفرادی طور پر کافی تگ و دو کرتے رہے ہیں۔ مہاراشٹرا اُردو اکیڈیمی سے" اُردو چیئر" کے قیام کے لئے پانچ لاکھ روپئے بھی حاصل کئے گئے تھے لیکن افسوس صد افسوس! چھ سو ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی وسیع و عریض یونیورسٹی میں چھ سو ایکڑ فٹ جگہ کی گنجائش بھی میسر نہیں ہے جس پر شعبۂ اُردو" کی علیٰحدہ عمارت تعمیر کی جاسکے۔

چنانچہ اُردو کے ساتھ ناانصافی اور مرہٹواڑہ کے اُردو داں طبقے کی حق تلفی کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے محمد مشتاق احمد کارپوریٹر (اورسوشل ورکر) کی سرکردگی اور رہنمائی میں مرہٹواڑہ اُردو ایکشن کمیٹی نے وائس چانسلر ڈاکٹر شیوراج ناکاڈے سے ملاقات کی اور ایک یادداشت پیش کیا ہے کہ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے قیام اور علیٰحدہ عمارت کی تعمیر کی جانب توجہ مبذول کروائی۔ اگر یونیورسٹی کے ارباب مجاز عمارت کی تعمیر خود نہیں کرسکے تو اُردو ایکشن کمیٹی خود اپنے وسائل سے عمارت تعمیر کروائے گی! واقعی یہ ایک جرأت مندانہ قدم ہے صد قابل تحسین عمل ہوگا جس طرح ہم نے مسلم پرسنل لا ء میں ترمیم کے سلسلے میں ملک گیر پیمانے پر ایک منظم تحریک چلائی تھی بابری مسجد کے تعلق سے احتجاج ہوا تھا اور ہزاروں مسلمانوں نے جام شہادت نوش فرمایا اورنگ آباد کے تبدیلیٔ نام کے خلاف تحریک آرائی ہوئی۔ عدالت عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ اسی طرح شعبۂ اردو کے قیام اور ملک کی تمام ریاستوں میں اُردو دوسری سرکاری زبان سے متعلق ایک ایسی ہی منظم تحریک وقت اور حالات کا تقاضہ ہے۔ اس بے یقینی کے دور میں اشد ضروری بھی ہے

ہم ہمارے ..... [illegible]

حال ہی میں آندھرا پردیش کے آٹھ اضلاع میں اُردو دوسری سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کا اعلان ہوا جو اُردو کے حق میں ایک نیک شگون ہے ۴ر فروری ۱۹۷۸ء کو نئی ریاست گوا نے ایک بل پیش کیا تھا جس کی رو سے تین زبانوں کے حقوق منظور کر لیئے گئے ہیں۔ کونکنی (دیوناگری رسم الخط میں) مراٹھی اور گجراتی ان تینوں زبانوں کو سرکاری مقصد کے استعمال کیا جانے لگا۔ یہ بل اُردو کے حق میں نیک فال ثابت ہوگا۔

یوپی میں جہاں کثیر تعداد میں اُردو داں طبقہ رہتا بستا ہے اُردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کے سلسلے میں عرصۂ دراز سے جدوجہد کی جارہی ہے یہ اُردو کا گھر ہے چند برس پہلے ملک زادہ منظور احمد اور مالک رام مرحوم نے اُردو کی ترقی کے سلسلے میں ایک تحریک چلائی تھی۔

دنیا میں بے شمار ممالک ہیں جہاں ایک سے زائد سرکاری زبانیں رائج ہیں لبنان میں عربی اور فرانسیسی دونوں زبانیں قومی ہیں۔ کینیڈا میں انگریزی اور فرانسیسی دونوں سرکاری زبانیں ہیں۔ زمبابوے میں چار زبانیں سرکاری ہیں۔ ہندوستان میں ریاست بہار ایک ایسی ریاست ہے جہاں ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔

"دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اگر آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ یہ خواہش کرے اور مطالبہ کیا جائے کہ کوئی مخصوص زبان سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کی جائے اور اگر صدر مطمئن ہو جائے تو ہدایت دے کہ ایسی زبان ریاست کے کچھ حصوں میں یا پورے صوبے میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔"

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اترپردیش ایک ایسی ریاست جہاں اُردو والوں کی سب سے زیادہ تعداد ۹۲ء۱۵ فی صد ہے۔ لسانی اعتبار سے اُردو زبان کا دوسرا نمبر ہے۔ مہاراشٹرا میں اُردو داں طبقہ ۴ا فی صد ہے اور مراٹھی لولنے والوں کے بعد دوسرا نمبر اُردو کا ہے۔

۱۹۵۶ء میں فضل علی کمیشن کے مطابق ہندوستان کی ۱۶ لسانی ریاستوں کی جدید تنظیم عمل میں آئی ہر لسانی ریاست میں اکثریتی طور پر بولی جانے والی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور ہندی کو تمام ملک کے لیئے رابطہ کی زبان تسلیم کر لیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی لسانی بنیادوں پر تقسیم ہی ملک کی وحدت، یکتا اور قومی یکجہتی کے لیئے بڑا خطرہ ثابت ہوئی۔ جس نے علاقائی قومیت کو اولیت دی اور ہندوستان کی حب الوطنی کو شدید نقصان پہنچایا۔ ایک ہی ریاست میں رہنے والے مختلف زبان بولنے والے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے ہر ریاست میں دوسری لسانی اقلیتیں بھی رہتی ہیں۔ ان کو اپنے ریاست کو سرکاری کا سیکھنا ضروری ہو گیا ہے کیوں کہ یہ زبان سرکاری کاروبار کی زبان بن جاتی ہے اُردو جاننے والے ملک کی ہر ریاست میں موجود ہیں ان کی تعداد پورے ملک میں ۱۵ فی صد سے زیادہ ہے اس کی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اُردو تاج محل سے بھی زیادہ حسین و پُرکشش ہے قطب مینار سے زیادہ بلند و برتر ہے۔ تخت طاؤس اور کوہ نور سے بھی زیادہ قیمتی اثاثہ ہے یہ قومی اتحاد کی زبان ہے اس نے ہماری ثقافتی اور سیاسی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اس نے بھارت کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ یہ زبان ہی نہیں بلکہ تہذیبی ورثہ ہے۔ ہماری شناخت ہے۔ یہ اُردو ہی تھی جو گذشتہ تین سو برس سے عملاً پورے ہندوستان اور خاص کر شمالی ہند کی عام قومی زبان رہی تھی۔

ابراہیم عادل شاہ نے اُردو کو دفتری زبان قرار دیا تھا۔ اُردو کی ہمہ گیری اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ۱۸۳۲ء میں اُردو پورے ہندوستان کی سرکاری اور عدالتی زبان قرار پائی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں میر محبوب علی خان نے اپنی سلطنت کی سرکاری و دفتری زبان اُردو کو قرار دیا تھا

سید نعمان غنی دیلوری

حق گوئی کا سبق

کیوں ہر آدمی اپنے چہرے پر "سچ" کی نقاب ڈال کر جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ لکھتا، جھوٹ شائع کراتا ہے، جھوٹی گواہی دیتا ہے اور جھوٹا سرٹیفکیٹ دیتا ہے ــــ ؟ کیوں برائیوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹتا ہے ؟ اس وقت علم و دانش اور عقل و شعور کا دعویٰ کرنے والوں کی ساری دانائی اور سارا علم کہاں چلا جاتا ہے ؟ کیوں وہ چاہتا ہے کہ "جھوٹ" اور برائیوں کے آواز بلند نہ ہو ؟ کیوں عوام ہی نہیں بلکہ علماء، صوفیاء، دانشور اور رہنما سچ بول کر اور برائیوں کے خلاف زبان سے اظہار کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں جزا پانے کی جراءت نہیں کرتے ؟ جس دن انسان اپنے دل و دماغ سے کوڑا کرکٹ صاف کر کے احکام الٰہی اور فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہوئے "حق گوئی" پر عمل شروع کر دے گا اور برائیوں کی نشاندہی کر کے اعلانیہ بے خطر اظہار کرے گا تو اس دنیا کا نقشہ ہی بدل جائے گا اور قرآن اپنے ماننے والوں سے اسی فلاح اور روشنی معاشرے کا طلب گار ہے۔

اللہ نے "قول سدید" کا حکم دیا ہے یعنی جو بات جیسی ہے ویسا ہی اسے بیان کرنا، درست بات، سچ بات اور صورت واقعہ کے موافق بات کہنا، اپنی طرف سے اس میں نہ ایک لفظ بڑھایا جائے اور نہ گھٹایا جائے جوں کا توں بیان کیا جائے۔ خواہ وہ گفتگو میں ہو، تحریر میں ہو، مذاق میں ہو، تقریر میں ہو، گواہی میں ہو یا زندگی کے کسی معاملے میں ہو یہی حق گوئی ہے۔ اگر اس کے برعکس ہو تو وہ "جھوٹ" ہے اور وہ شخص بھی جھوٹا ہے جو کسی بات کو بلا تحقیق بیان کرتا چلے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کے جھوٹا ہو۔

کرے تئے یہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے (بلا تحقیق) بیان کردے۔ مسلم اگر ہم حق گوئی کا سبق بھول گئے ہیں اس لئے ہمارے بہت سارے معاملات بگڑ چکے ہیں اور بگڑ رہے ہیں ہمارا معاشرہ برائیوں کی غلاظت میں ڈوبا جارہا ہے سچ سننا اور اس کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا ہے اور سچ کا اظہار کرنا اس سے زیادہ مشکل۔

سورہ احزاب میں حکم الٰہی ہے کہ "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے گا وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔ (آیت ۷۰)

مولانا مفتی محمد شفیع رحمتہ اللہ علیہ معارف القرآن میں اس آیت مبارک کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قول سدید کی تفسیر بعض نے صدق کے ساتھ کی، بعض نے مستقیم اور بعض نے صواب وغیرہ کی ہے ابن کثیر نے سب کو نقل کر کے فرمایا کہ سب حق ہیں مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم نے اس جگہ صادق یا مستقیم وغیرہ کے الفاظ چھوڑ کر سدید کا لفظ اختیار فرمایا کیونکہ لفظ سدید ان تمام اوصاف کا جامع ہے اس لئے کاشفی نے روح البیان میں فرمایا کہ قول سدید وہ قول ہے جو سچا ہو جھوٹ کا اس میں شائبہ نہ ہو۔ صواب ہو جس میں خطا کا شائبہ نہ ہو، ٹھیک بات ہو ہزل یعنی مذاق دل لگی نہ ہو، نرم کلام ہو، دل خراش نہ ہو (جلد ہفتم۔ ص ۲۴۰)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یعنی اللہ سے ڈر کر درست اور سیدھی بات کہنے والے کو بہترین اور مقبول اعمال کی توفیق ملتی ہے اور تقصیرات معاف کی جاتی ہیں۔ حقیقت میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی میں حقیقی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے جس نے یہ راستہ اختیار کیا مراد کو پہنچ گیا۔" ص ۵۶۹)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ الفاظ عام ہیں اور ان سے ہر جھوٹ، بہتان اور جھوٹی شہادت کی حرمت ثابت ہوتی ہے مگر اس سلسلہ کلام میں خاص طور پر اشارہ ان باطل عقائد، احکام اور رسوم اور اوہام کی طرف ہے جن پر کفر و شرک کا

بنیاد ہے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں اس کے بندوں کو حصہ دار بنانا وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جس سے یہاں منع کیا گیا ہے اس کے ساتھ جھوٹی قسم اور جھوٹی شہادت بھی اسی حکم کے تحت آتی ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عدلت شہادۃ الزور بالشرک باللہ " جھوٹی گواہی شرک با اللہ کے برابر رکھی گئی ہے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثبوت میں یہی آیت پیش فرمائی۔ اسلامی قانون میں یہ جرم مستلزم تعزیر ہے امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا فتوی یہ ہے کہ جو شخص عدالت میں جھوٹا گواہ ثابت ہو جائے اس کی تشہیر کی جائے اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔ یہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اور فعل بھی ہے۔ مکحول کی روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں یضرب ظهره ويحلق راسه ويسخم وجهه ويطال حبسه اس کی پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں اس کا سر مونڈا جائے اور منہ کالا کیا جائے اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔

عبداللہ بن عامر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت میں ایک شخص کی جھوٹی گواہی ثابت ہو گئی تو انہوں نے اس کو ایک دن برسرعام کھڑا رکھ کر اعلان کرایا کہ یہ فلاں بن فلاں جھوٹا گواہ ہے، اسے پہچان لو، پھر اس کو قید کر دیا۔ موجودہ زمانے میں ایسے شخص کا نام اخبارات میں نکال دینا تشہیر کا مقصد پورا کر سکتا ہے" (تفہیم القرآن جلد سوم ص ۲۲۳، ۲۲۲)

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ " قول زور سے مراد جھوٹ ہے حق کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل اور جھوٹ میں داخل ہے خواہ وہ عقائد فاسدہ شرک و کفر ہوں یا معاملات میں، شہادت میں جھوٹ بولتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے کبیرہ گناہ یہ ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا اور عام باتوں میں جھوٹ بولنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول الزور کو بار بار فرمایا۔ (جلد ۶، ص ۲۵۱)

سورۂ انعام میں حکم الٰہی ہے کہ "اور جب بولو تو عدل (کا خیال) رکھو اگرچہ وہ قرابت دار ہی ہوں (آیت ۱۵۲)

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "جب تم بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا رشتہ دار ہی ہو۔ اس جگہ کسی خاص بات کا ذکر نہیں اس لئے جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہر قسم کی بات کو شامل ہے خواہ وہ بات کسی معاملہ کی گواہی ہو یا حاکم کی طرف سے فیصلہ یا آپس میں مختلف قسم کی گفتگو۔ ان سب میں ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ ہر جگہ ہر حالت میں بات کرتے ہوئے حق و انصاف کا خیال رہنا چاہیئے۔ کسی مقدمہ کی گواہی یا فیصلہ میں حق و انصاف قائم رکھنے سے معنی ظاہر ہیں کہ گواہ کو جو بات یقینی طور پر معلوم ہے وہ اپنی طرف سے کسی لفظ کی کمی یا بیشی کئے بغیر جتنا معلوم ہے صاف صاف کہہ دے اپنی اٹکل اور گمان کو دخل نہ دے اور اس کی فکر نہ کرے کہ اس سے کس کو فائدہ پہنچے گا اور کس کو نقصان۔ اسی طرح کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنا ہے تو گواہوں کو شرعی اصول پر جانچنے کے بعد جو کچھ ان کی شہادت سے نیز دوسری قسم کے قرائن سے ثابت ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، گواہی اور فیصلہ دونوں میں نہ کسی کی دوستی اور محبت حق بات کہنے سے مانع ہو اور نہ کسی کی دوستی، دشمنی اور مخالفت، اس لئے اس جگہ یہ جملہ بڑھایا گیا ولو کان ذا قربیٰ یعنی اگرچہ وہ آدمی جس کے مقدمہ کی شہادت دینا یا فیصلہ کرنا ہے وہ تمہارا رشتہ دار ہی ہو تب بھی حق و انصاف کو نہ گواہی میں ہاتھ سے جانے دو اور فیصلہ میں۔" (معارف القرآن۔ جلد سوم، ص ۴۸۹)

سورۃ الفرقان میں ارشاد الٰہی ہے کہ "اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے" (آیت ۷۲)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ "اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی جھوٹی بات کی گواہی نہیں دیتے اور کسی ایسی چیز کو واقعہ اور حقیقت قرار نہیں دیتے جس کے خلاف وحقیقت ہونے کا انہیں اطمینان ہو دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کا مشاہدہ نہیں کرتے، اس کے تماشائی نہیں بنتے، اس کو دیکھنے کا قصد نہیں کرتے اس دوسرے مطلب کے لحاظ سے جھوٹ کا لفظ باطل اور شر کا ہم معنی ہیں انسان جس برائی کی طرف بھی جاتا

ہے لذت یا خوشنمائی یا ظاہری فائدہ ہے کہ اس جھوٹے ملمع کی وجہ سے جاتا ہے جو شیطان نے اس پر چڑھا رکھا ہے یہ ملمع اتر جائے تو ہر بدی سراسر جھوٹ ہے کہ وہ اپنی جھوٹی چمک دمک کی وجہ ہی سے اپنی طرف لوگوں کو کھینچتی ہے مومن چونکہ حق کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اس لیئے وہ اس جھوٹ کو ہر روپ میں پہچان جاتا ہے خواہ وہ کیسے ہی دل فریب دلائل یا نظر فریب آرٹ یا سماعت فریب خوش آویزیوں کا جامہ پہن کر آئے" (جلد سوم - ص ۴۶۸)

مولانا مفتی محمد شفیع رحمتہ اللہ علیہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ " یعنی یہ لوگ جھوٹ اور باطل کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے۔ سب سے بڑا جھوٹ اور باطل تو شرک و کفر ہے اس کے بعد عام جھوٹ اور گناہ کے کام ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ایسی مجلسوں کی شرکت سے بھی گریز کرتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس سے مراد مشرکین کی عیدیں اور میلے ٹھیلے ہیں۔ حضرت مجاہد اور محمد بن حنفیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد گانے بجانے کی محفلیں ہیں۔ عمرو بن قیس نے فرمایا کہ بے حیائی اور ناچ رنگ کی محفلیں مراد ہیں۔ زہری امام مالک کے نزدیک شراب پینے پلانے کی مجلسیں مراد ہیں (ابن کثیر)

اور حقیقت یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں یہ ساری ہی مجلسیں مجلس زور کی مصداق ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں کو ایسی محفلوں ہی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ چونکہ خود باطل کا بالقصد دیکھنا بھی اس کی شرکت کے حکم میں ہے (مظہری) بعض حضرات مفسرین نے لا یشہدون الزور میں یشہدون کو شہادت بمعنی گواہی لیا ہے اور معنی آیت کے یہ قرار دیئے کہ یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی کا گناہ کبیرہ اور وبال عظیم ہونا قرآن و سنت میں معروف و مشہور ہے بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص کے متعلق ثابت ہو جائے کہ اس نے جھوٹی شہادت دی تو ہے اس کو چالیس کوڑوں کی سزا دی جائے اور اس کا منہ کالا کر کے بازار میں پھرایا جائے اور رسوا کیا جائے پھر طویل زمانے تک قید میں رکھا جائے

(رواہ ابن ابی شیبہ عبدالرزاق ۔ مظہری ۔ جلد ٦ ۔ ص ٩٥ ۴)

حق گوئی اور کذب بیانی کے متعلق چار قرآنی آیات اور ان کی تفسیر ہیں آپ نے پڑھیں ۔ ان سے بہت واضح طور پر چند اہم باتیں معلوم ہوئیں کہ انسان کو ہر صورت میں سچ بولنا چاہیئے، خواہ اپنی ذات ہو یا رشتہ دار ہوں ۔ دوست ہوں یا دشمن، حلیف ہو یا حریف، اس کے ساتھ جھوٹ بولنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے صرف جھوٹ بولنا اور جھوٹ لکھنا ہی جھوٹ نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے مثلاً جھوٹی گواہی دینا، سچ کو چھپانا، حق کا انکار کرنا، لغو اور باطل کھیل تماشائیوں اور مجلسوں میں شرکت کرنا، مشرکانہ تہواروں اور میلوں میں شریک ہونا ۔

اس سلسلے میں چند احادیث بھی پڑھیں ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم پر سچائی لازم ہے کیونکہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے ۔ آدمی برابر سچ بولتا رہتا ہے اور سچائی کا متلاشی رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک صدیق لکھ لیا جاتا ہے (بخاری ۔ مسلم) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے وصیت فرمائیے! فرما ..... حق بات کہنا اگرچہ وہ کڑوی ہو ... (بیہقی)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم مجھے چھ چیزوں کی ضمانت دو تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں جب بات کرو سچ بولو ... (احمد، بیہقی)

جھوٹ بدی کی طرف لے جاتا ہے اور بدی کا راستہ سیدھا جہنم میں پہنچا دیتا ہے اس لئے جھوٹ گناہ کبیرہ ہے، منافقت ہے اور خیانت ہے وغیرہ ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں بہت بڑے گناہ کے متعلق خبر نہ دوں؟ ہم نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی بات .... (بخاری و مسلم) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص میں چار خصلتیں ہوں گی وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے

ایک موجودگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے۔۔۔۔ اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ (بخاری مسلم)

حضرت سفیان بن اسید حضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو تو وہ تمہیں سچا جانتا ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو تو وہ تمہیں سچا جانتا ہو تم جھوٹ بول رہے ہو۔ (ابوداؤد) اس لئے کہ حضرت بہز بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے والد ان کے جد امجد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے لئے خرابی ہے جو جھوٹی بات کرے اس لئے کہ لوگ ہنسیں، اس کے لئے خرابی ہے اس کے لئے خرابی ہے (احمد، ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور جھوٹ سے پرہیز کرو کیونکہ جھوٹ بدی کی طرف لے جاتا ہے اور بدی جہنم میں لے جاتی ہے آدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک کذاب لکھ لیا جاتا ہے (بخاری مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو اس کی بدبو کے باعث فرشتے اس سے ایک میل پرے ہٹ جاتے ہیں (ترمذی)

جھوٹ کی سزا کے متعلق بھی ایک حدیث پڑھئے کہ جھوٹ کی کتنی سخت سزا ہے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت کے ساتھ اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرماتے رہتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب بیان کرتا جس کو مشیت ایزدی ساتھ ہوتی کہ وہ خواب بیان کرے۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان کیا کہ آج رات میرے پاس دو آنے والے آئے انہوں نے مجھ سے کہا چلو چنانچہ میں ان کے ساتھ چل دیا اور ہم ایک آدمی کے پاس پہنچے جو گدی کے بل لیٹا ہوا ہے اور ایک دوسرا آدمی اس کے پاس لوہے کا آنکڑا لے کر کھڑا ہے اور وہ اس کے چہرے کے ایک طرف کے کلے کو گدی تک چیر دیتا ہے اور اس کے ناک کو بھی گدی تک اور اس کی آنکھ کو بھی گدی تک چیرتا

ہے۔ پھر دوسرے پہلو کی طرف جاتا ہے تو اس کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار پہلو کی طرف جاتا ہے تو اس کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار کرتا ہے جو پہلے کے ساتھ کیا تھا ابھی اس پہلو سے وہ فارغ نہیں ہوا یہاں تک کہ وہ پہلے کی طرح درست ہو جاتا ہے پھر دوبارہ اس کے ساتھ پہلا والا عمل کرتا ہے مجھے بتایا گیا کہ یہ جھوٹ بولنے والا انسان ہے اور جھوٹی باتیں کرتا ہے... قیامت کے دن تک یہ آدمی اسی عذاب میں مبتلا رہے گا۔ (بخاری)

یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیئے کہ جھوٹ بولنا حرام ہے لیکن بعض حالات میں چند شرائط کے ساتھ جھوٹ بولنا جائز ہو جاتا ہے حضرت اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ وہ انسان جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان مصالحت کراتا ہے اور بہتر بات کی نسبت کرتا ہے یا اچھی بات کہتا ہے۔ (بخاری)

امام مسلم نے ایک روایت میں اضافہ کیا ہے کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات میں (جھوٹ بولنے کی اجازت دیتے ہوں مگر تین باتوں میں' جہاد لوگوں کے درمیان صلح کرانے اور خاوند کا اپنی بیوی سے باتیں کرتے ہوئے یا بیوی کا اپنے خاوند سے باتیں کرتے ہوئے جھوٹ کہنا۔ اس حدیث سے جھوٹ کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے جن میں چند باتیں اور بھی ہیں۔ مثلاً جب کوئی مسلمان کسی ظالم سے چھپا ہوا ہے جو اس کو قتل کرنا چاہتا ہے یا اس کا مال لینا چاہتا ہے لیکن اس نے اپنے مال کو چھپا دیا ہے تو اگر کسی آدمی سے اس کے بارے میں معلوم کیا جائے اور وہ جانتا بھی ہو تو اس کو بچانے کے لئے جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس کسی کی امانت ہے اور کوئی شخص اس سے چھیننا چاہتا ہے تو اسے جھوٹ بولنا ضروری ہے کہ اس کے پاس امانت نہیں ہے۔

اللھم طھر قلبی من النفاق وعملی من الریاء ولسانی من الکذب

☆

غنی نعیم

رئیس اختر اور شاعری

یہ مشاہدہ عام ہے کہ اکثر کمسن بچے رنگین تتلیوں کو پکڑنے کے شوق میں دیوانہ وار دوڑتے ہیں اور اس کوشش میں گر کر اپنے گھٹنے زخمی کر لیتے ہیں۔ پھول پر بیٹھی رنگین تتلی پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو تتلی اڑ جاتی ہے۔ انگلیوں میں کانٹے دھنس جاتے ہیں۔ بعید مشقت اور مشکل سے رنگین تتلی ہاتھ آتی ہے تو اس کا رنگ انگلیوں پر آجاتا ہے اور وہ رنگین خوبصورت تتلی اپنا رنگ کھو کر عجیب سی لگنے لگتی ہے۔ بچوں کے ہاتھوں بیدم ہو جاتی ہے اور اپنا دم توڑ دیتی ہے۔ اس مشاہدہ کی اصلیت اور حقیقت کا احساس ایک قاری کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ جناب رئیس اختر کے دو مجموعۂ کلام کے مطالعہ کی زحمت برداشت کرتا ہے۔ جناب رئیس اختر اس کمسن بچے کے مانند فکر و خیال کی رنگین تتلیوں کو گزشتہ چالیس سال سے پکڑنے کی کوشش میں بار بار گر کر اپنے گھٹنوں پر زخموں کے گلاب کھلاتے رہے ہیں اور "گل تازہ" پر بیٹھی رنگین تتلی کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش میں اپنی انگلیوں میں کانٹے پیوست کر لیے ہیں کیونکہ اس طویل چالیس سالہ دورِ شاعری میں کی گئی بھاگ دوڑ میں اگر کوئی تتلی ہاتھ آئی ہے تو اس کا رنگ اُتر گیا۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ جناب رئیس اختر اپنے خیال کو اپنی فکر کو، شعر کے قالب میں ڈھالنے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ فنِ شعر کی مبادیات سے عدم واقفیت کا اظہار اُن کے مجموعۂ کلام کے ہر ایک صفحہ سے ظاہر ہوتا ہے جناب رئیس اختر

ر دو مجموعۂ کلام شائع کرا چکے ہیں (طبع کا املا صحیح ہے) لیکن صوتی اعتبار و مماثلت کی یکسانیت
ہلِ ذوق کے لئے موجبِ انبساط ہوگی بشرطیکہ انھوں نے جناب رئیس اختر کے مجموعۂ کلام
کا مطالعہ کیا ہو)۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ دیدہ زیب گرد پوش جو اُن کی رفیقِ حیات کی فنکارانہ
صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے اتنا جاذبِ نظر ہے کہ قاری شاعر کی رفیقِ حیات کے حسنِ تخیل
میں محو ہو جاتا ہے اور بقول خامہ بگوش "اب اُسے کتاب کے باطن میں جھانکنے کی
ضرورت محسوس نہیں ہوتی"۔ قابلِ تحسین ہیں بیگم رئیس اختر اور صاحبِ قسمت ہیں
جناب رئیس اختر کہ اُن کی بیگم نے اپنے شوہرِ نامدار کے "سودائے خام" کو اپنا
خونِ جگر دے کر شاعر کے تو نہیں اپنے دل کی کرچیوں اور اپنے آنسوؤں کو آئینہ اور
پھول بنا کر حقِ زوجیت ادا کیا ہے اسی لئے جب بھی ایک باشعور قاری گرد پوش کی عظمت و
حرمت اور عصمت کا خیال کرتے ہوئے ورق گردانی کرتا ہے تو گرد پوش کا صوری حسن اس کی
گرانباریٔ خاطر میں کمی ضرور کرتا ہے اور اُسے خیال ہوتا ہے کہ کاش گرد پوش کے بعد
اوراق صرف سادہ ہوتے۔

جناب رئیس اختر کے دو مجموعۂ کلام "آئینۂ دل" اور "اشکوں کے پھول" اردو
اکیڈمی حیدرآباد کی رقمی معاونت سے طبع ہوئے ہیں (ہماری اردو اکادمیوں کی اس بد خدمتی
نے اردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے) "آئینۂ دل" (حمد، نعت، سلام اور
منقبت کو الگ کرتے ہوئے ۲۷۹ صفحات پر مشتمل خیالات) ایسے محسوس ہوتا ہے کہ آبگینہ
چڑھی ہوئی پارہ کی بہت ہی ہلکی تہہ چھوٹ چھوٹ کر شیشہ بن کر معنوی طور پر داغ دار
ہو گیا ہے۔ گو کہ آئینۂ دل اُن کا بیس سالہ شعری سفر ہے ایک قاری کے لئے ذہنی گرد آلودگی
اور گم کردہ راہ مسافر کی درماندگی کے سوا کچھ اور نہیں ہے

دوسرا مجموعۂ کلام "اشکوں کے پھول" (آنسوؤں کی غیر شاعرانہ تشبیہ اور ترکیب

یہ اور سارا اردو شاعری خون کے آنسو روتی محسوس ہوتی ہے) جو پندرہ برس بعد طبع کرایا۔ گویا عمرِ عزیز کے چالیس سالوں کی عرق ریزی کے باوجود بھی جناب رئیس اختر اپنی فکر کو اپنے خیال کو مکمل شعر کی صورت میں شاذ ہی ڈھال سکے ہیں۔ غیر مربوط فکر و خیال سے مملو ہر دو مجموعۂ کلام زحمتِ مطالعہ کے بعد ایک با ذوق قاری کو اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ جناب رئیس اختر دو مجموعۂ کلام کے حامل شاعر بمشکل تمام اگر کوئی کہنا چاہے تو ایک ہی مصرعہ کے شاعر" کہلانے کے مستحق اور حقدار ہو سکتے ہیں۔

"آئینہ دل" کا تعارف کراتے ہوئے مرحوم عابد علی خاں صاحب نے مشورہ دیا:

"رئیس اختر اپنی مشقِ سخن جاری رکھیں کیوں کہ ان میں ایک بڑے اور معیاری شاعر بننے کے تمام جراثیم موجود ہیں ـــ"

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

رئیس اختر بڑے اور معیاری شاعر بننا تو کجا "بگڑے اور غیر معیاری "شاعر" تک بن نہ پائے۔ رئیس اختر کی فکری اور دیگر کمزوریوں کی وجہ غالباً ان جراثیم کی مناسب پرورش اور پرداخت نہ ہو سکی۔ باقی ماندہ غیر نمو یافتہ جرثوموں کی کمزوری سخن پرور کر نہ سکی۔ فکر و خیال کی بے ربطی اور شاعرانہ کمزور گرفت نے "آئینہ دل" اور "اشکوں کے پھول" سے صنفِ شعر کو گرد آلودہ اور پژمردہ بنا دیا۔ امتدادِ زمانہ اور کاروبارِ شوق نے گرمیٔ خون کو سرد کر دیا۔ ڈاکٹر افضل محمد نے انھیں "بے حد شرمیلی لڑکی" قرار دیا جناب رئیس اختر جب ترنم ریز ہوتے ہیں تو سامعین آواز کے اُتار چڑھاؤ کی وجہ عجیب و غریب ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاعر کو کونسی صنف میں سمجھا جائے۔

آیئے اب دل و جگر تھام کر صبر و سکون کی تمام قوتوں کو یکجا کر کے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے صرف اور صرف اردو شاعری کے قاری کی حیثیت سے "آئینہ دل" اور "اشکوں کے پھول" کا چیدہ چیدہ مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ "فن شریف" کی شرافت اِن شریف زادہ کے پاس

کہیں نظر آتی ہے۔

"آئینۂ دل" کا صفحہ ۳۳ "خونِ دل" کے عنوان سے شاعر نے اپنا سیرتانی خیال پیش کیا ہے۔ جس سے حصۂ غزل کا آغاز ہوتا ہے ؎

نغمۂ نغما سے خونِ دل ٹپکتا ہے ٭ عشرتوں کے متوالو شاعری سے مت کھیلو

عشرتوں کا متوالا' خود رئیس اختر ہی ہو سکتے ہیں جو گزشتہ چالیس سال سے شاعری کے نام پر کھلواڑ کر رہے ہیں اور کسی سیاسی بازیگر کی طرح اپنی شاطرانہ فطرت کے ساتھ شعری و ادبی فضا کو آلودہ کرنے میں اپنے ماہر استاد سے گٹھ جوڑ کئے ہوئے اپنی مہارت کا لوہا منوانے میں شب و روز مصروف ہیں۔ آدابِ شاعری اور آئینِ فن میں ناکامی اور مسلسل ناکامیوں نے انھیں سنہ ۱۹۹۳ء سے آدابِ شاہی و رموزِ درباری اور تجربہ بردباری میں کامیاب و کامران کر دیا ہے۔ اور "عشرتوں کے متوالوں" کے ساتھ "فنِ شریف" کی آبرو ملیامیٹ کرنے میں دامے درمے [illegible] جا رہے ہیں۔

"رئیسانہ" شاعری کی شان دیکھیئے وہ اس مہمل خیال کو بحر اور وزن کے "توبڑے" میں ڈال کر لٹکتے ہیں (ز "اشکوں کے پھول" کے پہلے صفحہ پر شعر درج ہے اور یہ دوسرا مجموعہ "آئینۂ دل" بیس برس بعد طبع ہوا ہے)

اشکوں کے پھول لے کے میں نکلا تو ہوں رئیس ٭ یہ دیکھنا ہے ان کا خریدار کون ہے؟

اشکوں کا یہ تاجر خریدار کی تلاش میں حیران ہے۔ قاری پریشان ہے کہ اس کو "مہملات" کے کس درجہ میں رکھا جائے۔ شعری صلاحیت ودیعت ہے جو ریاضت چاہتی ہے تاکہ "خونِ جگر" کی آبیاری سے وہ فن پارہ بن سکے' تک بندی اور شاعری کا فرق کاش جناب رئیس اختر کی سمجھ میں آیا ہوتا۔ اُن کے ہر دو مجموعۂ کلام (اگر آپ اُسے مجموعۂ کلام خیال فرماتے ہیں) اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ تو شاعری کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں اُن سے "شائستگی کی بات" کی توقع فضول معلوم ہوتی ہے حالانکہ وہ دعویدار ہیں کہ ؎

ہمیں دیکھو کہ ہم تہذیب ہیں کل کی جہاں والو ؛ سنو ہم کو کہ ہم شائستگی کی بات کرتے ہیں
جناب رئیس اختر کیا تہذیب اسی کا نام ہے کہ مغلظات سے بھرپور "دشنام نامے" لکھے اور لکھوائے جائیں اور انھیں شہر کے باوقار معتبر لوگوں کو فرضی ناموں سے بھیجا جائے؟ شہر حیدرآباد کی شعری دنیا کو بزعم خود اپنے، اپنے سرپرست اور مستاعروں تک محدود کرنے سیاست سے کام لیا جائے۔ خیر بات اُن کی تہذیب اور شائستگی کی تھی کہ مندرجہ بالا کے مصرعۂ ثانی میں "سنو ہم کو کہ" کی ثقالت سماعت پر کس قدر گرانبار ہے۔ کیا یہی شاعر لطافت ہے۔ کیا یہی شعری تہذیب کی روایت ہے؟ کیا یہ شائستگی کی بات ہے۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی "اشکوں کے پھول" میری نظر میں رقمطراز ہیں کہ —— "ایک اور بات آج کا المیہ یہ ہے کہ شاعر اور فن کا ربط ٹوٹ گیا ہے۔ "اشکوں کے پھول" کے شاعر نے فن کے ساتھ فن کی تہذیب استوار رکھی ہے" اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کی اہمیت آج کے بیشتر شعراء کے پاس ثانوی ہے۔ فن صرف موضوع ہی نہیں شعر کا پاس بھی ہے اور جذبہ کے اظہار کی تکنیک بھی۔ فن سے یہ رشتہ رئیس اختر کو بہت عزیز ہے، تلفظ کی درستگی، الفاظ کا برمحل استعمال، دروبست اور زبان و بیان کی صحت کا خیال رکھنے والا شاعر ہی اپنی شاعری کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے۔"

اس سے پہلے کے پیراگراف میں استاد و شاعر ڈاکٹر علی احمد جلیلی لکھتے ہیں کہ ——

"جہاں تک غزل کی زبان کا سوال ہے آج زبان جس بے احتیاطی اور بے راہ روی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اس انتشار میں رئیس اختر نے زبان کو اس کے فطری بہاؤ کے ساتھ قبول کیا ہے اور غزل کے ورثہ میں پائے ہوئے الفاظ کے ساتھ غزل کے باہر کے الفاظ بھی اس احتیاط کے ساتھ برتنے ہیں کہ غزل کے مزاج کے بانکپن کو قائم رکھا ہے۔"

آپ نے استاد شاعر ڈاکٹر علی احمد جلیلی کے "اردو شاعری کے وارث" ہونے کے ناتے

شاداب	ڈسمبر ۱۹۹۶ء

ہم اُن سے پوچھیں کہ محولا بالا اقتباسات سے مملو مضمون انہوں نے واقعی " اشکوں کے پھول" کے مطالعہ کے بعد لکھا ہے یا بقول پروفیسر شہریار کتابوں پر سرسری نظر اور مطالعہ سے جو تخلیقی ادب سامنے آرہا ہے اس کا معیار کیا ہے۔" یہ جملہ 'فکر و نظر' جو بہت ہی معتبر تخلیقی رسالہ ہے اس سے اخذ کیا گیا ہے اور یہ اظہار پروفیسر شہریار نے اس سلسلہ میں کیا کہ آج کل ہمارے فن کار اور محقق مقدمات اور تبصروں میں کتنے مصلحت پسند اور غیر محتاط ہو گئے ہیں۔ شاعر رئیس اختر سے تو بھلا کیا پوچھنا ہے ؟ استاد شاعر ڈاکٹر علی احمد جلیلی سے یہ سوال بحیثیت ایک قاری میں یہ کروں گا کہ وہ اس "جہل" خیال کی کیا توضیح کریں گے۔

ہاتھ رہتا تھا جو ماتھے پہ تو سر قدموں پر ٭ ایسی اک شب بھی کٹی ہے کسی بیمار کے ساتھ

اس ذہنی و جسمانی جمناسٹک کو صرف اور صرف ڈاکٹر علی احمد جلیلی شاعری مان سکتے ہیں کیونکہ یہ ذہنی بیمار شاعر کے ساتھ ان کے شب و روز گزرتے ہیں۔ شاعر رئیس اختر کو ہی یہ حق ہے کہ وہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی سے سوال کریں کہ ع

آپ کیوں رہتے ہیں مجھ گنہگار کے ساتھ ٭ کون سا رشتہ ہے گرتی ہوئی دیوار کے ساتھ

"گنہگار" اور "دیوار" کی قافیہ بندی ڈاکٹر علی احمد جلیلی کے اس رشتہ شاعری کو کس رشتہ سے گوارا ہے جو "دبستانِ جلیل" سے انھیں وابستہ کئے ہوئے ہے۔ رئیس اختر فصاحت اور بلاغت سے کس قدر واقفیت رکھتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

"یہ غزل کے ورثہ میں پائے ہوئے الفاظ کے ساتھ غزل کے باہر کے الفاظ بہ احتیاط چن کر غزل کے بانکپن کو قائم رکھتا ہے"

فرمائیے ڈاکٹر علی احمد جلیلی ۔۔۔ کاش کہ آپ کی رفاقت ہی نے انھیں الفاظ کا برمحل استعمال زبان و بیان کی صحت کا خیال رکھنے کا سلیقہ سکھایا ہوتا۔ کچھ تو آپ کی صحبت رنگ لاتی۔ بقول آپ کے "آج کا المیہ یہ ہے کہ شاعر اور فن کا رابطہ ٹوٹ

گیاہے۔" "اشکوں کے پھول" پر اُردو ادب کے ڈاکٹروں، ممتاز شاعروں اور بلندقا نقادوں نے بقول پروفیسر شہر یار ایسے ایسے معیار کے تبصرے لکھے ہیں کہ ذرّے کو آفتا بنانے زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

پھر کسی نے مرے ماضی کو صدا دی شائد ؛ میری آنکھوں میں اُجالا سا ہوا جاتا

جناب رئیس اختر کی آنکھ کے کیا کہنے کہ ان کی آنکھوں میں "اُجالا سا ہوا جاتا ہے" بہتر ہے کہ آنکھوں کے سامنے نظر آنے والے اُجالوں کے لیئے وہ کسی آنکھوں کے ماہر ڈا سے اوّلین فرصت میں مل لیں، اُردو ادب کے ڈاکٹر تو انہیں رئیسِ ترنّم کہہ کر دامن آ ہیں یا پتہ نہیں دامن ــــ ؟

رشیارنہ فکرِ شعر دیکھیئے اور اپنے ذوقِ شعری پر "اشکوں کے پھول" نچھاور کیجئے ــ

ہم نے اک شمع جو بستی میں جلا رکھی تھی ؛ آندھیوں سے نظر آس پہ ہم نگار رکھی تھو

اُردو ادب کا ایک طالب علم اُن اسنادانِ فن سے جنھوں نے "اشکوں کے پھو کی تعریف و توصیف اور فنّی محاسن کے اظہار میں صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے یا پھر شا سے پوچھ سکتا ہے کہ شمع تو محفل میں جلتی ہے۔ شمع کا بستی میں جلانا شاعر کا کمال اور اُمس حاشیہ برداروں کی شعر فہمی کی معراج ہے کہ اس خیال کو "جذبہ کے اظہار کی تکنیک" کا نام د کر شاعر کو غلط فہمی کا شکار بنا کر شاعری کا خون کرتے ہیں اور خود کے لئے سرستی کا سامان فراہم کرا لیتے ہیں۔ اسی غزل کا ایک اور شعر دیکھیئے اور اس شاعر کے حسن تخیل کا ماتم کیجیے

کیا خبر آپ تھے کس سمت سے آنے والے ؛ ہم نے ہر سمت نظر اپنی بچھا رکھی تھی

ڈاکٹر علی احمد جلیلی جو غزل کی تہذیب کے پاسبان ہیں اُن سے اور دیگر صاحبانِ فکر و نظر سے جن کے تبصرے "اشکوں کے پھول" میں ہیں پوچھا چاہیئے کہ اُردو شاعری کی تا! آنکھیں تو فرش راہ رہی ہیں اور "زاویۂ نظر" بھی ایک ہوتا ہے تب ہی صاف صاف دکھ

دیتا ہے۔ لیکن رئیس اختر کی شاعری میں وہ تو اپنی نظر ہر سمت بچھائے رکھے ہیں۔ تو آپ جیسے صاحبانِ نظر نسا سے کس لیئے کن مصالح کی بنا پر نظر انداز کیا۔ رئیس اختر تو غالباً اسی لیئے کالا چشمہ لگائے "آئینۂ دل" اور "اشکوں کے پھول" میں اپنے سرپرست کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ رئیس اختر کا نظر کے تعلق سے ایک اور خیال ملاحظہ کیجئے۔ غ

دیکھنا اور ہے کیا آپ کے دیدار کے بعد　∴　اب یہیں چھوڑ کے ہم اپنی نظر جاتے ہیں

" نظر چھوڑ نا " کیا یہ شاعرانہ الفاظ کا برمحل استعمال ہے یا فکری شگفتگی اسے کہا جا سکتا ہے۔ نہیں صاحب ۔ نہیں۔ یہ تو کالے چشمہ کا کمال ہے۔ شاعرانہ الفاظ کا نہیں بلکہ شعریت سے میرا الفاظ اور فکری ظلمت کا آئینہ دار ہے ۔

"آئینۂ دل" سے پارہ اتر جانے کے بعد شعر کی درگت ملاحظہ کیجئے ۔

اپنی آنکھوں کو بند کر لیجئے　∴　روشنی کی کوئی نظیر نہیں

آنکھوں کو بند کیوں کیا جائے۔ اگر روشنی تیز ہو تو آنکھیں خود بخود بند ہو جائیں گی۔ یہ مشورہ کیسے اور کیوں دیا جا رہا ہے۔

شاعر کی علمیت کا اندازہ لگا ئیے کہ روشنی کی نظیر اُسے مل نہ سکی۔ کاش کہ وہ چند کتابیں پڑھے ہوتے۔ روشنی کی نظیر سے جلوہ مراد ہے تو ایک حد تک ٹھیک ہے پھر تجلی کسے کہیں گے ؟

اسی غزل کا ایک خیال بے رنگ تتلی کی مانند

باب رحمت کو کھولنا ہوگا　∴　تیرا بندہ ہوں میں فقیر نہیں

رئیس اختر کی تنگ بندی اور مہمل خیال" قابلِ داد" ہے " مقام فقیری" سے واقف ہو نا یا پھر " فقیر " کے بلند ترین درجہ کے متعلق جاننا تو رئیس اختر کے بس کے باہر ہے لیکن بندہ و فقیر کا یہ فرق شاعر کی علمیت پر ماتم کناں ہے کہ فقیر بندہ نہیں۔ بندہ فقیر نہیں ۔ نعوذ باللہ ۔ کیا ہر دو کا خالق الگ الگ ہے سائل اور فقیر کے معنی تو وہ

ڈسمبر ۱۹۹۶ء

شاداب

کسی بھی لغت سے معلوم کر سکتے تھے۔

تلمیح کے معنی، مفہوم اور تعریف سے اردو کا ادنیٰ طالب علم بھی واقف ہوتا ہے۔ شاعر رئیس اختر بھلا تلمیح کو کہاں جانیں نہ تو فصاحت سے واقف نہ بلاغت سے۔ نہ قواعد سے نہ علم زبان دبیان سے۔ اسی لیے تو یہ مطلع کہتے ہیں کہ

شہرِ غزل میں بکنے کو تیار کون ہے ؛ یوسف نہیں تو زینتِ بازار کون ہے

شہرِ غزل میں کون بک رہا ہے ؟ شاید خود رئیس اختر۔ کیونکہ وہ ہی بازارِ مصر شہرِ غزل کا تعلق سمجھ سکتے ہیں یا پھر اُن کے اُن جیسے دوست احباب جو کسی ایوان یا کسی ۱۲ مربع فٹ قالین نوازیاں میں "مدعو شعراء" اور "مدعو سامعین" ہوتے ہیں۔ "آئینۂ دل" کی صفحہ ۵۶ کی غزل کے چھ شعر اور مقطع دو لخت اور مہمل ہیں۔ غزل کا مطلع، چھٹا شعر دو لخت ہیں۔ دوسرا، تیسرا اور پانچواں شعر مہمل ہے اور چوتھا شعر بے ربط ہے۔ صفحہ (۵۸) کی غزل کا مطلع ہے

درد بڑھنے لگا رات ڈھلنے لگی ؛ درد کی شمع نزدیک جلنے لگی

کیا یہ شاعرانہ اظہار ہے۔ اس میں کوئی مفہوم ہے۔ دور کی شمع کا نزدیک جلنا کیا کہنے اس ذوقِ شعری کے ؟ لیکن شاعر مجبور ہے اور اس کی ذاتی مجبوری وہ فاصلہ ہے جو حیدر آباد اور بیدر کا ہے۔ اسی لیے اگر آپ اس فکری کجروی کو نظر انداز کریں تو شاعر پر احسان ضرور ہے مگر شاعری کا نقصان آپ کو گوارا کرنا ہوگا

"آئینۂ دل" کی اشاعت کے بیس سال بعد "اشکوں کے پھول" میں رئیس اختر کا فکر و شعور منزل کی اس منزل پر آئی کہ انہوں نے "پھر چھپنے دی" "اشکوں کے پھول" صفحہ ۶۵ اور ۶۶ پر چھپی ہوئی اُن کے خیال میں اُن کی یہ غزل ہے۔ انھیں ان کا حلقہ معرفت میں انھیں شاعر مانے تو بات دوسری ہے ویسے ان کے افراد خاندان کی قوتِ برداشت اور وسعت اندیشی کی تعریف کرنا ضروری ہے اب انھیں ایر کولر کے حال میں مشروح کو مشترکہ خاندا[illegible]

شاداب ڈسمبر ۱۹۹۶ء

کاروباریں معروف بیوں کو وہ اپنے احباب کے گھر گھر پہنچکر ایر کولر کی نکاسی کے لئے کوشش کریں کیونکہ ان کے افراد خاندان اس حقیقت سے کبھی کے واقف ہو چکے ہیں کہ رئیس اختر کی فکر کے سوتے تو کبھی کے سرد ہوکر خشک ہو چکے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کاروبار انھیں راس آئے اور شاعری مزید غارتگری سے محفوظ و مامون رہ سکے۔ آئیے اس غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے ذوق شعر پر زخم لگاتے ہوئے اشکوں کے پھولوں کے شاعر کو جو خود کو مفت بیچ رہا ہے اس کے لئے کسی خریدار کی تلاش کر کے شاعری کی گلو خلاصی کی کوشش کریں۔ یہ غزل نو اشعار پر مشتمل ہے۔ صفحہ ۶۵ اور ۶۶ کی تک بندیاں ملاحظہ فرمائیے اور معنی و مطلب کی تلاش کی زحمت قطعی نہ کیجئے۔ کیونکہ "لغویات" کو "مقویات" کا استعمال کرنے والے شاعری خیال کر کے واہ واہ کے نعرے بلند کرتے ہیں یا پھر شدت جذبات سے مغلوب ہوکر شرمندہ شرمندہ سینہ کوبی کرتے ہیں۔ مطلع ملاحظہ ہو ؎

لب پہ آئے ہنسی تو ہنسی بیچ دوں :: تیرے غم کے لئے ہر خوشی بیچ دوں

ہنسی اور خوشی کیسے اور کس طرح بیچی جا سکتی ہے ؟ یہ تو صرف جسم فروش طوائف مجبور ہوکر کرتی ہے۔ دوسرا شعر ؎

جس کو دیکھا وہی مجھ کو پیاسہ ملا :: میں نے چاہا بہت تشنگی بیچ دوں

افسوس صد افسوس۔ رئیس اختر کی بدبختی کہ تشنگی بیچنا چاہا بھی تو انھیں ہر کوئی پیاسہ ملا۔ انھیں کون بھلا مانس سمجھائے کہ تشنگی تشنگی ہوتی ہے۔ حسیات کو جنس بنانا شاعری کی غارت گری ہے شاعر کی نفسیاتی کمزوری ہے یا فکری یا دماغی دیوالیہ کی غماز ہے

تیسرا شعر متروک لفظ کے استعمال کے ساتھ کس قدر مہمل ہے ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

کب تلک لاش تیری اٹھائے پھروں
چل تجھے مفت ہی زندگی بیچ دوں

کیا کہنے شاعر رئیس اختر "مفت بیچنا" زبان و ادب کی یہ بد خدمتی، ادب و شعر سے یہ

کھلواڑ' یہ غیر شاعرانہ اظہارِ خیال اور اندازِ بیان شاعر کی بد ذوقی' مطالعہ کی کمی ا
قوتِ اظہار کے فقدان کا کھلا ثبوت ہے اور اس پر دعوئ شاعری ۔ ڈاکٹر افف
صاحب کیا آپ اسے رفعتِ خیال اور پروازِ فکر تصور کرتے ہیں ؟ آپ کے پیمانے
رئیس اختر کھرے اترتے ہیں ؟ خدارا اپنی خیر منائیے ۔ پڑھے لکھے طبقے میں آپ کی عزت
توقیر ہے آپ کیوں اپنے دامن کو داغدار بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ رئیس اختر کے پاس اگر
تو وہ یقینی طور پر اس حقیقت سے با خبر ہوتے کہ محسوسات اور کیفیات جنس نہیں ہوتے
خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اسی غزل میں رئیس اختر کے ذہنی دیوالیہ پن اور فکر کی کمی اور ا
کی مکمل تصویر نظر آتی ہے وہ "سارے عالم کی افسردگی" "اپنی بیکسی" پلکوں کی نمی یہاں تک
متاعِ خودی" تک بیچ رہے ہیں ۔ متاعِ خودی تو انسان کے لئے اور خصوصاً ایک باشعور شا
لئے کتنی گراں مایہ ہوتی ہے ۔ لیکن بیچارہ نام کا رئیس اختر' سیم و زر کے عوض خودی کو تو
بیچ چکا ہے کاش کہ وہ یہ سمجھ سکتے کہ

زبہر درم تند و بدخو مباش ∴ تو باید کہ باشی درم گو مباش

جناب رئیس اختر آپ کی فکر کے کیا کہنے کہ مہمل خیال صرف آپ ہی کے شعر میں سما سکتے
غور کیجئے اپنے اس شعر پر جو آپ نے اپنے محسن کرم فرما کی اتباع میں لکھا ہے ۔

کچھ تشنگی مرے ساغر میں ڈال دے
محسوس ہو نہ ہو مرا خالی گلاس ہے

آپ کے محسن جناب صلاح الدین نیّر کی مہمل گوئی بھی دیکھئے !

کبھی تو آپ کی آنکھوں میں آئیں گے آنسو
اس انتظار میں خالی گلاس رہتا ہے

ایک تو یہی محسوس کرتا ہے کہ آپ ہر دو کے "خالی گلاس" آپ دونوں کے مجموعہ کا
ہیں اور ایسی تمام خرافات کو شائع کر لینے کے باوجود نذرِ آتش کر دیا جائے تاکہ زبان اُر

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

شاداب ڈسمبر ۱۹۹۶ء

مادھو گوڈ بولے — ترجمہ: شارق علوی

قسط اوّل

اجودھیا کا المیہ

مسٹر مادھو گوڈ بولے اکتوبر ۱۹۹۱ء سے مارچ ۱۹۹۳ء تک حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کے سکریٹری کے اہم عہدے پر فائز رہے۔ بابری مسجد کی شہادت اور اس سے قبل پورے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلائی گئی اور دسمبر ۱۹۹۲ء اور جنوری ۱۹۹۳ء میں ملک میں فسادات کی جو آگ بھڑکی اس سلسلے میں حکومت ہند کی تساہلی اور بے عملی کے الزامات مسٹر مادھو گوڈ بولے کے سر ان کے سیاسی آقاؤں نے منڈھنے کی کوشش کی جس سے بددل ہو کر انھوں نے ملازمت سے قبل از وقت سبکدوشی حاصل کر لی اور اپنی تازہ شائع ہوئی کتاب "انفنشڈ انگس" کے ایک باب میں انہوں نے اجودھیا المیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ پر مسجد کی شہادت اور اس کے بعد ملک میں برپا یکطرفہ فساد جس میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اس کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ مسٹر گوڈ بولے کی اس انگریزی کتاب سے "اجودھیا المیہ" کا باب اردو داں حضرات کے ملاحظہ کیلئے پیش ہے۔

اجودھیا مہابھارت کی شروعات تقریباً ۴۵ سال قبل ۲۲، ۲۳ ڈسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب سے ہوتی ہے جب بابری مسجد میں رام للّا کی مورتیاں گپ چپ طریقے سے نصب کر دی گئیں۔ اس شرارت کو اسی

وقت مورتیوں کو وہاں سے ہٹا کر ختم کیا جاسکتا تھا لیکن مقامی انتظامیہ کی نسا اہلی اور اکثریتی احساسات کا لحاظ اور مروت نے اس مسئلہ کو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی مسئلہ کی وسعت کر دی اور یہ ایک واحد مسئلہ ہے جس نے ملک کو فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم کر دیا ہے۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل جو ہندوستان پسند کی حیثیت سے مشہور ہیں اتر پردیش کے وزیر گووند بلبھ پنت کو اپنے ۹ جنوری ۱۹۵۰ء کے مکتوب میں رقمطراز ہیں " اس طرح کے مسائل سے حل نہیں کیے جا سکتے اس لیے امن و قانون کی مشنری کو ہر قیمت پر امن قائم رکھنا چاہیے۔ لیے صلح پسندی اور خوشامدانہ رویہ اپنانا چاہیے جس سے کہ یکطرفہ اٹھائے گئے قدم اور جبر کی حمایت کا شائبہ بھی نہ ہونے پائے۔

وزیر داخلہ پٹیل کو گووند بلبھ پنت نے ۱۳ جنوری ۱۹۵۰ء کو جو جواب ارسال کیا وہ کی زبان کا ایک عدیم المثال شاہکار کہا جاسکتا ہے جس میں اگلے ۴۲ سال تک ایک کے بعد حکومتوں کی بے عملی کا جز رپنپا ہے اور جس کے نتیجے میں بالآخر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد گئی۔ پنت لکھتے ہیں۔

" حالات سازگار بنانے کی ہر ممکن کوشش جاری ہے اور اس میں کامیابی کی امید بھی ہے لیکن حالات اب بھی سیاسی کیفیت میں ہیں اور ان کے بارے میں اس وقت کچھ کہ دشوار ہوگا۔ "

اجودھیا کارڈ کا ہر بڑی سیاسی جماعت نے لمبے عرصے تک استعمال کیا، بھارتیہ جنتا پا اپنے انتخابی منشور میں رام مندر کی تعمیر کا جنم استھان پر وعدہ کیا اور کہا کہ وہ بابری مسجد کو پوری عقیدت کے ساتھ منتقل کر دے گی دوارکا پیٹھ کے شنکر آچاریہ نے اعلان کیا کہ تک اس متبرک مقام کو جس پر مسلم حملہ آوروں نے مندر منہدم کر کے مسجد تعمیر کرائی ہے ہندو واپس نہیں کیا جاتا امن اور فرقہ وارانہ میل محبت ممکن نہیں ہے اپل کے اڈوانی صدر بھارتیہ جنتا پارٹی ان کے ساتھیوں نے بھی اسی طرح کے بیانات دینا شروع کئے ہیں دوارکا کے سومناتھ مندر سے ا

ک اپنی رتھ یاترا سے قبل اڈوانی نے اعلان کیا تھا ہندو قوم رام جنم بھومی اجودھیا، کرشن جنم
بھومی متھرا اور کاشی کے وشنوناتھ مندر کی قربانیاں نہیں دے سکتی' سیتارام گوپال نے ایک مضمون
خاموش شہادت کو بولنے دیجئے۔ میں ریاست اور ضلع وار ان ۴ ۸۶ ۱ مسلم عبادت گاہوں کا
کر کیا ہے جو ہندوؤں (جن میں بودھ اور جین بھی شامل ہیں) کی عبادت گاہوں پر یا ان کے ملبہ
ے تعمیر کی گئی ہیں یہ سب کی سب اجودھیا جیسی اہمیت رکھتی ہیں۔
بی جے پی کے ایک ممبر پارلیمنٹ مہاراج سوامی ساکشی نے ہندوستان ٹائمس ۲۴ جنوری ۱۹۹۳ء
ں شائع ایک انٹرویو میں کہا۔
ہم متھرا اور کاشی میں وہی کریں گے جو ہم نے اجودھیا میں کیا۔ ایک بانگی تھا جب اجودھیا
معاملے میں مسلمان ہمارے نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہو پائے تو ہم نے اسے زبردستی لے لیا اور ہمارا
نعرہ ہے ہمیں تین عبادت گاہیں واپس کرو ورنہ ہم تین ہزار مسلم عبادت گاہوں بشمول جامع مسجد
قبضہ کریں گے۔
جیسے ودیا ستی لکھتے ہیں
ملک اب ہمارا ہے بابر کا نہیں اور ایسی آزادی کا کیا مطلب جس میں ہم بے انصافیوں کو انصاف
ں نہ بدل سکیں۔ یہی تاریخ ہے کہ ہر اس غلط کام کو جو حکومت کی طاقت کے زور پر کیا گیا ہو
ست کر دیا جاتا ہے اور یہی مقصد ہے ہمارے اس عزم کا کہ تاریخ دوبارہ لکھی جائے۔
ارون شوری جیسے ادیب اور اسکالر کا کہنا ہے کہ "یہ اچھا ہو گا کہ ہم ماضی کو بھول جائیں
ن اسلامی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی اور وہ ہر مسلمان سے بتوں اور مندروں کو توڑنے
مید رکھتی ہے۔"
کانگریس (آئی) جو سب سے بڑی قومی سطح کی سیاسی جماعت ہے اس کا بی جے پی کی اس متعصبانہ
نیت پر کیا ردعمل رہا ہے؟ کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں جو اجودھیا معاملے پر ایک گنجلک

شاداب — دسمبر ۱۹۹۶ء

رویہ اپنانے کا ذکر کیا ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں اپنے ۱۹۸۹ء کے منشور میں کانگریس کہتی ہیں " نازک مسائل کو قومی یکجہتی اور دوستی کے پس منظر میں کھلے دماغ سے حل کیا جانا چاہیئے۔ کانگریس قومی اتحاد اور میل محبت کی ہمیشہ سے حامی رہی ہے۔" یہ ایک ٹالنے والی بات ہے جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے ۱۹۹۱ء کے انتخابی منشور میں کانگریس نے پھر ایک مبہم شوشہ چھوڑا کہ وہ رام مندر بنائے جانے کے حق میں ہے —— لیکن مسجد کو مسمار کیئے بغیر " لیکن کسی کانگریسی نے اس کی تشریح کبھی نہیں کی کہ یہ کیسے ممکن ہو سکے گا کانگریس برابر یا تو ہندو کارڈ مارچ ۱۹۸۶ء میں عدالتی حکم حاصل کر کے مسجد کا تالا کھلوانے کا یا ۱۹۸۹ء میں شیلانیاس کی اجازت دیکر اس کا سنگ بنیاد رکھوا کر اور مسلمانوں کو مسلم مطلقہ خواتین سے متعلق ایکٹ ۱۹۸۶ء اور عبادت گاہوں کی حفاظت ایکٹ ۱۹۹۱ سے کھیلتی رہی۔

اے جی نورانی نے ارون نہرو کے حوالے سے لکھا ہے کہ " جب میں نے راجیو گاندھی سے پوچھا کہ منتازعہ عبادت گاہ کا تالا کھلنے کے دو دن بعد سے دوردرشن پر اس میں پوجا اور آرتی کے مناظر کون دکھا رہا ہے تو انہوں نے جواب نہیں دیا وہ صرف مسکرائے اور بولے یہ مسلم مطلقہ ایکٹ کا بدلہ۔ اجودھیا مسئلہ ۱۹۵۰ء میں تو کانگریس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا لیکن ۱۹۸۹ء میں نہیں راجیو گاندھی نے اس بات کا اقرار کیا کہ ۱۹۸۹ء میں کانگریس کی شکست میں شیلانیاس کا اہم رول رہا ہے بی جے پی کو کانگریس کی دوغلی پالیسی کا فائدہ ملا۔

جہاں تک اہم قومی مسائل کا تعلق ہے اس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا رویہ ملک کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے تاریخ نے دوبارہ پلٹا کھایا جب ۱۹۹۲ء میں کانگریس آئی اور بی جے پی نے ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کی اور اس کے نتیجہ میں ملک کو نہایت خوفناک اور کربیہہ دور گذرنا پڑا لیکن اگر تاریخ کو الٹنا نہیں چاہتے ہیں تو اجودھیا میں جو کچھ ہوا اس کا تجزیہ کیا جانا چاہیئے۔ کس نے کون سے " کارڈ " کھیلا اس کی یہ چال قومی مفاد میں تھی ؟

دسمبر ۱۹۹۶ء

شاداب

جس طرح سے ہندوستان میں سیاست ہو رہی ہے اس سے اس بات کا یقین کرنا مشکل ہے کہ اجودھیا "آخری المناک حادثہ" تھا نہ صرف یہ کہ اجودھیا کا معاملہ ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے متھرا اور کاشی پر ہی نہیں بادل منڈلا رہے ہیں بلکہ اور بہت سے مقامات پر بھی "تاریخ" کو درست کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وشو ہندو پریشد کا دعوی ہے کہ اس نے ۲۷ فروری ۱۹۹۵ء کو کاشی میں گیان واپی مسجد کی پشت پر "جل ابھیشیک" کی رسم ادا کر کے کسی حد تک اسے آزاد کرا لیا ہے بجرنگ دل اور شیوسینا کے رضاکاروں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ متھرا میں کرشن جنم بھومی عبادت گاہ کمپلکس سے متصل تقریباً سو میٹر کی دوری پر ۶ اگست ۱۹۹۵ء کو بھومی پوجن کی رسم کی رسم ادا کی جا چکی ہے جس کے بعد ۸ اگست کو وشو ہندو پریشد نے ایک مہا یگیہ بھی کیا۔ مہا بودھی مندر بودھ گیا کی تحریک بھی زور پکڑ رہی ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان محرکات اور حالات کا منصفانہ تجزیہ کیا جائے جو بابری مسجد کے انہدام میں معاون ثابت ہوئے تاکہ اس سے مستقبل میں اس طرح کے المیہ سے بچا جا سکے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں بڑھتی ہوئی جارحیت تشویشناک ہے ہمارے معمول سے عمل کو دینا بغور دیکھنی ہے اگر مختلف مذاہب کی تعظیم ایک قوم کی دوسرے کیلئے برداشت کی قوت اور سیکولرزم کو زندہ رکھنا ہے تو ہم اجودھیا جیسے اور واقعات برداشت نہیں کر پائیں گے۔

مرکزی حکومت میں انسانی وسائل کی ترقی کے وزیر ارجن سنگھ کے دسمبر ۱۹۹۴ء میں وزارت سے استعفی دینے کے بعد سے اجودھیا مسئلہ نے نئی صورت اختیار کر لی ہے ارجن سنگھ نے الزام لگایا ہے کہ ان کے متواتر آگاہی دیئے جانے کے باوجود اور وزیر اعظم کو متنبہ کرنے کے بعد مرکزی حکومت نے متنازعہ عمارت کی حفاظت کا بندوبست نہیں کیا۔ کانگریس سے ان کے اخراج کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۹۵ء کو ارجن سنگھ نے وزیر اعظم نیز حکومت کے دوسرے ذمہ داروں کو اجودھیا مسئلہ پر لکھے گئے اپنے رازداری کے خطوط کی نقلیں اخبارات کو شائع کرنے کیلئے دیدیں اس میں ان کے اس خط کا بھی حوالہ ہے جو انہوں نے مجھ کو بحیثیت داخلہ سکریٹری کے ۲۶ نومبر ۱۹۹۲ء کو لکھا تھا اور جس کے ساتھ انہوں نے اجودھیا کے ایک ہمدرد سنت

شاداب — ڈسمبر ۱۹۹۶ء

کانگریس کی رپورٹ بھی منسلک کی تھی کہ کارسیوا پُرامن نہیں ہو گی۔ انہوں نے ۴ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء کو ٹیلیفون پر ہوئی مجھ سے اپنی گفتگو کا بھی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے مسجد کے انہدام کی پیشتر آگاہی مجھ کو دی تھی۔

ارجن سنگھ کے انکشاف کے بعد اخبار والے مجھ سے برابر پوچھتے رہے کہ میں ان کے الزامات کی تصدیق یا تردید کروں لیکن میں اس کو اس لیئے ٹالتا رہا کہ یہ سرکار کا کام ہے کہ وہ اس کی وضاحت کرے لیکن جب حکومت کی طرف سے کسی ردّعمل کا اشارہ نہیں ملا تو بالآخر مجبور ہو کر میں نے انڈین ایکسپریس اخبار کے نمائندہ سے کہا کہ "میری خاموشی کو بے عملی سے نہ محمول کیا جائے کہ ارجن سنگھ کو فراہم کی گئی اطلاع پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی"۔

اخبارات میں راجیش پائلٹ جو مرکزی وزیر تھے کے بیانات بھی شائع ہوئے کہ انھوں نے ۴ر ڈسمبر ۹۲ کو ہی وزیر اعظم کو مطلع کر دیا تھا کہ ان کے پاس معتبر اطلاع ہے کہ ۶ر ڈسمبر کو متنازعہ عمارت منہدم کر دی جائے گی پائلٹ نے یہ بھی الزام لگایا کہ اس وقت وزیر داخلہ چوان نے اعلان کیا تھا کہ حفاظتی دستے اجودھیا میں صورتحال پر پوری نظر رکھے ہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ آر ایس ایس کے سربراہ راجندر سنگھ نے بھی عوامی بیان میں یہ انکشاف کیا کہ انھوں نے ۳ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء کو ہی وزیر اعظم کو مطلع کر دیا تھا کہ ۶ر ڈسمبر کو اجودھیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے، کانگریس آئی نے اس کی تردید کی ہے جمشید پور کے ایک جلسہ عام میں وزیر اعظم نے وضاحت کی کہ انہدام سے چار دن قبل یوپی کے گورنر نے انھیں مطلع کیا تھا کہ اُترپردیش میں صدر راج کا قیام حالات کو اور پیچیدہ کر دے گا صوبائی حکومت پر مرکزی حکومت کا کیا دباؤ ہے وزیر اعظم نے سوال کرتے ہوئے کہا کہ مرکزی حکومت کی حالت اس شخص کی جیسی تھی کہ جس کے بچے دشمنوں نے اغوا کر لیا ہو۔

مجھے امید ہے کہ حالات کے سلسلے وار بیان سے اس مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی ہو گی اور آنے والے "حادثات" کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

(باقی آئندہ)

کتابت: شاہ بہار محبوب بازار چادرگھاٹ حیدرآباد

- گھٹنوں سے اونچا غرارہ نہیں پہن سکتیں۔
- آرائشی لباس نہیں پہن سکتیں۔
- جاپانی بچے نشہ کی کوئی چیز استعمال نہیں کر سکتے۔
- اسکول میں چھری چاقو کی وارداتیں نہیں ہوتیں • جاپانی بچے اسکول سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ اسکول چھوڑتے وقت زار و قطار روتے ہیں • جاپانی شہروں میں ہر شام کو لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ اب چھ بج گئے ہیں اچھے بچے اور بچیوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی کار سنبھالیں اور گھر چلے جائیں۔ • جاپانی استاد اور شاگرد میں گہرا ربط ہوتا ہے اور جاپانی اسکول جاپان کی زندگی کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت مولانا کا یہ اشارہ کہ طلباء کو مطالعہ اور عمل کی طرف موڑ دینے کی ضرورت ہے۔ وقت کی اہم ترین پکار ہے۔ اس پکار پر عالمی تفکر جاری ہے اور مغربی ممالک کے نصاب تعلیم میں تیزی سے تبدیلی لائی جا رہی ہے کیونکہ علوم کا بوجھ بڑھ رہا ہے۔ اور وقت کی کمی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیئے نئی تکنیک کا استعمال شروع ہو گیا ہے مثلاً قرآنی تعلیمات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ایک کیسٹ میں بھر دیا گیا ہے جس کا نام "عالم" ہے دینی مدارس میں بھی درسی نصاب کے علاوہ غیر ملکی طریقہ پر سائنس اور دیگر علوم جدیدہ کا ذوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بعض ملکوں میں یہ تحریک چل رہی ہے کہ اخلاقیات کا ایک علمی اور معیاری نصاب ماؤں کے ہاتھ میں دیا جائے کہ اپنے گھروں میں چلائیں۔ تاکہ نصاب کا ایک حصہ گھروں میں پورا ہو جائے اور مدرسہ کا کام اس پر عمل درآمد کرانا ہو۔ جس کے لیئے کسی ذہنی تنظیم اور گھٹنے کی ضرورت نہ ہو۔ احقر نے سلسلۂ قرآن آپ کے مخاطب ہے "گھر کے درسیات کے طور پر تیار کیا ہے جس کی ایک قسط صرف ۵ منٹ میں سنائی جا سکتی ہے۔

متعدد اقدامات کئے گیا۔ بچوں سے متعلق قومی منصوبہ عمل میں پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں غذائیت کی کمی دور کرنے کے سلسلے میں جو نشانے مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے ایک نشانہ ہے۔ "تمام عورتوں کو اس قابل بنانا کہ وہ خاص طور سے چار سے چھ ماہ تک اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلا سکیں۔ نیز دوسرے سال بھی وہ یہ سلسلہ جاری رکھ سکیں" غذائیت سے متعلق قومی پالیسی اور غذائیت سے متعلق قومی منصوبہ عمل میں ماؤں کو غذائیت اور صحت کے بارے میں تعلیم دینے پر زور دیا گیا ہے۔

حکومت نے ایسی غیر سرکاری تنظیموں کو بھی نامزد کیا ہے جو قانون کی خلاف ورزی کے سلسلے میں عدالتوں سے رجوع کر سکتے ہیں۔ خواتین اور بچوں کی ترقی کے محکمے نے قومی سطح پر جن غیر سرکاری تنظیموں کو نامزد کیا ہے، ان میں یہ تنظیمیں شامل ہیں۔ سماجی بہبود سے متعلق مرکزی بورڈ، بچوں کی بہبود سے متعلق ہندوستانی کونسل، تحفظ اور صحت کے سلسلے میں صارفین کے اقدام سے متعلق انجمن اور ہندوستان میں ماں کا دودھ پلانے کے رواج کو فروغ دینے سے متعلق نظام

کریچ سے متعلق قومی فنڈ

حکومت ۱۲۰۰۰ سے زیادہ کریچ چلا رہی ہے تاکہ ملازمت پیشہ عورتوں کو سہولت مل سکے۔ حکومت نے ۱۹۹۴ میں ۱۹.۹ کروڑ روپے سے کریچ سے کریچ سے متعلق قومی فنڈ قائم کیا ہے تاکہ مزید کریچ کے لئے بڑھتی ہوئی مانگ پوری کی جا سکے۔ اب تک اس فنڈ سے ۹۴۴ کریچ کے لئے امداد کی منظوری دی جا چکی ہے۔ غیر منظم شعبے میں ملازمت پیشہ ماؤں کی مدد کرنے کے لئے تقریباً ۲۹۹ آنگن واڑی مرکزوں کو آنگن واڑی اور کریچ مرکزوں میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔

مزید برآں، خوراک اور غذائیت سے متعلق بورڈ ۲۷ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں واقع خوراک اور غذائیت سے متعلق اپنے ۴۳ اجتماعی توسیعی